منہاج القاصدین

تصنیف

امام عبد الرحمن ابن جوزیؒ

تلخیص

امام احمد بن محمد بن عبد الرحمن بن قدامہ مقدسیؒ

ادارہ معارف اسلامی

منصورہ ⊙ لاہور ⊙ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنہاجُ القاصِدین

تصنیف

امام عبدالرحمٰن ابنِ جوزیؒ

تلخیص

امام احمد بن محمد بن عبدالرحمٰن بن قدامہ مقدسیؒ

اُردو ترجمہ

محمد سلیمان کیلانی

اِدارۂ معارفِ اسلامی

منصورہ ـــــــ لاہور ـــــــ پاکستان

یکے از مطبوعات، ادارہ معارف اسلامی، لاہور

بار اوّل	:	۱۹۸۵ء
تعداد	:	ایک ہزار
مطبع	:	اللہ والا پرنٹرز دی مال لاہور
قیمت	:	۱۰۰ روپے

تقسیم کنندگان

المنار بک سینٹر، منصورہ، لاہور نمبر ۱۸

پاکستان

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

امام عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ (۵۱۱ - ۵۹۷ ھ) کی کتاب منہاج القاصدین (جو تلخیص و ترجمہ کی صورت میں پیش کی جارہی ہے) بلاشبہ اُنہی عظیم کتابوں میں سے ہے جنہیں حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے "علم کے موتی" کے نام سے یاد کیا ہے اور جو محض کتاب نہیں، بلکہ تحریکِ انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہیں۔

کتاب کے مصنف جس دور میں اصلاحِ امت کا کام سرانجام دے رہے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب عباسی خلافت کا آفتاب ایک مدت تک نصف النہار پر ضیا پاشیاں کرنے کے بعد مائل بہ زوال ہو چکا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا ظاہری ٹھاٹ باٹ اب بھی مرعوب کن تھا، ان کے دارالخلافے بغداد کو عروس البلاد کہا جاتا تھا اور ان کی سلطنت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت شمار کی جاتی تھی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان کے عصائے اقتدار کو گھن لگ چکا تھا۔ سلطنت کے ظاہری روپ کی طرح ان کی ظاہری زندگی پر بھی اسلام کا خول ضرور موجود تھا، لیکن عملی زندگی میں انہیں اس دین سے کچھ زیادہ علاقہ نہ رہ گیا تھا اور یقیناً یہ ان کی بے عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف وہ اندرونی خلفشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو رہے تھے اور دوسری طرف کافر قومیں انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔

شاید یہ قدرت کا مستحکم قانون ہے کہ قوموں کے دورِ زوال میں ان کے اندر کچھ بڑے آدمی ضرور پیدا ہوتے ہیں جو کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے زوال کے عمل کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں؛ چنانچہ عباسیوں کے دورِ زوال میں بھی بہت قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے عوام الناس کے اندر نئے سرے سے دینی اور اخلاقی روح پیدا کی اور اپنی درسگاہوں میں علم و عمل کے ایسے چراغ روشن کیے کہ حکمرانوں کے جھلمل کرتے دربار وں کی کافوری شمعیں دھندلا کر رہ گئیں۔ امام عبدالرحمٰن ابنِ جوزیؒ انہی عظیم مصلحین میں سے ایک ہیں۔

امامؒ کا پورا نام عبدالرحمنؒ بن علی بن محمد ابوالفرج جمال الدین البکری، الحنبلی، البغدادی الجوزی ہے۔ پندرہ پشتوں کے بعد ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ ان کے لقب ابن الجوزیؒ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ایک دادا، جن کا نام جعفر تھا، بصرہ کے ایک محلے جوزہ میں رہتے تھے۔ اسی نسبت سے وہ ابن الجوزیؒ کہلائے۔ ابن الجوزیؒ کی پیدائش راجح قول کے مطابق ۵۱۱ ہجری میں بغداد میں ہوئی۔ تین سال کے تھے کہ ان کے والد علیؒ بن محمد کا انتقال ہو گیا جو تانبے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ وہ اپنے پیچھے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بڑی جائیداد چھوڑ گئے تھے۔ ابن الجوزیؒ کی والدۂ محترمہ نے تربیت کے لیے انہیں ان کی ایک نیک نفس اور خدا پرست پھوپھی کی تحویل میں دے دیا۔ جب یہ کچھ بڑے ہوئے تو وہ خاتون انہیں بغداد کے ایک مشہور عالم محدث ابوالفضل محمدؒ بن ناصر کی خدمت میں لے گئیں۔ ابن الجوزیؒ نے ان کے پاس قرآن کریم حفظ کیا اور ساتھ ہی حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ بھی سینے میں محفوظ کر لیا، بلکہ محدثین کے طریقے کے مطابق امام احمدؒ بن حنبل کے مسند اور متعدد دیگر کتبِ حدیث کا ان سے سماع کیا۔ شیخ محمدؒ بن ناصر جب تک زندہ رہے ابن الجوزیؒ نے ان کی صحبت ترک نہیں کی۔

حصولِ علم کے معاملے میں ابن الجوزیؒ نے صرف ایک دو علوم پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حدیث و فقہ سے لے کر لغت و ادب، خطابت و مناظرہ اور دیگر کئی علوم و فنون میں دسترس حاصل کی۔ ابن الجوزیؒ نے اپنی کتاب مشیخۃ ابن جوزی میں اپنے اساتذہ کی تعداد ۸۰ سے اوپر بیان کی ہے۔

حصولِ علم کا شوق گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ بالکل چھوٹی عمر میں یہ حال تھا کہ کتاب کے سوا کوئی چیز اچھی لگتی ہی نہ تھی اور مطالعے کے علاوہ کوئی بات پسند آتی ہی نہ تھی۔ خود بیان کیا ہے "ہم عمر بچے جن مشاغل میں مصروف رہتے تھے مجھے ان میں سے کوئی پسند نہ آتا تھا" طالب علمی کے زمانے میں تقریباً بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اللہ نے حافظہ بھی قابلِ رشک دیا تھا جس کی برکت سے تمام مروجہ علوم میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ جو بات ایک بار سن لیتے تھے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔

امام ابنِ جوزیؒ کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات میں اتنی وجاہتیں جمع ہو گئی تھیں کہ کسی ایک شخص کو کم ہی میسر آتی ہیں۔ بہت خوش رو اور خوش حال ہونے کے ساتھ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے مفسر، محدث، مصنف، خطیب اور مؤرخ تھے۔

انہوں نے مختلف علوم و فنون پر اپنی گرفتاری (۵۹۰ - ۵۹۵ ھ) تک جو کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ رہائی کے بعد بھی ان کی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں اکثر و بیشتر چھپ چکی ہیں اور متعدد ابھی مخطوطوں کی شکل میں ہیں یا نایاب ہو چکی ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ابن الجوزیؒ نے حالات کا رُخ دیکھ کر بغداد میں وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف علم وفضل کا پیکر تھے، بلکہ اخلاص وللّٰہیت اور تقویٰ وپارسائی میں بھی بے مثال تھے۔ ان کے درسوں کا ٹہ ا چرچا ہونے لگا اور ہر طبقے کے لوگ ان میں شرکت کرنے لگے " تراجم القرنین السادس والسابع " کے مطابق "ان کے درسوں میں خلفاء اور وزراء بھی شرکت کرتے تھے، امراء واعیانِ ملک بھی اور علماء وعوام بھی اور حاضرین کی کم از کم تعداد دس ہزار ہوتی تھی۔ جمعہ کے وعظ میں یہ حاضری ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور ہیبت دونوں پیدا کر دی تھیں۔

ابن الجوزیؒ نے بروایت " تراجم رجال القرنین " خود بیان فرمایا کہ: میں نے اپنی عمر میں ان دو انگلیوں کے ساتھ دو ہزار مجلدات تحریر کی ہیں۔ میرے ہاتھ پہ ایک لاکھ افراد نے توبہ کی اور دس ہزار یہودی اور عیسائی مسلمان ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ابن الجوزیؒ کی عمر اور علم دونوں میں برکت عطا فرمائی اور لوگ چالیس سال تک بغداد کے اندر ان کے مواعظ و دروس کی خوشبو سے معطر ہوتے رہے۔ ان کے درسوں سے مُردہ دلوں میں جان پڑ گئی، بے راہ رو راہِ راست پہ آ گئے اور مسلم مُعاشرے کے اندر ایمان و اخلاق کی بہار تازہ ہو گئی۔

ابوالفرج ابن الجوزیؒ کی وفات ۱۲ رمضان ۵۹۷ ہجری میں ہوئی۔ تراجم رجال القرنین نے ان کی وفات کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ایک روز منبرِ وعظ سے اترے اور یکایک بیمار ہو گئے اور پھر پانچ روز تک بغداد میں اپنے گھر میں مرض میں مبتلا رہے۔ چھٹے روز جمعرات کو مغرب اور عشاء کے درمیان جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ ان کی والدہ رحمہا اللہ بتاتی ہیں کہ: موت سے چند لمحات پہلے میں نے اُن کے منہ سے یہ الفاظ سُنے:

"آپ لوگ طاؤس لے کر آ گئے ہیں۔ میں ان طاؤسوں کو کیا کروں"

بغداد کے محدث شیخ ضیاء الدینؒ ابن جُبیر نے سحری کے وقت ابن الجوزیؒ کو غسل دیا۔ پورا بغداد اُن کی طرف اُمڈ آیا۔ بازار بند ہو گئے۔ لوگوں نے ابن الجوزیؒ کے تابوت کو رسیاں باندھ دیں اور وہ شہر کا نے جنازہ کو تھما دیں۔ ان کا جنازہ اسی مقام پہ لے جایا گیا جہاں ان کی مجلسِ وعظ ہوتی تھی۔ نمازِ جنازہ ان کے بیٹے ابوالقاسمؒ علی نے پڑھائی، اس لیے کہ دوسرے سرکردہ علماء ہجوم کی وجہ سے تابوت تک نہ پہنچ پائے۔ پھر ان کا تابوت بغداد کی جامع المنصورہ میں لے جایا گیا اور وہاں دوسرا جنازہ پڑھا گیا۔ حالت یہ تھی کہ مسجد اپنی وسعت کے باوجود لوگوں کے لیے تنگ ہو رہی تھی۔ وہ دن بغداد کا ایک اہم دن تھا۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس انہیں دفن کر دیا گیا۔ جب ان کے جسم مبارک کو قبر میں اتارا جا رہا تھا، بغداد کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں

لوگ غم و اَلم سے نڈھال ہوگئے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا کی آوازیں تھیں۔ خلقِ کثیر رمضان بھر ان کی قبر کے پاس بیٹھی رہی اور لوگ قرآن کریم ختم کرتے رہے۔

یہ روایت بھی انہی کے بارے میں بیان کی گئی ہے کہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو وصیت کی کہ مجھے غسل دینے کے لیے وہ تراشے ایندھن کے طور پر استعمال کیے جائیں جو قلم بناتے ہوئے جمع ہوئے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ قلم کے تراشے اس مقدار میں جمع ہو چکے تھے کہ غسل کا پانی گرم کرنے کے بعد بھی بچ گئے۔

ابوالفرج ابن الجوزیؒ کی تصانیف کی تعداد اوپر بیان ہو چکی ہے، ان میں سے چند ایک نمایاں تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ زاد المسیر (قرآن کریم کی تفسیر۔ اس میں مصنف نے تمام تفسیری اقوال کا احاطہ کیا ہے)
۲۔ تلقیح فھوم الآثار (سیرو تاریخ)
۳۔ مناقب عمرؒ بن عبد العزیز
۴۔ المقیم المقعد (عربی زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے بارے میں)
۵۔ صولۃ العقل علی الھوی (اخلاقیات)
۶۔ الناسخ و المنسوخ
۷۔ تلبیس ابلیس (اردو میں چھپ چکی ہے)
۸۔ فنون الافنان فی عجائب علوم القرآن (قرآنی علوم پر ایک جامع کتاب)
۹۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم (اقوامِ ماضیہ کی تاریخ)
۱۰۔ الذھب المسبوک فی سیر الملوک (مختلف حکمرانوں کے حالات اور ان کا تجزیہ)
۱۱۔ مناقب عمرؓ بن الخطاب
۱۲۔ مناقب امام احمدؒ بن حنبل
۱۳۔ صید الخاطر
۱۴۔ مثیر عزم الساکن الی اشرف الاماکن (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ)
۱۵۔ الضعفاء و المتروکین (رجالِ حدیث)
۱۶۔ نزھۃ الاعین النواظر فی علم الوجوہ والنظائر (قرآن و حدیث میں مترادف اور متوارد کلمات کی تشریح)
۱۷۔ الموضوعات (موضوع احادیث کا ذخیرہ)

۱۸۔ منہاج القاصدین (جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)

منہاج القاصدین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تزکیہ و تصوّف کو جمع کر دیا گیا ہے اور یُوں اس خطرناک تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے فقہ و حدیث کا راستہ الگ اور تزکیہ و تصوّف کا راستہ الگ کر دیا تھا اور یہ تفریق محض علم و فکر کی حد تک نہ رہی تھی، بلکہ اس کی بنیاد پر امّت مختلف گروہوں میں بٹ رہی تھی۔ ایک طرف فقہاء و محدثین کا گروہ تھا اور دوسری طرف اربابِ تزکیہ و تصوّف کا طائفہ۔ منہاج القاصدین دینی علوم کے اندر وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اس میں احکامِ شریعت کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ماخذ قرآن و سنّت ہے اور ان کے مقاصد روح کی نشو و نما اور تعلق باللہ کی استواری قرار پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے نہایت مفید سرمایۂ علم و عمل ثابت ہوگی۔ خود اس کتاب کا تاریخی پس منظر یہ واضح کرتا ہے کہ جس زمانے میں منہاج القاصدین لکھی گئی، مسلمانوں کی بے علمی اور عقیدے میں بگاڑ انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ جوہر اُن سے قریب قریب چھن چکا تھا جو قوموں کو معزز اور آزاد رکھتا ہے؛ چنانچہ اُن کی اسی کمزوری کی وجہ سے تاتاریوں کی یلغار اُنہیں اس طرح روندتی چلی گئی جس طرح کسان تیار فصل کاٹتا ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر تاتاریوں کے حملے سے پہلے عقائد و اعمال کی اصلاح کا وہ کام نہ کر لیا گیا ہوتا جو امام ابنِ جوزیؒ اور اُن کے ہم مرتبہ علماء نے کیا، تو مسلمانوں کے سنبھالا لینے کا امکان بھی معدوم ہو جاتا۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی اگر مسلمان اپنا وجود برقرار رکھنے اور اپنی اُجڑی ہوئی مملکتوں کو پھر منظم کرنے میں کامیاب ہوئے، تو اس کا باعث یہی تھا کہ اُن کی تباہ شدہ صفوں میں ایک عنصر ایسا ضرور موجود تھا جس میں صحیح دینی غیرت کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی سکت بھی تھی اور یہ وہی عنصر تھا جس نے دین میں تفریق ختم کر کے اس کی صحیح تعلیم کی اشاعت کی اور نہ صرف مسلمانوں کے احوال و اعمال کی اصلاح کر دی، بلکہ فاتح اقوام کو بھی آخر کار اسلام کے قدموں میں لا ڈالا۔

امام ابوالفرج ابن الجوزیؒ کی کتاب "منہاج القاصدین" وسیع و عریض ابواب و مضامین پر مشتمل ہے۔ اسے علماء و عوام کے لیے آسان بنانے کی خاطر ایک اور محدّث اور فقیہ نے اس کی تلخیص کی جس کا اردو ترجمہ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بزرگ امام احمد بن محمد قدامۃ المقدسی ہیں جو بیت المقدس کے نامور حنبلی علماء میں سے ہیں۔ تفقّہ میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ طبقات الحنابلہ کے مصنّف ابنِ رجب حنبلی نے انہیں زاہد و عابد اور علم الفرائض کے اندر اونچا پایہ رکھنے والا شمار کیا ہے۔ ان کا لقب شرف الدین اور کنیت ابوالعباس ہے۔ موصوف ۴ محرم ۶۵۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۵ محرم ۶۸۰ ہجری کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ بیت المقدس میں روضہ کے مقام پر اپنے نانا، نامور فقیہ شیخ الاسلام موفق الدینؒ قدامہ کے جوار میں دفن ہوئے۔

احمدؒ بن محمد المقدسی نے اپنے نانا شیخ الاسلام موفقؒ الدین ابن قدامہ سے حدیث کا سماع کیا۔ نیز اپنے دور کے دیگر علمائے حدیث و فقہ سے بھی مختلف علوم اخذ کیے۔ فقہ میں وہ التقیؒ بن العز کے شاگرد تھے۔ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں:

" احمدؒ بن محمد نامور عالم اور صالح انسان تھے۔ زہد و عبادت میں مشہور تھے۔ کم پر قناعت اور بے نیازی ان کا شعار تھا۔ علم الفرائض میں خصوصی دستگاہ رکھتے تھے۔ علمِ جبر و مقابلہ میں یکتا تھے۔ جامع المظفر میں ان کا حلقۂ درس قائم تھا جس میں سالہا سال بغیر کسی اجرت کے درس دیتے رہے۔ علماء کے گروہِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا ہے۔"

ادارۂ معارفِ اسلامی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ مختصر منہاج القاصدین کا اُردو ترجمہ اُردو دان طبقہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ یہ ترجمہ مولانا محمد سلیمان کیلانی نے کیا ہے اور پھر دیگر متعدد اہلِ علم نے اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے ہر لحاظ سے ثقہ اور مستند بنا دیا ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ یہ کتاب دراصل اُس عظیم منصوبے کی ایک کڑی ہے جس کے تحت ادارۂ معارفِ اسلامی فقہ و حدیث، تاریخ و رجال اور سیرت و اخلاق سے متعلق امہاتِ کُتب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس ارادے کو بروئے کار لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیں اخلاص سے نوازے اور ہم سے اپنے دین کی وہ خدمت لے جو آخرت میں ذریعۂ نجات بن جائے۔

خلیل احمد حامدی

ڈائرکٹر ادارۂ معارفِ اسلامی، منصورہ
لاہور

دیباچہ از مؤلف

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی رحمت تمام بندوں کے شامل حال ہے اور سیدھے راستے کی ہدایت کے لیے اُس نے اہلِ طاعت کو مخصوص کر رکھا ہے اور کرم گستری سے ان کو اچھے اعمال کی توفیق عطا فرمائی ہے اور وہ اپنی مراد کو پہنچے ہیں۔

میں اُس کی بے انتہا نوازشوں کا اقرار کرتے ہوئے اُس کی تعریف کرتا ہوں اور دور کر دینے اور رہائی دینے کے عذاب سے اس کی پناہ لیتا ہوں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں ایسی شہادت دیتا ہوں جس کو میں قیامت کے روز کے لیے ذخیرہ بناؤں۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور اُس کے رسول ہیں جنھوں نے اصلاح وہدایت کی راہ واضح کی۔ ضدی اور کجرو لوگوں میں سے، بے دینوں اور منکروں کا قلع قمع کیا۔ اللہ تعالیٰ آپؐ پر اور آپؐ کی آل کرام پر ایسی رحمتیں نازل فرمائے جو ان کو ان کی آرزوؤں کی انتہا تک پہنچا دیں۔

امابعد۔ مجھے ایک دفعہ شیخ، امام، یگانۂ روزگار، عالم، جمال الدین ابن جوزیؒ کی کتاب "منہاج القاصدین" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اسے بے حد مفید اور بہترین پایا۔ یہ کتاب مجھے بڑی پسند آئی۔ میں نے چاہا کہ اس کو حاصل کر کے تفصیلی مطالعہ کروں، چنانچہ جب میں نے اسے دوبارہ غور سے پڑھا تو وہ میرے اندازے سے بھی بہت زیادہ بہتر ثابت ہوئی، لیکن کتاب بڑی ضخیم تھی۔ یہ محسوس کر کے مجھے خیال آیا کہ اس کی تلخیص اس طرح کردوں کہ پورے مقاصد بھی درج ہو جائیں اور اس پر کچھ حواشی بھی دے دوں جس سے فوائد میں اضافہ بھی ہو جائے۔

بحمد اللہ اس ارادے کو جامۂ عمل پہنانے کی توفیق نصیب ہوئی۔

یہ کام کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا کہ ماسوائے اُن ظاہری مسائل کے جو کتاب کی ابتداء میں فروعات سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ فقہ کی متداول کتابوں میں مشہور ہیں کوئی ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔

میں نے ابن جوزیؒ کی ترتیب اور بعینہٖ اُن کے الفاظ کی پابندی کا التزام نہیں کیا، بلکہ اختصار کے لیے بعض مقامات کا مضمون بیان کر دیا ہے اور ضرورت محسوس ہونے پر کوئی حدیث بھی ذکر کر دی ہے جو اصل کتاب میں نہ تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

طالبانِ حق سے خطاب

مصنف رحمہ اللہ نے خطبے[1] کے بعد فرمایا:

اے عزم بالجزم رکھنے والے صادق مرید! میں دیکھتا ہوں کہ تو نے اپنے نفس کو آمادہ کیا ہے کہ دنیا

---

[1] تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو غفلت کی نیند میں سونے والوں کو جگا دینے والے امور کے ذریعے بیدار کرنے والا ہے اور توبہ کرنے والوں کو واعظوں کی نرم نرم باتوں سے پاک کرنے والا ہے اور جو عارفین سے اُن کی خلوت میں نہایت شیریں انداز میں باتیں کرنے والا ہے اور زاہدوں کو اونچی خواہش کو اپنانے سے بچانے والا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ظاہر بینوں سے الگ ہو گئے اور نفس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جیسے بپھرا ہوا شیر! جس چیز کی حفاظت کا ان سے مطالبہ تھا اس کی حفاظت کی۔

میں اللہ تعالیٰ کی باقی رہنے والے الفاظ میں تعریف کرتا ہوں اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتا ہوں جس نے عکاظ کے دن بذربان فصحاء کے بیانات کو باطل کر دیا اور ان کی آل اور صحابہ پر بھی جو اہلِ یقین اور متقی اور بیدار دل تھے۔

ایسا درود وسلام جس سے میں قیامت کے روز اس آگ کے شعلوں سے بچ سکوں جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر بڑے سخت گیر فرشتے متقرر ہیں۔

میں نے اپنی اس کتاب کا نام "منهاج القاصدين ومفيد الصادقين" رکھا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور تمام پڑھنے سننے دیکھنے والوں کو بھی فائدہ دے اور اسے خالص اپنی رضامندی کے لیے انتخاب کرے اور ہمارا خاتمہ بالخیر ہو اور وہ ہمیں ایسے قول اور فعل اور نیت کی توفیق دے جسے وہ خود پسند کرتا ہے اور ہماری تقصیرات سے درگزر فرمائے اور ہمیں پلک جھپکنے تک بھی ہمارے نفس کے سپرد نہ کرے اور نہ اپنی کسی اور مخلوق کی طرف رغبت دلائے۔ وہی ہمیں کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

کی فضول چیزوں کی مشغولیت سے الگ ہو جائے اور اپنی توجہ آخرت پر مرکوز کر دے۔ اس لیے کہ تو جانتا ہے کہ مخلوق کی صحبت پراگندہ کرتی ہے اور نفس کا محاسبہ نہ کرنا ہی تقصیرات کی بنیاد ہے۔

زندگی کو با مقصد نہ بنایا جائے گا تو ایک دن موت اسے آلے گی اور سانسوں کی سواریاں سوار کو جلد ہی موت کی منزل تک پہنچا دیں گی۔ سو میں نے غور کیا کہ کونسی کتاب ہو جو تیری خلوت کی ساتھی ہو اور جب تو خاموش ہو تو وہ بولے۔

اگر تو کتاب "احیاء علوم الدین" کو پسند کرے اور خیال کرے کہ وہ اپنی شان میں بے مثال اور اپنی ذات میں نفیس ترین ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ کتاب "احیاء" میں کچھ آفتیں ہیں جن کو صرف علماء ہی جانتے ہیں۔ اس کی کمتر آفت احادیث باطلہ، موضوعہ اور احادیث آثار موقوفہ ہیں، جن کو مرفوع حدیث بنا دیا گیا ہے۔ مصنف نے ان کو جیسا پڑھا ہے ویسا ہی نقل کر دیا ہے۔

میں کیسے پسند کروں کہ تو دن رات ایسی نمازیں پڑھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کلمہ نہ فرمایا ہو اور میں کیسے پسند کروں کہ تیرے کان متصوفین کے ایسے کلام کی طرف لگے رہیں جن کو انھوں نے خود جمع کیا ہے اور جن کا کچھ بھی حاصل نہیں۔ مثلاً فنا اور بقا کے مباحث اور بھوکا رہنے کا حکم دینا۔ بغیر ضرورت کے سیاحت کے لیے نکلنا اور بغیر خرچ کے جنگلوں میں جا کر بیٹھ جانا وغیرہ۔

میں نے ان کاموں کے نقصانات اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں کھول کر بیان کر دیے ہیں اور اب میں تیرے لیے ایسی کتاب لکھ رہا ہوں جو ایسے تمام مفاسد سے پاک ہے۔ میں نے اس میں صحیح اور مشہور روایات نقل کی ہیں۔ اچھے اور پائیدار معانی کو ملحوظ رکھا ہے۔"

اس کے بعد فرمایا، جب نفس سے پورا پورا حق وصول کرنے اور اس کی روک تھام کے لیے گوشہ نشینی پر تیرا ارادہ پختہ ہو جائے، تو اس پر تیرا وکیل عالم ہونا چاہیے۔ خواہشات نفس کی باریکیوں کو اچھی طرح کرید تاکہ تو سلامت رہے۔

ان دو آدمیوں کی راہ سے بچ کر رہنا!

ایک اس عالم کی راہ سے جو فقہ میں جھگڑا کرتا ہے۔ اپنی سرداری پر قناعت کر چکا ہے یا جج کے عہدے پر فائز ہے اور اپنے عہدے کی حفاظت میں کوشش کرتا رہتا ہے یا وہ بڑا اچھا واعظ ہے اور اپنے جال کے حلقے تنگ کرتا جاتا ہے۔

دوسرے اس زاہد کی راہ سے جو اپنی جہالت میں اپنی فاسد رائے کو سند بناتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو بوسہ دینے والوں کو عزیز رکھتا ہے اور اپنی ذات کے بابرکت ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے اور اللہ کی شریعت اور نبی کی سنت چھوڑ کر اپنی خواہش پر عمل کرتا ہے۔

یہ دونوں صحیح راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور گودے کو چھوڑ کر چھلکوں پر قناعت کر چکے ہیں۔ یہ مبتدی لوگوں کو اپنی ظاہری آب و تاب سے دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کا طریقہ سلف صالحین کے طریقے سے جو کہ استقامت و سلامتی کا طریقہ تھا بالکل الگ ہے۔

میں اس کتاب میں ان شاء اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے واقعات درج کروں گا جن سے ان کے آثار کا پتہ چلے گا۔ آسانی کے خیال سے میں نے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ عبادات کے متعلق ہے، دوسرا عادات کے متعلق، تیسرا مہلک چیزوں کے بیان میں اور چوتھا نجات و بخشش کے تذکرے میں۔

یہ چاروں حصے کئی ابواب اور فصول میں منقسم ہیں۔

کتاب العلم

- علم، اُس کی فضیلت اور متعلقات
- حقیقی علم کی تعریف
- علم معاملہ اور اُس کی تفصیل
- علم کے فوائد
- مناظرہ بازی کی قباحتیں
- اُستاد و شاگرد کے آداب اور آفاتِ علم کا بیان
- علماءِ سُو اور علماءِ حق

فصل اوّل

علم، اس کی فضیلت اور متعلقات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[1] (آپ کہیں کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا: يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ[2] (تم میں سے مومنوں اور علم والوں کو اللہ تعالیٰ درجات میں بلند کرے گا)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: "علماء کو عام مومنوں پر سات سو درجوں کی بلندی نصیب ہوگی اور دو درجوں کے درمیان پانچ سو سالہ راہ ہوگی"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ[3] (اللہ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں)

صحیحین میں معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: "جس کا اللہ بھلا کرنا چاہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے"۔

ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمیوں کا تذکرہ ہوا: ایک ان میں سے عالم تھا اور دوسرا عابد، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی مجھ کو تم میں سے ایک ادنیٰ آدمی پر۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معلم خیر پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتے ہیں اور اس کے فرشتے اور زمین اور آسمانوں کے رہنے والے اس کے لیے دعا کرتے ہیں یہاں تک کہ چیونٹیاں اور مچھلیاں بھی رحمت کی دعا کرتی ہیں۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا اور حسن صحیح کہا۔

ایک اور حدیث میں ہے: "عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو عام ستاروں پر"

---

[1] سورۂ زمر آیت: ۹

[2] سورۂ مجادلہ آیت: ۱۱

[3] سورۂ فاطر آیت: ۲۸

فرمایا: علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء درہم اور دینار (روپیہ پیسہ) کا ورثہ نہیں چھوڑتے۔ وہ ورثے میں علم چھوڑ کر جاتے ہیں جس نے علم حاصل کر لیا اس نے بہت سا حصہ لے لیا۔" اسے ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتے طالب علم کے مقصود پر خوش ہو کر اپنے پَر اس کے سامنے بچھا دیتے ہیں۔" اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔

خطابی نے کہا: پَر بچھانے کے متعلق تین قول ہیں:

۱۔ وہ حقیقتاً پَر بچھاتے ہیں۔

۲۔ طالب علم کی تعظیم کے لیے تواضع کرتے ہیں۔

۳۔ علم کی مجلسوں میں نازل ہوتے ہیں اور اڑنا چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی علم کی تلاش میں کسی رستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو آدمی اسلام کو زندہ کرنے کے لیے علم حاصل کرتے ہوئے مر جائے تو جنت میں اس کے اور نبیوں کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔ اس مضمون میں اور بہت سی احادیث ہیں۔[۱]

ایک حکیم کا قول ہے: "میں نہیں سمجھتا کہ جسے علم نصیب نہ ہوا اسے کیا ملا اور جسے علم مل گیا وہ کس چیز سے محروم ہے؟"

تعلیم دینے کی فضیلت کے متعلق صحیحین میں سہلؓ بن سعد کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے ایک آدمی کو ہدایت دے دے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔"

ابن عباسؓ نے کہا: "جو لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا ہے اس کے لیے ہر جاندار چیز بخشش کی دعا کرتی ہے"

---

[۱] اسے دارمی نے حسن سے مرسلاً روایت کیا ہے اور طبرانی نے اوسط میں ابن عباسؓ سے مرفوعاً ایسی ہی حدیث روایت کی ہے اور اس کی سند میں محمد بن جعد متروک ہے۔

یہاں تک کہ دریاؤں اور سمندروں کی مچھلیاں بھی"۔

ایک مرفوع حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ قول مروی ہے۔

یہ سوال کہ مچھلیاں معلّم کے لیے کیوں بخشش کی دعا کرتی ہیں ؟ تو اس سوال کا جواب سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ علم کا نفع ہر چیز کو پہنچتا ہے، یہاں تک کہ مچھلیوں کو بھی۔ کیونکہ علماء علم کی وجہ سے حلال و حرام کو جانتے ہیں اور وہ ذبح ہونے والے جانوروں اور مچھلیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حسنِ سلوک کے بدلے میں تمام جانوروں کو الہام کر رکھا ہے کہ وہ علماء کے لیے استغفار کریں۔

ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے " اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی ہے۔ کچھ زمین تو بہت اچھی تھی اس نے پانی کو جذب کیا اور گھاس اور سبزی اُگائی اور کچھ خشک تھی (گڑھے وغیرہ) تو اس نے پانی کو روک لیا۔ اُس سے اللہ نے لوگوں کو فائدہ دیا۔ انھوں نے پیا اور پلایا اور کھیتی باڑی کی اور کچھ صاف چٹیل اور بنجر تھی نہ اُس نے پانی کو روکا اور نہ گھاس اُگائی۔ تو یہ اس آدمی کی مثال ہے جس نے دین کا علم حاصل کیا اور اللہ نے اسے اس کے ساتھ نفع دیا۔ اُس نے پڑھا بھی اور پڑھایا بھی اور اس کی مثال بھی جس نے اسے سر اٹھا کر نہ دیکھا اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جسے مجھے دے کر بھیجا گیا ہے۔" اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔

اللہ تم پر رحم فرمائے اس حدیث پر غور کرو کہ مخلوق کے کتنی مطابقِ حال ہے۔ عقلمند اور فقہاء لوگ تو اس زمین کی طرح ہیں جس نے پانی کو قبول کیا اور گھاس اگائی کیونکہ اُنھوں نے علم حاصل کیا اور سمجھا اور استنباط کیا اور لوگوں کو سکھایا۔ دوسرے محدثین سے نقل کرنے والے لوگ جن کو خود فقہ اور فہم و فراست سے حصہ نہ ملا ان کا حال اس زمین جیسا ہے جس نے پانی کو روک لیا اور لوگوں نے ان کے علم سے فائدہ اٹھایا۔ رہے وہ جنھوں نے سنا اور علم حاصل نہ کیا اور نہ یاد رکھا تو یہ جاہل عوام ہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: "اگر علماء نہ ہوتے تو لوگ چارپایوں کی طرح ہوتے"۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "علم حاصل کرو کہ اللہ کے لیے علم حاصل کرنا خشیّت، اُس کا طلب کرنا عبادت، اُس کا پڑھنا پڑھانا تسبیح، اُس کی تحقیق کرنا جہاد، بے علم کو علم سکھانا صدقہ اور اُس کے اہل پر اُس کی سخاوت کرنا قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور وہی تنہائی کا انیس اور خلوت کا ساتھی ہے۔"

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اے موسیٰ بھلائی کا علم حاصل کرو اور وہ لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں بھلائی کے معلّم اور متعلّم دونوں کی قبروں کو نور سے بھر دیتا ہوں کہ وہ قبروں میں وحشت محسوس نہ کریں۔"

فصل دوم

حقیقی علم کی تعریف

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" اسے احمد نے "علل" میں روایت کیا ہے[1]۔

مصنف رحمہ اللہ نے کہا لوگوں کا اس میں اختلاف ہے۔

فقہاء کہتے ہیں یہ فقہ کا علم ہے کیونکہ اسی سے حرام حلال معلوم ہوتا ہے۔

مفسرین اور محدثین کہتے ہیں کہ یہ کتاب و سنت کا علم ہے کیونکہ انہی سے تمام علوم تک رسائی ہوتی ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ یہ اخلاص اور آفات نفس کا علم ہے۔

متکلمین کہتے ہیں یہ علم کلام ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ اقوال ہیں جن میں کوئی بھی پسندیدہ قول نہیں اور صحیح یہ ہے کہ یہ بندے کا اپنے رب سے معاملے کا علم ہے اور وہ معاملہ جس کا بندہ مکلف ہے تین قسم پر ہے:

عقیدہ، عمل اور منہیات سے پرہیز۔

اس لیے جب بچہ بالغ ہو جائے تو سب سے پہلا فرض اس پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ کلمۂ شہادتین سیکھے۔

---

[1] اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ بوصیری نے "زوائد" میں کہا اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ حفص بن سلیمان ضعیف راوی ہے۔ سیوطی نے کہا شیخ محی الدین نووی رحمہ اللہ سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو کہا سنداً ضعیف ہے اگرچہ مطلب کے لحاظ سے صحیح ہے۔ آپ کے شاگرد جمال الدین مزی نے کہا "یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے اس لیے حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے" سیوطی نے کہا میں نے اس کے پچاس طرق دیکھے ہیں اور میں نے ان کو ایک جزء میں جمع کر دیا ہے۔

اور ان کے معانی سمجھے۔ چاہے اس نے ان کے باب میں غور و فکر نہ کیا ہو اور دلائل سے ان کی صداقت معلوم نہ کی ہو۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اُجڈ لوگوں سے صرف تصدیق ہی قبول فرمائی تھی۔ ان کو دلیل کا علم حاصل نہ تھا۔ اس کے بعد اس پر واجب ہے کہ استدلال اور غور و فکر سے بھی کام لے۔

پھر اس پر نماز اور طہارت کا سیکھنا فرض ہوگا اور رمضان المبارک کے روزے رکھے گا اور اس کے پاس مال ہوگا تو سال گزر جانے پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔ اسی طرح صاحب حیثیت ہونے کی صورت میں حج کرنا واجب ہوگا۔

باقی رہے منہیات تو وہ حالات کے مطابق ہوتے ہیں کیونکہ اندھے پر واجب نہیں ہے کہ وہ ایسی چیزوں کا علم حاصل کرے جن کو دیکھنا منع ہے۔ گونگے پر واجب نہیں کہ وہ جانے کہ کون سی بات کہنا حرام ہے۔ پھر اگر کسی شہر میں شراب نوشی اور ریشمی لباس پہننے کا عام رواج ہو تو اُس پر فرض ہے کہ ان کی حرمت کو جانے۔

جن عقائد میں خیالات فاسد کی دخل اندازی ہو، ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر اس کو کلمۂ شہادت کے معانی میں کوئی شک ہو تو واجب ہے کہ ایسی چیزوں کا علم حاصل کرے جن سے شک زائل ہو جائے۔ اگر کسی شہر میں بدعات کا عام رواج ہو تو اس پر واجب ہے کہ حق سیکھے جیسے کہ کوئی تاجر اگر کسی ایسے شہر میں ہو جہاں سودی کاروبار عام ہو تو اس پر سود سے پرہیز کرنے کا علم حاصل کرنا واجب ہوگا۔

یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قیامت اور جنت و دوزخ پر ایمان لانے کا علم حاصل کرے۔

ہمارے مذکورہ بیان سے واضح ہو گیا کہ طلب علم سے مراد وہ علم ہے جو فرض عین ہے اور جس کا وجوب اشخاص پر متعین ہو۔

فرض کفایہ وہ علم ہے جو دنیاوی امور کے لیے ضروری ہو۔ مثلاً علم طب کہ وہ ابدان کو صحت پر باقی رکھنے کی حاجت میں ضروری ہے اور حساب کہ وہ وراثت اور وصیتوں کی تقسیم کے لیے ضروری ہے۔

یہ علوم ایسے ہیں کہ اگر کوئی شہر ایسے علوم کے جاننے والوں سے خالی ہو تو تمام شہریوں کو تکلیف ہو۔ ہمارے اس قول پر تعجب نہ کیا جائے کہ طب اور حساب وغیرہ علوم فرض کفایہ میں سے ہیں کیونکہ صناعات کے اصول بھی فرض کفایہ ہیں۔ مثلاً کاشتکاری اور کپڑا بننا بلکہ پچھنے اور سنگی لگانا بھی۔ کیونکہ اگر کوئی شہر ایسے ماہرین سے خالی ہوگا تو ان کی طرف ہلاکت تیز رفتاری سے آئے گی۔[1]

---

[1] میں کہتا ہوں کہ طب اور تمام کونی علوم فرض کفایہ ہیں اور ان میں رسوخ حاصل کرنا مسلمانوں پر واجب ہے تاکہ وہ ان کے اچھے اور مفید نتائج سے فائدہ اٹھا سکیں جن سے ان کو خیر اور نفع حاصل ہو اور مسلمانوں کی شوکت اور عظمت تو اسلام ا

بعض علوم مباح (جائز) ہیں جیسے ایسے اشعار کا علم جن میں بے وقوفی، کمزوری، یا وہ گوئی نہ ہو اور اخبار کی تاریخ وغیرہ۔ اور بعض علوم مذموم بُرے ہیں۔ جیسے جادو اور طلسم اور فریب کاری وغیرہ۔

باقی رہے شرعی علوم تو یہ سب اچھے علم ہیں اور ان کی چار قسمیں ہیں: اصولؔ، فروعؔ، مقدماتؔ اور متممات۔ پھر اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنّت اور اجماعِ اُمت اور آثارِ صحابہ ہیں۔

فروع سے وہ معانی مراد ہیں جو ان اصولوں سے ذہنی بیداری کی وجہ سے سمجھ میں آجائیں، یہاں تک کہ ملفوظ معنی کے ساتھ ذہن ان معانی تک بھی پہنچ جائے جن کے لیے الفاظ نہیں۔ جیسا کہ آنحضرت کے اس قول سے کہ "قاضی غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے" یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بھوک کی حالت میں بھی فیصلہ نہ کرے۔

مقدمات وہ علوم ہیں جو آلات کے قائم مقام ہیں، جیسے علم نحو و لغت وغیرہ کہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علم کے آلات ہیں۔

متممات جیسے قرأت اور مخارج حروف کا علم یا جیسے اسماء الرجال اور ان کی عدالت اور ان کے حالات کا جاننا کہ یہ سب شرعی علوم ہیں اور سب اچھے ہیں۔

فصل سوم

علمِ معاملہ اور اس کی تفصیل

پھر علمِ معاملہ ہے اور وہ ہے دل کے حالات کا علم، جیسے خوف، امید، رضا، صدق اور اخلاص وغیرہ تو انہی کی وجہ سے علماء بلند مراتب تک پہنچے اور ان کا تذکرہ چار دانگ عالم میں ہوا۔ جیسے سفیانؒ ثوری، ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ۔

ان مقامات سے علماء اور فقہاء کا مرتبہ جو گر گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علم کی صورت میں تو مشغول رہے لیکن نفس پر گرفت نہ کی کہ وہ ان کے حقائق تک پہنچتے اور ان کے مخفیات پر عمل کرتے۔ تم فقیہہ کو دیکھو گے کہ ظہار، لعان، گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی پر گفتگو کرے گا اور ایسے ایسے مسائل بیان کرے گا جس سے ساری زندگی واسطہ نہ پڑے لیکن اخلاص پیدا کرنے اور ریا سے بچنے کے متعلق گفتگو نہ کرے گا حالانکہ یہ اس پر فرضِ عین ہے کیونکہ ان کو چھوڑ دینے میں اُس کی ہلاکت ہے۔

اگر اُس سے سوال کیا جائے کہ اخلاص اور ریاء کی بحث کیوں ترک کر دی ہے، تو اس کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ ہاں اگر لعان اور تیر اندازی کے مسائل میں مشغول ہونے کا سبب پوچھا جائے تو وہ کہے گا یہ فرضِ کفایہ ہے۔ بیشک یہ فرضِ کفایہ ہے لیکن اُس سے یہ بات کیوں مخفی رہی کہ علمِ حساب حاصل کرنا بھی فرضِ کفایہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کا نفس مغرور ہے کیونکہ اس کا مقصد ریاء اور سُمعہ (دکھانا اور سنانا) ہے اور وہ مناظرے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ علمِ حساب کی تحصیل سے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ان الفاظ میں تبدیلی اور تحریف ہو چکی ہے۔ اب ان کے وہ معنی ہیں جو سلفِ صالحین کے وقت نہیں تھے اور انہی میں سے لفظ فقہ بھی ہے۔ انھوں نے اس میں تحریف کر ڈالی ہے اور اسے فروع اور اس کے علل و اسباب کی معرفت سے خاص کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ عصرِ اوّل میں فقہ کا لفظ آخرت کی راہ اور آفاتِ نفوس کے دقائق کی معرفت اور مفسداتِ اعمال اور دنیا کی حقارت کے احاطہ کی قوت اور آخرت کی نعمتوں کی شدید خواہش اور دل پر خوف کے غلبے پر بولا جاتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ نے کہا فقیہ وہ ہے جو دنیا سے بے نیاز، آخرت کا طالب، دین پر توجہ رکھنے والا، ہمیشہ اپنے رب کی عبادت کرنے والا، پرہیزگار، مسلمانوں کی بے عزتی کرنے سے باز رہنے والا۔ ان کے مال واسباب کا محافظ اور ان کا خیرخواہ ہو۔ وہ اکثر فقہ کا لفظ علم آخرت پر بولا کرتے تھے، کیونکہ اس وقت وہ صرف فتاویٰ میں مشغول ہونے کو فقہ نہیں کہتے تھے بلکہ وہ اس کو عموم و شمول کے طریق سے لیتے تھے۔ اب اس تخصیص سے ایک ایسی تلبیس پیدا ہوئی جس نے اس لفظ کو صرف ظاہری فتاویٰ کے علم کے لیے خاص کر دیا اور معاملۂ آخرت کے علم سے بے نیازی ہوگئی۔

دوسرا لفظ علم ہے۔ پہلے یہ لفظ اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کے مفہوم میں بولا جاتا تھا، یعنی بندوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کے افعال پر۔ پھر زیادہ تر فقہی مسائل میں بحث کرنے والے پر استعمال کرنے لگے۔ اگرچہ وہ تفسیر اور احادیث سے جاہل ہی کیوں نہ ہو۔

تیسرا لفظ توحید ہے، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تم تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو اور اس طرح سمجھو کہ اسباب اور وسائل سے توجہ پوری طرح ہٹ جائے۔ اس سے توکل اور رضا حاصل ہوگی لیکن اب اس کے معنی ہیں اصولِ دین میں فنِ کلام یا اصول میں صنعتِ کلام، حالانکہ سلف صالحین اس مفہوم سے بالکل ناآشنا تھے۔

چوتھا لفظ تذکیر اور ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ[1] (اور نصیحت کر کہ نصیحت مومنوں کے لیے مفید ہے۔)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو کچھ کھا پی لیا کرو۔" صحابہؓ نے پوچھا "جنت کے باغ کون سے ہیں؟" تو فرمایا "ذکر کی مجلسیں۔"

اب یہ لفظ منتقل ہو کر واقعات اور قصہ گو لوگوں کی بکواس اور یاوہ گوئی پر بولا جانے لگا ہے۔ جو اپنے وعظ میں سنے سنائے قصے بیان کرنے کا عادی ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر واقعات جو بیان کیے جاتے ہیں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنا ازار بند کھولا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنا ہاتھ منہ میں لے کر کاٹ رہے تھے۔ یا حضرت

---

[1] سورۃ ذاریات آیت ۵۵

داؤد علیہ السلام نے اوریا کو میدانِ جنگ میں بھیج دیا یہاں تک کہ وہ مارا گیا۔ ایسے واقعات بیان کرنا اور سننا نقصان سے خالی نہیں۔ ایسی شطحیات اور بے سروپا باتوں کا سننا عوام کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ ان میں عموماً محبت اور وصال اور فراق کے دکھ کا تذکرہ ہوتا ہے اور حاضرین بالعموم اجڈ اور غیر مہذب ہوتے ہیں۔ اُن کے باطن خواہشات و شہوت اور اچھی صورتوں کی محبت سے بھرے ہوتے ہیں؛ چنانچہ یہ باتیں ان کے دلوں میں شہوانی تحریک کرتی ہے۔ اس سے شہوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور وہ چیخ اٹھتے ہیں اور یہ سب کچھ بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔

پانچواں لفظ حکمت ہے۔ حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔

ابن قتیبہؒ نے کہا آدمی اس وقت تک حکیم نہیں ہوتا جب تک علم اور عمل کو جمع نہ کرلے، لیکن اب یہ طبیب اور نجومی پر بولا جانے لگا ہے۔

فصل چہارم

علم کے فوائد

معلوم ہونا چاہیے کہ اچھے علوم دو قسم کے ہیں:

پہلا وہ ہے جو اپنی انتہا تک اچھا ہی اچھا ہے اور جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے اور یہ علم ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کے افعال اور دنیا پر آخرت کو مرتب کرنے کی حکمت کا علم۔ یہ علم اور اس کے ذریعے سے آخرت کی سعادت کا حصول مقصود بالذات ہے اور یہ وہ سمندر ہے جس کی گہرائی کی انتہا نہیں۔ اس کے گرد پھرنے والے عموماً اس کی گہرائی کے بجائے اس کے ساحل اور اطراف پر اپنی ہمت کے مطابق پھرتے ہیں۔

دوسرا وہ علم ہے جس کی ایک خاص مقدار ہی محمود ہے اور یہ وہی علوم ہیں جن کو ہم فرض کفایہ کہتے ہیں۔ ان علوم میں ادنیٰ، درمیانہ اور انتہائی تینوں مراتب ہیں۔

تم دو آدمیوں میں سے ایک بن جاؤ، یا تو اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول رہو یا اپنے نفس کی اصلاح سے فارغ ہو کر دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرو لیکن خبردار! اپنے نفس کی اصلاح سے پہلے دوسروں کی اصلاح میں مشغول نہ ہونا۔ تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے نفس کو بری صفات سے پاک کرنے میں مشغول ہو جاؤ، جیسے حرص، حسد، ریا اور غرور وغیرہ سے۔

اس کے بعد اپنے ظاہر کی اصلاح کرو (ان شاء اللہ اس کا مفصل بیان ربع مہلکات کے حصے میں آئے گا) یہ بات ضروری ہے کہ جب تک تم اس سے فارغ نہ ہو تو فرض کفایہ کی طرف توجہ نہ کرو کہ مخلوقات میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ جو اپنے آپ کو ہلاک کرے اور دوسرے کی اصلاح چاہے بے وقوف ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے کپڑوں میں بچھو داخل ہو جائیں اور وہ اس کی طرف سے غافل رہ کر دوسروں کی مکھیاں اڑا رہا ہو۔

پھر جب تم اپنے نفس اور اس کی تطہیر سے فارغ ہو جاؤ ــــ اور یہ کتنی مشکل بات ہے ــــ

تو فرائض کفایہ میں مشغول ہو جاؤ اور ان میں بھی مراتب کا خیال رکھو!
پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے شروع کرو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر توجہ کرو، پھر قرآنی علوم تفسیر اور ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ وغیرہ کو دیکھو۔
اسی طرح حدیث میں بھی تفکّر کرنا چاہیے، پھر فروعات شروع کرو اور اصولِ فقہ دیکھو اور باقی علوم کے حصول میں کوشاں ہو جاؤ اور جس قدر بھی عمر اور وقت اجازت دے انھیں حاصل کرو۔ ایک ہی فن کی انتہا تک پہنچنے میں اپنی عمر برباد نہ کرو کہ علوم تو بے شمار ہیں جب کہ عمر بہت تھوڑی ہے۔ پھر یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ علوم محض آلات ہیں مقصود کچھ اور ہے اور ہر وہ چیز جو دوسروں کی وجہ سے مطلوب ہو اس کا یہ حق نہیں کہ اس میں آدمی اپنا مقصد ہی بھول جائے۔

مناظرہ بازی کی قباحتیں

معلوم ہونا چاہیے کہ مناظرہ جس کا مقصد دوسرے پر غالب آنا اور فخر کرنا ہو وہ اخلاق ذمیمہ کا منبع ہے۔ یہ صورت ہو تو مناظر تکبّر اور مغلوب کو حقارت سے دیکھنے کی برائی سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے نفس پر مغرور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے جیسے بہت سے لوگوں پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ ریاء سے بھی نہیں بچ سکتا کیونکہ ایسے مناظر کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کے غلبے کا علم ہو جائے اور وہ اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ ظاہر ہے ایسا آدمی اپنی زندگی برباد کر لیتا ہے۔ یقیناً ایسے علوم کسی کام کے نہیں جو مناظرے میں تو مددگار ہو سکتے ہیں، لیکن آخرت میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ جیسے نوادرات و شذوذ کا یاد کرنا اور تحسینِ الفاظ وغیرہ۔
حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "قیامت کے روز سب سے سخت عذاب اس عالم کو ہوگا جس کو اس کے علم نے فائدہ نہ دیا۔"

فصل پنجم

اُستاد و شاگرد کے آداب اور آفاتِ علم

شاگرد کو چاہیے کہ پہلے اپنے نفس کو ردّی اخلاق اور مذموم صفات سے پاک کرے، پھر علم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو کیونکہ علم دل کی عبادت ہے اُسے چاہیے کہ دنیاوی معاملات میں مشغول کرنے والے تعلقات کو ختم کر دے کیونکہ جب فکر تقسیم ہو جائے تو وہ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ سلف صالحین علم کو ہر چیز پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ امام احمدؒ کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے چالیس سال کے بعد نکاح کیا۔ ابوبکر بن انباری کو ایک لونڈی ہدیہ میں دی گئی جب وہ آپ کے پاس آئی تو آپ کسی مسئلے کے استخراج میں غور کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے توجہ بٹ گئی اور آپ کی فکر نے کام نہ کیا۔ فرمایا "دلال کے پاس لے جاؤ کہ وہ اسے بیچ دے"۔ اس نے کہا "میرا کوئی گناہ"؟ آپ نے کہا "کوئی گناہ نہیں بات یہ ہے کہ میرا دل تجھ میں مشغول ہو گیا۔ اور تیرے جیسی عورت کی قدر و منزلت اتنی نہیں کہ مجھے میرے علم سے روک دے"۔

شاگرد پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح استاد کے سپرد کر دے جیسے مریض اپنے آپ کو طبیب کے حوالے کر دیتا ہے۔ استاد سے تواضع کے ساتھ پیش آئے اور اس کی خدمت میں مبالغہ کرے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رکاب تھام لیتے اور کہتے ہیں علماء سے ایسا ہی سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر شاگرد کسی ایسے آدمی سے استفادہ کرنے سے گریز کرے جو اس میں مہارت کی شہرت نہ رکھتا ہو تو وہ بدنصیب ہے کیونکہ حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے وہ جہاں بھی اُسے پائے لے لے۔ شاگرد کو چاہیے استاد کی رائے کے سامنے اپنی رائے چھوڑ دے کیونکہ استاد کی غلطی بھی شاگرد کے لیے اس کی رائے کے مقابلے میں مفید ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تجھ پر عالم کا یہ حق ہے کہ تو قوم کو عام سلام کہے لیکن عالم کو خصوصی اسلام کا تعظیماً ہدیہ پیش کرے اور اس کے سامنے مودب بیٹھے اور اس کے پاس اپنے ہاتھ سے اشارہ تک نہ کرے نہ آنکھ سے بے باکانہ دیکھے۔ کثرت سے سوال نہ کرے اور نہ جواب دینے میں اس کی مدد کرے۔ جب وہ سست ہو تو

اصرار نہ کرے اور خاموش ہو جائے جب وہ اٹھے تو اس کا کپڑا نہ پکڑے۔ اس کے راز کو فاش نہ کرے۔ اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے اور اس کی لغزش کی جستجو نہ کرتا رہے۔ اگر وہ لغزش کر جائے تو اس کے عذر کو قبول کرے اور اس کے سامنے ایسا نہ کہے کہ میں نے فلاں سے اس طرح سنا ہے اور یہ نہ کہے کہ فلاں آدمی آپ کے خلاف کہتا ہے۔ اس کے سامنے کسی عالم کی تعریف نہ کرے۔ اس کی لمبی صحبت سے اکتا نہ جائے اور اس کی خدمت سے دست بردار نہ ہو۔ جب اس کا کوئی کام ہو تو لوگوں سے اس کام میں سبقت کرے۔ وہ ایک پھل دار درخت ہے۔ انتظار کر کہ کب کوئی پھل تجھ پر گرتا ہے "۔

جو علم حاصل کرنے کا خواہاں ہو اسے چاہیے کہ ابتدا میں لوگوں کے اختلافات کی طرف توجہ نہ کرے اس سے اس کی عقل حیران اور ذہن پریشان ہو جائے گا۔ اُسے چاہیے کہ ہر چیز سے اس کا بہترین حصہ حاصل کرے کیونکہ عمر میں تمام علوم حاصل کرنے کی وسعت نہیں ہے۔ پس لازم ہے کہ اپنا پورا وقت بہترین علم پر صرف کرے اور وہ آخرت سے تعلق رکھنے والا علم ہے کہ جس سے وہ یقین حاصل ہوتا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شہادت دی اور فرمایا "ابوبکر جو تم پر سبقت لے گئے ہیں تو وہ نماز روزے سے نہیں لے گئے وہ دل کے یقین سے آگے بڑھے ہیں"۔

یہ تو شاگرد کے فرائض تھے اسی طرح استاد پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور ان میں سے شاگردوں پر شفقت بھی ہے۔ ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھے اور علم سکھانے پر کسی معاوضے کا طلبگار نہ ہو۔ نہ ان سے جزاء اور شکریہ کا خواہشمند رہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے پڑھائے۔ شاگردوں پر کچھ احسان نہ رکھے بلکہ ان کی قدر کرے کہ انھوں نے اپنے دلوں کو علم کی زراعت کے سبب اللہ کے تقرب کے لیے تیار کیا ہے اور یوں ان کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو کسی کو عاریتہً زمین کاشت کرنے کے لیے دے دے۔ معلّم کو تعلیم کی مزدوری صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرنی چاہیے۔ سلف صالحین تو شاگرد کا ہدیہ بھی قبول نہیں کیا کرتے تھے۔

استاد کا فرض ہے کہ شاگرد کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ انھیں بڑے اخلاق سے تعلیم دے۔ اشارۃً بھی ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے کیونکہ اس سے ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے۔

استاد کا فرض ہے کہ شاگرد کے فہم و فراست اور عقل کی مقدار معلوم کرے۔ اس کو ایسی چیز نہ بتائے کہ اس کا فہم، اس کا ادراک نہ کر سکے اور اس کی عقل اس کے احاطے سے معذور رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

روایت کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے ان کی عقول کے مطابق خطاب کروں۔"[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہاں ایک ایسا علم بھی ہے کہ اگر میں اس کے حاملین پاتا تو انھیں اس کی تعلیم دیتا۔" امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

۱- کیا میں اونٹ چرانے والوں کے آگے موتی بکھیر دوں ؟ کیا بکریوں کے چرواہوں کے لیے موتی پروؤں ؟

۲- جس نے جاہلوں کو علم دیا اُس نے علم کو ضائع کیا اور جس نے قابل آدمیوں سے علم کو روکا اس نے بھی ظلم کیا۔

ان باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ استاد اپنے علم کے مطابق عمل بھی کرے اور اس کا کردار اس کی گفتار کی تکذیب نہ کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ[2]۔ (کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا، "دو آدمیوں نے میری کمر توڑ دی ہے عالم بدکردار اور جاہل عبادت گزار۔"

---

[1] اس مضمون کی کوئی صریح مرفوع حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور یہ مضمون حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے "لوگوں سے ایسی بات کرو جس کو وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور رسولؐ کی تکذیب کی جائے؟" اسے بخاری نے اپنی صحیح (۱: ۱۹۹) میں تعلیقاً روایت کیا ہے اور ابن مسعودؓ کا قول بھی اسی طرح ہے، "اگر تو لوگوں سے ایسی بات کرے گا جو ان کی عقل میں نہ آئے، تو یہ بات بعض کے لیے فتنے کا باعث بنے گی۔" اسے مسلم (۱: ۱۱) نے روایت کیا۔

[2] سورۃ بقرہ آیت: ۴۴

فصل ششم

علماء سوء اور علماء حق

علمائے سوء (بُرے عالم) وہ ہیں جن کا علم حاصل کرنے سے مقصود دنیوی آسائش، دنیاداروں کی نظروں میں اعتبار حاصل کرنا اور جاہ و منزلت تک پہنچنا ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی دنیا کا سامان حاصل کرنے کے لیے ایسا علم سیکھے جس سے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہو تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔"

دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: "جس نے اس لیے علم حاصل کیا کہ علماء سے مقابلہ کرے یا جہلاء سے جھگڑے یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے تو وہ آگ میں داخل ہو گا۔" اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اسی مفہوم کی اور بہت سی احادیث ہیں۔

بعض سلف نے کہا: "موت کے وقت سب سے زیادہ ندامت کوتاہی کرنے والے عالم کو ہوتی ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ عالم پر صرف اوامر و نواہی کی پابندی ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہو اور جائز چیزوں سے پرہیز کرے۔ ہاں اُسے یہ ضرور چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو دنیا تھوڑی حاصل کرے۔ اس لیے کہ ہر ایک جسم ہر قسم کی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ بڑے خوش خوراک تھے اور کہا کرتے تھے جب تک تم گھوڑے کو اچھی خوراک نہ دو گے وہ کام نہیں کرے گا۔" ان کے مقابلے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بڑی سخت زندگی پر بھی صبر کر لیتے تھے۔ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔

علمائے حق کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کو حقیر سمجھتے ہیں اور آخرت کو بزرگ اور اُن کے افعال اُن کے اقوال کے مخالف نہیں ہوتے اور اُن کا میلان اس علم کی طرف ہوتا ہے جو آخرت میں نفع دے۔ وہ زیادہ مفید کو پسند کر کے تھوڑے فائدے والے علوم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حضرت شقیقؒ

بلخی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے حاتم سے کہا: "تم اتنی مدت میرے پاس رہے، تم نے کیا سیکھا؟"

انھوں نے جواب دیا: "آٹھ باتیں":

پہلی یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی محبوب ہوتا ہے اور جب وہ قبر میں جاتا ہے تو محبوب جدا ہو جاتا ہے پس میں نے اپنی نیکیوں کو اپنا محبوب بنا لیا تاکہ وہ قبر میں میرے ساتھ رہیں۔

دوسری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو دیکھا: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى[1] (اور نفس کو خواہشات سے روکا) تو میں نے اسے خواہشات کو روکنے کی مشقت دی اور میرا نفس اللہ کی عبادت پر آکر ٹھہر گیا۔

تیسری یہ کہ میں نے دیکھا کہ جس کسی کے پاس کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ[2] (جو تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا) تو جب بھی میرے ہاتھ میں کوئی قیمتی چیز آئی میں نے اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دیا تاکہ وہ میرے پاس باقی رہے۔

چوتھی یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مال اور حسب ونسب اور بزرگی کو دیکھتے ہیں اور ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں، تو میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر غور کیا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[3] (تم میں سب سے معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) اور تقویٰ اختیار کیا تاکہ میں اللہ کے نزدیک معزز بن جاؤں۔

پانچویں یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا وہ آپس میں حسد کرتے ہیں تو میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیا نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ[4] (ہم نے ان میں زندگی کے اسباب تقسیم کیے ہیں) اور حسد چھوڑ دیا۔

چھٹی یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا وہ ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو دیکھا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا[5] (کہ شیطان تمھارا دشمن ہے تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو) تو

---

[1] سورۂ نازعات آیت: ۴۰ [2] سورۂ نحل آیت: ۹۶ [3] سورۂ حجرات آیت: ۱۳

[4] سورۂ زخرف آیت: ۳۲ [5] سورۂ فاطر آیت: ۶

میں نے لوگوں کی دشمنی چھوڑ کر صرف شیطان سے دشمنی باقی رکھی۔

ساتویں یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا وہ رزق کی تلاش میں اپنے نفس کو ذلیل کرتے ہیں تو میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دیکھا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا[1] (اور زمین میں جو بھی جاندار ہے اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے) تو ان چیزوں میں مشغول ہو گیا جو اس نے میرے ذمے لگائی ہیں اور اس کی فکر چھوڑ دی جس کا میرے لیے اس نے ذمہ لیا ہے۔

آٹھویں یہ کہ میں نے لوگوں کو دیکھا وہ اپنی تجارت اور صنعت اور جسمانی صحت پر بھروسہ کرتے ہیں تو میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا۔"

اور علمائے حق کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بادشاہوں سے کھچے رہتے ہیں اور ان کے ملنے ملانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فتنے کے مقامات سے بچو! پوچھا گیا وہ کونسے مقامات ہیں؟ تو فرمایا: امراء کے دروازے۔ تم میں سے کوئی آدمی امیر کے پاس جاتا ہے تو اس کے جھوٹ کی تصدیق کرتا ہے یا اس کی جھوٹی تعریف کر کے اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ امراء کے دروازوں پر جاتا ہے، تو اس سے بچو وہ چور ہے۔"

بعض سلف نے کہا: "جتنی تم ان سے دنیا حاصل کرو گے اس سے زیادہ وہ تمہارا دین خراب کریں گے۔"

علمائے حق کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ فتویٰ دینے میں جلدی نہیں کرتے اور صرف وہی فتویٰ دیتے ہیں جس کا ان کو یقین ہو۔

سلف فتویٰ کو ایک دوسرے پر ٹالتے جاتے یہاں تک کہ پہلے کے پاس ہی آ جاتا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے کہا: "میں نے اس مسجد میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو بیس صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ ان میں سے جس کسی سے بھی کوئی حدیث یا فتویٰ پوچھا جاتا اس کا دل یہی چاہتا کہ کوئی دوسرا بھائی اس کا جواب دے دے، لیکن اب معاملہ ان لوگوں کی جرأت تک آ پہنچا ہے جو ایسے مسائل

---

[1] سورہ ہود آیت: ۶

کا جواب دینے کے لیے جری ہو جاتے ہیں کہ اگر وہی مسائل عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پیش آتے تو اہلِ بدر کو اکٹھا کر کے اُن سے مشورہ لیتے۔

اُن کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ اُن کی اکثر بحث اعمال کے علم میں ہوتی ہے کہ عمل کس طرح ضائع ہو جاتے ہیں اور دل مکدر کیسے ہوتے ہیں اور وساوس کیوں پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ اعمال کی صورتیں قریب اور آسان ہوتی ہیں؛ چنانچہ ان کو پاک صاف رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور دین کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی بُرائی سے بچے لیکن جب تک اس کا علم نہ ہو انسان بُرائی سے کیسے بچ سکتا ہے۔

اُن کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اعمال شرعیہ کے اسرار اور حکمتوں کے متعلق بحث کرتے تھے، لیکن اگر وہ معلوم نہ ہو سکیں تو شریعت کے سامنے جھک جانے کو کافی سمجھتے تھے۔

اُن کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ صحابہ اور خیار تابعین کی اتباع کرتے اور بدعت سے بچتے ہیں۔

کتاب الطہارۃ

- طہارت، اس کے اسرار اور نماز کے متعلقات
- نماز کی فضیلت
- جمعہ اور نمازِ جمعہ کے آداب
- نوافل کا بیان
- نماز کے مسائل

فصل اوّل

طہارت، اس کے اسرار اور نماز کے متعلّقات

معلوم ہونا چاہیے کہ طہارت کے چار مرتبے ہیں :

پہلا : ظاہری طہارت۔ نجاست، فضلات اور حدث سے پاک ہونا۔

دوسرا : اعضاء کو گناہوں سے پاک صاف رکھنا۔

تیسرا : دل کو اخلاقِ ذمیمہ اور ناپسندیدہ و ذلیل چیزوں سے پاک رکھنا۔

اور چوتھا : اپنے باطن کو اللہ کے سوا ہر چیز سے پاک کر دینا اور یہی سب سے بڑا مقصد ہے جس کی بصیرت طاقتور ہوگی وہ اس مطلوب تک پرواز کرے گا، لیکن جس کی بصیرت اندھی ہوگی وہ طہارت کے مراتب میں سے صرف پہلا مرتبہ ہی جان سکے گا۔ تم اُسے دیکھو گے کہ وہ اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ استنجا میں زور لگانے اور کپڑے دھونے میں ضائع کر دے گا ——— وسوسوں اور قلّتِ علم کی وجہ سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ طہارت مطلوبہ صرف یہی ہے۔ وہ متقدّمین کی عادات سے جاہل ہے کہ وہ دل کو پاک کرنے میں اپنی ساری زندگی ختم کر دیتے تھے اور ظاہر کے معاملے میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے ایک عیسائی عورت کے مٹکے سے وضو کیا۔ وہ میل کچیل کی وجہ سے بسا اوقات ہاتھ بھی صاف نہ کرتے، زمین پر نماز پڑھتے، ننگے پاؤں چلتے اور استنجاء میں صرف ڈھیلوں کے استعمال پر اکتفا کر لیتے، لیکن اب اُن لوگوں تک معاملہ آپہنچا ہے جو حماقت کو نظافت کہتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اُن کا زیادہ وقت ظاہری ٹیپ ٹاپ میں گزرتا ہے جبکہ اُن کا باطن خراب ہے۔ اس میں تکبّر، غرور، جہالت، ریا اور نفاق وغیرہ کی گندگیاں بھری ہوئی ہیں۔ اگر وہ کسی کو دیکھیں کہ صرف ڈھیلوں کے استعمال پر اکتفا کرتا ہے اور زمین پر ننگے پاؤں چلتا ہے یا ننگی زمین پر نماز پڑھتا ہے یا کسی بڑھیا کے برتن سے وضو کرتا ہے تو اس پر سخت اعتراض کریں۔ اُسے "گندہ" کا لقب دیں اور ساتھ کھانے سے انکار کر دیں۔ دیکھو، اُن لوگوں نے سادگی کو جو کہ ایمان کا حصّہ ہے کس طرح "گندگی" اور احمقانہ فعل کو نظافت بنا دیا اور

برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی میں بدل ڈالا۔

جو آدمی اس طہارت سے نظافت کا ارادہ کرے اور پانی بہانے میں اسراف نہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ زیادہ پانی استعمال نہ کرنا دین کا منشا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں، نجاستوں اور پلیدیوں کی پہچان کے لیے فقہی کتابوں کی طرف رجوع کرو کہ اس کتاب کا مقصود "آداب" ہے۔

فضلات کا دُور کرنا دو طرح پر ہے:

ایک تو میل کچیل ہے جس کو زائل کیا جائے جیسے کہ سر میں میل جمع ہو جائے، تو اُسے غُسل اور کنگھی کر کے صاف کیا جائے اور تیل لگائے کہ بالوں کی پریشانی ختم ہو۔ اسی طرح کان اور ناک میں جو میل جمع ہو جائے اُس کا دور کرنا مستحب ہے۔

مسواک اور کُلی کرنا بھی مستحب ہے کہ دانت اور زبان میل کچیل سے پاک ہو۔ اسی طرح ہاتھوں کے پوروں کا میل ہے اور پھر تمام بدن کا میل جو راستے کے غُبار اور جسم کے پسینے سے جمع ہو جاتا ہے اور اُس کو غُسل زائل کرتا ہے۔

حمام میں غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ وہاں میل کچیل اچھی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت حمام جایا کرتی تھی، لیکن جو وہاں جائے اس پر لازم ہے کہ ستر پوشی کا خیال رکھے۔ جو شخص حمام میں داخل ہو، اس پر لازم ہے کہ اس کی حرارت سے آتش دوزخ کی حرارت یاد کرے کیونکہ مومن کی فکر دنیا کے ہر معاملے میں آخرت کی طرف چلی جاتی ہے۔ ہر برتن سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں ہو۔

کیا تم غور نہیں کرتے کہ اگر ایک آباد گھر میں بزاز اور بڑھئی اور معمار اور جولاہا داخل ہوں، تو بزاز فرش کو دیکھے گا اور اس کی قیمت کا اندازہ کرے گا۔ جولاہا کپڑے کی بنائی دیکھے گا۔ بڑھئی مکان کی چھت پر غور کرے گا اور معمار دیواروں کو دیکھے گا۔ اسی طرح مومن اگر اندھیرا دیکھے گا تو قبر کا اندھیرا یاد کرے گا اور اگر کوئی ہیبت ناک آواز سُنے گا تو نفخۂ صور کو یاد کرے گا۔ نعمتیں دیکھے گا تو اسے جنت کی نعمتیں یاد آئیں گی اور اگر عذاب دیکھے گا تو آگ کو یاد کرے گا۔

سورج غُروب ہونے کے قریب اور مغرب اور عشاء کے درمیان حمام میں جانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ شیطانوں کے پھیلنے کے اوقات ہیں۔

فضلات کے ازالہ کی دوسری قسم :

کچھ اجزاء ہیں جن کو کاٹا جاتا ہے۔ مثلاً مونچھوں کے بال، بغل کے بال، موئے زہار اور ناخن۔ سفید بالوں کا اکھاڑنا مکروہ ہے، لیکن خضاب لگانا مستحب۔ طہارت کے باقی مراتب مہلکات و منجیات کے رُبع میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ۔

فصل دوم

نماز کی فضیلت

رہا معاملہ نماز کا تو یہ دین کا ستون ہے اور تمام طاعات سے افضل۔ نماز کے فضائل میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں اور اس کے بہترین آداب میں سے خشوع ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:
"فرض نماز کا وقت آجائے تو جو آدمی اچھا وضو کرے، اچھا خشوع و رکوع کرے، تو یہ نماز اُس کے پہلے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی جب تک کہ کوئی کبیرہ گناہ نہ کرے، اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے"۔

آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اور حدیث بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو آدمی دو رکعت نماز پڑھے اور اس میں خیالات اور وساوس نہ لائے تو اس کے پہلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔"

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب نماز میں کھڑے ہوتے، تو خشوع کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے جیسے لکڑی کھڑی ہے۔ آپ سجدہ کرتے تو چڑیاں آپ کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتیں۔ ایک دن آپ حطیم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پتھر آپ کے کپڑے کا کچھ حصہ اُڑاتا ہوا آپ کے سامنے آگرا لیکن آپ پھر بھی نماز میں مشغول رہے۔

میمون بن مہران رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے مسلم بن لیسار کو کبھی نماز میں اِدھر اُدھر توجہ کرتے نہ دیکھا۔ ایک دفعہ مسجد کا ایک حصہ گر پڑا۔ اس کے گرنے سے بازار والے گھبرا گئے لیکن وہ نماز میں مشغول رہے۔

علی بن حسین رضی اللہ عنہ جب وضو کرتے تو آپ کا رنگ زرد ہو جاتا۔ آپ سے پوچھا گیا۔ وضو کے وقت آپ کی یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے؟ تو آپ نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ میں کس کے سامنے کھڑے ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں؟

معلوم ہونا چاہیے کہ نماز کے کچھ ارکان ہیں۔ کچھ واجب اور سنتیں۔ اور اس کی روح نیت، اخلاص

خشوع اور حضورِ قلب ہے۔ اور نماز کچھ اذکار و مناجات اور چند افعال پر مشتمل ہے۔ اگر دل حاضر نہ ہو تو اذکار اور مناجات بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر زبان سے دل کی صحیح ترجمانی نہ ہو تو وہ ہذیان کے مریض کی باتوں کے مانند ہے۔ اسی طرح محض افعال سے بھی اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ قیام کا مقصود خدمت اور رکوع و سجود کا انکساری اور اللہ کی تعظیم و کبریائی کا اقرار ہے۔ چنانچہ اگر دل حاضر نہ ہو تو مقصودِ حقیقی حاصل نہ ہوگا۔ اگر فعل اپنے مقصود سے خارج ہو جائے تو صرف اس کی صورت باقی رہ جاتی ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ[1] (اللہ کے پاس نہ قربانی کے گوشت پہنچتے ہیں نہ خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک جو چیز پہنچتی ہے وہ، وہ کیفیت ہے جو دل پر غالب آتی ہے اور بندے کو مطلوبہ اوامر کی تعمیل پر آمادہ کرتی ہے۔ نماز میں دل کا حاضر ہونا ضروری ہے، لیکن شارع نے اس غالب آنے والی غفلت میں کچھ نرمی رکھی ہے۔ اگر نماز کے ابتداء میں دل حاضر تھا تو باقی ساری نماز پر وہی حکم جاری ہوگا۔

وہ معانی جن سے نماز پوری طرح مکمل ہوتی ہے وہ بہت سے ہیں اور ان میں سے ایک حضورِ قلب ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کو ان تمام چیزوں سے خالی کر دے جو اس سے متعلق ہیں لیکن یہ بدون ہمت نہیں ہو سکتا، کیونکہ جب کوئی اہم کام ہوگا تو لازمًا دل اس کی طرف متوجہ ہوگا اس کو حاضر کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہمت کو نماز کی طرف پھیر دو اور ہمت کا پھرنا آخرت پر ایمان اور دنیا کی حقارت کے مطابق کمزور اور طاقتور ہوگا۔ پھر جب تم محسوس کرو کہ دل حاضر نہیں ہو رہا تو سمجھ لو اس کا سبب ایمان کی کمزوری ہے۔ اس کو طاقتور بنانے کی کوشش کرو!

دوسری بات کلام کے معانی کا سمجھنا ہے اور یہ حضورِ قلب کے علاوہ اور چیز ہے، کیونکہ بعض اوقات دل بھی حاضر ہوتا ہے اور لفظ بھی صحیح ادا ہوتے ہیں، لیکن معانی پر توجہ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں دل کے خیالات اور اُن کے اسباب کو ختم کر کے معانی کے ادراک کی طرف ذہن کو پھیرنا چاہیے کیونکہ جب تک سبب ختم نہ ہوگا خیالات کی آمد و رفت ختم نہ ہوگی۔

سبب یا تو ظاہری ہوگا یا باطنی، اور یہ بہت سخت ہے جیسے وہ آدمی جس کے خیالات دنیا کی وادیوں

---

[1] سورۃ الحج - آیت: ۳۷

میں منتشر ہو جائیں تو اس کی توجہ ایک چیز پر مرکوز نہیں ہو سکتی اور نہ اُسے آنکھوں کا بند کرنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ دل میں موجود ہے وہ مشغول ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اگر سبب ظاہری ہے تو جو چیزیں آنکھوں اور کانوں کو مشغول کرتی ہیں اُن کو ختم کر دیا جائے۔ یہ فائدہ اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان قبلے کی طرف متوجہ ہو جائے اور نگاہ کو سجدے کی جگہ جمائے رکھے۔ نیز نقش و نگار والی جگہ پر نماز پڑھنے سے پرہیز کرے اور اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہ رہنے دے جو اس کی حس کو مشغول کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب منقش انبجانیہ[1] پر نماز پڑھی تو اس کو ہٹا دیا۔ فرمایا: "اس نے میری نماز سے مجھے غافل کر دیا"۔

یہ سبب اگر باطنی ہے تو اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کو زبردستی نماز کی قراءت کی طرف متوجہ کرے اور دوسرے خیالات کو چھوڑ کر نماز کا خیال کرے اور نماز شروع کرنے سے پہلے اس کی تیاری کرے کہ اپنے تمام اشغال سے فارغ ہو جائے اور اپنے دل کو فارغ کرنے کی کوشش کرے اور اپنے نفس پر آخرت کی یاد کو مسلط کرے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کی بابت سوچے اور حشر کے ہولناک منظر کو یاد کرے۔ پھر اگر اس سے بھی خیالات نہ رکیں تو جان لے کہ وہ اپنی سب سے اہم اور مرغوب خواہش میں غور کرتا ہے تو اس خواہش کو چھوڑ دے اور ان علائق کو ختم کر دے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ بیماری اگر پختہ ہو چکی ہو تو اس کو طاقتور دوا ہی فائدہ دے سکتی ہے اور جب کوئی روحانی بیماری طاقتور ہو گی تو وہ نمازی کو کھینچے گی اور نمازی اسے کھینچے گا اور اس کشمکش میں نماز ختم ہو جائے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص درخت کے نیچے بیٹھا ہو اور یکسو ہو کر کسی معاملے پر غور کرنا چاہے اور چڑیوں کی آوازیں اسے پریشان کر رہی ہوں اور اس کے ہاتھ میں لکڑی ہو جس سے وہ چڑیوں کو اڑاتے اور ابھی وہ اپنی سوچ میں یکسو بھی نہ ہوا ہو کہ چڑیاں پھر اس درخت پر آ جائیں۔ تو اسے کہا جائے گا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ اگر تم اس سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہو تو درخت کو کاٹ دو۔ یہی مثال خواہشات کے درخت کی بھی ہے۔ جب یہ پھیلتا پھولتا ہے اور اس کی شاخیں دور دور چلی جاتی ہیں تو افکار اس کی طرف اس طرح کھنچے چلے آتے ہیں جیسے درخت پر چڑیاں اور گندگی پر مکھیاں؛ چنانچہ عمر عزیز ایسی چیزوں کی مدافعت میں ختم ہو جاتی ہے جو دفع نہیں ہوتیں۔ اس قوی خواہش کا سبب دنیا کی محبت ہے۔ عامر بن عبد قیس سے پوچھا گیا کیا آپ کو بھی نماز میں

---

[1] ایک کپڑے کا نام ہے جو منبج میں بنا جاتا ہے اور یہ شہر حلب کے علاقہ میں ہے اور بعض نے کہا کہ یہ انبجان شہر کی طرف نسبت ہے۔

دنیاوی خیالات ستاتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا: "مجھ پر ایسی حالت کے طاری ہونے سے یہ بہتر ہے کہ مجھ پر تیروں کی بوچھاڑ ہو۔"

معلوم ہونا چاہیے دنیا کی محبت کو دل سے نکالنا ایک مشکل کام ہے اور پوری طرح اس کو زائل کرنا تو بہت ہی مشکل ہے۔ بہر حال جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی کوشش کرے اور اللہ ہی توفیق دینے والا اور مددگار ہے۔

تیسری بات اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور ہیبت ہے اور یہ دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کی معرفت اور نفس کی حقارت اور یہ کہ اسے غلام بنا لیا گیا ہے تو ان دونوں معرفتوں سے خشوع اور عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

انہی میں سے اُمید بھی ہے جو خوف سے زائد اور علیحدہ چیز ہے۔ بادشاہ کی تعظیم کرنے والے بہت سے لوگ جس طرح اس کی عظمت کی وجہ سے خوف زدہ ہوتے ہیں اسی طرح اس کے احسان کے امیدوار بھی ہوتے ہیں۔ نمازی کو چاہیے کہ وہ اپنی نماز کے ثواب کی بھی اُمید رکھے جیسا کہ اس میں کوتاہی کرنے سے سزا کا خوف رکھتا ہے۔ نیز یہ بھی چاہیے کہ نماز کی ہر حالت میں دل کو حاضر رکھے۔ جب مؤذن کی آواز سنے تو اُسے قیامت کی نداء کا نمونہ سمجھے۔ اُس کی تعمیل میں اُٹھ کھڑا ہو۔ کمر ہمت باندھے اور غور کرے کہ کس حال میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اپنے باطن کی برائیوں کو یاد کرے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ سے اُن کو چھپا سکے اور اُن کا کفارہ ندامت، حیا اور خوف سے ہوتا ہے۔

جب قبلے کی طرف مُنہ کیا تو اپنے چہرے کو تمام جہات سے ہٹا کر بیت اللہ شریف کی طرف کر دیا۔ اسی طرح اپنے دل کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دے اور جیسے کہ قبلے کی طرف مُنہ اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک لوگوں کی طرف پیٹھ نہ ہو! اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف بھی توجہ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماسوی اللہ سے منہ نہ موڑ لے۔

اے نمازی! جب تو نے تکبیر کہی تو تیرا دل تیری زبان کی تکذیب نہ کرے۔ اگر تیرے دل میں اللہ تعالیٰ سے بڑی کوئی چیز ہو گی تو تُو جھوٹا ہو گا اور اس سے ڈر کہ تیری نگاہ میں خواہشِ نفس اللہ سے بڑی ہو کہ تو اُس کی موافقت کرے اور اللہ کی اطاعت کو چھوڑ دے۔

پھر جب تو اعوذ باللہ پڑھے تو تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف پناہ پکڑنا ہے۔ اگر تو

اپنے دل سے پناہ نہ پکڑے گا تو تیرا کلام لغو ہوگا۔ اپنی تلاوت کے معانی پر غور کر، جب تُو الحمد للہ رب العلمین (تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں) کہے تو اپنے دل میں اس کو سمجھ اور جب الرحمن الرحیم (نہایت شفقت کرنے والا مہربان) کہے تو اُس کی مہربانیوں کو ذہن نشین کر۔ اور مالك يوم الدين (روزِ جزا کا مالک) کہے تو اللہ کی عظمت ذہن میں لا اور اسی طرح باقی ساری تلاوت پوری کر!

زُرارہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی: فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ (پھر جب صُور میں پھونکا جائے گا) تو آپ کی وفات ہوگئی اور آپ گر پڑے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ انھوں نے اس حالت کا تصوّر کیا تو ہیبت سے جان نکل گئی۔

رکوع میں تواضع کا تصوّر کرو اور سجدے میں زیادہ سے زیادہ ذلّت کا، کیونکہ تم نے نفس کو اس کے مقام پر رکھ دیا اور مٹی پر سجدہ کر کے جس سے تم پیدا ہوئے تھے فرع کو اصل کی طرف لوٹا دیا۔ دیگر اذکار کے معنی تم ذوق سے معلوم کر لو گے۔

جاننا چاہیے کہ ان شرائط سے اگر نماز ادا کی جائے، تو دل کا زنگ دُور کر کے اس کو روشن کر دیتی ہے اور ایسے انوار حاصل ہوتے ہیں جن کے سبب معبود کی عظمت نظر آنے لگتی ہے اور آدمی اسرارِ الٰہی پر مطلع ہوتا ہے۔ ان باتوں کو عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

جو آدمی صرف نماز کی صورت ادا کرتا ہے۔ اُس کے معانی کو نہیں سمجھتا، وہ ان میں سے کسی چیز پر بھی مطلع نہیں ہو سکتا۔

فصل سوم

جمعہ اور نمازِ جمعہ کے آداب

آداب جمعہ پندرہ ہیں:

پہلا: یہ کہ اس کے لیے جمعرات کے روز اور جمعہ کی رات ہی سے تیاری شروع کرے۔ کپڑے دھوئے اور نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے خود کو تیار کرے۔

دوسرا: جمعہ کے دن غسل کرے جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے اور غسل میں بہتر یہ ہے کہ جمعہ کے وقت سے تھوڑا سا پہلے غسل کرے۔

تیسرا: بدن کو پاک صاف کر کے خوشنما بنائے، ناخن کاٹے، مسواک کرے اور تمام فضلات کو جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے دُور کرے۔ خوشبو لگائے اور اپنے بہترین کپڑے پہنے۔

چوتھا: یہ کہ جمعہ کے لیے نماز کے وقت سے کچھ پہلے روانہ ہو اور پیدل جائے

جامع مسجد کی طرف جانے والے پر لازم ہے کہ وقار اور تسلی اور خشوع سے چلے اور مسجد سے نکلنے کے وقت تک مسجد میں اعتکاف کرنے کی نیت کرے۔

پانچواں: یہ کہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور معقول گنجائش کے بغیر دو آدمیوں کے درمیان میں نہ بیٹھے۔ ہاں اگر کوئی خالی جگہ دیکھے تو آگے چلا جائے۔

چھٹا: یہ کہ کسی نمازی کے آگے سے نہ گزرے۔

ساتواں یہ کہ پہلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرے۔ اگر وہاں کوئی قباحت محسوس کرے تو پیچھے بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔

آٹھواں یہ کہ جب امام اپنے حجرے سے باہر نکل آئے تو ذکر اور نفل پڑھنا ختم کر دے، اذان کا جواب دے اور پھر توجہ سے خطبہ سنے۔

نواں یہ کہ جمعہ کے فرضوں کے بعد سنت ادا کرے۔ دو رکعت یا چار رکعت یا چھ رکعت جتنی چاہے۔

دسواں یہ کہ عصر کی نماز پڑھنے تک مسجد میں ٹھہرے اور اگر مغرب تک ٹھہرے تو افضل ہے۔

گیارھواں یہ کہ اس ساعتِ سعید کی جو جمعہ کے دن میں ہے حضورِ قلب اور ذکرِ الٰہی سے طلب کرے۔

اس ساعت کے متعیّن وقت میں اختلاف ہے۔ مسلم کی مفرد روایتوں میں حضرت ابو موسیٰؓ کی حدیث ہے کہ امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ وہ امام کے خطبے سے فارغ ہونے سے لے کر نماز ختم ہونے تک ہے۔ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ وہ عصر کے بعد کی آخری ساعت ہے۔ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ اُسے عصر سے لے کر غروبِ آفتاب تک تلاش کرو۔

حضرت ابوبکر اثرمؒ نے کہا یہ احادیث دو وجہوں سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو بعض احادیث بعض سے زیادہ صحیح ہوں گی اور یا پھر یہ ساعت مختلف اوقات میں منتقل ہوتی رہتی ہوگی۔ جیسا کہ لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

بارھواں یہ کہ اُس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بہت زیادہ پڑھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا جو آدمی جمعہ کے دن مجھ پر اسّی مرتبہ درود شریف پڑھے اس کے اسّی سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اگر پسند کرے تو درود میں آپ کے لیے دعا کا اضافہ بھی کر لے جیسا کہ یہ دعا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ ، اَللّٰهُمَّ اجْزِ نَبِيَّنَا عَنَّا مَا هُوَ اَهْلُهٗ۔

(اے اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ وسیلہ اور فضیلت اور بلند درجہ عطا فرما اور آپؐ کو مقامِ محمود پر پہنچا جس کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے۔ اے اللہ ہمارے نبی کو ہماری طرف سے وہ جزا عطا فرما جس کے وہ اہل ہیں)

درود کے ساتھ استغفار کو بھی ملا لے کہ اُس دن میں استغفار کرنا مستحب ہے۔

تیرھواں یہ کہ سورۃ کہف پڑھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسی سورت نہ بتاؤں جس کی عظمت نے زمین و آسمان کو بھر دیا ہے اور اُس کے لکھنے والے کے لیے بھی اتنا ہی اجر ہے اور جو اُس کو جمعہ کے دن پڑھے تو اُس کے جمعہ سے لے کر جمعہ تک اور تین دن کے زیادہ بھی گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور جو آدمی سوتے وقت اس کی آخری پانچ آیتیں پڑھے تو وہ رات کے جس حصے میں بھی اٹھنا چاہے گا اللہ اسے اٹھائے گا۔ تو لوگوں نے

کہا ہاں، اے اللہ کے رسول ضرور بتائیے، تو آپ نے فرمایا "سورۃ کہف" ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو اسے جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں پڑھے گا وہ فتنے سے محفوظ رہے گا۔"

مستحب ہے کہ جمعہ کے دن قرآن کریم کی تلاوت بہت زیادہ کرے اور اگر ہو سکے تو جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن میں قرآن مجید ختم کرے۔

چودھواں یہ کہ: جتنا ہو سکے جمعہ کے دن صدقہ کرے اور صدقہ مسجد سے باہر کرے۔ مستحب ہے کہ جمعہ کے دن نمازِ تسبیح پڑھے۔

پندرھواں یہ کہ جمعہ کے دن کو آخرت کے اعمال کے لیے رکھے اور دنیا کے تمام کام اس دن چھوڑ دے۔

فصل چہارم

نوافل کا بیان

جان لو کہ فرض نماز کے علاوہ جو بھی نماز ہے اس کی تین قسمیں ہیں ؛
سنن، مستحبات اور نوافل ۔

سنت تو وہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشگی کی ہو، جیسے کہ فرائض کے بعد سنن مؤکدہ اور وتر وغیرہ ۔

مستحب وہ ہے جس کی فضیلت تو احادیث میں آئی ہو، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر مداومت نہ کی ہو، جیسے کہ گھر میں داخل ہوتے یا گھر سے نکلتے وقت نماز پڑھنا ۔

نوافل وہ ہیں جو ان کے علاوہ ہوں جن کے متعلق کوئی حدیث نہ آئی ہو، لیکن انسان اُسے اپنی خوشی سے کرے اور ان تینوں اقسام کا نام نفل ہے ۔ نفل زائد چیز کو کہتے ہیں اور یہ فرائض سے زائد ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بدن کی نفلی عبادت میں سب سے افضل نماز ہے ۔

نوافل کی اقسام اور ان کے فضائل فقہ کی کتابوں میں مذکور و مشہور ہیں، لیکن ان میں سے ہم نماز تسبیح کا ذکر کرتے ہیں ۔ کیونکہ اس کی کیفیت سے بعض لوگ واقف نہیں ۔ عکرمہؓ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا : " اے چچا ! کیا میں آپ کو عطیہ نہ دوں ؟ کیا میں آپ کو کچھ تعلیم نہ دوں ؟ " اور راوی نے حدیث ذکر کی یہاں تک کہ فرمایا : " آپ چار رکعت نماز پڑھیں، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور کوئی اور سورۃ پڑھیں ۔ جب پہلی رکعت میں قرات سے فارغ ہو جائیں تو قیام کی حالت ہی میں پندرہ مرتبہ یہ تسبیح پڑھیں سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر پھر رکوع کریں اور رکوع میں یہی تسبیح دس مرتبہ پڑھیں ۔ پھر رکوع سے سر اٹھائیں تو دس مرتبہ پڑھیں، پھر سجدے میں جائیں تو دس مرتبہ پڑھیں، پھر سجدے سے سر اُٹھائیں تو دس مرتبہ پڑھیں ۔ پھر سجدے میں جائیں تو دس مرتبہ پڑھیں، پھر سجدے سے سر اٹھائیں تو کھڑا ہونے سے پہلے دس مرتبہ پڑھیں

یہ ایک رکعت میں پچھتر تسبیحات ہوئیں۔ اسی طرح چاروں رکعات میں پڑھیں۔ اگر طاقت ہو تو یہ نماز ہر روز پڑھیں، اگر نہ ہو سکے تو ہر جمعہ میں ایک بار پڑھیں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک بار پڑھیں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو سال میں ایک مرتبہ اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو عمر میں ایک دفعہ پڑھ لیں۔

نماز کے مسائل

ممنوع اوقات میں ایسی نفل نماز نہ پڑھے جس کا سبب نہ ہو جیسے کہ نماز تسبیح کیونکہ ممنوع اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت بڑی مؤکد ہے۔ یہ نفل نمازیں ضعیف ہیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، ہاں جن کا کوئی سبب ہو جیسے تحیۃ المسجد اور سورج یا چاند گرہن کی نماز اور استسقاء کی نماز وغیرہ تو ان کے متعلق دونوں قسم کی روایات ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تینوں اوقات میں نماز پڑھنے کی جو ممانعت ہے اس میں تین راز ہیں!

پہلا یہ کہ سورج کے پجاریوں کی مشابہت نہ ہو۔

دوسرا یہ کہ شیطان کے کنارۂ سر کو سجدہ کرنے سے بچ جائے کہ سورج چڑھتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان کا سینگ (کنارۂ سر) ہوتا ہے۔ پھر جب سورج بلند ہوتا ہے تو وہ الگ ہو جاتا ہے لیکن جب دوپہر کو ٹھہرتا ہے تو اس سے آ ملتا ہے اور جب ڈھلتا ہے تو الگ ہو جاتا ہے۔ پھر جب غروب ہونے کے لیے جھکتا ہے تو آ ملتا ہے۔ پھر جب غروب ہوتا ہے تو الگ ہو جاتا ہے۔

تیسرا یہ کہ آخرت کی راہ پر چلنے والے عبادات پر ہمیشگی کرتے ہیں اور ایک ہی طریقے پر ہمیشگی کرنا انسان کو اکتا دیتا ہے۔ پھر جب رکاوٹ واقع ہو جائے تو لذت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ جس چیز سے نفس کو روکا جائے وہ اس کی خواہش کرتا ہے۔ ممنوع اوقات میں انسان کو صرف نماز سے روکا گیا ہے، دوسری عبادات سے نہیں روکا گیا۔ مثلاً قراءت اور تسبیح، تاکہ عبادت گزار ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا رہے جیسا کہ نماز میں بھی کئی قسم کے ارکان ہیں۔ قیام اور تعود اور رکوع و سجود وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

کتاب الزکوٰۃ

- زکوٰۃ اور اُس کے اَسرار و متعلقات
- زکوٰۃ کے باطنی آداب
- زکوٰۃ لینے والے کے آداب
- نفلی صدقہ، اُس کی فضیلت اور آداب

فصل اوّل

زکوٰۃ اور اُس کے اَسرار و متعلّقات

زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو نماز کے ساتھ ملایا ہے۔ فرمایا:
وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ[1] (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو)

زکوٰۃ کے انواع و اقسام اور اس کے وجوب کے اسباب تو ظاہر ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اپنے مواقع پر مرقوم ہیں۔ ہم صرف بعض شرائط اور آداب کا تذکرہ کریں گے۔

شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ منصوص علیہ چیز سے زکوٰۃ ادا کی جائے اور اُس کی قیمت ادا نہ کی جائے صحیح یہی ہے اور جس نے قیمت ادا کرنے کو جائز کہا ہے اُس نے صرف حاجت پوری کرنے کو ملحوظ رکھا ہے اور حاجت کا پورا کرنا ہی مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کا کچھ حصّہ ہے، کیونکہ شریعت کے واجبات تین قسم کے ہیں:

ایک قسم تو وہ ہے جس میں صرف بندگی کا اظہار ہے، جیسے جمرات کو کنکریاں مارنا۔ اس سے شریعت کا مقصد صرف بندے کا امتحان ہے کہ وہ تعمیل کرتا ہے یا نہیں تاکہ بندے کی غلامی ایسے فعل سے ظاہر ہو جس کے معنی بھی وہ نہیں سمجھ سکتا۔

دوسری قسم اس کے برعکس ہے اور وہ ایسے واجبات ہیں جن سے اظہارِ غلامی مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد خالص حقوق ہیں۔ جیسے لوگوں کا قرضہ ادا کرنا اور چھینی ہوئی چیز کو واپس کرنا وغیرہ۔ اس میں نیت اور فعل کا اعتبار بھی نہیں ہے، بلکہ جس طرح بھی مستحق کو اس کا حق پہنچ جائے مقصود حاصل ہو جائے گا۔ یہ دونوں قسم کے واجبات غیر مرکّب ہیں۔

تیسری قسم مرکّب واجبات کی ہے اور ان سے دونوں چیزیں مقصود ہوتی ہیں۔ مکلّف کا امتحان بھی اور بندوں کے حقوق بھی۔ ان میں جمرات کو کنکر مارنے کی عبودیت اور حقوق ادا کرنے کا حصّہ دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

---

[1] سورۃ البقرۃ۔ آیت ۴۳

ضروری نہیں کہ ان میں سے جو زیادہ باریک معنی ہیں، یعنی اظہارِ عبودیت ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور شاید جو زیادہ دقیق ہے وہی زیادہ اہم ہے اور زکوٰۃ بھی اسی قسم سے ہے۔ اس میں فقیر کا حصہ حاجت پوری کرنے میں ہے اور عبودیت کا حق حکم کی تفصیلات میں اتباعِ شریعت، شریعت کا مقصود ہے اور اسی اعتبار سے زکوٰۃ، نماز اور حج کے قریب ہو گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

زکوٰۃ کے باطنی آداب

معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت کے طلبگار پر اس کی زکوٰۃ میں چند ایک ذمہ داریاں ہیں:

پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مقصد کو سمجھے اور یہ تین چیزیں ہیں۔ پہلی اپنی محبوب چیز نکالنے سے اللہ کی محبت کے دعویدار کا امتحان۔ دوسری بخل سے پاک ہونا اور تیسری مال کی نعمت کا شکر۔

دوسری ذمہ داری یہ کہ زکوٰۃ پوشیدہ طور پر نکالی جائے کیونکہ اس میں ریا کی آمیزش نہیں ہوتی۔ ظاہر کر کے دینے میں لینے والے کی ذلت کا اظہار بھی ہے پھر اگر اسے خوف ہو کہ زکوٰۃ نہ دینے کا اس پر الزام عائد ہو گا تو علانیہ طور پر کسی ایسے حاجتمند کو دے جو جماعت کے سامنے لینے کو بُرا نہ سمجھتا ہو۔

تیسری یہ کہ احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اس کو ضائع نہ کرے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو زکوٰۃ لینے والے پر احسان کرنے والا اور انعام کرنے والا سمجھتا ہے تو بسا اوقات اس سے اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ اگر غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ حاجتمند خود اُس پر احسان کرنے والا ہے کیونکہ وہ اُس سے اللہ کا وہ حق قبول کرتا ہے جو اُس کے مال کو پاک کرتا ہے۔

ساتھ ہی اس بات کو بھی مدِ نظر رکھے کہ اُس کا زکوٰۃ ادا کرنا نعمتِ مال کا شکرانہ ہے، تو پھر اُس کے اور زکوٰۃ لینے والے کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں رہتا اور یہ کسی صورت بھی درست نہیں کہ لینے والے کو اس کی غریبی کی وجہ سے حقیر سمجھے کیونکہ نہ مال سے فضیلت ہے اور نہ غریبی کوئی نقص۔

چوتھی یہ کہ اپنے عطیے کو حقیر سمجھے، کیونکہ اپنے کام کو عظیم سمجھنے والا مغرور ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حقیقی نیکی تین باتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اُسے ہلکا سمجھنا اور جلدی کرے اور پوشیدہ کرے۔

پانچویں یہ کہ اپنے مال میں سے سب سے زیادہ حلال اور اچھا اور محبوب مال کا انتخاب کرے۔ حلال اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے اور اچھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ[1] (اور خرچ کرتے وقت ردّی چیز کا انتخاب نہ کرو)۔

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۷

چاہیے کہ اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کا حق تعظیم ہے اور اللہ کا زیادہ حق ہے کہ اس کے لیے منتخب چیز دی جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کے سامنے ردی کھانا رکھے تو اس کا سینہ جل اُٹھے گا۔ دوسری یہ کہ جو کچھ وہ آج آگے بھیجے گا کل قیامت کو وہی کچھ اس کو ملے گا؛ چنانچہ چاہیے کہ اپنے لیے بہتر چیز کا انتخاب کرے۔

باقی رہی سب سے پیاری چیز تو وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[1] (تم اس وقت تک بھلائی نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب آپ کسی چیز سے بہت زیادہ محبت کرتے تو اُسے خدا کی راہ میں قربان کر دیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ جحفہ میں آئے تو بیمار تھے۔ آپ نے مچھلی کھانے کی خواہش کی۔ بڑی مشکل سے صرف ایک ہی مچھلی ملی۔ بیوی صاحبہ نے تیار کر کے آپ کے سامنے رکھی تو اسی وقت ایک مسکین ہو گیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے وہ مچھلی اسے عطا فرما دی۔ بیوی صاحبہ نے کہا ہمارے پاس اور بہت کچھ کھانے کو ہے۔ ہم وہ اسے دے دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا: نہیں یہی دو، کیونکہ ہمیں یہی سب سے زیادہ پسند ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ربیعؒ بن خیثم کے دروازے پر ایک سائل آیا۔ آپ نے فرمایا اسے انگور یا کھجوریں کھلاؤ۔ گھر والوں نے کہا ہم اسے روٹی کھلا دیتے ہیں وہ اس کے لیے زیادہ اچھی ہے، تو آپ نے فرمایا؛ تم پر افسوس ہے، اسے انگور کھلاؤ کیونکہ ربیع کو انگور پسند ہیں۔

چھٹی یہ کہ اپنے صدقے کے لیے مستحق آدمی کا انتخاب کرے اور یہ کچھ خاص لوگ ہیں اور ان کی کچھ صفات یہ ہیں:

پہلی صفت تقویٰ ہے۔ اپنے صدقے کے لیے پرہیزگار لوگوں کو منتخب کرے کہ اس سے اُن کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور زیادہ ہو جائے گی۔

حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیرؓ عبادت گزاروں کو سجدے کی حالت میں دینا پسند کرتے۔ آپ دینار یا درہم کی تھیلی لے آتے اور چپکے سے ان کے پاؤں کے پاس رکھ دیتے اس طرح کہ اُن کو تھیلی کا تو پتہ چل

---

[1] سورۂ آل عمران۔ آیت: ۹۲

جاتا، لیکن یہ پتہ نہ چلتا کہ کون رکھ گیا ہے۔ آپ سے کہا گیا آپ ان کے گھروں میں کیوں نہیں بھیج دیتے؛ تو جواب دیا: مجھے یہ پسند نہیں کہ جب وہ مجھے یا میرے ایلچی کو دیکھیں تو ان کا چہرہ ندامت سے متغیر ہو جائے۔

دوسری صفت علم ہے کہ عالم کو دینے میں علم اور دین کی تبلیغ میں اعانت ہے اور یہ شریعت کی تقویت ہے۔

تیسری یہ کہ وہ ان لوگوں سے ہوں جو انعام صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اسباب کی طرف اتنا ہی متوجہ ہوتے ہیں جتنا کہ شکریہ ادا کرنے کے لیے مستحب ہے۔ وہ آدمی جو عطیہ لے کر مدح کرنے کا عادی ہو اس کو جب نہ ملے گا تو وہ ہجو بھی کرے گا۔

چوتھی یہ کہ وہ اپنے فقر کی حفاظت کرتا ہو، یعنی اپنی حاجت کو چھپاتا ہو۔ تکلیف کو ظاہر نہ کرتا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ[۱] (سوال سے بچنے کی وجہ سے بے خبر آدمی اُن کو دولت مند سمجھتا ہے)

اور ایسے لوگ بڑی تحقیق کے بعد ملتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ وہ عیالدار ہو یا بیماری یا قرضے میں گرفتار ہو تو یہ مُحْصَر (بند کیے گئے) لوگوں میں سے ہے اور ان پر صدقہ کرنا ان کو قید سے چھڑانا ہے۔

چھٹی یہ کہ وہ قرابت دار ہو اور ذوی الارحام سے تعلق رکھتا ہو، کیونکہ ان پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ جس آدمی میں ان میں سے دو صفتیں یا زیادہ پائی جائیں تو اس کو دینا اتنا ہی افضل ہوگا۔

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت: ۲۷۳

فصل دوم

زکوٰۃ لینے والے کے آداب

ضروری ہے کہ زکوٰۃ لینے والا آٹھ قسموں میں سے ہو، کیونکہ زکوٰۃ لینے میں بھی کچھ فرائض ہیں۔
اوّل یہ کہ وہ سمجھے اللہ تعالیٰ نے اُس کو زکوٰۃ اس لیے دلوائی ہے کہ اُس کی پریشانیاں دور ہو جائیں اور اسے ایک ہی فکر اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کی رہ جائے۔
دوسرا یہ کہ دینے والے کا شکریہ ادا کرے اور اُس کے لیے دعا اور اُس کی ثنا کرے اور یہ چیزیں صرف اتنی ہوں جتنی کہ سبب کا شکر ادا کرنے کی ہوتی ہیں، کیونکہ جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اُس نے خدا کا شکر بھی ادا نہ کیا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور پورا شکریہ ادا کرنے کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ اس عطیے کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ وہ تھوڑا سا ہی ہو اور اُس کی مذمّت نہ کرے اور اُس میں اگر کوئی عیب ہو تو اس کو ظاہر نہ کرے اور جیسا کہ دینے والے کا ذمّہ یہ ہے کہ وہ اپنے عطیے کو حقیر سمجھے اسی طرح لینے والے کا ذمّہ یہ ہے کہ اُسے بڑا سمجھے اور یہ تمام باتیں نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنے کے برخلاف نہیں ہیں، کیونکہ جو آدمی واسطے کو واسطہ نہ سمجھے وہ جاہل اور جو واسطہ کو اصل سمجھ لے وہ منکر ہے۔
تیسرا یہ کہ جو کچھ اُسے مل رہا ہے اس میں غور کرے۔ اگر وہ حلال مال سے نہ ہو تو بالکل نہ لے، کیونکہ غیر حلال مال سے دینا زکوٰۃ نہیں۔ کچھ بھی مشتبہ ہو تو اُس سے پرہیز کرے الّا یہ کہ تنگی میں مبتلا ہو۔ پھر جس کا اکثر مال حرام کا ہو وہ زکوٰۃ نکالے اور جو مال نکالا ہے اُس کے خاص معیّن مالک کو نہ جانتا ہو تو اس میں فتویٰ یہ ہے کہ اس سارے مال کو صدقہ کر دے؛ البتّہ تنگی کے وقت اگر صاف مال نہ مل سکے، تو اس مال سے بقدر ضرورت لینا جائز ہے۔[1]

---

[1] غزالی کی عبارت یہ ہے کہ جب لینے والے پر معاملہ تنگ ہو جائے اور جو اسے دیا جا رہا ہے اُس کے معیّن مالک کو نہ جانتا ہو، تو وہ بقدر ضرورت لے لے۔ اور اگر لے لے گا تو یہ زکوٰۃ کا لینا نہ ہوگا، کیونکہ دینے والا اگر حرام سے دے گا تو وہ زکوٰۃ نہ ہوگی۔

چوتھا یہ کہ جتنا لیتا ہے اُس میں بھی شبہات کے مواقع سے پرہیز کرے اور صرف اتنا ہی لے جتنا اُس کے لیے جائز ہے۔ اگر وہ مقروض ہے تو قرض کی مقدار سے زیادہ نہ لے یا غازی ہے تو جتنی ضرورت ہے اتنا لے اور اگر تنگدستی ہے تو ضرورت کے مطابق لے۔ دولت اکٹھی کرنے کی کوشش نہ کرے اور یہ سب کچھ اُس کے اپنے اندازے پر موقوف ہے۔ پرہیز گاری مشتبہ چیز کو چھوڑ دینے میں ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کتنا سرمایہ پاس ہو تو زکوٰۃ لینا منع ہے۔ اس میں صحیح بات یہ ہے کہ اُس کے پاس اتنا ہو کہ اُس کی عام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ تجارت ہو یا صنعت یا زمین کی آمدن یا کوئی اور ذریعہ۔ اور اگر بعض ضرورتیں پوری ہوتی ہوں تو باقی کے لیے لے لے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بقدر ضرورت لے لے، لیکن جو بقدر کفایت لے وہ سال کے خرچ سے زیادہ نہ ہو۔ سال کا اعتبار اس لیے کیا گیا ہے کہ جب سال پورا ہو جائے گا تو پھر لینے کا وقت آجائے گا اور اگر سال سے زیادہ لے گا تو دوسرے فقراء تنگ ہو جائیں گے۔

نفلی صدقہ، اُس کی فضیلت اور آداب

صدقے کے فضائل بے شمار اور مشہور ہیں۔ اُن میں سے وہ بھی ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کون ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہو؟" صحابہؓ نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا مال پیارا نہ ہو۔" آپؐ نے فرمایا اُس کا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا اور وارث کا وہ ہے جو پیچھے چھوڑا۔"

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی نے پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا ـــ اور اللہ کے ہاں پاکیزہ چیز ہی قبول کی جاتی ہے ـــ تو اللہ تعالیٰ اسے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے پھر اس کے مالک کے لیے اس کی پرورش کرتا ہے جیسے کوئی تم سے اپنے بچھیرے کی پرورش کرتا ہے[1]۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

---

[1] عربی لفظ یہاں فَلُوّ ہے اور فلوّ گھوڑے کے بچے کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر کھُر والے جانور کے بچے کو فلوّ کہہ دیتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ صدقہ خدا کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت سے بچاتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے کہ "صدقہ کرو صدقہ جہنّم سے آزادی ہے"۔

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی آدمی صدقہ کرتا ہے تو اس آدمی سے ستّر شیطانوں کے جبڑے کھل جاتے ہیں یعنی وہ ان سے آزاد ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقے سے مال کم نہیں ہوتا۔"

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ انھوں نے بکری ذبح کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس میں سے کیا کچھ باقی رہ گیا ہے؟" انھوں نے کہا۔ "ایک شانے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔" تو آپؐ نے فرمایا: "سب کچھ باقی رہا صرف شانہ نہیں رہا۔"

صدقے کے آداب وہی ہیں جو زکوٰۃ میں بیان ہو چکے ہیں، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے فقیر کے لیے کون سی چیز بہتر ہے، یعنی وہ زکوٰۃ لے یا صدقہ؟ تو کچھ لوگوں نے کہا زکوٰۃ افضل ہے اور دوسروں نے کہا صدقہ لینا بہتر ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ بہترین صدقہ کونسا ہے؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ تُو صحت اور ضرورت کے ہوتے ہوئے صدقہ کرے۔ تجھے تنگدستی کا خوف ہو اور دولتمندی کی خواہش ہو اور اتنی دیر نہ کرے کہ جان حلق تک آ جائے اور تو کہے اتنا فلاں کو دے دو اور اتنا فلاں کو دے دو۔ وہ تو اب فلاں کا ہو ہی چکا ہے"۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا۔

کِتَابُ الصَّوْمِ

- روزہ، اس کے اہم امور اور متعلّقات
- روزے کی سُنّتیں
- روزے کے آداب

فصل اوّل

روزہ، اُس کے اہم اُمور اور متعلّقات

معلوم ہونا چاہیے کہ روزے میں کچھ خصوصیتیں ہیں جو دوسری عبادات میں نہیں ہیں۔ مثلاً اُس کا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونا جیسے کہ اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دُوں گا"۔ اور یہ نسبت بہت بڑا شرف ہے جیسا کہ بیت اللہ کا شرف کہ اُس کو بھی اپنی طرف منسوب کرکے فرمایا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ[1] (اور میرے گھر کو پاک کر) اور روزے کی فضیلت دو طرح سے ہے:

پہلی یہ کہ یہ پوشیدہ اور باطن کا عمل ہے۔ اسے مخلوق نہیں دیکھ سکتی اور یوں اس میں ریا نہیں۔

دوسری اس لیے کہ یہ اللہ کے دشمن کو مغلوب کرتا ہے کیونکہ دشمن کا وسیلہ خواہشات ہیں اور خواہشات کھانے پینے سے قوّت پکڑتی ہیں۔ جب تک خواہشات کی زمین ہری بھری رہے گی شیطان اس چراگاہ میں آتے ہی رہیں گے، البتہ خواہشات ختم ہو جانے سے ان پر راستے تنگ ہو جاتے ہیں۔

روزے کے متعلق بہت سی احادیث ہیں جو اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔

روزے کی سُنّتیں

سحری کا کھانا اور آخر وقت میں کھانا۔ روزہ جلدی افطار کرنا اور کھجور سے افطار کرنا۔ یہ سب ہیں سنت ہیں۔ اور یہ بھی سنت ہے کہ رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع کرتے ہوئے سخاوت کرے، نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ نیز قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور اعتکاف میں بیٹھنا، خصوصاً آخری عشرے میں سنت ہے۔

---

[1] سورۂ حج آیت: ۲۶

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر باندھ لیتے اور شب بیداری کرتے اور اپنے گھر والوں کو جگاتے۔
کمر باندھنے کے علماء نے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ عورتوں کی صحبت سے اجتناب کرتے۔ دوسرے یہ کہ نیک اعمال کے لیے بہت کوشش کرتے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ زیادہ نیکی کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ لیلۃ القدر کو تلاش کرتے۔

فصل دوم

روزے کے آداب

روزے کے تین درجے ہیں۔ عام روزہ، خاص روزہ اور خاص الخاص روزہ۔

عام روزہ تو یہ ہے کہ خود کو پیٹ بھرنے اور شہوت سے روکے۔ خاص روزہ یہ ہے کہ نظر، زبان، ہاتھ، پاؤں، کان اور تمام اعضاء کو گناہ سے بچائے اور خاص الخاص روزہ یہ ہے کہ دل کو ردّی خیالات اور خدا سے دُور کرنے والے افکار سے پاک کرے اور اللہ کی یاد کے سوا ہر چیز سے رُک جائے۔ اس روزہ کی کئی شرحیں ہیں جو کسی اور جگہ بیان ہوں گی۔

خاص روزے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ نگاہ نیچی رکھے، زبان کو تکلیف دینے والی بے فائدہ باتوں سے روکے اور اپنے باقی اعضاء کو بھی برائیوں سے بچائے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے جھوٹ اور اس پر عمل کو نہ چھوڑا اللہ کو اُس کے کھانا اور پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔[1]

روزے کے آداب میں سے ہے کہ رات کو پیٹ بھر کر نہ کھائے، بلکہ بقدرِ کفایت کھائے، کیونکہ پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی برتن ابنِ آدم نہیں بھرتا اور جب پہلی رات میں سیر ہو کر کھائے گا تو باقی رات میں اپنے نفس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ اسی طرح اگر سحری پیٹ بھر کے کھائے گا تو ظہر تک اپنے نفس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا، کیونکہ زیادہ کھانے سے سُستی اور فتور پیدا ہوتا ہے۔ پھر زیادہ کھانے سے روزے کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ روزے کا مقصد تو یہ ہے کہ بھوک کا مزہ بھی چکھے اور خواہشات کے ترک کرنے کی تکلیف بھی اٹھائے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے عمل کی پروا نہیں کرتے اور نہ اس کو دیکھتے ہیں کیونکہ اُس نے ان چیزوں کو تو چھوڑ دیا جو روزے کے وقت کے علاوہ اس کے لیے حلال تھیں اور جو ہر وقت حرام تھیں ان سے پرہیز نہ کیا۔

نفلی روزے کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ فضیلت والے دنوں میں نفلی روزہ رکھنے کی تاکید ہے اور فضیلت والے دن بعض تو سال کے دوران میں پائے جاتے ہیں، جیسے رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے اور یوم عرفہ کا روزہ اور عاشورا اور ذی الحجہ کے دس روزے اور محرم کے روزے وغیرہ۔ نیز فضیلت والے بعض دنوں کی گردش ہر مہینے میں ہوتی ہے مثلاً ہر مہینے کے ابتداء، درمیان اور آخر کے روزے۔ جس نے مہینے کے اوّل اور درمیان اور آخر میں روزہ رکھا، اُس نے اچھا کیا، لیکن بہتر یہ ہے کہ ایام بیض کے تین روزے رکھے۔ اسی طرح فضیلت والے بعض دنوں کی تکرار ہر ہفتے میں ہوتی ہے جیسے پیر اور جمعرات کا روزہ۔

نفلی روزوں میں سب سے افضل داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے اور اس میں تین مقاصد ہیں:

پہلا یہ کہ افطار کے دن نفس کو اس کا حصہ دیا جائے اور روزے کے دن عبادت کا حق ادا کیا جائے۔ اس میں انسان کے فرائض اور حقوق دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور یہی عدل ہے۔

دوسرا یہ کہ کھانے کا دن شکر کا دن ہے اور روزے کا دن صبر کا دن ہے اور ایمان دو نصف، صبر اور شکر کا مجموعہ ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ نفس پر مجاہدے میں زیادہ مشکل ہے کیونکہ جب وہ کسی حالت سے مانوس ہوتا ہے تو اُس سے پھیر دیا جاتا ہے۔ باقی رہا ہمیشہ کا روزہ رکھنا، تو مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ "جو ہمیشہ روزہ رکھے وہ کیسا ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "اُس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔" اور یہ اس آدمی کے متعلق ہے جو ان ایام میں بھی روزہ رکھتا ہے جن میں روزہ رکھنا منع ہے اور وہ ہیں دونوں عیدوں کے دن اور تشریق کے دن، لیکن اگر کوئی ان دنوں میں افطار کرے اور باقی سارا سال روزے رکھتا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ہشام بن عروہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کے باپ عروہؒ مسلسل روزہ رکھتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی مسلسل روزہ رکھتی تھیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو طلحہؓ نے چالیس سال تک روزے رکھے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمائی ہے وہ روزے کے مقصد کو سمجھتا ہے

وہ اپنے نفس پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جو اُسے روزے سے افضل کام سے عاجز نہ کردے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت تھوڑے روزے رکھتے تھے۔ کہتے اگر میں زیادہ روزے رکھوں، تو نماز سے کمزور ہو جاؤں گا اور میں نماز کو روزے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

حضرات صحابہ میں بعض کا حال یہ تھا کہ روزہ رکھتے تو قرآن کی تلاوت سے عاجز آجاتے۔ پھر وہ زیادہ دن افطار کرتے، یہاں تک کہ تلاوت پر قادر ہو جاتے۔ ہر آدمی اپنے حالات اور اپنی اصلاح کو خوب جانتا ہے[1]۔

---

[1] ابن عبد البرؒ نے "تمہید" میں کہا ہے کہ عمری عابد نے امام مالک رحمۃ اللہ کی طرف لکھا وہ انھیں گوشہ نشینی اور عبادت گزاری کی ترغیب دینا چاہتے تھے اور انھیں اپنے ہاں کے علمی اجتماع سے دل برداشتہ کرنا چاہتے تھے تو امام مالکؒ نے ان کو لکھا۔ اللہ تعالیٰ نے رزق کی طرح اعمال بھی تقسیم کیے ہیں۔ کسی آدمی کی طبیعت نماز میں لگتی ہے روزے میں نہیں لگتی اور کوئی آدمی صدقہ خوب کرتا ہے لیکن روزے اتنے نہیں رکھتا اور کوئی جہاد میں خوش رہتا ہے اور نماز اتنی نہیں پڑھتا۔ اور علم کو پھیلانا اور اس کی تعلیم دینا انسان کے بہترین اعمال میں سے ہے اور اس میں سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے حصے میں لکھا ہے میں اس پر خوش ہوں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ میرا عمل تمھارے عمل سے کم تر ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم دونوں ہی نیکی اور بھلائی پر ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر خوش رہنا چاہیے۔ والسلام۔

کتاب الحج

- حج اور اس کے اسرار و فضائل
- حج کے باطنی آداب اور اسرار

فصل اوّل

حج اور اس کے اسرار و فضائل

جو آدمی حج کا ارادہ کرے اُسے چاہیے کہ پہلے توبہ کرے اور جن پر ظلم کیا ہے ان کا حق دے، قرضہ ادا کرے اور جن کے اخراجات کا ذمہ دار ہے واپسی تک کے لیے ان کے خرچ کا انتظام کرے۔ نیز لوگوں کی امانتیں واپس کرے۔ علاوہ ازیں اپنے ساتھ حلال مال اتنا لے جائے جس سے بغیر کسی کنجوسی اور تکلیف کے آجا سکے۔ نہ صرف سفر کے دوران میں خورد و نوش کا اچھا انتظام کر سکے بلکہ فقیروں کو بھی دینے کے قابل ہو۔ مناسب مقدار میں روپے کے علاوہ اپنے ساتھ بدنی آرائش کی چیزیں بھی لے جائے۔ مثلاً مسواک، کنگھی، شیشہ، سرمہ دانی وغیرہ۔

حج کے لیے جانے لگے تو گھر سے نکلنے سے پہلے کچھ صدقہ کرے اور جب اونٹ کرایہ پر لے تو اونٹ والے کو تمام سامان خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ ضرور بتا دے کہ یہ چیزیں اونٹ پر رکھے گا۔ ابن مبارکؒ سے ایک آدمی نے کہا فلاں آدمی کے لیے میرا ایک رقعہ لے جاؤ تو آپ نے کہا ٹھہرو میں اونٹ والے سے اجازت لے لوں۔

چاہیے کہ کوئی نیک ساتھی تلاش کرے جو نیکی پسند کرنے والا اور نیکی کے کاموں میں مددگار ہو۔ اگر بھول جائے تو وہ اسے یاد کرائے اور اگر یاد ہو تو وہ اس کی مدد کرے اور اگر اس کا سینہ تنگ ہو تو اسے صبر کی تلقین کیا کرے۔ علاوہ ازیں اہلِ قافلہ باہمی مشورے سے اپنے میں سے بہتر آدمی کو اپنا امیر بنالیں۔ یہ شخص ایسا ہو کہ ساتھیوں سے اچھے اخلاق سے پیش آئے۔ اُن سے نرم برتاؤ کرے اور امیر کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ رائیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے کوئی کام بھی منظم طریقے سے انجام نہیں پا سکتا۔ امیر کا فرض ہے کہ قوم سے نرمی کرے۔ ان کی مصلحت پر غور کرے اور اپنے آپ کو ان کے لیے ڈھال بنائے رکھے۔

سفر کے دوران میں ہر شخص کو چاہیے کہ اچھی گفتگو کرے، دوسروں کو کھانا کھلائے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے کہ سفر باطن کی پوشیدہ چیزیں ظاہر کر دیتا ہے، جو آدمی سفر میں جہاں کہ بے چینی ہوتی ہے اچھے خُلق والا ہو

تو اپنے گھر میں تو وہ اس سے بھی اچھے خُلق والا ہوگا۔

کہا گیا ہے کہ جب کسی آدمی سے حضر میں معاملہ کرنے والے اور سفر میں اُس کے ساتھ رہنے والے تعریف کریں تو اس کے اچھا ہونے میں شک نہ کرو۔

حج پر روانہ ہونے والے کو چاہیے اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہلِ محلہ کو الوداع کہے۔ اُن سے دُعا کی درخواست کرے اور جمعرات کے دن صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ نکلنے سے پہلے اپنے گھر میں دو رکعت نماز پڑھے۔ اہل و عیال کو اللہ کے سپرد کرے اور گھر سے نکلنے اور سوار ہونے اور اُترنے کے وقت منقول دعائیں اور اذکارِ مسنونہ پڑھے۔ یہ دعائیں مناسکِ حج کی کتابوں میں درج ہیں۔

اسی طرح حج کے تمام مناسک، احرام، طواف، سعی اور عرفات کا وقوف وغیرہ بہ اطمینان ادا کرے اور جو اذکار و ادعیہ اور آداب اُن کے بارے میں لکھے ہیں اُنھیں پوری صحت کے ساتھ ادا کرے۔ یہ سب باتیں فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے درج ہیں۔

فصل دوم

حج کے باطنی آداب اور اسرار

معلوم ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ آدمی اس کی عبادت کے لیے دوسری چیزوں سے الگ ہو جائے۔ عیسائی راہب اللہ تعالیٰ سے اُنس حاصل کرنے کے لیے پہاڑوں میں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ اُمّتِ مُسلمہ کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا، لیکن حج کو اللہ کے لیے وقف ہو جانے کا ذریعہ بنا دیا گیا؛ چنانچہ حج کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ حج میں تجارت وغیرہ سے الگ ہو کر اللہ کی اطاعت کے لیے مجتمع رہے اور غبار آلود، ژولیدہ مُو اور پریشان حال ہو کر اسے پکارے اور زیب و زینت کا زیادہ خیال نہ کرے۔

محمل میں بغیر عذر کے سوار ہونے سے پرہیز کرے، مثلاً کوئی کجاوے پر نہ بیٹھ سکتا ہو، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر حج کیا اور آپ کے نیچے پرانا شکستہ کجاوا تھا۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حاجیوں کے ساتھ فرشتوں کو گواہ بناتا ہے اور کہتا ہے میرے بندوں کو دیکھو میرے پاس ہر راستے سے غُبار آلود اور پریشان بال آئے ہیں میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو شرف اور عظمت عطا فرمائی ہے اور اپنے بندوں کے لیے اسے مقصد مقرر کیا ہے اور اُس کے ماحول کو محض اُس کی عظمت، شان اور بزرگی کے لیے حرم بنایا ہے اور عرفات اُس کے کے لیے مقدس میدان مقرر کیا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ حج کے تمام افعال میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب زادِ راہ حاصل کرے تو یاد کرے کہ آخرت کے سفر کے لیے زادِ راہ (نیک اعمال) کی ضرورت ہوگی۔ ریا اور سُمعہ سے اعمال کو ضائع ہونے سے بچائے کہ وہ نہ اس کا ساتھ دے سکیں گے نہ اس کے کام آسکیں گے۔ اُن کی مثال اُس کھانے کی سی ہے

جو سفر کی پہلی منزل ہی میں خراب ہو جائے اور ضرورت کے وقت کھانے والا پریشانی کے سوا کچھ نہ پائے۔ جب اپنے وطن سے نکلے اور جنگل میں گھاٹیوں کو دیکھے تو دنیا سے قیامت کے میدان کی طرف اپنے نکلنے کو اور موت سے قیامت تک کے مابین ہونے والے ہولناک مناظر کو یاد کرے۔

اُن میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احرام باندھنے اور کپڑے اُتارنے کے وقت اپنے کفن کو یاد کرے کہ وہ عنقریب اپنے رب کو ایسے لباس میں ملے گا جو دنیا والوں کے لباس سے مختلف ہوگا اور جب لبّیک کہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا تصوّر کرے جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (اور لوگوں کو حج کی آواز دو) اور اس کی قبولیت کی اُمید رکھے نیز قبول نہ ہونے کا ڈر بھی رکھے۔ اسی طرح جب حرم شریف تک پہنچے تو چاہیے کہ عذاب سے امن کی اُمیّد رکھے اور یہ ڈر بھی رکھے کہ ایسا نہ ہو کہ میں مقرّبین میں شمار نہ ہوؤں، البتہ اُمیّد غالب رہنی چاہیے کیونکہ اللہ کی بخشش بڑی عام ہے اور زیارت کے لیے آنے والے کے حقوق کی رعایت کی جاتی ہے اور پناہ لینے والے کے حق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب بیت اللہ شریف کو دیکھے تو اللہ کی عظمت کو اپنے دل میں حاضر کرے اور اُس کا شکریہ ادا کرے کہ وہ اُس کے پاس سائل بن کر آنے والوں کے مرتبہ تک پہنچا ہے اور طواف کی عظمت کو سمجھے کہ وہ نماز ہے اور حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت عقیدہ رکھے کہ وہ خدا تعالیٰ سے اُس کی اطاعت کی بیعت کر رہا ہے اور اُس کے ساتھ ہی بیعت کو پورا کرنے کا عزم بھی رکھے اور خانہ کعبہ کے پردے کو پکڑتے وقت اور ملتزم سے چمٹتے وقت تصور کرے کہ گنہگار غلام اپنے مالک کی پناہ لے رہا ہے اور مُحب محبوب کے قریب ہو گیا ہے۔

اس کے متعلق بعض نے یہ اشعار پڑھے ہیں:

۱۔ تیرے گھر کے پردے تیری طرف سے امن کی علامت ہیں اور اے خداوند! میں تیری پناہ لینے کی خاطر اُن سے چمٹا ہوں۔

۲۔ اور جب میں نے آگ سے ڈر کر ان پردوں کو پکڑ لیا تو میں یقین رکھتا ہوں کہ تو مجھے آگ کے قریب نہ کرے گا۔

۱؎ سورۃ الحج۔ آیت: ۲۷

۴۔ اور یہاں میں تیرے گھر کا ہمسایہ ہوں جس کے حج کا تو نے حکم دیا ہے اور تو نے ہمسائے سے اچھا سلوک کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔

اور اُن میں سے یہ بھی ہے کہ جب صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے، تو اُسے ترازو کے دونوں پلڑوں کی طرح سمجھے اور ان کے درمیان اپنی آمد و رفت کو میدانِ قیامت کے درمیان بھاگ دوڑ خیال کرے۔ تصور یہ ہو کہ غلام اپنے مالک کے دروازے پر اُس کی خدمت میں خلوص کے اظہار، اس کی رحمت کی اُمید اور اپنی حاجت روائی کی خاطر آجا رہا ہے۔

عرفات کے میدان میں خلقت کی بھیڑ، اُن کا آوازیں بلند کرنا اور اُن کی زبانوں کا اختلاف دیکھ کر قیامت کا میدان یاد کرے کہ کس طرح اُمتیں اُس میدان میں اکٹھی ہوں گی اور کس طرح وہ شفاعت کی آرزو کریں گی۔

پھر جب جمرات کو کنکریاں مارو تو اُس سے حکم کی تعمیل اور غلامی اور عبودیت کے اظہار کا ارادہ کرو اور یہ جان لو کہ زندگی کا مقصد نفسانی خواہش پورا کرنے کے بجائے صرف اطاعت ہے۔

جب شہر مدینہ نظر آنے لگے تو یاد کرو کہ یہ وہ شہر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے پسند کیا۔ اُس کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا اور اپنے نبی کی قبر اُس میں رکھی۔ پھر تصور کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم آتے جاتے وقت کہاں کہاں پڑے ہوں گے نیز آپ کے خشوع اور وقار و سکینہ کا تصور کرو۔ پھر جب آپ کی زیارت کا قصد کرو تو اپنے دل میں آپ کی تعظیم اور ہیبت طاری کرو۔ اور آپ کی صورتِ گرامی کو خیال میں لاؤ اور اپنے دل میں آپؐ کے عظیم مرتبے کو حاضر کرو پھر آپؐ پر سلام پڑھو اور جان لو کہ آپؐ کو تمھارے حاضر ہونے اور سلام کہنے کا علم ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

کتاب التلاوت

- قرآن کریم کی تلاوت کے آداب اور فضیلت
- آدابِ تلاوت
- قرارت کا بیان

فصل اوّل

قرآن کریم کی تلاوت کے آداب اور فضیلت

قرآن کریم کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں خود اُس کی عظمت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ[1] (اور ہم نے اُس کتاب کو اُتارا یہ برکت والی ہے) اور فرمایا: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ[2] (یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بہت سیدھی ہے) اور فرمایا: لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ[3] (باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے)۔

بخاری شریف کے افراد میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے"۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کچھ بندے اللہ تعالیٰ کا اہل وعیال ہیں"۔ کہا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ وہ کون لوگ ہیں؟" تو فرمایا: "قرآن والے ہی اللہ کا اہل وعیال اور اُس کے خاص بندے ہیں"۔ اسے نسائی نے روایت کیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اس دل کو عذاب نہ کرے گا جس نے قرآن یاد رکھا"۔

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن والے سے کہا جائے گا پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ترتیل سے پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں پڑھا کرتا تھا۔ تیری منزل وہاں ہے جہاں تجھے تیری آخری آیت کی قرأت پہنچا دے"۔ اسے ترمذی نے صحیح کہا۔

---

[1] سورۃ انعام۔ آیت: ۹۲
[2] سورۃ اسراء۔ آیت: ۹
[3] سورہ فُصّلت (حٰمٓ السجدہ) آیت: ۴۲

حضرت بُریدہؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "قیامت کے دن قرآن اپنے ساتھی کو ملے گا جبکہ وہ قبر سے کمزور اور زرد رنگ نکلے گا تو کہے گا۔ کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ وہ کہے گا "میں نہیں پہچانتا" تو وہ کہے گا "میں تیرا ساتھی قرآن ہوں کہ میں نے تجھے گرمی میں پیاسا رکھا اور رات کو جگایا اور ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے اور میں آج تیرے لیے ہر تجارت سے اچھا ہوں" پھر اُس کے دائیں ہاتھ میں اختیار دیا جائے گا اور بائیں ہاتھ میں ہمیشہ رہنا اور اُس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا اور اس کے ماں باپ کو دو حُلّے (جوڑے) پہنائے جائیں گے کہ ساری دنیا اُن کی قیمت نہیں بن سکتی تو وہ کہیں گے "یہ حلّے ہمیں کس سبب سے پہنائے گئے ہیں؟" کہا جائے گا تمھارے بیٹے نے قرآن یاد کیا تھا۔ پھر کہا جائے گا "جنّت کے درجات اور بالاخانوں میں پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ وہ جب تک پڑھتا جائے گا چڑھتا رہے گا خواہ تیزی سے پڑھے یا آہستہ۔"

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا "قرآن والے کو چاہیے کہ وہ اپنی رات کو پہچانے جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ اور اپنے دن کو جبکہ لوگ کھانا کھائیں اور اپنے غم کو جبکہ لوگ خوش ہوں اور اپنے رونے کو جبکہ لوگ ہنسیں اور اپنی خاموشی کو جبکہ لوگ باتیں کریں اور اپنے خشوع کو جبکہ لوگ تکبر کریں۔

قاری کے لائق نہیں کہ وہ سنگدل، غافل، شور مچانے والا اور مغلوب الغضب ہو۔"

فضیلؒ نے کہا "قرآن کا حامل اسلام کا علمبردار ہے۔ اسے لائق نہیں کہ لغو گوئی کرنے والوں کے ساتھ مل کر لغو گوئی کرے۔ بھولنے والوں کے ساتھ بھول جائے اور کھیلنے والوں کے ساتھ کھیلے۔ اسے چاہیے کہ اللہ کی عظمت کو ملحوظ رکھے! ورنہ یہ لائق ہے کہ وہ اپنی حاجت کسی کے پاس لے کر جائے، بلکہ لوگ اپنی حاجتیں اُس کے پاس لے کر آئیں۔"

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا "میں نے خواب میں رب العزّت کو دیکھا، میں نے عرض کیا "اے میرے رب! آپ کی جناب میں تقرب حاصل کرنے والے کس چیز سے تقرّب حاصل کرتے ہیں؟" فرمایا اے احمد میرے کلام سے۔" میں نے عرض کیا "سمجھ کر پڑھنے سے یا بغیر سمجھ کر پڑھنے سے بھی؟" فرمایا "سمجھ سے بھی اور بغیر سمجھ کے بھی۔"

فصل دوم

آدابِ تلاوت

قرآن کریم پڑھنے والے کو چاہیے کہ باوضو ہو، ادب سے بیٹھے، سر نیچا کیے ہوئے اور چار زانو یا تکیہ لگا کر۔ منکبروں کی طرح نہ بیٹھے۔ بہترین حالت یہ ہے کہ نماز میں کھڑا ہو کر پڑھے اور مسجد میں ہو۔ باقی رہا یہ کہ کتنا پڑھے، تو اس میں سلف کی عادت مختلف تھی، بعض ایک دن رات میں ختم کر لیا کرتے تھے۔ بعض ایک دن رات میں پورا قرآن ختم کر کے کچھ زیادہ بھی پڑھتے اور بعض تین دنوں میں ختم کرتے۔ بعض ایک ہفتے میں ختم کرتے، بعض ایک مہینے میں ختم کرتے کیونکہ وہ قرآن کے سمجھنے میں مشغول ہوتے یا علم کو پھیلانے میں یا تعلیم دینے میں یا قراءت کے علاوہ کسی اور عبادت میں یا دنیا کی محنت مزدوری کے شغل کی وجہ سے۔ بہتر یہ ہے کہ اتنا پڑھے جس سے اس کے ضروری کاموں میں رکاوٹ نہ پیدا ہو اور نہ اس کے جسم کو تکلیف ہو اور نہ ترتیل اور تدبّر کے بغیر قرآن ضائع ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا "اگر میں صرف سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھ لوں اور ان کو ترتیل سے پڑھوں اور ان میں غور و فکر کروں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں سارا قرآن تیز تیز پڑھ جاؤں۔ جسے فرصت ہو وہ زیادہ قراءت کو غنیمت سمجھے تاکہ زیادہ ثواب حاصل کرے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وتر کی ایک رکعت میں سارا قرآن پڑھتے تھے۔ اور امام شافعیؒ رمضان میں ساٹھ قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے۔

باقی رہا ہمیشہ کا معاملہ تو جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اپنی ہمّت کے مطابق رکھے۔ بعض نے پسند کیا ہے کہ اگر دن کو ختم کرے تو صُبح کی سنّتوں میں یا ان کے بعد ختم کرے اور اگر رات کو ختم کرے تو مغرب کی سُنّتوں میں یا ان کے بعد ختم کرے، یعنی ختم کرنے کے لیے رات کی ابتداء یا دن کے شروع کا وقت انتخاب کرے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو قرآن ختم کرے اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب قرآن ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو اکٹھا کرتے اور دعا مانگتے۔

قراءت کا بیان

اچھی آواز سے قراءت کرنا مستحب ہے۔ اگر کسی کی آواز اچھی نہ ہو تو جتنا ہو سکے اچھا بنائے، اگرچہ ایسا کرنے کو سلف مکروہ سمجھتے تھے۔

مستحب یہ ہے کہ قراءت آہستہ آواز سے کرے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "پوشیدہ قراءت علانیہ قراءت سے ایسے ہی بہتر ہے جیسے پوشیدہ صدقہ ظاہری صدقہ سے بہتر ہے۔" ہاں اتنا ضرور ہو کہ اپنے آپ کو آواز سنائی دے۔ علاوہ ازیں صحیح مقصد کے لیے بعض اوقات بلند آواز سے قراءت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً حفظ میں عمدگی پیدا کرنے کے لیے یا اپنی نیند اور سستی دور کرنے کے لیے یا سوئے ہوؤں کو جگانے کے لیے۔

نماز میں قراءت کا حکم کیا ہے اور فرض نمازوں میں کتنی قراءت کرے اور کب جہری قراءت کرے اور کب سِرّی؛ تو یہ سب چیزیں فقہ کی کتابوں میں معروف و مشہور ہیں۔

جس کے پاس قرآن مجید کا نسخہ ہو اسے چاہیے کہ ہر روز اس سے دیکھ کر چند آیتیں ضرور پڑھا کرے تاکہ قرآن چھوٹا ہوا معلوم نہ ہو۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کو چاہیے کہ غور کرے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے فہم کی طرف قرآن کے معانی کو پہنچا کر مہربانی فرمائی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھے کہ جو پڑھ رہا ہے وہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ کلام والے کی عظمت کو ذہن نشین کرے اور کلام پر غور و تدبّر کرے کیونکہ قراءت کا مقصد ہی تدبّرِ قرآن ہے۔ اگر بغیر تکرار کے تدبّر حاصل نہ ہو تو تکرار کرے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک ہی آیت: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ[1] (اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں) کی تکرار کرتے ہوئے رات کا قیام پورا کیا۔ تمیم داریؓ نے بھی ایک ہی آیت پڑھتے ہوئے رات گزار دی اور وہ یہ آیت تھی: اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ[2] (کیا بدکردار لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم ان کو مومن، نیکوکار لوگوں کے برابر کر دیں گے) اسی طرح ربیع بن خثیمؒ نے بھی ایک آیت سے رات بھر

---

[1] سورۃ مائدہ۔ آیت: ۱۱۸ [2] سورۃ جاثیہ۔ آیت: ۲۱

قیام کیا۔

تلاوت کرنے والے کو چاہیے کہ ہر آیت کے مناسب اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرے۔ جب آیت: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ[1] (اس نے زمین آسمان پیدا کیے) پڑھے تو ہر نظر آنے والی چیز میں اس کی عظمت اور قدرت کا تصور کرے اور جب آیت: اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ[2] کیا جو تم نطفہ ڈالتے ہو اس پر غور کرتے ہو؟) تو نطفے میں غور کرے کہ اس کے اجزاء کیسے ایک دوسرے سے متشابہ ہیں، پھر وہ گوشت، ہڈی، رگ اور پٹھے میں کس طرح تقسیم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی مختلف شکلیں سر، ہاتھ اور پاؤں کس طرح بنتی ہیں۔ پھر جو اس میں صفاتِ شریفہ مثلاً سننا، دیکھنا اور سمجھنا وغیرہ کس طرح نمودار ہوتی ہیں، ان سب عجائبات پر غور کرے۔

جب جھٹلانے والوں کے حالات کی تلاوت کرے تو اس بات کا احساس کرے کہ نافرمانی کی صورت میں کس قدر خوفناک حالت ہوگی۔

تلاوت کرنے والے کو سمجھنے میں رکاوٹ بننے والی چیزوں کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے کہ تلاوت کا حق ادا نہیں ہوا۔ حروف اپنے مخرج سے نہیں نکلے یا یہ کہ تلاوت کرنے والا تکرار کرتا رہے اور معانی کا ادراک کرنے میں طبیعت الجھ جائے۔

تلاوت کرنے والا گناہ پر اصرار نہ کرے۔ متکبّر نہ ہو اور اپنی خواہش کی پیروی کرنے میں مبتلا نہ ہو کیونکہ ان سے دل میں ظلمت پیدا ہوتی ہے اور دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال زنگ آلود شیشے کی ہے کہ وہ حق کی تجلّی کو روک دیتا ہے۔ دل آئینے کی طرح ہے اور خواہشات زنگ کی مثل۔ اور قرآن کے معانی ان شکلوں کی طرح ہیں جو شیشے میں نظر آتی ہیں۔ خواہشات کو دُور کرنے کی ریاضت سے دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔

تلاوت کرنے والے کو چاہیے یہ جان لے کہ قرآن کے خطاب اور اُس کے وعید کا مخاطب وہی ہے اور واقعات جو بیان ہوئے ہیں یہ قصّے اور کہانیاں نہیں ہیں، بلکہ یہ عبرت کا سامان ہے۔ پس اس سے متنبہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس کی تلاوت ایسی ہوگی جیسے مالک اپنے غلام کو اپنے مقصد کے متعلق لکھے کہ وہ اُس کے مکتوب کو غور سے پڑھے اور اُس کے مطابق عمل کرے۔ قرآن کریم کو درسہ کر پڑھ کر نافرمانی کرنے والے کی مثال ایسی ہے

---

[1] سورۃ انعام۔ آیت: ۳۷ [2] سورہ واقعہ۔ آیت: ۵۹

جیسے کوئی بادشاہ کا خط پڑھے، لیکن اُس کے مکتوب پر عمل کرنے اور اُس کی حکومت کو مضبوط کرنے سے رُوگردانی کرے۔ ایسا آدمی بادشاہ کے حکم کی مخالفت کرنے والا ہے۔ ایسی تلاوت عذاب کا مستحق بناتی ہے۔

چاہیے کہ اپنی قوّت اور طاقت پر بالکل بھروسہ نہ کرے۔ اپنے نفس کو پاک نہ سمجھے اور نہ اُس کو خوشنودی کی نگاہ سے دیکھے۔ جو آدمی اپنے نفس کی کوتاہی پر نظر رکھتا ہے اُس کا یہ فعل قربتِ الٰہی کا سبب بن جاتا ہے۔

کتاب الاذکار

- اذکار و ادعیہ
- اوراد، اُن کی فضیلت اور اوقات کے مطابق عبادات
- رات کے اوراد
- اوراد کے اوقات
- رات کے قیام کی فضیلت اور آسان کرنے والے اسباب
- فضیلت والے دن اور راتیں

فصل اوّل

اذکار وادعیہ

معلوم ہونا چاہیے کہ زبان کی عبادات میں سے قرآن کریم کی تلاوت کے بعد اللہ کے ذکر اور خالص دُعا کے ذریعہ اُس کی جناب میں حاجتیں پیش کرتے سے افضل کوئی بات نہیں۔ ذکر کی فضیلت پر یہ آیات دلالت کرتی ہیں: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ[1] (تم مجھے یاد رکھو میں تم کو یاد رکھوں گا) اور فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ[2] (وہ جو اللہ کو کھڑے بیٹھے لیٹے یاد کرتے ہیں) اور فرمایا: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ[3] (اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب تک وہ میرا ذکر کرتا رہے اور اُس کے ہونٹ میرے ذکر سے ہلتے رہیں۔"

مسلم کے افراد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو لوگ بھی اللہ کے ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں اُن کو فرشتے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اُن پر رحمت چھا جاتی ہے۔ اُن پر وقار اور سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں میں اُن کا تذکرہ کرتا ہے۔"

فضائل اعمال میں ذکر کے متعلق اور بہت سی احادیث مذکور ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو قوم بھی کسی مجلس میں بیٹھے اور اللہ کے ذکر کے بغیر اُٹھ جائے وہ گویا گدھے کا مردار کھا کر اُٹھے اور یہ مجلس قیامت کے روز اُن کے لیے حسرت و افسوس کا باعث ہوگی۔"

ایک اور حدیث میں ہے: "جو لوگ مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجیں، تو قیامت کے دن اُن کو اس مجلس کا افسوس ہوگا۔"

---

[1] سورۃ بقرہ - آیت: ۱۵۱
[2] سورۃ آل عمران - آیت: ۱۵۰
[3] سورۃ احزاب - آیت: ۳۵

دُعا کی فضیلت کے متعلق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دعا سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی چیز اچھی نہیں ہے اور بہترین عبادت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے اور جو اللہ سے نہ مانگے اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے"۔ ایک اور حدیث میں ہے: "اللہ سے اس کا فضل مانگو، اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اُس سے مانگا جائے"۔

دُعا کے کچھ آداب ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ افضل اوقات کا خیال رکھے، جیسے سال میں سے عرفہ کا دن، مہینوں میں رمضان کا مہینہ اور ہفتوں میں سے جمعہ کا دن اور رات میں سحری کا وقت اور فضیلت والے اوقات میں اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت اور فرض نمازوں کے بعد اور بارش برستے وقت اور اللہ کی راہ میں لڑائی کے وقت اور قرآن ختم کرنے کے بعد اور سجدے میں اور روزہ افطار کرتے وقت اور جب دل حاضر ہو اور خدا کا ڈر اس پر غالب ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ اوقات کی بزرگی کا دارومدار حالات کی بزرگی پر ہے۔ جیسے سحری کا وقت دل کی صفائی اور فراغت کا وقت ہے اور سجدے کی حالت ذلّت کی حالت ہے۔

دعا کے آداب یہ ہیں کہ قبلہ رُخ ہو۔ اپنے ہاتھوں کو اُٹھائے۔ پھر اُن کو چہرہ پر ملے اور دُعا آہستہ آواز سے کرے۔ دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود بھیجے اور دعا میں قافیہ بندی نہ کرے۔ اس کے آداب میں سے ایک باطنی ادب بھی ہے اور وہی قبولیت میں اصل ہے، یعنی توبہ اور لوگوں کے حقوق کی ادائیگی۔

اوراد، ان کی فضیلت اور اوقات

معلوم ہونا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے وعدوں کی تصدیق حاصل ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو کہ عمر بہت تھوڑی ہے تو واجب ہے کہ اس تھوڑی سی عمر میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ نفس ایک ہی حال پر قائم رہے تو اُس سے اُکتا جاتا ہے۔ اُس پر نرمی یہ ہے کہ اس کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (اور صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور رات کے وقت

خدا کو سجدہ کرا در لمبی رات تک اُس کی تسبیحیں بیان کر) یہ آیت اور اس جیسی اور آیتیں بھی جو اس مضمون میں بیان ہوئی ہیں دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ اوقات کا ضبط اور انھیں اذکار سے ہمیشہ آباد رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ۵ (وہ اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا اس کے لیے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکرگزاری کرے) مطلب یہ ہے کہ اگر دن کے وظائف میں سے کچھ رہ گیا ہے تو رات کو پورا کرے اور رات کے رہ گئے ہیں تو دن کو پورے کرے۔

دن کے اوراد سات ہیں اور رات کے چھ۔ ہم ہر ایک ورد کی فضیلت، اُس کے وظیفے اور متعلقات بیان کرتے ہیں۔ دن کے اوراد میں سے پہلا ورد طلوع فجر کے وقت سے سُورج کے طلوع ہونے تک ہے اور یہ وقت بڑی بزرگی والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی قسم اٹھائی ہے فرمایا: وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۲ (اور صُبح کی قسم جب پَو پھٹے) مرید کو چاہیے کہ جب نیند سے بیدار ہو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرے اور کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اُسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے) بخاری نے اپنے افراد میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ مسلم کے افراد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شام کرتے تو کہتے:

أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ رَبِّ أَسْأَلُكَ خَيْرَ مَا فِي هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا۔ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَسُوءِ الْكِبَرِ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ۔

(ہم نے اور اللہ کے سارے ملک نے شام کی اور اللہ ہی کی تعریف ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے میرے اللہ میں تجھ سے اس رات کی اور اس کے بعد کی بھلائی کا سوال کرتا

---

۵ سورۃ فرقان آیت: ۶۲ ۲ سورۃ تکویر۔ آیت: ۱۸

ہوں۔ اور اس رات کی برائی اور اس کے بعد کی برائی سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ اے میرے اللہ! میں سستی اور انتہائی بڑھاپے اور دوزخ اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔)

اللہ کے رسول ﷺ جب صبح کرتے تو بھی یہی دعا کرتے اور کہتے:

اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ ....

ہم نے اور اللہ کے سارے ملک نے صبح کی .... آخر تک۔

اور کہتے:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

(اس اللہ کے نام سے جس کے نام کی برکت کے باعث زمین اور آسمان کی کوئی چیز تکلیف نہیں دے سکتی اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔)

یہ دعا تین مرتبہ پڑھتے اور کہتے:

رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا وَرَسُوْلًا۔

(میں راضی ہوں اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی و رسول ہونے پر۔)

پھر جب صبح کی نماز پڑھ لیتے اور ابھی دوزانو بیٹھے ہوتے تو کلام کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھتے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی اور اسی کی تعریف ہے۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

مرید کو چاہیے کہ یہ کلمہ دس مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد سید الاستغفار پڑھے جو یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔

(اے اللہ تو ہی میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا غلام ہوں اور میں تیرے عہد اور وعدے پر طاقت کے مطابق قائم ہوں۔ میں اپنے اعمال کی

برائی سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ میں اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ سو تو مجھے بخش دے کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا۔)

اس کے بعد کہے:

اَصْبَحْنَا عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَكَلِمَةِ الْاِخْلَاصِ وَدِيْنِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِلَّةِ اَبِيْنَا اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(ہم نے صبح کی فطرت اسلام اور کلمۂ اخلاص اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر جو کہ ایک رُخ پر اور اللہ کا فرمانبردار تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔)

پھر یہ دعا مانگے:

اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَاَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ وَاَصْلِحْ لِيْ آخِرَتِي الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ وَاجْعَلِ الْحَيٰوةَ زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ۔

(اے میرے اللہ! میرے دین کو درست کر دے جس پر میرے سارے معاملات کا مدار ہے اور میری دنیا کو بھی درست کر دے جس میں میری روزی ہے اور میری آخرت کو بھی درست کر دے جس میں مجھے لوٹ کر جانا ہے اور میری زندگی کو ہر بھلائی میں زیادتی کا باعث بنا۔ اور موت کو ہر برائی سے بچاؤ کا ذریعہ بنا۔)

پھر حضرت ابوالدرداؓ والی دعا مانگے:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تو بڑے عرش کا رب ہے، جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور جو اس نے نہ چاہا نہ ہوا۔ اور نیکی کرنے کی طاقت اور گناہ

سے بچنے کی قوت صرف اللہ بزرگ و برتر کی توفیق سے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ نے ہر چیز کو اپنے علم میں گھیر رکھا ہے۔ اے اللہ! میں اپنے نفس کی برائی اور ہر جاندار کی برائی سے جس کی پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے تیری پناہ لیتا ہوں۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔)

مرید کو ان دعاؤں کا یاد کرنا نہایت ضروری ہے۔ اُسے نماز فجر کی طرف نکلنے سے پہلے اپنے گھر میں دو سنّتیں پڑھنی چاہئیں، پھر مسجد کی طرف نکلے اور کہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَایَ هٰذَا فَاِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشَرًا وَّلَا بَطَرًا وَّلَا رِيَاءً وَّلَا سُمْعَةً خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سُخْطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ اَسْأَلُكَ اَنْ تُنْقِذَنِیْ مِنَ النَّارِ وَاَنْ تَغْفِرَلِیْ ذُنُوْبِیْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔

(اے اللہ! میں تجھ سے اس حق کی طفیل سوال کرتا ہوں جو تجھ پر سوال کرنے والوں کا ہے۔ اور اپنے اس چلنے کے واسطہ سے بھی۔ میں اکڑتا ہوا فخر کرتا ہوا نہیں نکلا۔ اور نہ دکھانے اور سنانے کو نکلا ہوں۔ میں تو تیری ناراضگی سے بچنے اور تیری رضامندی حاصل کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھ کو آگ سے بچا اور میرے گناہ بخش دے۔ تیرے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کرتا۔)

پھر جب مسجد میں داخل ہو تو وہ دعا پڑھے جو صحیح مسلم میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر کہے: اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ۔ (اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب نکلے تو کہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ (اے اللہ! میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں) مسجد میں پہلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرے۔ جماعت کے انتظار میں بیٹھے، تو جو دعائیں پہلے گزر چکی ہیں ان کو پڑھتا رہے۔

فجر کی نماز سے فارغ ہو جائے تو مستحب ہے کہ سورج کے طلوع ہونے تک اسی جگہ میں بیٹھا رہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی فجر کی نماز جماعت سے پڑھے پھر سورج کے طلوع ہونے تک بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا رہے پھر دو رکعت پڑھے، تو اسے حج اور عمرے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔" اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا ہے۔

اس وقت میں چار وظیفے رکھے۔ دعا، ذکر، قرآن کریم کی تلاوت اور غور و فکر اور سوچ سکے وہ ادا کرے اور سوچے کہ بھلائی سے روکنے والے اور برائی میں مشغول کرنے والے کام کس طرح ختم کیے جائیں تاکہ اپنے

اس دن کا وظیفہ پورا کر سکے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور کرے تاکہ اللہ کا پورا شکر ادا کر سکے۔

دوسرا ورد سورج کے طلوع ہونے سے ضحیٰ کے وقت تک ہے۔ اگر دن کے بارہ گھنٹے فرض کیے جائیں، تو یہ وقت تین گھنٹے گزرنے پر ہے اور وہ ہے دن کا چوتھا حصہ اور یہ بڑا قیمتی وقت ہے۔ اس میں دو وظیفے ہیں۔ ایک تو ضحیٰ کی نماز ہے[1] اور دوسرا جو لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً بیمار کی عیادت۔ جنازے میں شمولیت، علم کی مجلس میں حاضری یا کسی مسلمان کی حاجت پوری کرنا اور اگر ان کاموں میں سے کچھ بھی نہ کرے تو قراءت اور ذکر میں مشغول رہے۔

تیسرا ورد: ضحیٰ سے لے کر زوال تک ہے اور اس وقت کا وظیفہ پہلی چار قسموں دعا، ذکر، قراءت اور فکر کے علاوہ دو کام زائد بھی ہیں:

پہلا: کسب معاش میں مشغول ہونا، بازار جانا۔ اگر تاجر ہے تو سچائی اور دیانت داری سے تجارت

---

[1] غزالی نے "احیاء" میں کہا اس نماز پر ہمیشگی کرنا بڑی ہمت کا کام ہے اور بہت افضل ہے باقی رہی اس کی رکعات کی تعداد تو وہ آٹھ رکعتیں ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ کی بہن حضرت ام ہانیؓ نے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضحیٰ کی نماز کی آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ ان کو لمبا کیا اور بڑا اچھا ادا کیا۔ اور اتنی رکعات اور کسی حدیث میں نہیں آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضحیٰ چار رکعت پڑھتے اور جتنا اللہ کو منظور ہوتا زیادہ بھی پڑھ لیتے اور اس "زیادہ" کی حد نہیں ہے، یعنی آپ چار رکعت تو ہمیشہ پڑھتے۔ چار سے کم نہ کرتے اور کبھی زیادہ کر لیتے۔ ایک اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چھ رکعت نماز ضحیٰ پڑھتے۔ اب رہا اس کا وقت تو حضرت علیؓ نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضحیٰ کی نماز چھ رکعت دو وقتوں میں ادا کرتے۔ جب سورج نکلتا اور بلند ہوتا تو دو رکعت پڑھتے اور یہ دن کے دوسرے ورد کا پہلا حصہ ہے اور جب سورج پھیل جاتا اور مشرق کی جانب سے چوتھے حصہ آسمان تک آ جاتا تو چار رکعت پڑھتے۔ پہلی دو رکعتیں اس وقت ہوتیں جب سورج آدھے نیزہ کے برابر آتا اور چار رکعتیں جب دن کا چوتھا حصہ گزر جاتا۔ عصر کی نماز کے مقابل کیونکہ اس کا وقت بھی چوتھائی حصہ دن رہنے پر ہے اور ظہر کی نماز نصف النہار پر ہے۔ ضحیٰ کی نماز سورج کے طلوع ہونے سے زوال تک کے نصف وقت پر ہے جیسا کہ عصر کی نماز زوال سے لے کر غروب تک کے نصف پر ہے اور یہ سب سے افضل وقت ہے۔ بہرحال سورج بلند ہونے سے لے کر زوال سے پہلے پہلے ضحیٰ کا وقت ہے۔

کہے اور اگر صنعتکار ہے تو خیر خواہی اور شفقت سے صنعت کرے اور اپنی تمام مصروفیات میں اللہ کا ذکر نہ بھولے اور تھوڑے پر قناعت کرے۔

دوسرا: دوپہر کا سونا کہ اس سے رات کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ جیسا کہ سحری کھانے سے دن کے روزے میں مدد ملتی ہے۔ پھر اگر سو جائے تو زوال سے آنا پہلے اٹھنے کی کوشش کرے کہ ظہر کا وقت آنے سے پہلے نماز کے لیے تیار ہو سکے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دن اور رات کے چوبیس گھنٹے ہیں۔ اعتدال یہ ہے کہ ان میں سے تیسرا حصہ سوئے، یعنی آٹھ گھنٹے۔ اگر اس سے کم سوئے گا تو بدن میں اضطراب اور بے چینی رہے گی اور اگر اس سے زیادہ سوئے گا تو سستی زیادہ ہو جائے گی۔ پھر اگر اس سے زیادہ رات کو سو چکا ہو تو دن کو سونے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اگر رات کو اس سے کم سویا ہے تو دن میں اتنی کسر پوری کر لے۔

چوتھا وِرد: زوال سے لے کر نمازِ ظہر سے فراغت تک ہے اور دن کے اوراد میں سے یہ سب سے چھوٹا اور افضل وقت ہے۔ اس وقت میں اسے چاہیے کہ جب مؤذن اذان کہے، تو اس کو اسی طرح جواب دے۔ پھر ظہر اور اس کی سنتیں پڑھے۔ پھر اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔

پانچواں ورد: اس کے بعد عصر تک مستحب ہے کہ ذکر، نماز اور نیکی کے کاموں میں مشغول رہے اور بہترین عبادت نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار ہے۔

چھٹا ورد: عصر کے شروع وقت سے سورج زرد ہونے تک ہے۔ اس عرصے میں سوائے عصر کی چار سنت کے جو اذان اور تکبیر کے درمیان ہیں کوئی نفل نماز نہیں۔ پھر عصر کے فرض پڑھے اور چاروں قسم کے وظائف میں مشغول رہے جن کا ذکر پہلے ورد کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ افضل یہ ہے کہ اس میں غور و تدبر سے قرآن کریم کی تلاوت کرے۔

ساتواں ورد: سورج زرد ہونے سے غروب آفتاب تک ہے اور یہ بڑا اچھا وقت ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا۔ لوگ پچھلے پہر کو پہلے پہر کی نسبت زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ اس وقت میں خاص طور پر تسبیح اور استغفار کرنا مستحب ہے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ دن کے اوراد ختم ہو گئے۔ اب بندے کو چاہیے کہ اپنے حالات کا جائزہ لے اور اپنا محاسبہ کرے کہ اس کے راستے کا ایک مرحلہ طے ہوا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ عمر، ایام ہی کا نام ہے۔ ایک ایک دن ختم ہونے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت حسنؓ نے کہا: "اے آدم کے بیٹے سن لے تو ایام ہے۔ جب تیرا ایک دن گزر جائے گا، تو تیرا بعض حصہ گزر جائے گا۔ سوچے کہ آج کا دن کل کے برابر ہے یا نہیں! اگر دیکھے کہ آج کل کی نسبت نیکی زیادہ ہوئی ہے، تو اس توفیق پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے اور اگر دوسری صورت ہو تو توبہ کرے اور رات میں اس کوتاہی کی تلافی کرنے کا پورا ارادہ کرے کہ نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں اور اپنی بدنی صحت اور اپنی زندگی پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے کہ ابھی ہر تقصیر کا مداوا ہو سکتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت پسند کرتی تھی کہ دن کا خاتمہ صدقے پر ہو اور حتی المقدور وہ ہر طرح کی نیکی کی کوشش کیا کرتے تھے۔

فصل دوم

رات کے اوراد

پہلا ورد: سورج غروب ہونے سے عشا کے وقت تک ہے۔ جب سورج غروب ہو تو مغرب کی نماز پڑھے اور مغرب اور عشاء کے درمیان کے وقت کو زندہ رکھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے قول: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] (ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں) کے متعلق روایت ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شان میں نازل ہوئی۔ وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھا کرتے تھے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے مغرب کے بعد چھ رکعت نماز پڑھی اور اس دوران میں کوئی بُری بات نہ کی، تو یہ بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوں گی۔" اسے ترمذی نے روایت کیا۔

دوسرا ورد: سُرخی غائب ہونے سے سونے کے وقت تک ہے۔ مستحب ہے کہ عشاء کی اذان اور تکبیر کے درمیان جتنی ہو سکے نماز پڑھے اور اس میں الٓمّٓ تَنْزِيْلُ السَّجْدَة (سورۃ سجدہ) اور تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (سورۃ الملک) کی قرأت کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک ان کی قراءت نہ کر لیتے سوتے نہ تھے۔ دوسری حدیث میں ہے ابن مسعودؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی ہر رات سورۃ واقعہ پڑھے اس کو کبھی فاقہ نہ آئے گا۔"

تیسرا ورد: سونے سے پہلے وتروں کا پڑھنا ہے۔ ہاں اگر کسی کو رات کے قیام کی عادت ہو تو اس کے حق میں ان کو آخر رات میں پڑھنا بہتر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سورۃ سجدہ۔ آیت ۱۶

نے رات کے اول اور درمیان اور آخر تمام حصوں میں وتر پڑھے ہیں لیکن آخر عمر میں آپ نے سحری کے آخر میں وتر پڑھے (متفق علیہ) پھر وتروں کے بعد تین مرتبہ کہے "سبحان الملك القدوس" (پاک ہے اللہ بادشاہ نہایت ہی پاک)

چوتھا ورد: سونا ہے اور ہم نے اس کو بھی اوراد میں شمار کیا ہے کیونکہ اگر اس کے آداب کی رعایت کی جائے اور اس کا مقصد اچھا ہو تو یہ بھی عبادت شمار ہوتا ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں اپنی نیند میں بھی ثواب کی امید رکھتا ہوں جیسے کہ اپنے قیام کے ثواب کی امید رکھتا ہوں۔"

سونے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ باوضو سوئے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے کا ارادہ کرتے تو نماز کی طرح کا وضو کرتے ــــ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا کہ نیند میں ارواح آسمان کی طرف چڑھتی ہیں تو ان کو عرش کے پاس سجدہ کرنے کا حکم ہوتا ہے جو باوضو ہوتے ہیں وہ عرش کے پاس سجدہ کرتے ہیں اور جو باوضو نہیں ہوتے وہ عرش سے دور رہ کر سجدہ کرتے ہیں ــــ اس کے آداب سے یہ بھی ہے کہ سونے سے پہلے توبہ کرے کیونکہ جس کا ظاہر پاک ہو اس کا باطن بھی پاک ہونا چاہیے۔ کئی دفعہ نیند میں ہی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کسی مسلمان کے متعلق اپنے دل میں کینہ اور دشمنی نہ رکھے اور نہ کسی پر ظلم کرنے کی نیت کرے۔ جب جاگے تو گناہ کا ارادہ نہ کرے۔ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کی وصیت کرنی ہو، تو رات گزارنے سے پہلے اس کو اپنے پاس لکھ کر رکھ لے کیونکہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی چیز وصیت کرنے والی ہو تو وہ دو راتیں بھی بغیر وصیت لکھنے کے گزارے"

یہ بھی چاہیے کہ آرام کرنے کی غرض سے بستر نرم کرنے میں مبالغہ نہ کرے کیونکہ اس سے نیند زیادہ ہو جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دوہرا بستر بچھایا گیا تو آپ نے فرمایا: "اس بستر پر سونے سے میری رات کی نماز رہ گئی۔"

جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو سونا نہیں چاہیے کیونکہ سلف نیند کے غلبے کے بعد ہی سویا کرتے تھے۔

سونے کے آداب سے یہ بھی ہے کہ منہ قبلہ کی طرف کرے اور جو دعائیں احادیث میں آئی ہیں وہ پڑھے اور دائیں پہلو پر سوئے۔ جو روایات اس میں آئی ہیں ان میں سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی اپنے بستر کے پاس آئے تو پہلے اسے اپنے ازار کے پلو سے

جھاڑے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اُس کے بعد کیا بات ہوگئی ہو (مثلاً کوئی موذی کیڑا مکوڑا، سانپ، بچھو بستر میں گھس گیا ہو۔ مترجم) جب اپنا پہلو بستر پر رکھے تو کہے:

بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ اَرْفَعُهُ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِي فَاغْفِرْ لَهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ۔

(اے میرے اللہ! میں نے تیرے نام سے پہلو رکھا اور تیرے نام سے اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری جان کو روک لے تو اس کو بخش دے اور اگر اس کو چھوڑ دے تو اس کی حفاظت کر ان چیزوں سے جن سے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے (بخاری مسلم)

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر آتے تو ہر رات اپنی ہتھیلیوں کو جمع کرتے پھر اُن میں پھونکتے اور اُن میں قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر پھونکا کرتے۔ پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے سارے جسم پر پھیرتے، جہاں تک ہاتھ پہنچتے۔ سر اور منہ سے شروع کرتے اور جسم پر ہاتھ پھیرتے جاتے۔ ایسا تین مرتبہ کرتے۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنے بستر پر آنے لگو تو نماز کی طرح کا وضو کرو۔ پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاؤ اور کہو:

اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِي اِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِي اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِي اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِي اِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ

(اے اللہ! میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی اور اپنی توجہ تیری طرف کی اور اپنے کام تیرے سپرد کیے اور میں نے رغبت اور خوف سے تیری پناہ چاہی۔ تیرے سوا نہ کوئی پناہ کی جگہ ہے نہ نجات کی۔ میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل کی۔ اور تیرے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لایا۔)

اگر اس رات میں مر گیا تو فطرت اسلامیہ پر مرے گا اور اگر صبح کرے گا تو بھلائی پائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے اور حضرت فاطمہؓ سے کہا: جب تم بستر پر آکر لیٹ جاؤ تو سُبْحَانَ اللهِ ۳۳ مرتبہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۳۳ مرتبہ اور اَللهُ اَكْبَرُ ۳۴ مرتبہ کہو۔ یہ تمھارے لیے خادم سے بہتر ہے۔ (متفق علیہ)

رمضان کے صدقۂ فطر کی حفاظت میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث مشہور ہے کہ شیطان نے اُن سے کہا جب تم بستر پر آؤ تو آیت الکرسی پڑھو تم پر اللہ کی طرف سے ہمیشہ ایک نگہبان رہے گا اور شیطان تمھارے قریب نہ آئے گا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ آپ نے فرمایا: تھا وہ بڑا جھوٹا، لیکن تم سے اُس نے سچ کہا۔

مسلم کے افراد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر آتے تو کہتے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَآوَانَا، فَکَمْ مِمَّنْ لَا کَافِیَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِیَ۔

(سب تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور کفایت کی اور جگہ دی۔ کتنے ہی آدمی ہیں جن کی کفایت کرنے والا کوئی نہیں اور نہ کوئی پناہ دینے والا۔)

تہجد کے لیے اٹھے تو وہی دعا پڑھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے،

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُکَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُکَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ حَاکَمْتُ فَاغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ۔

(اے اللہ! ہمارے رب، تیری ہی سب تعریفیں ہیں، تو ہی آسمانوں اور زمینوں اور اُن کی مخلوقات کو سنبھالے ہوئے ہے اور تیری ہی تعریف ہے، تو ہی آسمانوں اور زمینوں اور اُن کے اندر کی چیزوں کو روشن کرنے والا ہے۔ اور تیری ہی تعریف ہے۔ تو ہی آسمانوں اور زمین اور اُن کے اندر کی چیزوں کا بادشاہ ہے اور تیری ہی تعریف ہے۔ تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری ملاقات حق ہے۔ جنت حق ہے۔ دوزخ حق ہے نبی برحق ہیں۔ محمدؐ حق ہیں۔ اور قیامت حق ہے۔ اے اللہ! میں تیرا فرمانبردار ہوا، میں تجھ پر ایمان لایا اور تجھی پر توکل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا۔ میں تیری مدد سے جھگڑا اور تیری طرف فیصلہ لایا۔ تو مجھے بخش دے، جو گناہ میں نے پہلے کیے اور جو بعد میں کیے اور جو چھپ کر کیے اور جو علانیہ کیے۔)

ایک اور حدیث میں ہے:

وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ (متفق علیہ)

(اور جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے تو ہی آگے بڑھانے والا ہے اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے)

کوشش کرے کہ سوتے وقت اس کا آخری کلام اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو۔ اور جاگتے وقت جو الفاظ سب سے پہلے اُس کی زبان پر جاری ہوں وہ بھی اللہ کا ذکر ہو، تو یہ دونوں ایمان کی علامتیں ہیں۔

رات کے اوراد میں سے پانچواں ورد نصف رات کے بعد، چھٹا حصہ رات رہنے تک ہے۔ اور یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ رات کی کون سی نماز افضل ہے؟ تو فرمایا: آدھی رات کی نماز اور ایسا کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے رب! میں کون سے وقت میں تیرے سامنے کھڑا ہوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی کی اے داؤد! نہ پہلی رات قیام کر اور نہ پچھلی رات۔ آدھی رات کو قیام کر۔ تو میرے لیے تنہا ہو، میں تیرے لیے تنہا ہوں اور اپنی حاجتیں میرے حضور پیش کر۔

تہجد کے لیے اٹھے، تو سورۂ آل عمران کی آخری دس آیتیں پڑھے جیسا کہ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے اور رات میں بیدار ہو کر وہ دعا پڑھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔ پھر دو ہلکی رکعتوں سے اپنی نماز شروع کرے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی تم میں سے رات کی نماز کے لیے کھڑا ہو تو دو ہلکی رکعات سے شروع کرے۔" اسے مسلم نے روایت کیا۔ پھر دو دو رکعت کر کے نماز پڑھے اور زیادہ سے زیادہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ وتر سمیت تیرہ رکعت ہیں اور کم از کم سات۔

رات کا چھٹا ورد: آخری چھٹا حصّہ رات ہے اور وہ سحر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وبالاسحار ھم یستغفرون (اور وہ سحر کے وقت بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں)[1]

حدیث میں ہے۔ آخری رات کی قراءت اس میں حاضری دی جاتی ہے اور طاؤس سحر کے وقت ایک آدمی کے پاس آئے تو انھوں نے کہا وہ سو رہا ہے تو کہنے لگے میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی آدمی سحر کے وقت بھی سوتا ہے۔

جب مرید تہجد کی نماز سے فارغ ہو جائے تو اللہ سے استغفار کرے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

---

[1] سورۃ الذاریات۔ آیت: ۱۸

فصل سوم

اوراد کے اوقات

معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت کی راہ کا سالک چھ حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو وہ عابد ہوگا۔ یا عالم۔ یا طالب علم۔ یا حاکم۔ یا کوئی پیشہ ور۔ یا دوسروں سے بے نیاز ہو کر اللہ کی محبت میں غرق۔

پہلا عابد ہے اور وہ ہے تمام اشغال کو چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرنے والا۔ یہ ان اوراد پر عمل کرے جو ہم نے ذکر کیے ہیں۔ کبھی وظائف مختلف ہوتے ہیں۔ سلف میں بھی عابدوں کے حالات مختلف تھے۔ بعض کے حال پر تلاوت غالب تھی یہاں تک کہ وہ ایک یا دو یا تین قرآن ایک دن میں ختم کرتے۔ بعض پر تسبیح غالب تھی۔ بعض پر نماز اور بعض بیت اللہ کا طواف زیادہ کرتے تھے۔ اگر پوچھا جائے کہ ان اوراد میں سے بہتر کیا ہے جس میں وقت صرف کیا جائے؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ نماز میں کھڑے ہو کر تدبر و غور سے قرآن کریم کی تلاوت میں سب چیزیں آجاتی ہیں، لیکن اس پر ہمیشگی بعض اوقات مشکل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں آدمی کے حالات مختلف ہونے سے اعمال کا درجہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ بہرحال اوراد کا مقصود دل کو پاک و صاف کرنا ہے۔ مرید کو دیکھنا چاہیے کہ کونسی چیز اس پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ اسی پر ہمیشگی کرے۔ پھر جب اکتاہٹ محسوس ہو، تو کوئی دوسرا شغل اختیار کرے۔

دوسرا عالم ہے جس کے علم سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فتویٰ یا تدریس یا تصنیف یا وعظ و نصیحت سے تو اس کے اوراد کی ترتیب عابد کی ترتیب سے مختلف ہوگی کہ وہ تصنیف اور علم سکھانے کے لیے مطالعے کا محتاج ہے۔ اگر وہ فرائض ادا کرنے کے بعد اپنا سارا وقت انہی کاموں میں گزارے تو یہ سب سے بہتر ہے۔ وہ علم جو عبادت سے مقدم ہے اس سے ہماری مراد وہ علم ہے جو آخرت کی ترغیب دے اور اس کی راہ پر چلنے میں مددگار ہو۔ عالم کے لیے بہتر ہے کہ اپنے اوقات کو تقسیم کرے کیونکہ سارا وقت علم میں صرف کرنے پر نفس صبر نہیں کرتا تو بہتر ہے کہ صبح صادق سے طلوع آفتاب تک مذکورہ ادعیہ و اوراد میں مشغول رہے۔ پھر سورج نکلنے سے ضحیٰ تک تعلیم دے اور اگر اس کے پاس کوئی طالب علم نہ ہو تو اس وقت کو علوم میں غور

کرنے میں صرف کرے کیونکہ ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اور دنیا کے کاموں میں مشغول ہونے سے پہلے دل صاف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مشکل مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ پھر ضحی سے لے کر عصر تک تصنیف اور مطالعے میں مشغول رہے اور کھانے یا طہارت اور فرضوں یا قیلولہ کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرے۔ عصر سے لے کر سورج زرد ہونے تک تفسیر یا حدیث یا کوئی نفع دینے والا علم جو اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو اس کا سماع کرے اور سورج زرد ہونے سے غروب تک استغفار اور تسبیح میں مشغول رہے۔ یوں اس کا پہلا ورد زبان کا عمل ہوگا۔ دوسرا دل یعنی غور کرنے کا اور تیسرا آنکھ اور ہاتھ کا یعنی مطالعے اور لکھنے کا اور چوتھا عصر کے بعد کان کا، تاکہ ہاتھ اور آنکھ آرام پائیں کیونکہ عصر کے بعد مطالعہ کرنا یا لکھنا بعض اوقات نظر کو نقصان دیتا ہے۔

رہی رات، تو اس میں بہترین تقسیم وہ ہے جو امام شافعیؒ نے کی ہے۔ آپ نے رات کے تین حصے کیے ہیں۔ پہلی تہائی لکھنے کے لیے، دوسری نماز کے لیے اور تیسری سونے کے لیے۔ گرمی کا موسم اس پروگرام کا متحمل نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ آدمی دن کو اچھی طرح نہ سوئے۔

تیسرا طالب علم کا حال ہے، تو علم حاصل کرنا اذکار اور نوافل کے شغل سے افضل ہے۔ اوراد کی ترتیب میں طالب علم کا حکم عالم جیسا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب عالم پڑھانے میں مشغول ہو، تو طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ رہے اور جب عالم تصنیف میں لگے تو طالب علم حواشی اور نوٹ لکھے۔ اگر کوئی عوام میں سے ہو، تو اس کے لیے نفلی اوراد کے شغل سے ذکر اور علم اور وعظ کی مجلسوں میں حاضر ہونا زیادہ بہتر ہے۔

چوتھا حال والی کا ہے۔ مثلاً امام، قاضی اور مسلمانوں کے امور میں سے کسی کام کا نگران متولی، تو مسلمانوں کی ضروریات اور اغراض میں شریعت کے مطابق پورے اخلاص سے ان کے کام میں لگے رہنا ان کے لیے اوراد مذکورہ میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کیونکہ ان کی عبادت کا نفع متعدی ہے؛ چنانچہ اسے چاہیے کہ دن میں صرف فرائض پر اکتفا کرے۔ باقی وقت ان امور میں صرف کرے اور صرف رات کے اوراد پر قناعت کیا کرے۔

پانچواں پیشہ ور ہے۔ وہ اپنے اور اہل وعیال کے لیے کمائی کرنے کا محتاج ہے۔ تمام وقت عبادت میں نہیں گزار سکتا اسے چاہیے کہ دوام ذکر کے ساتھ کمانے کی کوشش کرے اور جب اسے بقدر کفایت حاصل ہو جائے تو اوراد کی طرف رجوع ہو۔

چھٹا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہے، تو فرائض کے بعد اس کا وِرد اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کا حاضر رکھنا ہے اور وہی اس کو اپنے پسندیدہ وِرد کی طرف متوجہ کرے گا۔

چاہیے کہ اوراد پر ہمیشہ عمل کرے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کو سب سے پیارا عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل پر ہمیشگی کرتے تھے۔

فصل چہارم

قیامُ اللّیل اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ[1] (ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رات کا قیام ضرور کرو کہ وہ تم سے پہلے کے نیک لوگوں کی عادت تھی اور وہ تمھارے لیے رب کے قرب کا باعث اور گناہوں کی بخشش اور گناہ سے روکنے والا ہے۔"

اس کی فضیلت میں اور بہت سی احادیث ہیں:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا میں نے آدھی رات کی نماز سے زیادہ سخت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ آپ سے پوچھا گیا۔ کیا وجہ ہے کہ تہجّد گزاروں کے چہرے بڑے خوبصورت لگتے ہیں؟ کہا۔ وہ اللہ کے ساتھ خلوت کرتے ہیں، تو اللہ ان کو اپنے نور کا لباس پہناتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ رات کا قیام بڑا مشکل ہے سوائے اُس آدمی کے جس کو آسان کرنے والی شرائط سے توفیق مل جائے۔ اس کے کچھ اسباب ظاہری ہیں اور کچھ باطنی۔

ظاہری یہ ہیں کہ تھوڑا کھائے۔ بعض کہتے تھے اے مرید! زیادہ نہ کھایا کر کہ پھر زیادہ پیئے گا اور پھر زیادہ سوئے گا اور زیادہ نقصان اٹھائے گا۔

علاوہ ازیں ایک یہ بھی ہے کہ ان کو اعمالِ شاقہ سے اپنے نفس کو تھکا نہ دے۔ نیز یہ بھی ہے کہ دن کا سونا نہ چھوڑے کہ اس سے رات کے قیام میں مدد ملتی ہے۔

گناہ سے بچے، حضرت سفیان ثوریؒ نے کہا میں ایک گناہ کی وجہ سے پانچ ماہ تک رات کے قیام سے محروم رہا۔

باطنی اسباب یہ ہیں: مسلمانوں کے لیے دل سلیم ہو، بدعات سے پرہیز کرے اور دنیا کی فضول چیزوں سے منہ پھیر لے اور یہ کہ دل پر خوف غالب ہو اور امید کوتاہ ہو۔ اور یہ کہ رات کے قیام کی فضیلت جانتا ہو۔

---

[1] سورۃ سجدہ۔ آیت ۱٦:

اس پر سب سے زیادہ آمادہ کرنے والی چیز اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور اس پر قوی ایمان کہ جب قیام کرے گا تو اپنے رب سے ہمکلام ہوگا۔ اسی طرح یہ تصور کہ میں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا اور اس کا مشاہدہ کرنے والا ہوں۔ اپنے رب سے ہمکلامی اس کو لمبے قیام پر آمادہ کرے گی۔

ابوسلیمان رحمہ اللہ نے کہا: "رات والے اپنی رات میں اس سے زیادہ لذت پاتے ہیں جتنی کھیل والوں کو کھیل میں لذت ملتی ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو میں دنیا میں رہنا پسند نہ کرتا۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رات میں ایک گھڑی ہے جو بھی مسلمان اس میں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھلائی مانگے وہ اس کو دیتا ہے اور ایسا ہر رات ہوتا ہے۔"

رات کو زندہ رکھنے کے کئی مراتب ہیں۔ ایک یہ کہ ساری رات قیام کرے۔ سلف کی ایک جماعت سے یہ بھی مروی ہے۔

دوسرا یہ کہ آدھی رات قیام کرے اور یہ بھی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اور اس میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ رات کی پہلی تہائی اور آخری چھٹا حصہ سو جائے باقی قیام کرے۔

تیسرا یہ کہ تہائی رات قیام کرے۔ پہلی نصف رات اور آخری چھٹا حصہ سوئے اور یہ داؤد علیہ السلام کا قیام ہے۔

صحیحین میں ہے کہ سب سے زیادہ پیاری نماز اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات سوتے۔ ایک تہائی قیام کرتے اور پھر چھٹا حصہ سوتے۔

آخری رات میں سو جانا اچھا ہے کیونکہ صبح کو چہرے سے نیند کے آثار کو ختم کرتا ہے اور چہرے کی زردی کم ہو جاتی ہے۔

چوتھا یہ کہ رات کا چھٹا یا پانچواں حصہ قیام کرے اور اس میں بہتر یہ ہے کہ رات کے آخری حصے میں ہو۔ بعض کہتے ہیں آخری چھٹا حصہ بہتر ہے۔

پانچواں یہ کہ وقت مقرر نہ کرے کیونکہ اس طرح اس کی رعایت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ کرے اس کے دو طریقے ہیں: پہلا یہ کہ اوّل رات میں قیام کرے۔ جب نیند غالب آجائے تو سو جائے۔ پھر جب بیدار ہو، تو قیام کرے۔ پھر نیند غلبہ کرے تو سو جائے اور یہ سب سے سخت مشقت ہے اور یہ بھی سلف کی ایک جماعت کا طریقہ تھا۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم جب بھی رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھنا چاہتے دیکھ لیتے اور جب سوتے دیکھنا چاہتے تو بھی دیکھ لیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو نماز پڑھتے جتنی اللہ کو منظور ہوتی۔ پھر جب رات کا آخری حصّہ ہوتا تو اپنے گھر والوں کو اٹھاتے۔ کہتے نماز، نماز!

ضحاکؒ نے کہا میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے جو رات کی سیاہی میں زیادہ سونے سے اللہ سے شرم کھایا کرتے تھے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رات کے شروع میں سو جائے پھر جب اپنی نیند پوری کر کے جاگے تو باقی حصہ قیام کرے۔ حضرت سفیانؒ ثوری نے کہا: "رات کا پہلا حصہ نیند ہے جب میں بیدار ہو جاتا ہوں تو پھر نہیں سوتا۔

چھٹا مرتبہ یہ ہے کہ چار رکعت یا دو رکعت کی مقدار قیام کرے۔ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا: رات کو نماز پڑھا کرو۔ چار رکعت پڑھو۔ دو رکعت پڑھو۔ الخ

سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو رات کو جاگے اور اپنی بیوی کو بھی جگائے اور دونوں مل کر دو رکعت نماز پڑھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں میں لکھے جاتے ہیں۔"

طلحہ بن مصرف اپنے گھر والوں کو رات کو قیام کا حکم دیتے اور کہتے: "دو رکعتیں ہی پڑھو، آدھی رات کی نماز گناہ ختم کر دیتی ہے۔"

غرض رات کی تقسیم کے یہ طریقے ہیں۔ مرید اپنے لیے وہ طریقہ اختیار کرے جو اس کے لیے آسان ہو۔ پھر اگر اس پر آدھی رات کا قیام مشکل ہو تو اسے چاہیے کہ مغرب اور عشا کے درمیان اور سحر کے وقت کو زندہ رکھے تاکہ رات کے دونوں اطراف میں اس کا قیام ہو جائے اور یہ ساتواں مرتبہ ہے۔

جس شخص پر رات کو وضو کرنا اور نماز پڑھنا مشکل ہو، تو وہ قبلہ رُو ہو کر بیٹھے بیٹھے اللہ کا ذکر کرتا رہے اور جتنا ہو سکے دعائیں کیا کرے۔ اگر وہ بیٹھ نہ سکے تو لیٹ کر ہی دعا کرتا رہے۔ جس کے اوراد رات کو نیند کے غلبے کی وجہ سے رہ جائیں تو وہ نماز ضحیٰ کے بعد ان کو پورا کر لے۔ اس باب میں حدیث بھی آئی ہے کہ جس کو رات کے قیام کی عادت ہو تو وہ اسے چھوڑ نہ دے صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمروؓ سے فرمایا تھا: تو فلاں آدمی کی طرح نہ ہونا کہ پہلے وہ رات کو قیام کرتا تھا پھر اس نے رات کا قیام چھوڑ دیا۔

فضیلت والے دن اور راتیں

راتیں جو زائد فضیلت کی حامل ہیں اور جن کو زندہ رکھنا مستحب ہے وہ پندرہ ہیں۔ مرید کو ان سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ تاجر اگر منافع کے موسم سے غافل ہوگا تو کب منافع حاصل کرے گا۔ ان راتوں میں سے سات رمضان شریف میں ہیں۔ پہلی ۱۷ رمضان کی رات۔ یہ وہ رات ہے جس کی صبح کو بدر کی جنگ ہوئی اور باقی چھ آخری عشرہ کی وتر راتیں ہیں کہ ان میں لیلۃ القدر کی تلاش کی جاتی ہے۔

باقی آٹھ راتیں یہ ہیں: محرم کی پہلی رات، عاشورا کی رات، رجب کی پہلی رات۔ رجب کی پندرہ اور ستائیس کی رات کہ وہ معراج کی رات ہے۔ پندرہ شعبان کی اور عرفہ کی رات اور دونوں عیدوں کی راتیں ان میں سے بعض راتوں میں نمازیں بھی بیان کی جاتی ہیں لیکن وہ ثابت نہیں۔

اسی طرح فضیلت والے دن انیس ہیں۔ عرفہ کا دن۔ عاشورا کا دن۔ ستائیس رجب کا دن (یہ وہ دن ہے جس میں حضرت جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آئے) اور سترہ رمضان کا دن کہ اس میں بدر کی جنگ ہوئی اور پندرہ شعبان کا دن اور جمعہ کا دن اور دونوں عیدوں کے دن اور ایام معلومات اور وہ ذی الحجہ کے دس دن ہیں اور ایام معدودات اور وہ تشریق کے دن ہیں۔

ہفتے کے سات دنوں میں سے فضیلت والے دن سوموار (پیر) اور جمعرات ہیں۔ ایام بیض چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ ہیں اور ان کی بڑی فضیلت ہے۔ باللہ التوفیق

یہ کتاب الاوراد کا آخر ہے اور یہی عبادات کے ربع کا آخر ہے۔

کتاب الطعام

- کھانے پر اکٹھا ہونے اور ضیافت کے آداب
- مل کر کھانے کے آداب
- ضیافت کے آداب
- نکاح اور اُس کے متعلقات
- بیوی کے اوصاف
- خاوند اور بیوی کے فرائض

فصل اوّل

کھانے پر اکٹھا ہونے اور ضیافت کے آداب

کھانے کے آداب میں سے کچھ کھانے سے پہلے ہیں، کچھ کھانے کے ساتھ اور کچھ کھانے کے بعد
پہلی قسم کے آداب یہ ہیں، کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کیونکہ ان پر
کچھ نہ کچھ میل ضرور ہوتا ہے۔

کھانا دستر خوان پر رکھے جو زمین پر بچھا ہوا ہو۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ
قریب ہے بہ نسبت اس کے کہ کھانا کسی میز پر رکھا جائے۔ یہ تواضع کے بھی زیادہ قریب ہے۔ کھانا
کھانے کے لیے اس انداز سے بیٹھے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھے اور بائیں پر ٹیک لگائے۔

کھاتے وقت یہ نیّت رکھے کہ اللہ کی عبادت کے لیے قوت حاصل کرتا ہے اور یہ کہ کھانے میں بھی
اللہ کی اطاعت ہو۔ اس سے صرف لذت حاصل کرنا مقصد نہ ہو۔ اس نیّت کی صحت کی نشانی یہ ہے کہ ضرورت
کے مطابق کھائے۔ پیٹ بھر کر نہ کھائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ابن آدم نے پیٹ سے زیادہ
بُرا برتن اور کوئی نہیں بھرا۔ ابنِ آدم کو چند ایک لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔

صرف بھوک کی حالت میں کھانے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے اور پیٹ بھرنے سے پہلے ہاتھ اٹھائے
جو ایسا کرے گا وہ طبیب کا محتاج نہ ہو گا

جو رزق دستر خوان پر ہو اسے بڑی نعمت خیال کرے اور تھوڑے کھانے کو حقیر نہ سمجھے۔

کوشش کرے کہ کھانے میں زیادہ لوگ شامل ہوں اگرچہ اپنے بیوی بچے ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسری قسم کھانا کھانے کے آداب ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھے اور
آخر میں اللہ کی تحمید کرے۔ دائیں ہاتھ سے کھائے۔ لقمہ چھوٹا رکھے۔ خوب چبا کر کھائے اور جب تک پہلا
لقمہ نگل نہ لے دوسرے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔

کھانے کی مذمت نہ کرے اور اپنے آگے سے کھائے۔ ہاں اگر انواع و اقسام کے کھانے ہوں تو جہاں

سے چاہے لے لے، مثلاً پھل وغیرہ ہوں تو ضرورت کے مطابق لے لے۔

تین انگلیوں سے کھائے۔ اگر لقمہ گر پڑے تو اسے اٹھالے۔ گرم پانی میں پھونک نہ مارے اور کھجوروں اور گٹھلیوں کو ایک ہی پلیٹ میں نہ رکھے اور نہ گٹھلیاں ہاتھ میں اکٹھی کرتا رہے۔ بلکہ اپنے منہ سے ہتھیلی کی پشت پر رکھ کر پھینک دے اور اسی طرح دوسری چیزیں گٹھلیاں اور چھلکے وغیرہ الگ کرے۔ کھانے کے دوران میں پانی نہ پئے کہ یہ طبی لحاظ سے فائدے کی بات ہے۔

پینے کے آداب میں سے یہ ہے کہ برتن دائیں ہاتھ میں پکڑے اور پینے سے پہلے اسے دیکھ لے۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پئے۔ ایک ہی سانس میں نہ چڑھا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: پانی گھونٹ گھونٹ پیو ایک ہی دفعہ نہ پی جاؤ کہ اس سے جگر کا درد شروع ہو سکتا ہے۔

پانی کھڑے ہو کر نہ پئے اور پینے کے دوران میں تین سانس لے۔

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پانی پینے میں تین سانس لیا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ برتن کو منہ سے دور کر کے تین سانس لے۔ یہ مطلب نہیں کہ برتن میں تین سانس لیتے تھے۔

کھانے کے آداب کی تیسری قسم بعد کے امور سے متعلق ہے اور وہ یہ ہیں کہ اگر کچھ کھانا انگلیوں پر لگ گیا ہو تو انھیں چاٹ لے۔ برتن کو صاف کرے اور جو کچھ کھایا پیا ہے اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرے۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو کھانا کھائے تو اللہ کی حمد بیان کرے اور پانی پئے تو اللہ کی حمد بیان کرے۔

دسترخوان سے اٹھ کر اپنے ہاتھ دھوئے۔

فصل دوم

مل کر کھانے کے آداب

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص علم وفضل یا کسی اور وجہ سے فضیلت رکھتا ہو کھانے کی ابتداء کرے۔ ہاں اگر کوئی شخص مہمانِ خصوصی ہو، تو اور بات ہے۔ وہ بھی ابتدا کر سکتا ہے۔

ایک یہ ہے کہ کھانے پر خاموش نہ رہیں بلکہ نیکی کی باتیں کریں خاص طور سے کھانے کے متعلق نیک لوگوں کی حکایات بیان کریں۔ نیز ہر آدمی اپنے ساتھی کے لیے ایثار کرے، یعنی اس بات کا موقع دے کہ وہ آسانی اور فراغت سے کھا سکے۔

ضرورت کے مطابق بے تکلفی سے کھائے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ کم کھاتا ہے تصنع نہ کرے۔ اپنے ساتھیوں کو کھاتا ہوا نہ دیکھے کہ وہ شرم کھائیں گے۔ بلکہ ایسا انداز اختیار کیے رکھے کہ کوئی شخص اپنی طرف متوجّہ ہونا محسوس نہ کرے۔

کوئی ایسا کام نہ کرے جسے دوسرے بُرا سمجھیں۔ مثلاً اپنے ہاتھ پیالے میں نہ جھاڑے اور نہ منہ میں لقمہ رکھتے وقت اپنے منہ کو پیالے کی طرف آگے بڑھائے۔ اگر منہ سے کوئی چیز پھینکنے کے لیے نکالے، تو اپنا منہ کھانے کی طرف سے دوسری طرف کرے اور منہ سے نکلنے والی چیز کو بائیں ہاتھ میں لے کر پھینکے۔ چکناہٹ والے لقمے کو سرکے میں نہ ڈبوئے اور نہ سرکہ چکناہٹ میں ڈالے کہ بعض آدمی اسے بُرا سمجھتے ہیں۔ منہ سے لقمہ کاٹ کر باقی لقمہ شوربے میں نہ ڈبوئے۔

دوستوں کے سامنے کھانا پیش کرنا مستحب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر میں ایک صاع کھانے پر دوستوں کو جمع کروں تو یہ مجھے ایک غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

حضرت خیثمہ رحمہ اللہ، حلوہ اور نفیس کھانا تیار کرتے، تو ابراہیم اور اعمش کو بلاتے اور کہتے کھاؤ۔ یہ میں نے تمہارے لیے ہی تیار کیا ہے۔

جو کچھ موجود ہو بلا تکلف مہمانوں کے آگے رکھ دے اور کھانا پیش کرنے میں اُن سے اجازت نہ لے، بلکہ

پوچھے بغیر کھانا پیش کرے۔ بہ تکلف زیادہ چیزیں دسترخوان پر رکھنا بھی مناسب نہیں۔
مہمان کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ کسی کھانے کی فرمائش نہ کرے کہ فلاں چیز پکاؤ۔ ہاں دو کھانوں میں اختیار دیا جائے تو جو آسانی سے تیار ہو جاتا ہو وہ پسند کرے۔ البتہ اگر اسے معلوم ہو کہ کسی چیز کے تجویز کرنے سے میزبان خوش ہوگا اور اس کے حاصل کرنے میں پریشانی بھی نہ ہوگی تو درست ہے۔
امام شافعیؒ زعفرانی کے پاس گئے جو اپنی لونڈی کو کھانوں کی فہرست لکھ کر دیا کرتا تھا۔ امام صاحب نے وہ رقعہ لے کر اس میں درج کھانوں میں ایک اور کھانا بھی لکھ دیا۔ زعفرانی کو معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا۔
اگر معلوم ہو جائے کہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں تو ان کے پاس نہ جانا چاہیے، ہاں اتفاقیہ ایسا ہو جائے اور وہ اسے کھانے کی دعوت دیں تو فوراً شریک طعام نہ ہو جانا چاہیے، بلکہ غور کرنا چاہیے کہ انھوں نے محض رسماً دعوت دی ہے یا فی الواقع کھانے میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اندازہ ہو کہ شریک ہونے سے وہ لوگ خوش ہوں گے تو کھانا جائز ہے۔
اگر کوئی اپنے دوست کے گھر جائے اور دوست گھر نہ ہو اور اسے اعتماد ہو کہ اس کے گھر سے کھانے پر وہ خوش ہوگا تو کھانا جائز ہے۔
ضیافت کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پرہیزگاروں کو کھانے پر بلائے۔ فاسق لوگوں کو نہ بلائے۔ بعض سلف نے تو یہ بھی کہا ہے کہ پرہیزگار کے علاوہ کسی کا کھانا نہ کھاؤ۔ نہ پرہیزگار کے علاوہ کسی کو کھلاؤ۔
چاہیے کہ ضیافت میں فقیروں کو بلائے، دولتمندوں کو نہ بلائے نیز یہ کہ اپنے خویش و اقارب کو ضیافت میں بھول نہ جائے۔ نہ بلانا ان کو متوحش کرنے اور قطع رحمی کا باعث ہے۔ اسی طرح اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں ترتیب کو ملحوظ رکھے۔
یہ ضروری ہے کہ ضیافت سے مقصد فخر اور غرور نہ ہو بلکہ کھانا کھلانے کی سنت کو پورا کرنا، بھائیوں کے دلوں کو جیتنا اور مومنوں کے دلوں کو خوش کرنا ہو۔
جس آدمی کے متعلق معلوم ہو کہ اُسے ضیافت کا قبول کرنا ناگوار ہوگا اور اگر آ جائے گا تو حاضرین سے اسے تکلیف پہنچے گی تو نہ بلائے۔
ضیافت قبول کرنے کے آداب یہ ہیں کہ اگر دعوت شادی کی ہو تو اسے قبول کرنا واجب ہے۔ مسلمان بھائی ولیمے پر بلائے تو ضرور جائے۔ اگر دعوت شادی کی نہ ہو تو اس کا قبول کرنا بھی جائز ہے۔ پھر یہ بھی چاہیے کہ

صرف امیروں کی دعوت قبول نہ کرے بلکہ فقیر کی دعوت بھی قبول کرے۔ روزے کی وجہ سے دعوت میں شمولیت کرنے سے انکار نہ کرے بلکہ حاضر ہو جائے۔ پھر اگر روزہ نفلی ہو اور اسے معلوم ہو کہ اگر روزہ افطار کر لوں تو مسلمان بھائی خوش ہو جائے گا تب روزہ افطار کر دینا چاہیے۔

یہ معلوم ہو جائے کہ جو کھانا پیش کیا جائے گا حرام ہے تو دعوت قبول نہ کرے۔ اسی طرح اگر وہاں فرش حرام کا ہو یا برتن حرام کے ہوں یا گانا بجانا ہو یا تصویریں وغیرہ ہوں تو نہ جائے۔ اسی طرح اگر دعوت دینے والا ظالم آدمی ہو یا فاسق یا بدعتی ہو یا دعوت کا مقصد فخر و غرور ہو تو نہ جائے۔

دعوت قبول کرتے وقت صرف کھانا کھانا مقصود نہ ہو بلکہ سنت کی پیروی کی نیّت کرے اور اپنے بھائی کی عزت اور اپنے آپ کو بدظنی کرنے والے کی بدظنی سے بچانے کی نیت رکھے۔ اگر آدمی دعوت قبول نہ کرے تو اسے متکبر کہا جاتا ہے۔

مجلس میں حاضر ہو تو انکساری اختیار کرے۔ صدر نشینی نہ اختیار کرے اور اگر صاحب خانہ کسی خاص جگہ بٹھائے تو دوسری جگہ نہ بیٹھے۔ جس کمرے سے کھانا آ رہا ہو بار بار اس کی طرف نہ دیکھے کہ ندیدے پن کی دلیل ہے۔

ضیافت کے آداب

کھانا پیش کرنے کے پانچ آداب ہیں: پہلا یہ کہ کھانا جلدی لائے کہ اس میں مہمان کی عزت ہے۔
دوسرا یہ کہ پہلے پھل لا کر سامنے رکھے۔ طبی لحاظ سے یہ بہت بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وفاکھۃ مما یتخیرون ولحم طیر مما یشتہون[۱] (اور پھل جو وہ پسند کریں اور پرندوں کا گوشت جو وہ چاہیں گے)
پھلوں کے بعد گوشت پیش کرنا سب سے افضل ہے۔ خاص طور پر بھنا ہوا گوشت۔ گوشت کے بعد بہترین کھانا ثرید (شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگوئے ہوئے) ہے پھر کوئی میٹھی چیز اور سب کی تکمیل ٹھنڈے پانی سے ہوتی ہے اور ضیافت کی تکمیل یہ ہے کہ بعد میں نیم گرم پانی سے ہاتھ دھلائے جائیں۔
تیسرا یہ کہ تمام موجود کھانے سامنے لا کر رکھ دیے جائیں۔
چوتھا یہ کہ برتن اٹھانے میں جلدی نہ کرے تاوقتیکہ سب آدمی کھانا کھا کر ہاتھ نہ کھینچ لیں۔
پانچواں یہ کہ اتنا کھانا رکھے جس سے مہمان سیر ہو جائیں۔ کھانا کم رکھنا مروّت کے خلاف ہے۔
چاہیے کہ مہمانوں کو کھانا پیش کرنے سے پہلے گھر والوں کے لیے کھانا الگ رکھ لے۔ مہمان جانے لگیں

---

[۱] سورۃ واقعہ: آیات: ۲۱-۲۲

تو دروازے تک اُن کے ساتھ جائے کہ یہ سنت بھی ہے اور اس میں مہمان کی عزت بھی ہے۔ جہمان کا پورا اعزاز یہ ہے کہ اُس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ آتے جاتے وقت اور کھانا کھانے کے دوران میں اُس سے اچھے انداز میں گفتگو کرے۔

مہمان کو چاہیے کہ بہت خوش ہو کر واپس آئے اگرچہ اس کے حق میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو۔ یہ عادت اچھے اخلاق اور تواضع سے ہے۔ نیز یہ کہ صاحب خانہ کی رضا اور اجازت سے واپس آئے اور جب تک وہاں ٹھہرے اس کی خوشی کو ملحوظ رکھے۔

کتاب الزواج

- نکاح اور اس کے متعلقات
- بیوی کے اوصاف
- خاوند اور بیوی کے فرائض

فصل اوّل

نکاح اور اُس کے متعلّقات

اس میں علماء کا اختلاف نہیں ہے کہ نکاح مستحب، مندوب اور بہت سے فضائل کا حامل ہے اور اس میں بہت سے فوائد ہیں - ایک فائدہ اولاد ہے کیونکہ مقصود بقائے نسل ہے اور اس میں کوشش کرنے سے اللہ کی محبّت کا فائدہ بھی ہے - نیز حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی طلب بھی ہے کہ آپ کو امّت کی کثرت پر فخر ہوگا - علاوہ ازیں اس میں نیک اولاد کی دُعا سے برکت کا حصول بھی ہے اور چھوٹے بچے کی موت سے شفاعت کی امید بھی -

نکاح کے فوائد میں سے شہوت کی آفت دور ہو جانے کی وجہ سے شیطان سے بچاؤ بھی ہے اور اس میں نفس کی راحت بھی اور بیوی کی رفاقت سے اُنس و محبت بھی ہے -

ایک فائدہ گھر کی تدبیر سے دل کی فراغت ہے - کھانا پکانے، صفائی کرنے، بستر بچھانے، برتن صاف کرنے اور اسباب زندگی تیار کرنے سے کفالت بھی ہے کیونکہ اکیلا رہتے ہوئے ان میں سے اکثر کام انسان کے لیے مشکل ہو جاتے ہیں - اگر انسان خود ان کو کرنے لگے تو اس کا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے - بہت سے مفید کاموں کے لیے فراغت نہیں رہتی، گویا نیک بیوی دین میں مددگار بھی ہے -

نکاح کے فوائد میں سے یہ بھی ہیں کہ نفس کے مجاہدے، نگرانی اور حکمرانی کی وجہ سے اُس کی اصلاح بیوی بچوں کے حقوق کا پورا کرنا - عورتوں کی بداخلاقی پر صبر - اُن کی طرف سے تکالیف برداشت کرنا - ان کی اصلاح اور ان کو دین کے رستے کی طرف رہنمائی کرنے کی کوشش - کسب حلال کی جدّوجُہد - اولاد کی تربیت کا اہتمام وغیرہ تمام اعمال جو بڑی فضیلت رکھتے ہیں اسی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں - جو شخص یہ حقوق پورا کرنے سے ڈرتا ہے وہی نکاح سے اجتناب کرتا ہے - بیوی بچوں کے لیے مشقت برداشت کرنا دراصل جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہے -

مسلم کے افراد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک وہ دینار ہے جسے تُو

اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور ایک وہ دینار ہے جسے غلام آزاد کرنے میں خرچ کرے اور ایک وہ دینار ہے جسے تو مسکین پر خرچ کرے ایک وہ دینار ہے جسے تو اپنے بال بچوں پر خرچ کرے تو اُن سب سے افضل وہ ہے جسے تُو اپنے بال بچوں پر خرچ کرے۔

فوائد کے ساتھ نکاح میں کچھ آفات بھی ہیں۔ مثلاً سب سے بڑی آفت طلب حلال سے عاجز ہونا ہے کہ طلبِ حلال بہت مشکل ہے اور بیوی بچوں والے کا ہاتھ لمبا او فات ایسی چیزوں کی طرف بڑھتا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں ہوتیں۔

دوسری آفت عورتوں کے حقوق پورے کرنے سے قاصر ہونا ہے۔ اُن کے اخلاق اور ان کی تکالیف پر صبر نہ کرنے میں بہت بڑا خطرہ ہے کیونکہ مرد حاکم اور اپنی رعیت کے متعلق جواب دِہ ہے۔

تیسری آفت یہ ہے کہ بیوی بچے اللہ کی یاد سے غافل کر دیتے ہیں۔ انسان کے دن رات انہی کے شغل میں گزر جاتے ہیں۔ اُس کا دِل آخرت کی فکر اور اس کے عمل کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ نکاح آفات و فوائد کا مجموعہ ہے۔ اب کسی آدمی کے لیے نکاح کرنا بہتر ہے یا بغیر نکاح کے رہنا۔ اس کا فیصلہ انہی امور پر منحصر ہے اگر وہ آفاتِ نکاح سے بچ سکے۔ فوائد نکاح سے مستفید ہو سکے اُس کے پاس حلال مال اور حُسنِ خُلق ہو اور وہ صحت مند بھی ہو تو بلا شبہ اس کے لیے نکاح کرنا افضل ہے اور اگر یہ فوائد حاصل نہ ہو سکیں اور آفات جمع ہو جائیں تو اس کا چھوڑ دینا بہتر ہے۔

بیوی کے اوصاف

اچھی زندگی گزارنے کے لیے عورت میں چند خوبیوں کا ہونا خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

پہلی خوبی دیندار ہونا ہے اور یہی بنیادی خوبی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "دیندار عورت حاصل کرو" اور اگر وہ بے دین ہو گی تو اپنے شوہر کا دین بگاڑ دے گی۔ اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور اگر وہ غیرت کی راہ اختیار کرے گی تو وہ ہمیشہ مصیبت میں رہے گا اور اس کی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی۔

دوسری خوبی اچھا خُلق ہے کہ بدخُلق کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہوتا ہے۔

تیسری خوبی حُسنِ صورت ہے کیونکہ اسی سے تو شیطان سے بچاؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو اسے دیکھ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حُسن کی طرف توجہ نہیں کرتا

جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ علیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک کانی عورت کو اُس کی بہن کے مقابلے میں پسند کیا، لیکن یہ بات شاذ و نادر ہوتی ہے۔ عام طبائع اس کے خلاف ہیں۔

چوتھی خوبی حقِ مہر کا کم ہونا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی کا نکاح دو درہم حق مہر پر کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتوں کے مہر گراں نہ رکھا کرو۔ جس طرح عورت کی طرف سے زیادہ حق مہر کا مطالبہ برا ہے، اسی طرح مرد کی طرف سے جہیز کا مطالبہ بھی اچھا نہیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے کہا: جب آدمی نکاح کرنے لگا اور پوچھے عورت کا جہیز کیا کچھ ہے؟ تو سمجھ لو کہ وہ چور ہے۔

پانچویں خوبی کنواری ہونا ہے کیونکہ شارح نے اس کی تلقین فرمائی ہے۔ یہ اس لیے کہ کنواری عورت بہ نسبت بیوہ یا مطلقہ کے شوہر سے زیادہ محبت کرتی ہے اور اس سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ پہلی محبوب ہوتی ہے۔

چھٹی خوبی یہ ہے کہ عورت ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہو جس کی خواتین بالعموم صاحبِ اولاد ہوں۔

ساتویں خوبی نسب ہے اور وہ حقیقتاً یہ ہے کہ عورت کسی دیندار اور نیک گھرانے کی ہو۔

آٹھویں خوبی یہ ہے کہ عورت اجنبی نہ ہو۔ جیسے مرد کو حکم ہے کہ عورت کو دیکھ کر نکاح کرے، اسی طرح عورت کے ولی کو بھی حکم ہے کہ مرد کے دین اور اخلاق اور حالات کو دیکھے کیونکہ نکاح کے بعد تو وہ ایک طرح اس کی قیدی بن جائے گی۔ اگر اس کا خاوند فاسق یا بدعتی آدمی ہوگا تو عورت پر بھی ظلم کرے گا اور اپنی جان پر بھی۔

ایک آدمی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا: میں اپنی بیٹی کا کس سے نکاح کروں؟ تو کہا: جو اللہ سے ڈرتا ہو کہ اگر وہ اس کو پسند کرے گا تو اس کی عزت کرے گا اور اگر ناپسند بھی کرے گا تو اس پر ظلم نہ کرے گا۔

فصل دوم

خاوند اور بیوی کے فرائض

شوہر پر لازم ہے کہ بارہ چیزوں میں اعتدال کو ملحوظ رکھے :

پہلی : ولیمہ ۔ کہ یہ مستحب ہے ۔ دوسری : بیویوں سے حُسنِ سلوک ۔ تیسری : ان کی کم عقلی کی وجہ سے اُن کی تکلیفوں کو برداشت کرنا ۔ صحیح حدیث میں ہے کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو کہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصّہ اُس کا اُوپر کا حصّہ ہے ۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھا ہی رہے گا ۔ پس عورتوں سے اچھا سلوک کرو ۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ عورت کے ساتھ حُسنِ خُلق صرف یہ نہیں کہ مرد اُس کو تکلیف نہ دے بلکہ اُس کی تکالیف کو برداشت کرے ۔ اس کے غصے اور جوش پر حوصلے سے کام لے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے ۔ صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ سے سوال جواب کرتیں اور کوئی ان میں سے سارا سارا دن آپ سے نہ بولتی ۔ یہ حدیث مشہور ہے ۔

چوتھی یہ کہ اس سے ہنسی مذاق کرے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں سے ہنسی مذاق کرتے تھے ۔ آپ نے جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا " تو نے کنواری سے کیوں نہ نکاح کیا کہ تُو اُس سے کھیلتا اور وہ تجھ سے کھیلتی ۔" البتہ ان باتوں کی ایک حد ہونی چاہیے ۔ عورت سے اتنا نہ کھلے کہ مرد کی ہیبت ہی جاتی رہے ۔ اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ آپ اپنے کسی عامل پر ناراض ہوئے تو آپ کی بیوی نے کہا : اے امیرالمومنین ، آپ اس پر کیوں ناراض ہوتے ہیں ؟ فرمایا : اے اللہ کی دشمن تیرا اس معاملے سے کیا تعلّق ، تُو تو ایک گڑیا ہے کچھ دیر تجھ سے کھیل لیا جاتا ہے پھر تجھے چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

پانچویں یہ کہ غیرت میں اعتدال رکھے اور وہ یہ ہے کہ ان ابتدائی چیزوں سے بھی بے خبر نہ رہے جن کا انجام تباہی ہو اور حد سے بڑھ کر بدظنی بھی نہ کرے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر سے رات کو اپنے گھر

آپ نے منع فرمایا ہے۔

چھٹی یہ کہ اخراجات میں اعتدال رکھے۔ نہ تو حد سے بڑھ کر کرے اور نہ بخل سے کام لے اور یہ مرد کا حق نہیں کہ وہ خود تو اچھا کھانا کھائے اور بیوی کو ویسا نہ دے۔ اس سے دل میں بغض پیدا ہوتا ہے۔

ساتویں یہ کہ شادی کرنے والا حیض اور اس کے احکام سیکھے جس سے اسے معلوم ہو کہ حائضہ عورت کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے۔ اسے دین کا صحیح عقیدہ سکھائے اور اگر عورت کے دل میں بدعت ہے تو حسن تدبیر سے اس کو زائل کرے اور اسے نماز اور حیض کے ضروری مسائل سے آگاہ کرے۔ اسے بتائے کہ اگر مغرب سے پہلے بقدر ایک رکعت حیض کا خون بند ہو جائے تو اسے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کرنی پڑیں گی۔ اگر صبح سے پہلے بقدر ایک رکعت خون بند ہو جائے، تو اسے مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھنی ہوں گی۔ عورتیں ان باتوں کی پروا نہیں کرتیں۔

آٹھویں یہ کہ اگر اس کی بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو ان میں عدل و انصاف کرے۔ رات گزارنے اور خرچ دینے میں برابری ہے نہ کہ محبت کرنے میں کیونکہ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ پھر اگر سفر پر جائے اور چاہے کہ کسی بیوی کو ساتھ لے جائے تو ان میں قرعہ ڈالے جس کے نام پر نکلے اس کو ساتھ لے جائے۔

نویں، مخالفت ہے۔ اگر عورت مرد کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو مرد کا حق ہے کہ اس کو ادب سکھائے اور اُسے طاقت سے اطاعت پر آمادہ کرے، لیکن اس تادیب میں درجہ بندی کو ملحوظ رکھے۔ پہلے اُسے نصیحت کرے، پھر دھمکی دے اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو اسے اس کے بستر میں تنہا چھوڑ دے۔ اُس کی طرف پیٹھ کر لے۔ اس کا بھی اثر نہ ہو تو اپنا بستر الگ کر لے اور اس سے تین دن سے کم بول چال بند کر دے۔ پھر اگر اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو اسے مارے، لیکن سخت نہ مارے اور وہ یہ ہے کہ اس کا جسم خون آلود نہ ہو اور اس کے چہرے پر بھی نہ مارے۔

دسویں: جماع کے آداب کے متعلق مستحب ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے۔ قبلے سے منہ پھیرے۔ جماع کے وقت اوپر کپڑا ڈال لے ننگا نہ ہو اور یہ کہ پہلے کھیل اور معانقہ اور بوس و کنار شروع کرے۔ بعض علماء جمعہ کے روز جماع کرنا مستحب سمجھتے ہیں۔ پھر جب مرد فارغ ہو جائے تو اسی حالت میں کچھ دیر ٹھہرا رہے تاکہ عورت بھی فارغ ہو جائے کیونکہ عموماً عورت کا انزال مرد کی نسبت دیر سے ہوتا ہے۔

حیض کی حالت میں اور پاخانہ کی جگہ میں مجامعت کرنا جائز نہیں۔ اگر دوبارہ مجامعت کرنا چاہے تو اپنی شرمگاہ کو دھو کر وضو کرے۔

جنابت کی حالت میں بال نہ منڈائے۔ ناخن نہ کٹائے اور خون نہ نکلوائے۔ عزل کرنا (انزال کے وقت اپنی شرمگاہ کو باہر نکال کر منی گرا دینا) جائز، لیکن مکروہ ہے۔

گیارھویں: ولادت کے آداب ہیں اور وہ چھ ہیں: پہلا یہ کہ لڑکے کی پیدائش پر زیادہ خوش اور لڑکی کی پیدائش پر غمگین نہ ہو کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ لڑکے میں بھلائی ہے یا لڑکی میں۔

دوسرا یہ کہ بچہ جب پیدا ہو تو اس کے کانوں میں اذان کہے۔ تیسرا یہ کہ اس کا کوئی اچھا سا نام رکھے۔ مسلم کے افراد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ اگر کسی کا نام نامرغوب ہو تو اس کو تبدیل کر دینا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کے نام تبدیل کر دیے تھے۔ آپ نے ان ناموں کو برا سمجھا: افلح (کامیاب) نافع (نفع دینے والا) یسار (آسانی کرنے والا) رباح (فائدہ) برکت کیونکہ اگر پوچھا جائے کہ کیا وہ یہاں ہے؟ اور وہ وہاں نہ ہو تو کہا جائے گا نہیں ہے۔

چوتھا: عقیقہ۔ لڑکے کے لیے دو بکریاں اور لڑکی کے لیے ایک بکری۔ پانچواں یہ کہ اسے کھجور یا میٹھی چیز کی گھٹی دی جائے۔ چھٹا۔ ختنہ کرنا۔

بارھویں بات جو نکاح سے متعلق ہے وہ طلاق ہے اور یہ اللہ کے نزدیک سب حلال چیزوں میں سے ناپسندیدہ ہے۔ مرد کے لیے مکروہ ہے کہ اچانک ہی عورت کو بغیر کسی گناہ کے طلاق دے دے اور عورت کو جائز نہیں کہ مرد کو طلاق پر مجبور کرے۔ کسی وجہ سے طلاق کا ارادہ کرے تو چار باتیں ملحوظ رکھے۔

پہلی یہ کہ اس طہر میں طلاق دے جس میں مجامعت نہ کی ہو تاکہ اس کی عدت لمبی نہ ہو۔

دوسری یہ کہ ایک طلاق پر کفایت کرے کہ اگر بعد میں نادم ہو تو اسے رجوع کا فائدہ پہنچے۔

تیسری یہ کہ طلاق کے معاملے میں عورت پر نرمی کرے کہ اس کو کچھ سامان یا روپیہ دے دے جس سے اس کا کچھ غم غلط ہو جائے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے ایک عورت کو طلاق دی تو اس کو دس ہزار درہم دیے۔ عورت نے کہا یہ جدا ہونے والے محبوب کی طرف سے تھوڑا سا سامان ہے۔

چوتھی یہ کہ اس کے راز کو ظاہر نہ کرے۔ مسلم کے افراد میں صحیح حدیث ہے کہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بدترین شخص وہ ہو گا جو عورت کے پاس جائے اور عورت اس کے پاس آئے۔ پھر وہ اس کا راز ظاہر کرتا پھرے۔ بعض نیک لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ اس سے پوچھا گیا تم اسے طلاق کس وجہ سے دے رہے ہو؟ تو کہا کہ عقلمند کسی کا پردہ فاش نہیں کیا کرتے۔ پھر جب طلاق دے دی

تو پوچھا گیا تم نے طلاق کیوں دی ہے ؟ تو کہا میرا کسی کی بیوی کے متعلق بات کرنے کا کیا حق ہے ۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو مرد پر لازم ہیں۔

آداب معاشرت کی دوسری قسم وہ ہے جو عورت پر شوہر کے لیے لازم ہے ۔ حضرت ابوامامہؓ نے کہا : میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا : اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے مرد کو سجدہ کرے کیونکہ اس کا حق بہت بڑا ہے ۔

اس ذیل میں اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جو شوہر کے حقوق کی تاکید کرتی ہیں ۔ شوہر کے حق بہت زیادہ ہیں، لیکن ان میں سے اہم یہ دو ہیں :

پہلا پردہ پوشی اور پاک دامنی ۔ دوسرا قناعت ۔ سلف کی عورتیں اسی طرح کی تھیں ۔ جب مرد گھر سے باہر نکلنے لگتا تو کہتیں حرام کی کمائی سے بچنا ہم بھوک پر صبر کر لیں گی ، لیکن آگ پر صبر نہیں کر سکتیں ۔

عورت کے فرائض میں سے ہے کہ مرد کے مال میں فضول خرچی نہ کرے ۔ اگر مرد کی رضا مندی سے کسی کو کچھ دے تو اس کو بھی مرد کے برابر اجر ملے گا ، لیکن اس کی رضا کے بغیر دے گی ، تو مرد کو اجر ملے گا اور عورت کو گناہ ۔

ماں کو چاہیے کہ بیٹی کو سسرال بھیجنے سے پہلے اسے زندگی گزارنے کے آداب سکھائے ۔

عورت کو چاہیے کہ اپنے گھر میں مقیم رہے ۔ چرخہ کاتے ۔ ہمسایوں سے کم بولے ۔ شوہر کی غیر حاضری میں آزادانہ زندگی نہ گزارے ۔ گھر کی حفاظت کرے اور تمام حالات میں مرد کی خوشی کو ملحوظ رکھے ۔ اپنے نفس اور مرد کے مال میں مرد کی خیانت نہ کرے ۔ جسے مرد ناپسند کرے اُسے اس کے بستر پر نہ بیٹھنے دے ۔ مرد کی اجازت کے بغیر کسی کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے ۔ اُس کی پوری توجہ اپنی حالت کی درستی اور گھر کی اصلاح کی طرف ہو ۔ جہاں تک ممکن ہو گھر کی خدمت میں لگی رہے اور اپنے شوہر کے حقوق کو اپنی ذات اور تمام خویش و اقارب کے حقوق سے مقدم سمجھے ۔ کتاب النکاح ختم ہوئی ۔

کتاب المعاش

- معاش کی فضیلت، معاملات کی درستی اور متعلقات
- معاشرتی معاملات میں ظلم
- عدل اور احسان
- تجارت میں دیانتداری اور خوفِ خدا
- حلال اور حرام
- حرام اور حلال کے درجات
- پرہیزگاری

فصل اوّل

معاش کی فضیلت، معاملات کی درستی اور متعلّقات

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور دنیا اور عاقبت دونوں کی بھلائی کا انحصار ان کاموں پر ہے جو کوئی شخص کرتا ہے؛ چنانچہ اب ہم مختلف پیشوں اور ان کے اسباب وآداب کی تشریح کرتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا[1] (اور ہم نے دن کو کمائی کا وقت بنایا) گویا اسے احسان کے طور پر ذکر کیا ہے۔ نیز فرمایا: وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۔ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ[2] (اور ہم نے اس میں تمھارے لیے کمائی کے ذریعے بنائے۔ تم تھوڑا ہی شکر کرتے ہو) یعنی اسے ایک نعمت بتایا اور اس پر شکر کا مطالبہ کیا۔

فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ[3] (تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حلال کی طلب جہاد ہے اور اللہ تعالیٰ پیشہ ور بندے کو پسند کرتا ہے"۔

بخاری کے افراد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کسی نے کھانا نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے۔"

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ نوح علیہ السلام بڑھئی تھے،

---

[1] سورۃ النبا - آیت: ۱۱
[2] سورۃ اعراف - آیت: ۱۰
[3] سورۃ بقرہ - آیت ۱۹۸

ادریس علیہ السلام درزی تھے۔ ابراہیم اور لوط علیہما السلام زمیندار تھے۔ صالح علیہ السلام تاجر تھے۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور موسیٰ اور شعیب اور محمد صلوات اللہ علیہم بکریاں چراتے تھے۔

باقی رہے آثار، تو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا: اے میرے بیٹے، حلال کمائی کے ذریعے مدد مانگو کیونکہ جو آدمی بھی تنگدست ہو جاتا ہے اسے تین چیزیں ضرور پہنچتی ہیں۔ اُس کا دین کمزور ہو جاتا ہے۔ عقل کم ہو جاتی ہے۔ مروّت ختم ہو جاتی ہے اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ لوگ اسے حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا آپ اُس آدمی کے متعلق کیا کہتے ہیں جو اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھ جائے اور کہے کہ میں کوئی کام نہیں کروں گا، یہاں تک کہ میرا رزق میرے پاس آ جائے گا؟ امام احمدؒ نے کہا: یہ آدمی علم سے ناواقف ہے۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں سُنا کہ "میرا رزق اللہ تعالیٰ نے میرے نیزے کے نیچے رکھا ہے" اور جب پرندوں کا ذکر فرمایا تو کہا "وہ خالی پیٹ صبح کو جاتے ہیں اور لوٹتے بھر کر شام کو واپس آتے ہیں"۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جنگلوں اور سمندروں میں سفر کر کے تجارت کرتے اور اپنے باغوں میں کام کیا کرتے تھے اور وہی تو نمونہ ہیں۔

حضرت ابو سلیمانؒ دارانی نے کہا: ہمارے نزدیک یہ عبادت نہیں کہ پاؤں پسار کر بیٹھا رہے اور دوسرے تیرے لیے کام کر کے تھک جائیں۔ پہلے اپنی دو روٹیوں کی فکر کر، پھر عبادت کی طرف دھیان دے اور اگر کہا جائے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے تجارت اور عبادت دونوں کے متعلق کوشش کی، تو دونوں اکٹھی نہ ہو سکیں اور میں نے عبادت کو اختیار کر لیا؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تجارت بذاتہٖ مقصود نہیں، بلکہ لوگوں سے بے نیاز ہونے، بال بچوں کی ضروریات پوری کرنے اور بھائیوں سے تعاون کرنے کے لیے ہے۔ اگر مقصود مال جمع کرنا اور اس پر فخر کرنا ہو تو یہ بُری بات ہے۔

تجارت میں چار چیزوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے: صحتؔ، عدلؔ، احسانؔ اور دینی شغفؔ، پہلی بات صحت کے متعلق ہے۔ اگر معاملہ تجارت ہے تو اس کے تین رکن ہیں۔ بیچنے والا۔ بیچی جانے والی چیز اور لفظ۔

بیچنے والا: تاجر کو چاہیے کہ کسی دیوانے سے معاملہ نہ کرے کیونکہ وہ غیر مکلف ہے اور اُس کی بیع صحیح نہیں۔ نہ غلام سے معاملہ کرے، جب تک اُسے اُس کے مالک کی اجازت نہ ہو۔ اسی طرح بچے سے معاملہ نہ کرے، مگر یہ کہ اُسے باپ یا وصی نے اجازت دے رکھی ہو۔ اس صورت میں وہ اجازت والے غلام کی طرح ہو گا۔ امام شافعیؒ کے

نزدیک بچے کی بیع صحیح نہیں ہے۔ نابینا کا معاملہ ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ اس کا بیچنا اور خریدنا درست ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح نہیں۔

ظالم آدمی اور جس کا اکثر مال حرام ہو اُس سے صرف ایسی چیزوں میں معاملہ کرنا چاہیے جنھیں متعین طور پر حلال جانتا ہو۔

دوسرا رکن بیچی جانے والی چیز ہے اور یہ وہ مال ہے جس کو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کرنا مقصود ہے۔ کتّے کی بیع جائز نہیں کیونکہ وہ نجس العین ہے۔ البتہ خچر اور گدھے کی بیع جائز ہے چاہے ہم انھیں پاک کہیں یا پلید۔ زمین کے کیڑوں مکوڑوں اور گانے بجانے کے آلات اور مٹی کی بنائی ہوئی مورتیوں وغیرہ کی بیع بھی ناجائز ہے۔ نیز ان چیزوں کی بیع بھی جائز نہیں جن کو شرعی طور پر خریدنے والے کے سپرد نہیں کرسکتا جیسے ہوا میں پرندہ یا بھاگا ہوا غلام وغیرہ۔ لونڈی، غلام کی خرید و فروخت میں چھوٹے بچے کے بغیر صرف ماں کو یا ماں کے بغیر صرف چھوٹے بچے کو بیچنا شرعی طور پر منع ہے۔[1]

تیسرا رکن لفظ ہے اور وہ ایجاب و قبول ہے اور اگر قبول ایجاب سے پہلے ہو، تو ایک روایت کے مطابق بیع جائز نہیں، لیکن دوسری روایت کے مطابق درست ہے۔ یہ صورت بھی درست ہوگی کہ خریدار زبان سے کچھ کہے بغیر تاجر کو شے مطلوب کی قیمت دے دے اور بیچنے والا چیز اس کے ہاتھ میں دے دے۔ یہ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے۔

قاضی ابو یعلیٰؒ نے کہا: ایسی بیع صرف چھوٹی اور معمولی چیزوں میں جائز ہے اور یہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے، یعنی قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ باقاعدہ ایجاب و قبول ہو تاکہ اختلاف کا شبہ باقی نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے سود کے معاملے میں بڑی سختی کی ہے، لہٰذا سود میں پڑنے سے ڈرے۔

سود کی دو قسمیں ہیں: ربا بالفضل، یعنی اصل رقم سے زیادہ لینا اور ربا النسیئۃ یعنی سودی چیزوں کا ادھار کے ساتھ تبادلہ۔

ان سب باتوں کو جاننا چاہیے اور جن صورتوں میں سود پایا جاتا ہے ان سے بچنا چاہیے، علاوہ ازیں پیشگی رقم دے کر چیز خریدنے کی شرائط، اجارہ اور مضاربت (ایک کا پیسہ دوسرے کی محنت) اور شراکت وغیرہ کے اصول معلوم ہونے چاہئیں کیونکہ ہر کمائی کرنے والے کو ایسی خرید و فروخت سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔

---

[1] لونڈی غلام کی بیع کے مسائل اب خارج از بحث ہیں کیونکہ یہ سلسلہ ختم ہو چکا۔ (ادارہ)

فصل دوم

معاشرتی معاملات میں ظلم

اب رہا دوسرا معاملہ، یعنی عدل وانصاف اور معاملہ کرنے میں ظلم سے پرہیز کرنا، تو ظلم سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کو اس میں ضرر اور تکلیف ہو اور یہ ضرر دو قسم کا ہے: عام اور خاص۔

پہلا احتکار ہے اور یہ منع ہے کیونکہ اس سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور لوگوں کے لیے روزی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ آدمی مہنگائی کے زمانے میں بہت سا غلہ خریدے اور قیمت چڑھنے کا انتظار کرتا رہے، لیکن اگر اُس کی اپنی زمین کا غلہ ہو اور وہ اسے جمع کر کے رکھ لے تو یہ احتکار نہیں ہے۔ اسی طرح اگر اُس نے فراخی اور ارزانی کے زمانے میں اس خیال سے غلہ خریدا ہو کہ لوگوں کو غلے کے حصول میں کوئی دقت نہ ہو، تو یہ بھی احتکار نہیں۔ مختصر یہ کہ غلہ جات خرید کر مہنگا فروخت کرنے کی نیت سے جمع کرنا مکروہ ہے کیونکہ غلہ انسانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔

دوسرا وہ ہے کہ جس کا نقصان اور ضرر خاص ہے۔ جیسے کسی چیز کی ایسی صفتیں بیان کرنا جو اس میں نہیں ہیں یا اس کے عیوب کو چھپانا وغیرہ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو دھوکہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ بیع اور مصنوعات میں دھوکہ کرنا حرام ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ٹانکہ لگے ہوئے کپڑے کی بیع کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ اگر گاہک کو یہ بتائے کہ ٹانکا لگا ہوا ہے تو جائز ہو گا۔

تاجر کو چاہیے کہ وزن صحیح کرے اور اُس وقت تک ترازو نہ چھوڑے جب تک کہ دیتے وقت کچھ زیادہ نہ ہو جائے اور لیتے وقت کچھ کم نہ ہو۔ اگر چارہ فروش چارے میں مٹی ملائے تو وہ مُطفف (کم دینے اور زیادہ لینے والا) ہے۔ اسی طرح قصاب اگر دستور سے زیادہ گوشت میں ہڈی تول کر دے تو وہ بھی مطفف ہے۔

قیمت چڑھانے سے بھی منع کیا گیا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ خریدار کو دھوکہ دینے کے لیے کوئی ایسا آدمی بولی دیتا جائے جو حقیقت میں خریدار نہ ہو۔ جانوروں کے تھنوں میں دودھ روک کر بیچنا بھی منع ہے۔

عدل اور احسان

تیسری بات معاملے میں احسان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل اور احسان کا حکم دیا ہے اور احسان میں سے بیع میں رعایت کرنا بھی ہے اور دستور سے زیادہ منافع نہ لینا بھی ہے، یعنی اصل منافع کی تو اجازت ہے کیونکہ تجارت منافع ہی کے لیے کی جاتی ہے، لیکن جائز منافع ہونا چاہیے۔ اگر خریدار اپنی مجبوری کی وجہ سے زیادہ منافع دینے پر رضامند ہو تب بھی بیچنے والے کو ایسا منافع لینے سے پرہیز کرنا چاہیے اور یہ بھی احسان میں سے ہے۔

اس سے یہ بھی ہے کہ جب قیمت یا قرضہ وصول کرنے لگے تو نرمی کرے، کچھ حصہ رقم کا چھوڑ دینے سے، مہلت دینے سے اور مقروض کی آسانی کو مدِنظر رکھنے سے بھی درجۂ احسان حاصل ہو گا۔

احسان یہ بھی ہے کہ اگر گاہک کوئی چیز واپس کرنا چاہے تو خریدی ہوئی چیز واپس کر لے کیونکہ واپس وہی کرتا ہے جسے بیع میں نقصان ہوا ہو۔

ان مذکورہ امور کی فضیلت کی شہادت اور ایسا کرنے والے کے ثواب اور اجر کا تذکرہ احادیث میں ہے۔

فصل سوم

تجارت میں دیانتداری اور خوفِ خدا

چوتھا کام تاجر کا اپنے دین سے محبت کرنا ہے جو دنیا وی امور میں خاص اور آخرت کے لیے عام ہو۔ تاجر کو تجارت میں اپنی آخرت سے غافل نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے دین کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور اس کی اپنے دین سے محبت ان چھ چیزوں کو ملحوظ رکھنے سے ظاہر ہو گی:

پہلی تجارت میں اچھی نیت۔ نیت یہ کرنی چاہیے کہ کسی سے سوال نہ کرنا پڑے اور لوگوں سے طمع نہ رہے اور بال بچے کی ضروریات پوری ہوں تاکہ یہ بھی مجاہدین میں سے ہو۔ اور مسلمانوں کی خیر خواہی ملحوظ رہے۔

دوسری یہ کہ اپنی صنعت و تجارت میں فرض کفایہ کی ادائیگی کی نیت کرے۔ کیونکہ اگر صنعت اور تجارت چھوڑ دی جائے تو معیشت تباہ ہو کر رہ جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض صنعتیں اہم ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ ان کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اہم صنعت میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ اُس کی صنعت اور تجارت سے مسلمانوں کی اہم ضروریات پوری ہوں۔

زیور بنانے، نقش و نگار کرنے۔ مکانات پر پلستر کرنے اور تمام زیب و زینت کی صنعتوں سے پرہیز کرے کہ وہ مکروہ ہیں۔ یہ بھی گناہ ہے کہ درزی مرد کے لیے ریشمی کوٹ سیئے۔ قصاب بننا بھی مکروہ ہے، کیونکہ اس سے دل کی سختی پیدا ہوتی ہے۔ سینگی لگانے والا اور جھاڑو دینے والا بھی نہ بنے کیونکہ اس میں ہر وقت نجاست سے واسطہ پڑتا ہے اور یہی حکم چمڑے رنگ کا بھی ہے۔ قرآن کی تعلیم دینے اور نماز پڑھانے پر اجرت لینا بھی جائز نہیں۔

تیسری یہ کہ دنیا کا بازار آخرت کے بازار سے غافل نہ کر دے اور آخرت کا بازار مسجدیں ہیں چاہیے کہ دن کا پہلا حصہ اور دوسرا حصہ آخرت کے بازار کے لیے رکھے اور اس کے اوپر مداومت کرے۔ سلف صالحین میں سے جو تجارت کرتے تھے دن کا پہلا اور پچھلا حصہ آخرت کے لیے رکھا کرتے تھے اور دن کا درمیانی حصہ تجارت

کے لیے؛ چنانچہ جب ظہر اور عصر کی اذان سنے تو فرض کی ادائیگی کے لیے کاروبار چھوڑ دے۔

چوتھی یہ کہ بازار میں بھی ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتا رہے اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے۔

پانچویں یہ کہ بازار اور تجارت کی شدید حرص نہ رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ سب سے پہلے بازار میں جائے اور سب کے بعد نکلے۔

چھٹی یہ کہ صرف حرام سے بچنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ شکوک و شبہات کے مواقع سے بھی بچے محض فتاویٰ پر انحصار کرنا کافی نہیں بلکہ اپنے دل سے فتویٰ پوچھے اور جو بات دل میں کھٹکے اُس سے پرہیز کرے۔

فصل چہارم

رزقِ حلال

معلوم ہونا چاہیے کہ حلال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ بہت سے جاہل دعویٰ کرتے ہیں کہ حلال تو ہے ہی نہیں۔ حلال تو صرف دریائے فرات کا پانی یا گھاس اور سبزی وغیرہ کچھ چیزیں ہیں۔ ان کو معاملات فاسدہ نے بگاڑ دیا ہے پھر جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تو انھوں نے مشتبہ اور حرام چیزوں کو اپنے لیے جائز ٹھہرا لیا۔ یہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہے۔

صحیحین میں نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں۔

چونکہ ان جاہلوں کی طرف سے یہ دعویٰ ایک ایسی بدعت ہے جس کا نقصان عام ہو چکا ہے اور دین میں اس کے شعلے بلند ہو چکے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے ارشاد سے اس جہالت کا پردہ چاک کیا جائے کہ حلال اور حرام اور مشتبہ میں فرق کھل کر سامنے آجائے۔

ہم اس کو چند اقسام میں واضح کرتے ہیں:

پہلی: طلب حلال کی فضیلت اور حرام کی مذمت اور حرام اور حلال کے درجات کے بیان میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، يَآ اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا[1] (اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو) طیبات حلال چیزیں ہیں۔

حرام کی مذمت میں فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[2] (اور اپنے مال آپس میں حرام طریقے سے نہ کھاؤ) ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ

---

[1] سورۃ مومنون۔ آیت: ۵۰

[2] سورۃ البقرہ۔ آیت: ۱۸۸

پاک ہے اور پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے"۔ اور ساری حدیث کا ذکر کیا یہاں تک کہ فرمایا" ایک آدمی پریشان بال ہے، غبار آلود ہے، بڑا لمبا سفر کیا ہے (خانہ کعبہ جاکر) اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے رب اے رب اور اُس کی خوراک حرام اور پینا حرام اور لباس حرام اور حرام کی غذا سے بنا ہوا جسم ہوتا ہے، تو اللہ اس کی دُعا کیسے قبول فرمائے۔

حضرت سعدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کیا کروں کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں: تو آپ نے فرمایا: "اپنی خوراک پاکیزہ رکھو، تمھاری دعائیں قبول ہوں گی"

سلف، حلال میں بڑی تحقیق کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مشتبہ چیز کھائی تو معلوم ہونے پر حلق میں انگلیاں ڈال کر قے کر دی (حضرت ابوبکرؓ نے یہ اس لیے کہا تھا کہ وہ کہانت کی اُجرت کا کھانا تھا جو حرام ہے)

حرام اور حلال کے درجات

معلوم ہونا چاہیے کہ حلال سب پاک ہے، لیکن بعض چیزیں بعض سے زیادہ پاک ہیں اور حرام سب گندہ ہے، لیکن بعض چیزیں بعض سے زیادہ گندی ہیں۔ جیسا کہ طبیب حکم لگاتا ہے کہ ہر میٹھی چیز گرم ہوتی ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ پہلے درجے میں گرم ہے اور یہ دوسرے درجے میں اور یہ تیسرے میں اور یہ چوتھے میں۔

حرام میں اس کی مثال بیع فاسد سے حاصل کیا ہوا مال ہے۔ یہ حرام ہے لیکن یہ اس درجے کا حرام نہیں جس درجے کی زبردستی چھینی ہوئی چیز حرام ہے کیونکہ اس میں دوسرے کو ایذا دینا بھی شامل ہے اور کمانے میں شریعت کی راہ کو چھوڑنا بھی ہے جبکہ بیع فاسد میں صرف یہ گناہ ہے کہ اس نے عبادت کا طریقہ ترک کیا۔

اسی طرح وہ چیز جو زبردستی کسی فقیر یا نیک آدمی یا یتیم سے چھینی جائے زیادہ حرام اور گندی ہے بہ نسبت اُس چیز کے جو کسی طاقتور یا غنی یا فاسق سے چھینی جائے۔

پرہیزگاری

پرہیزگاری کے چار درجے ہیں:

پہلا درجہ ان چیزوں سے پرہیز کرنے کا ہے جن کے متعلق حرمت کا فتویٰ ہے۔ اس کی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

دوسرا درجہ: ان مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرنے کا ہے جن سے پرہیز کرنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے، جیساکہ مشتبہ چیزوں کی قسم میں آئے گا۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: جس میں شک ہو اُس کو چھوڑ دو اور جس میں شک نہ ہو وہ لے لو۔

تیسرا درجہ حرام میں مبتلا ہونے کے خوف سے بعض حلال چیزوں سے بھی پرہیز کرنے کا ہے۔

چوتھا درجہ ہر اس چیز سے پرہیز کرنے کا ہے جو اللہ کے لیے نہ ہو اور یہ صدیقین کی پرہیزگاری ہے۔ اس کی مثال وہ ہے جو یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دوا پی تو اُن کی بیوی نے اُن سے کہا آپ تھوڑا سا گھر میں چلیں پھریں تاکہ دوا پوری طرح اثر کرے، تو آپ نے فرمایا: میں اس چلنے پھرنے کو نہیں جانتا اور میں اپنے نفس کا محاسبہ تیس سال سے کر رہا ہوں۔ اس آدمی کو چلنے پھرنے میں دین کے متعلق کوئی نیت معلوم نہ ہوسکی، تو اس پر عمل نہ کیا۔ یہ پرہیزگاری کے باریک نکات ہیں۔

اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ پرہیزگاری کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا اور ان کے درمیان احتیاط کے درجات ہیں۔ جتنا کوئی انسان احتیاط میں متشدّد ہوگا، اتنا ہی پل صراط سے جلدی گزرے گا اور اس کا بوجھ ہلکا ہوگا۔

پرہیزگاری کے درجات کے مطابق آخرت میں درجات بھی مختلف ہوں گے جیسے کہ حرام کے درجات کے مطابق جہنّم میں ظالموں کے لیے عذاب بھی مختلف ہوں گے۔ پس اگر تم چاہو تو زیادہ احتیاط کرو اور اگر چاہو تو

رخصت پر عمل کرو۔ احتیاط کا فائدہ تم کو پہنچے گا اور رخصت کا بوجھ بھی تم پر ہی ہو گا۔

دوسری قسم شبہات کے مراتب اور حلال و حرام کی تمیز کے متعلق ہے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ان تینوں اقسام کے لیے نصِ صحیح ہے اور وہ ہیں: حلال و حرام اور ان دونوں کے درمیان کی چیزیں اور ان میں سے مشکل یہی درمیان کی چیزیں ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے اور وہ ہیں شبہات!

ہم اُن سے پردہ اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حلال مطلق تو وہ ہے کہ اُس کی ذات سے نہ تو کوئی ایسی صفت متعلق ہو جس سے اس کی ذات میں حرمت ثابت ہوتی ہو اور نہ ان کے اسباب سے ایسی چیز متعلق ہو جس سے ان میں حرمت یا کراہت پیدا ہوتی ہو۔

اس کی مثال بارش کا وہ پانی ہے جسے انسان کسی کی ملک میں آنے سے پہلے لے لے۔ حرام خالص وہ ہے جس میں کوئی حرمت پیدا کرنے والی صفت ہو جیسے شراب میں مستی اور پیشاب میں نجاست یا وہ کسی ناجائز ذریعے سے حاصل ہو، جیسے کہ ظلم یا سود سے۔

یہ دونوں اطراف تو ظاہر ہیں اور ان سے وہ چیزیں بھی ملحق ہیں جن کی ایک طرف یقینی ہے لیکن اس میں تغیر کا احتمال ہے۔ مثلاً اس احتمال کے لیے کوئی ظاہری سبب نہ ہو جو اس پر دلالت کرے۔ دیکھو جنگل اور سمندر کا شکار حلال ہے، لیکن جس نے کسی ہرن یا مچھلی کا شکار کیا تو اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ پہلے کوئی شکاری اس کا مالک ہو، یعنی اس نے شکار کیا ہو اور وہ رہا ہو کر چلی آئی ہو۔ یہ احتمال بارش کے اس پانی میں پیدا نہیں ہوتا جو فضا سے براہِ راست لیا گیا ہو۔ ویسے شکار میں اس قسم کے احتمال کا اعتبار کرنا وہمی لوگوں کی پرہیزگاری ہے کیونکہ وہ صرف ایک وہم ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ البتہ اگر اس پر کوئی بات دلالت کرے مثلاً ہرن کے جسم پر کوئی ایسا زخم پائے جو پکڑنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہو اور یہ گمان بھی ہو کہ ایسا زخم ویسے بھی لگ سکتا ہے، تو اجتناب پرہیزگاری کا مقام ہے۔

شبہ کی تعریف یہ ہے کہ اس میں دو اعتقاد متعارض ہوں، یعنی دو ایسی چیزوں سے پیدا ہوں جو مختلف اعتقاد کا تقاضا کرتی ہوں۔ شبہ کی مثالیں بہت ہیں، لیکن ان میں سے یہ دو بڑی اہم ہیں:

پہلی یہ کہ حرام یا حلال کرنے والے سبب میں شک پیدا ہو جائے اور اس کی چار قسمیں ہیں:

الف: پہلے سے حلال ہونا معلوم تھا پھر حلال کرنے والے سبب میں شک پیدا ہو گیا تو یہ وہ شبہ ہے جس سے پرہیز لازمی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شکار دیکھے اور اسے زخمی کر دے پھر وہ شکار پانی میں گر پڑے اور وہ

اسے مرا ہوا پائے اور اب معلوم نہیں کہ یہ جانور ڈوب جانے کی وجہ سے مرا ہے یا زخم سے، تو یہ حرام ہوگا کیونکہ اصل (ڈوبنے کے سبب یقینی ہونے کے سبب) تحریم ہے۔

ب۔ حلال ہونا معلوم ہے، لیکن حرام کرنے والی چیز میں شک ہے، تو اس میں اصل حلت ہے اور یہی حکم ہے۔ جیسے کوئی پرندہ اڑا ایک آدمی نے کہا اگر یہ کوا ہو تو میری بیوی کو طلاق اور دوسرے نے کہا اگر یہ کوا نہ ہو تو میری عورت کو طلاق۔ پھر معاملہ مشتبہ ہو گیا تو ہم ان دونوں کی بیویوں کی حرمت کا فیصلہ نہیں کریں گے، لیکن پرہیزگاری یہ ہے کہ دونوں کی طلاق سمجھی جائے۔

ج۔ اصل میں تو حرمت ہو، لیکن کوئی ایسی چیز پیدا ہو گئی جو ظن غالب سے حلت کی موجب ہے، تو یہ مشکوک ہے۔ لیکن اس میں حلت غالب ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شکار کو تیر مارا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر وہ مردہ حالت میں ملا اور اس کے تیر کے سوا اس پر کوئی نشان نہیں ہے تو اس میں ظاہر حلت ہے کیونکہ احتمال جب تک کسی دلیل سے متعلق نہ ہو وہ وسوسے سے ملحق ہے۔ ہاں اگر اس پر کسی اور صدمے یا زخم کا اثر ہو تو وہ پہلی قسم سے ملحق ہوگا۔

د۔ حلت معلوم ہو لیکن غالب ظن حرمت کا کسی شرعی معتبر سبب سے پیدا ہو جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی کا اجتہاد دو برتنوں میں سے ایک کے پلید ہونے کی طرف چلا جائے کسی معین علامت کی بنا پر جو ظن کی موجب ہو تو اس کے پینے کی حرمت واجب ہو جائے گی اور اس سے وضو کرنے کی ممانعت بھی ہوگی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ حرام حلال سے مل جائے اور معاملہ مشتبہ ہو جائے۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں:

پہلی یہ کہ حلال جانور کے گوشت میں مردار کا گوشت مل گیا۔ یا ذبح کیے ہوئے جانوروں کے گوشت میں مل گیا، یعنی محصور عدد میں۔ اسی طرح یہ مثال ہے کہ اجنبی عورتوں میں اس کی بہن بھی مشتبہ ہو گئی ہے (کہ ان میں سے ایک اس کی بہن ہے لیکن اس کا تعین نہیں ہو سکتا) تو یہ ایسا شبہ ہے جس سے پرہیز لازمی ہے۔

دوسری یہ کہ حرام محصور میں حلال غیر محصور مل جائے۔ جیسے کہ اس کی بہن یا دس دودھ شریک بہنیں کسی بڑے شہر کی عورتوں سے مشتبہ ہو جائیں (یعنی جن کے ساتھ اس نے دودھ پیا ہے وہ اس شہر کی ہیں لیکن پتہ نہ ہو کہ کونسی ہیں) تو اس سے تمام شہر کی عورتوں کے نکاح سے اجتناب کرنا لازم نہ آئے گا، بلکہ وہ جس عورت سے چاہے ان میں سے نکاح کرے کیونکہ ان سب کے حرام کرنے میں بہت بڑا حرج ہے۔

اسی طرح جس آدمی کو معلوم ہو گیا کہ دنیا کے مال میں قطعی طور پر حرام مل چکا ہے تو اسے خریدنا اور

ترک کرنا لازم نہ آئے گا کیونکہ اس میں بڑی تنگی ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ جانتے تھے کہ بہت سے لوگ سودی کاروبار کرتے ہیں، لیکن اس وجہ سے انھوں نے دراہم کلیتہً نہ چھوڑ دیے۔ آپ کے زمانے میں ایک ڈھال چوری ہوگئی لیکن آپ نے ڈھالوں کا خریدنا نہ چھوڑا، تو اس طرح کی صورت میں پرہیز کرنا وہمی لوگوں کا کام ہے۔

تیسری یہ کہ بے شمار حرام بے شمار حلال میں مل جائے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں اموال کا حکم ہے، تو اس اختلاط کی وجہ سے کسی معیّن چیز کا لینا حرام نہ ہوگا، مگر اس صورت میں کہ اس معیّن چیز سے کوئی ایسی علامت مل جائے جو اس کی حُرمت پر دلالت کرے۔ مثلاً ظالم بادشاہ سے کچھ لینا اور اگر کوئی علامت نہ ہو تو اس کا چھوڑنا پرہیزگاری ہے لیکن وہ حرام نہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء کے زمانے میں معلوم تھا کہ شراب کی قیمتیں اور سود کے پیسے اور اموالِ غنیمت میں سے چرایا ہوا مال، یہ سب کچھ اموال میں مل چکا ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں مدینہ لوٹا گیا اور ظالموں کا تصرّف ہوا لیکن انھوں نے بازار میں خرید و فروخت ترک نہ کی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو تمام تصرفات کے دروازے بند ہو جاتے کیونکہ زیادہ لوگوں پر فسق کا غلبہ رہتا ہے۔ لیکن اموال میں اصل حلت ہے اور جب اصل اور غالب میں تعارض ہو اور غالب پر کوئی علامت نہ ہو تو اصل کا حکم لگایا جائے گا، جیسا کہ ہم بازاروں کے گارے اور مشرکوں کے برتنوں کے متعلق کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی عورت کے مٹکے سے وضو کیا، حالانکہ ان کا پینا شراب اور ان کا کھانا خنزیر ہوتا ہے اور وہ نجاست سے پرہیز نہیں کیا کرتے۔

صحابہ رنگے ہوئے کپڑے اور رنگی ہوئی پوستین (چمڑے کی) پہنا کرتے تھے۔ جو آدمی چمرنگوں اور رنگریزوں کے حالات کو دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان پر نجاست غالب رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ ایسی نجاست سے پرہیز کیا کرتے تھے جو نظر آ جائے یا اس پر کوئی علامت ہو، وہ گمان جو حالات کے تحت وہم سے پیدا ہوتا ہے اس کا اعتبار نہیں کیا کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ صحابہ طہارت کے معاملے میں وسعت اختیار کرتے اور حرام کے شبہات سے پرہیز کیا کرتے تھے تو ان دونوں چیزوں میں کیا فرق ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ وہ نجاست کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرتے تھے تو یہ غلط ہے اور اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ وہ ہر ایسی نجاست سے پرہیز کیا کرتے تھے جس سے پرہیز کرنا واجب ہے تو یہ صحیح ہے۔ ان کا شبہات سے پرہیز کرنا اس طریق سے تھا کہ حرج والی چیزوں سے بچنے کے لیے ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنا جن میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور نفوس ہر طرح کے اموال کی طرف راغب ہیں بر خلاف نجاستوں کے، وہ تو ایسی حلال چیزوں سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے جو ان کے دل کو مشغول کر دیں۔ واللہ اعلم۔

کتاب التحریم

- حلال اور حرام
- بے انصاف حکام سے معاملات
- قلب کی کیفیات
- آداب اخوت اور معاشرت
- وہ صفات جو دوست بنانے کے لیے لازمی ہیں
- انسان کے ذمے اپنے بھائی کے لیے کون کون سے حقوق ہیں
- حُسن معاشرت
- قرابتداری اور ہمسائیگی کے حقوق
- ذوالارحام کے حقوق
- تنہائی اور گوشہ نشینی
- گوشہ نشینی کے فوائد اور نقصانات کی وضاحت
- عُزلت کے نقصانات

فصل اوّل

حلال اور حرام

اگر آپ کے پاس کھانا لایا جائے، یا آپ کو کوئی ہدیہ دیا جائے، یا آپ کسی آدمی سے کوئی چیز خریدنے کا ارادہ کریں، تو آپ کا یہ حق نہیں کہ آپ کہیں میں نے اس کے حلال ہونے کی تحقیق نہیں کی اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی تحقیق کر لوں۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ مطلقاً تحقیق کو چھوڑ دیں۔ تحقیق کر لینا کبھی واجب ہوتا ہے کبھی حرام، کبھی مستحب اور کبھی مکروہ۔

اس سلسلے میں تسلّی بخش بات یہ ہے کہ سوال کا موقع "شک" ہے اور یہ کبھی تو ایسے امر سے پیدا ہوتا ہے جو مال سے متعلق ہے اور کبھی مال والے سے، جیسے وہ آدمی جس کے ظلم پر کوئی قرینہ دلالت کرنے والا نہ ہو، جیسے کہ فوجیوں کا لباس یا اُس کی نیکی پر دلالت کرتا ہو جیسے اہلِ علم اور اہلِ زہد کا لباس۔ تو اس صورت میں نہ سوال کرنا واجب ہے اور نہ جائز کیونکہ اس میں مسلمان کی توہین اور ایذاء ہے اور اس کے متعلق یہ نہ کہا جائے گا کہ اس میں شک ہے کیونکہ شک اس میں ہوتا ہے جس میں کسی دلیل سے شک پیدا ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ ایسے لوگوں کی شکل وصورت میں ہو جو ظلم کرنے اور ڈاکہ زنی میں مشہور ہیں، ویسے اس آدمی سے بھی معاملہ جائز ہے کیونکہ قبضہ ملکیت پر دلالت کرتا ہے۔ ظنّی دلیلیں کمزور ہیں۔ ہاں ان کو چھوڑ دینا پرہیز گاری ہے۔

اگر حرام مال حلال میں مل جائے جیسے کہ چھینا ہوا غلہ لاکر بازار میں ڈال دیا جائے اور بازار والے اسے خرید لیں تو جو آدمی اس شہر میں بازار سے غلہ خریدے، اُس پر واجب نہیں ہے کہ وہ اُس کے متعلق سوال کرے جسے خرید رہا ہے۔ ہاں اگر ظاہر ہو جائے کہ جو کچھ تاجر کے پاس ہے اُس میں سے اکثر حرام ہے، تو اس وقت سوال کرنا واجب ہے۔ اگر اکثر حرام نہ ہو تو تفتیش کرنا پرہیز گاری ہے، واجب نہیں۔

اسی طرح ہم اس آدمی کے متعلق کہتے ہیں جس کے حلال مال میں حرام مل چکا ہو۔ مثلاً وہ تاجر جو عام کاروبار کے ساتھ سودی کاروبار بھی کرتا ہے اور گمان یہ ہے کہ اُس کا زیادہ مال حرام ہو گا تو اس کی ضیافت قبول کرنا اور ہدیہ لینا بغیر تفتیش کے جائز نہیں ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ اُس کا مال حلال ہے تو جائز ہے ورنہ چھوڑ دے۔

اگر حرام تھوڑا ہو تو بھی مال مشتبہ ہوگا۔ اس کا چھوڑ دینا پرہیزگاری ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ سوال شک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اُسی وقت ختم ہوگا جب شک مٹ جائے گا

وہ آدمی جس سے تو پوچھتا ہے متّہم نہ ہو اور اگر وہ متّہم ہو اور تجھے معلوم ہو کہ تیرے اس کے ہاں جانے یا اس کا

ہدیہ قبول کرنے سے اس کی غرض وابستہ ہے تو اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے ایسی صورت میں دوسروں سے

پوچھنا چاہیے۔

چوتھی قسم حلال اور حرام کے بیان میں اور اس میں ہے کہ توبہ کرنے والا مالی مظالم سے کیسے عہدہ برآ ہو

معلوم ہونا چاہیے کہ جو آدمی توبہ کرے اور اس کا مال حلال حرام ملا ہوا ہو، تو اس پر لازم ہے کہ حرام کی

تمیز کرے اور اسے نکال دے۔ اگر معیّن طور پر معلوم ہو تو اس کا معاملہ آسان ہے لیکن اگر وہ گھل مل چکا ہو اور وہ

مال ایک جیسی چیزوں میں سے ہو، مثلاً غلہ، روپیہ اور تیل وغیرہ اور اس کا اندازہ معلوم ہو تو اسی قدر نکال دے

اور اگر یہ مشکل ہو تو اس کے دو طریقے ہیں:

پہلا یہ کہ غالب گمان کے مطابق نکال دے اور دوسرا یہ کہ تحقیق کے مطابق نکالے اور یہ پرہیزگاری ہے

جب حرام مال نکال دے اور اس کا مالک معیّن آدمی ہو، تو واجب ہے کہ اس کو یا اس کے وارثوں

کو دے دے۔ اور اگر اس مال کا کچھ منافع بھی آیا ہو تو وہ بھی اس میں جمع کر کے سب کچھ ادا کرے۔

اگر مالک کی پہچان مشکل ہو اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کا کوئی وارث ہے یا نہیں؛ تو اس کو صدقہ کر دے

اور اگر وہ فَے کا مال ہو یا ایسا مال ہو جو مسلمانوں کی مصلحت کے لیے وقف ہو، تو اس کو پلوں اور مسجدوں

کی تعمیر اور مکّے کے راستوں کی درستی اور رفاہِ عامہ کے دوسرے کاموں میں خرچ کر دے جس سے تمام مسلما

کو فائدہ پہنچے۔

مسئلہ: اگر کسی کے پاس مالِ حلال بھی ہو اور مشتبہ بھی، تو اپنے نفس پر حلال مال خرچ کرے کہ

روٹی کپڑے کو سینگی لگانے والے کی اُجرت اور تیل اور تنور تپانے پر مقدم رکھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ا

ہے جو آپ نے سینگی لگانے والے کی کمائی کے متعلق فرمایا: "یہ اپنی اونٹنی کو کھلا دے"۔

اگر ماں باپ کے پاس حرام مال ہو تو ان کا کھانا نہ کھائے اور اگر مشتبہ ہو تو خوش اخلاقی سے ٹا

کی کوشش کرے۔ اگر نہ مانیں تو تھوڑا سا کھا لے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بشر حافی کی ماں نے ان کو ایک کھجور دی، آپ نے کھالی، لیکن پھر مکان کی چھت

قے کردی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے نزدیک مشتبہ تھی۔

پانچویں قسم بادشاہوں کے انعام و اکرام اور ظالم بادشوں سے ملنے ملانے کے متعلق ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جو آدمی کسی بادشاہ سے مال حاصل کرے تو اس پر لازم ہے کہ غور کرے یہ مال بادشاہ کے پاس کہاں سے آیا اور یہ مجھے کیوں دے رہا ہے اور کیا یہ اس کا حق دار بھی ہے یا نہیں؛

سلف میں کچھ تو ایسے مال سے قطعاً پرہیز کرتے تھے لیکن کچھ لے کر صدقہ کر دیا کرتے تھے اور اس زمانے میں تو بچنا ہی بہتر ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مال کس طرح لیا جاتا ہے اور پھر سوال کرنے کی ذلت اور منکرات پر خاموشی کے بغیر ملتا بھی نہیں۔

بعض سلف ایسا مال قبول نہ کرتے تھے اور وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ دوسرے مستحق لوگوں کو نہیں ملا لیکن یہ کوئی دلیل نہیں، کیونکہ یہ اپنا حق لیتا ہے اور جو مال لیا ہے وہ مشترکہ نہیں۔

فصل دوم

بے انصاف حکام سے معاملات

معلوم ہونا چاہیے کہ مظالم امراء اور عمال کے ساتھ تمھاری تین حالتیں ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ تم ان کے پاس جاؤ اور یہ سب سے بدترین حالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جو بادشاہوں کے دروازے پر گیا وہ فتنہ میں مبتلا ہوا اور جتنا کوئی بندہ بادشاہ سے قریب ہوتا ہے اتنا ہی اللہ سے دور ہوتا ہے۔"

حضرت حذیفہؓ نے کہا: "فتنے کی جگہوں سے بچو۔" پوچھا گیا فتنے کی جگہیں کون سی ہیں؟ تو فرمایا: "امراء کے دروازے۔ کوئی تم میں سے امیر کے پاس جائے گا، تو اس کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا اور اس کی وہ صفات بیان کرے گا جو اس میں نہیں ہیں۔"

بعض امراء نے بعض زاہدوں سے کہا کہ تم ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ تو انھوں نے جواب دیا۔ "ہمیں ڈر ہے کہ اگر آپ قریب کریں گے تو فتنے میں ڈالیں گے۔ اگر دور کریں گے تو محروم کر دیں گے اور جو ہماری خواہش ہے وہ بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کا آپ سے ڈر ہو اور جو آپ کے پاس آتا ہے وہ اس لیے آتا ہے کہ آپ اس کو دوسروں سے بے نیاز کر دیں اور ہم آپ سے بے نیاز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بے نیاز کر رکھا ہے۔"

یہ آثار بادشاہوں سے میل ملاپ کی کراہت پر دلالت کرتے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ جو بادشاہوں کے پاس جاتا ہے وہ اللہ کی نافرمانی کے میدان میں آتا ہے۔ خواہ فعل سے یا قول سے یا خاموشی سے۔

فعل سے تو اس طرح کہ اکثر اوقات ان کے پاس جانا ایسے مقامات میں ہوتا ہے جو غصب شدہ ہوتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا ہے کہ وہ جگہ چھینی ہوئی نہیں، تو اکثر اوقات ان کے نیچے بچھے ہوئے قالین یا سایہ کرنے والا سائبان حرام مال کا ہوتا ہے اور اگر اسے حلال مال سے فرض کر لیا جائے تو بسا اوقات اس کے علاوہ اور کئی ناجائز باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً یا اس کو سجدہ کرے گا، یا اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگا اور

اُس کی ولایت کے سبب سے جو کہ ظلم کا آلہ ہے اُس کے لیے تواضع کا رویہ اختیار کرے گا جبکہ ظالم کی تواضع کرنا گناہ ہے۔ جو آدمی کسی دولتمند کی صرف اُس کی دولت کے لیے تواضع کرے اُس کا دو تہائی دین ختم ہو گیا اور اگر ظالم کی تواضع کرے تو اُس کا انجام خود سوچ لے! اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا گناہ ہے، مگر یہ کہ خوف ہو، یا وہ عادل بادشاہ یا عالم ہو اُن لوگوں کے علاوہ جو ہم نے ذکر کیے ہیں صرف سلام کہنا جائز ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ظالم کے لیے دعا کرے گا۔ یا اُس کی مدح کرے گا۔ یا اُس کے باطل کی تصدیق کرے گا۔ صریحاً قول سے یا سر کے اشارے سے یا چہرے کی خوشی سے یا اُس کے سامنے اُس کی محبت اور دوستی کا اظہار کرے گا اور اس کی لمبی زندگی کی دعا مانگے گا کیونکہ اکثر اوقات صرف سلام کہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔

حدیث میں بھی آیا ہے "جس نے ظالم کے لیے لمبی زندگی کی دعا کی اس نے اللہ کی نافرمانی کو پسند کیا" اور ایسے آدمی کے لیے دعا کرنا جائز نہیں، مگر یہ کہ کہے اللہ تجھے نیک کرے یا اللہ تجھے توفیق دے یا اسی طرح کی کوئی اور دعا، لیکن خاموشی سے۔

ان کی مجلس میں ریشمی فرش یا سونے چاندی کے برتن دیکھے یا ان کے غلام ریشمی حرام لباس پہنے ہوئے ہوں اور خاموش رہے یا ایسی ہی کوئی اور چیز دیکھے اور خاموش رہے تو وہ بھی اس میں شریک ہے۔

اسی طرح جب ان کا فحش کلام، جھوٹ اور گالی وغیرہ سنے تو خاموش رہنا حرام ہے، کیونکہ آدمی پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔

اگر تم کہو کہ اسے اپنی جان کا ڈر ہوتا ہو گا اور یوں وہ خاموش رہنے میں معذور ہے، تو ہم کہتے ہیں یہ تو درست ہے، لیکن اسے کس نے کہا تھا کہ امراء کے پاس جائے اور ناجائز چیزوں کے ارتکاب کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے۔ اگر وہ نہ جاتا اور نہ مشاہدہ کرتا تو اس پر امر اور نہی واجب نہ ہوتا۔ جس کو معلوم ہو کہ فلاں جگہ فساد ہے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اگر وہاں گیا تو اس کے ازالہ کی طاقت نہ ہو گی، تو اس کے لیے وہاں جانا جائز نہیں۔

فصل سوم

قلب کی کیفیّات

اگر ان سب چیزوں سے بچ بھی گیا، اور یہ ناممکن ہے، تو اس بگاڑ سے تو نہیں بچے گا جو اُس کے دل میں پیدا ہوگا۔ وہ اُن کے پاس نعمتوں کی وسعت دیکھے گا، تو اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو حقیر سمجھے گا۔ پھر ایسی محافل میں داخل ہونے میں دوسرے بھی اس کی پیروی کریں گے اور یوں وہ ظالموں کی جماعت بڑھانے کا سبب ہوگا۔

بیان کیا گیا ہے کہ سعید بن مسیبؒ کو ولید اور سلیمان، عبدالملک کے بیٹوں کی بیعت کے لیے بلایا گیا تو آپ نے فرمایا: "جب تک رات اور دن کا نظام قائم ہے میں ان کی بیعت نہیں کروں گا۔"

اُنھوں نے کہا: "اچھا تم اس دروازے سے داخل ہو کر اُس دروازے سے نکل جاؤ۔"

آپ نے کہا: "خدا کی قسم ایسا بھی نہیں کروں گا، کیونکہ لوگ میری پیروی کریں گے۔" شاہی حکم نہ ماننے کی پاداش میں ان کو سو کوڑے مارے گئے اور اُون کا لباس پہنایا گیا اور انھوں نے یہ سزا بخوشی قبول کرلی۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کی بنا پر ظالم امراء کے پاس دو عذروں کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔

پہلا یہ کہ ان کی طرف سے بلایا جائے اور خلاف ورزی کرے تو تکلیف پہنچنے کا خوف ہو اور دوسرا یہ کہ کسی مسلمان کو ظلم سے بچانے کے لیے جائے، لیکن شرط یہ ہے کہ نہ جھوٹ بولے نہ ان کی ثنا کرے۔ اگر بات تسلیم کرنے کی توقع ہو تو ان کو نصیحت ضرور کرے۔

ایک حالت یہ ہے کہ بادشاہ خود آجائے ایسی صورت میں اس کے سلام کا جواب دینا لازمی ہے اور اُس کی تعظیم کرنا بھی حرام نہیں ہے کیونکہ وہ بھی اس کی تکریم کر رہا ہے اور دین اور علم کی عزت کرنے کی وجہ سے وہ بھی قابلِ احترام ہے جیسا کہ ظلم کی وجہ سے مستحقِ مذمت ہوتا۔

اگر بادشاہ اکیلا آئے اور دین کی عزت کی وجہ سے اس کی تکریم میں کھڑا ہونا مناسب سمجھے تو یہ بہتر ہے اور اگر بادشاہ جماعت کے ساتھ داخل ہو تو اربابِ ولایت کی حشمت کی رعایت رعایا کے سامنے اور بھی

بہتر اور مناسب ہے۔ اور اس نیّت سے کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں ، لیکن اگر معلوم ہو کہ رعیّت میں کوئی بگاڑ نہیں پیدا ہوگا اور نہ بادشاہ ناراض ہوگا ، تو تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہونا بہتر ہے ۔ نیز یہ واجب ہے کہ اُس کو نصیحت کرے اور اگر وہ کسی چیز کے حرام ہونے کا علم نہ ہونے کی بنا پر اسے کر رہا ہے تو اسے بتائے کہ یہ چیز حرام ہے ۔ ظلم اور شراب کی حرمت بتلانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے ، بلکہ اگر سمجھے کہ خدا کا ڈر اس کے دل میں اثر کرے گا تو اسے گناہوں کے ارتکاب سے روکے اور مصالح کی طرف اُس کی رہنمائی کرے ۔

تیسری حالت یہ ہے کہ اُن سے الگ رہے ۔ نہ یہ اُن کو دیکھے اور نہ وہ اس کو دیکھیں ۔ سلامتی اسی میں ہے ۔ پھر اُن کے ظلم پر اُن سے بغض کا عقیدہ رکھے ۔ اُن کی ملاقات کو پسند نہ کرے ۔ نہ اُن کی ثنا کرے ۔ نہ اُن کا حال پوچھے اور نہ اُن کے ملاقاتیوں کے قریب ہو ۔ اُن سے علیحدہ رہنے کے باعث اگر کوئی چیز اسے نہ ملے تو اس پر افسوس نہ کرے جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ میرے اور بادشاہ کے درمیان ایک ہی دن کا فرق ہے جو دن گزر چکا ہے ۔ اُس کی لذّت اب بادشاہ محسوس نہیں کرتا اور آنے والے کل کے متعلق ہم دونوں خوفزدہ ہیں ۔ باقی رہا آج کا دن ، تو آج کے دن میں بھی پتہ نہیں کیا ہوگا ۔

مسئلہ : جب بادشاہ تمھارے پاس مال بھیجے کہ اُسے فقیروں پر تقسیم کر دو اور اگر یہ معلوم ہو کہ اس مال کا کوئی مالک معیّن ہے تو اس کا لینا جائز نہیں ہے ۔ اگر مالک معیّن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے صدقہ کر دے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ۔

بعض علماء اس کو لینے سے انکار کر دیتے تھے ۔ جب ان کا اکثر مال حرام ہو تو اُن سے معاملہ کرنا حرام ہے ۔ ظالموں نے جو پُل ، مسجدیں اور حوض وغیرہ بنائے ہیں ، اُن میں غور کرنا چاہیے ۔ اگر یہ چیزیں کسی معیّن آدمی کے مال سے بنائی گئی ہیں تو ضرورت کے بغیر ان پر سے گزرنا جائز نہیں ہے اور اگر ان کا مالک معلوم ہو تو اُن پر سے گزرنا جائز ہے اور پرہیزگاری یہ ہے کہ گزرنے سے پرہیز کرے ۔ واللہ اعلم ۔

فصل چہارم

آداب اخوّت اور معاشرت

معلوم ہونا چاہیے کہ محبّت حسنِ خُلق کا نتیجہ ہے اور تفرقہ بدخُلقی کا ثمرہ، کیونکہ حُسنِ خُلق سے محبّت اور موافقت پیدا ہوتی ہے اور بدخُلقی کا انجام بغض اور غیبت ہے حُسنِ خُلق کی فضیلت مخفی نہیں ہے اور احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں :

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن مومن کے میزان میں حُسنِ خُلق سے بڑھ کر کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی" (ترمذی وصححہ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ "قیامت کے دن تم میں سے میرا سب سے زیادہ محبوب اور قریبی وہ ہوگا جس کے اخلاق اچھے ہوں گے اور سب سے زیادہ دور اور سب سے بُرا وہ ہوگا جس کے اخلاق بُرے ہوں گے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ کونسی چیز جنت میں داخل کرے گی؟ تو آپ نے فرمایا: "اللہ کا ڈر اور حُسنِ خُلق"

اللہ تعالیٰ کے لیے محبّت رکھنے کے متعلق صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن کہ اُس کے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا" ان سات آدمیوں میں سے دو آدمی وہ ہیں جنھوں نے اللہ کے لیے آپس میں محبّت کی، اُسی پر جمع ہوئے اور اسی پر الگ ہوئے"

ایک اور حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری محبّت اُن دو آدمیوں کے لیے واجب ہوگئی جو میرے لیے آپس میں محبّت رکھتے ہیں اور میرے لیے خرچ کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں"

ایک اور حدیث میں ہے "ایمان کا سب سے مضبوط کڑا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھے اور اللہ کے لیے دشمنی رکھے" اور اس بارے میں اور بہت سی احادیث ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جو اللہ کے لیے محبّت رکھے گا وہ اللہ کے لیے دشمنی بھی رکھے گا کیونکہ جب تو کسی آدمی

سے اس لیے محبت کرے گا کہ وہ اللہ کا فرمانبردار ہے، تو جب وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا تو تُو اُس سے بُغض بھی رکھے گا۔

چاہیے کہ تو مسلمان سے اُس کے اسلام کی وجہ سے محبت رکھے اور اُس کی نافرمانی کی وجہ سے ناراض ہو۔ اگر لغزش کے طور پر کوئی بات اس سے صادر ہو اور معلوم ہو جائے کہ وہ اس پر نادم ہے تو اس وقت بہتر یہ ہے کہ چشم پوشی کی جائے اور اُس کی پردہ پوشی کی جائے، لیکن اگر گناہ پر اصرار کرے تو غصے کا اظہار لازمی ہے، اُس سے منہ پھیر لے اور اُس سے دُور ہو جائے، نیز گناہ کے ہلکا یا بھاری ہونے کے مطابق اس سے سخت کلامی کرے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کئی قسم کے ہیں۔ مثلاً:

پہلی قسم یہ ہے کہ کوئی کافر ہو۔ پھر اگر وہ کافر حربی ہے، تو وہ قتل کرنے اور غلام بنا لینے کا مستحق ہے اور ان دونوں سے بڑھ کر اہانت کا کوئی مرتبہ نہیں، لیکن کافر ذمّی ہے تو اُس کو تکلیف دینا جائز نہیں۔ ہاں اُس سے رُوگردانی کی جائے اور اسے نیچا سمجھ کر تنگ جگہ کی طرف دھکیلا جائے اور اسے سلام نہ کہے اور اگر وہ سلام کہے تو صرف اتنا کہے وَعَلَیْكَ (اور تجھ پر بھی)

بہتر یہ ہے کہ میل ملاپ نہ رکھا جائے۔ اس سے معاملہ نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھائے اور دوستوں کی طرح اُس کے ساتھ گھل مل کر نہ رہے۔

دوسری قسم بدعتی ہے۔ اگر وہ اپنی بدعت کی طرف لوگوں کو دعوت بھی دیتا ہے اور بدعت بھی ایسی جو کفر تک پہنچا دے، تو اُس کا معاملہ ذمی سے زیادہ سخت ہے کیونکہ نہ تو وہ جزیے کا اقرار کرتا ہے اور نہ اس کو ذمی بنانے کی گنجائش ہے۔

اگر ایسی بدعت ہو جس سے کافر نہیں ہوتا تو لازماً اس کا معاملہ اللہ کے نزدیک کافر سے ہلکا ہے، لیکن اس کے ساتھ معاملہ کافر سے زیادہ سختی کے ساتھ کیا جائے گا کیونکہ کافر کی برائی غیر متعدی ہے، اُس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، برخلاف بدعتی کے جو اپنی بدعت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے، یعنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہے اور یوں لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب بن سکتا ہے؛ چنانچہ اسی لیے اُس سے بُغض کا اظہار، اُس کے ساتھ دشمنی رکھنے، قطع تعلق کرنے، اُسے ذلیل کرنے، اُس کی بدعت کی وجہ سے اس کی بُرائی بیان کرنے اور لوگوں کو اُس سے نفرت دلانے کا معاملہ بہت سخت ہے۔

ایک عامی بدعتی جو لوگوں کو بدعت کی دعوت نہیں دے سکتا اور نہ اس بات کا ڈر ہے کہ لوگ اس کی پیروی

کریں گے تو اس کا معاملہ آسان ہے۔ اُس کے سلسلے میں بہتر یہ ہے کہ اُسے نرمی سے نصیحت کی جائے کہ عوام کے دل بڑی جلدی بدل جاتے ہیں۔ اگر نصیحت نفع نہ دے تو اس سے منہ پھیرنا مستحب ہے اور اگر معلوم ہو کہ صرف منہ پھیرنا اس پر اثر نہ کرے گا کیونکہ اُس کی طبیعت میں جمود ہے تو اور سختی کا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو بدعت لوگوں میں پھیلتی جائے گی اور فسادِ عام برپا ہو گا۔

تیسری قسم وہ ہے کہ کسی کا عقیدہ صحیح ہے، لیکن وہ افعال و اعمال میں نافرمان ہے۔ اگر اُس کی نافرمانی کی حیثیت ایسی ہو جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہو جیسے ظلم اور غصب اور جھوٹی گواہی اور غیبت اور چغلی وغیرہ، تو اس سے منہ پھیرنا اور قطع تعلّق کرنا اور اس کے معاملے میں تنگی اختیار کرنا بہتر ہے اور یہی حکم اُس آدمی کے متعلّق ہے جو فساد کی دعوت دیتا ہو۔ جیسے وہ آدمی جو غلط کار مردوں اور عورتوں کو جمع کرے اور فسادی لوگوں کے لیے پینے پلانے کے اسباب مہیا کرے۔ ایسی صورت میں اُس کی توہین کرنی چاہیے اور جملہ معاملات میں اُس سے قطع تعلّق کرنا چاہیے۔

جو شخص اپنی ذات میں نافرمان ہو مثلاً شراب نوشی وغیرہ کا ارتکاب کرے یا واجب چھوڑے تو اُس کا معاملہ فسادی سے ہلکا ہے، لیکن اس سے ملاقات کے وقت ان کاموں سے روکنا واجب ہے۔ اگر نصیحت اُس کے لیے فائدہ مند ہو اور اس کام سے باز رہے تو اُسے نصیحت کی جائے ورنہ اس پر بھی سختی کی جائے۔

فصل پنجم

وہ صفات جو دوست میں ہونی چاہئیں

بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی اپنے دوست کے دین پہ ہے، تو تم کو دیکھنا چاہیے کہ کس کو دوست بناتے ہو۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے تعلقات استوار کیے جائیں۔ پس ضروری ہے کہ جس کو چنا جائے وہ عادات و خصائص میں ممتاز ہو۔ یہ خصائص دو طرح کے ہوں گے۔ مثلاً وہ دنیاوی ہوں گے جیسے مال و جاہ وغیرہ۔ یہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔ دوسرے خصائص دینی ہوں گے اور ان میں مختلف اغراض جمع ہو سکتی ہیں۔ مثلاً علم اور عمل کا استفادہ بھی ہے اور جاہ کا استفادہ بھی، تاکہ اس آدمی سے بچاؤ ہو سکے جو دل کو مکدر کرتا ہے اور عبادت سے روکتا ہے۔ علاوہ ازیں مالی استفادہ بھی ہے کہ روزی کی تلاش میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اسے بچایا جا سکے۔ نیز اہم کاموں میں استعانت بھی ہے کہ وہ حالات میں قوت اور مصائب میں سامانِ طمانیت ثابت ہو۔ اسی طرح آخرت میں شفاعت کا انتظار ہے جیسا کہ بعض سلف نے کہا: زیادہ بھائی بناؤ کہ ہر مومن کے لیے شفاعت ہو گی۔ غرض بہت سے فوائد ہیں اور ہر فائدہ کچھ شرائط کا مطالبہ کرتا ہے جن کے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

انسان کے لیے جس کی صحبت مؤثر ثابت ہو سکتی ہے، اس میں پانچ خصلتیں ہونی چاہئیں:
وہ عقلمند ہو، اچھے اخلاق والا ہو نہ فاسق ہو اور نہ بدعتی اور نہ دنیا کا حریص۔

دراصل عقل ہی راس المال ہے۔ بے وقوف کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں کیونکہ وہ تجھے فائدہ دینا چاہے گا تو تیرا نقصان کر دے گا۔ اور عقلمند سے ہماری مراد وہ آدمی ہے جو امور کو صحیح صحیح طور پر سمجھتا ہو اور اسے کوئی بات سمجھائی جائے تو بہ آسانی سمجھ لے۔

ان صفات کے ساتھ حسنِ خلق بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ بعض دفعہ عقلمند آدمی پر غضب یا شہوت غالب ہو جاتی ہے تو وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں رہتی۔

فاسق کا قرب موجبِ مصیبت ہوتا ہے، کیونکہ وہ اللہ سے نہیں ڈرتا اور جو اللہ سے نہ ڈرے اُس کی طرف سے مصیبت سے اطمینان ہے اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

بدعتی کی صحبت اس لیے بُری ہے کہ اس کی بدعت اس میں سرایت کرے گی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "سچے بھائیوں سے تعلّق رکھو۔ اُن کی حمایت میں زندگی گزارو۔ وہ نرمی میں زینت ہیں اور سختی میں سامانِ معاونت۔ اور اپنے بھائی کے معاملے کی ہمیشہ اچھی تاویل کرو، یہاں تک کہ کسی ایسی چیز کا علم ہو جس سے قلق ہو۔ اور اپنے دشمن سے کنارہ کش رہو۔ اور دوست سے ہوشیار، سوائے امین دوست کے اور امین وہی ہے جو اللہ سے ڈرے۔ اور فاجر سے صحبت نہ رکھو کہ تم اُس کا فجور سیکھو گے۔ اُسے اپنے راز پر مطلع نہ کرو اور اپنے امور میں ان آدمیوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔"

یحییٰ بن معاذؒ نے کہا: "بُرا دوست وہ ہے جسے یہ کہنے کی ضرورت پڑے کہ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا اور اس سے مدارات سے پیش آنا پڑے یا تمھیں اس کے پاس معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔"

کچھ لوگ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض گھر سے پھل لے کر کھانے لگے۔ بیدار ہونے پر آپ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا: "اللہ آپ پر رحم کرے خدا کی قسم یہ بھائیوں کا کام ہے۔"

ابو جعفر نے اپنے ساتھیوں سے کہا، "کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنا ہاتھ بھائی کی جیب میں ڈال کر جو چاہے نکال لے؟" کہنے لگے "نہیں" تو کہا: "تم بھائی نہیں ہو جیسے کہ تمھارا اپنا خیال ہے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ فتحؒ موصلی اپنے ایک دوست کے پاس آئے جن کا نام عیسیٰ تمار تھا۔ انھیں گھر میں نہ پایا تو اُن کی خادمہ سے کہا: "میرے بھائی کی تھیلی (روپے والی) میرے پاس لاؤ۔" وہ لے آئی تو اس میں سے دو درہم لے لیے۔ عیسیٰ گھر آئے تو لونڈی نے اُن کو یہ واقعہ بتایا۔ بولے: "اگر تو نے سچ کہا ہے تو تُو آزاد ہے۔" پھر تھیلی دیکھی تو وہ سچی نکلی؛ چنانچہ آزاد کر دی گئی۔

فصل ششم

انسان کے ذمے اپنے بھائی کے لیے کون کون سے حقوق ہیں

پہلا حق تو یہ ہے کہ اس کی حاجتیں پوری کی جائیں اور اس کا اہتمام کیا جائے اور اس کے کئی درجے ہیں جن میں سب سے کمتر درجہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی سوال کرے اور پورا کرنے کی طاقت ہو تو اُسے خوشی اور خندہ پیشانی سے پورا کرے۔ درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اُس کے سوال کے بغیر اس کا کام کیا جائے۔ اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اُس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔ بعض سلف اپنے بھائی کے فوت ہونے کے بعد چالیس چالیس سال تک اُس کے بال بچوں کی خبر گیری اور اُن کی حاجتیں پوری کرتے رہے۔

دوسرا حق زبان پر ہے اور یہ کبھی خاموشی سے اور کبھی بولنے سے۔ خاموشی سے تو اس طرح کہ اُس کے عیوب سے اُس کی حاضری اور غیر حاضری میں خاموش رہے۔ اُس سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اُس کی تردید نہ کرے نیز اُس کے ایسے حالات کے متعلق سوال نہ کرے جن کا بیان کرنا اُسے ناگوار ہو اور جب ملاقات ہو تو یہ نہ پوچھے کدھر جا رہے ہو، کیونکہ بعض دفعہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ اُس کے راز کو مخفی رکھے، اگرچہ اُس سے جدائی ہو چکی ہو۔ اُس کے دوستوں اور اس کے گھر والوں کے عیب نہ نکالے اور نہ کسی کی طرف سے عیب جوئی کی بات اسے پہنچائے۔ اسی طرح یہ بات ضروری ہے کہ جن امور کو دوست پسند نہ کرتا ہو ان کے بارے میں گفتگو نہ کرے۔ سوائے اس کے کہ بولنا واجب ہو جائے مثلاً بھلائی کا حکم دینے یا برائی سے روکنے کے لیے۔ خاموش رہنے کی رخصت نہ پائے تو ایسی گفتگو حقیقت میں اس پر احسان ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرنے لگو جس میں کوئی عیب نہ ہو تو نہیں ملے گا، چنانچہ جس میں برائیوں کی نسبت خوبیاں زیادہ ہوں وہی مطلوب ہے۔ ابن مبارکؒ نے کہا: "مومن معذرت تلاش کرتا ہے اور منافق لغزشیں۔"

حضرت فضیلؒ کا ارشاد ہے "جوانمردی یہ ہے کہ بھائیوں کی لغزش سے درگزر کرے۔ اپنے بھائی پر ہرگز بدظنی نہ کرنی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے بھائی کے کام کی اچھی تاویل کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم بدظنی سے بچو کہ بدظنی سب سے جھوٹی بات ہے۔"
معلوم ہونا چاہیے کہ بدظنی تجسس کو دعوت دیتی ہے جس کی ممانعت ہے۔ پردہ پوشی اور درگزر کرنا دینداروں کی علامت ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور بھائی چارے کا کمتر درجہ یہ ہے کہ اپنے بھائی سے وہ معاملہ کرے جو اپنے ساتھ کیا جانا پسند کرتا ہے اور یقیناً تم اپنے بھائی سے یہی چاہتے ہو کہ وہ تمھاری پردہ پوشی کرے اور تمھاری برائیاں دیکھ کر خاموش رہے۔ اگر تمھیں اس کے برخلاف کسی بات کا پتہ چلے تو تم کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔ پھر تم اُس سے ایسی بات کی امید کیسے رکھ سکتے ہو جو خود تم اس کے لیے نہیں کرتے؟

چشم پوشی نہ کرنے کی صورت میں اگر انصاف کی بات پوچھو تو تم اللہ تعالیٰ کے اس قول میں داخل ہو:
اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ[1] (وہ کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں)

پردہ پوشی کرنے میں کوتاہی کا باعث اور پردہ دری پر ابھارنے والا کینہ اور حسد ہوتا ہے اور کینے اور حسد کو بھائیوں میں اُبھارنے کا سب سے بڑا سبب "جھگڑا" ہے اور اس پر آمادہ کرنے والی یہ بات ہے کہ کوئی عقل و تمیز اور فضیلت میں زیادتی کا اظہار کرنا چاہتا ہو اور جس کی بات وہ کرتا ہے اسے حقیر جانتا ہو اور جس نے اپنے بھائی کو جہالت اور حماقت کی طرف منسوب کیا یا کسی چیز کو سمجھنے سے غفلت یا سہو کی طرف منسوب کیا تو یہ سب اسے ذلیل کرنے کی صورتیں ہیں جو کینہ اور عداوت پیدا کرتی ہیں۔

چوتھا حق زبان پر بولنے کا ہے کیونکہ بھائی چارہ جیسے بُری بات کہنے سے سکوت کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح اچھی بات کہنے کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ وہ اُخوّت کے ساتھ زیادہ مخصوص ہے۔ جس نے سکوت پر قناعت کی وہ مُردوں جیسا ہے۔ بھائی تو اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ پس لازم ہے کہ زبان سے محبت کا اظہار کرے۔ دوست کے حالات کی خبر گیری کرتا رہے اور جو معاملہ اسے پیش آئے اس کے متعلق پوچھے۔ اس کے سبب سے اپنے دل کے مشغول ہونے کا اظہار کرے۔ مثلاً جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہو اُن پر

---

[1] سورۃ مطففین۔ آیت: ۲

خوشی کا اظہار کرے۔

ترمذی کی صحیح روایت میں ہے کہ "جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی سے محبت رکھے تو اُسے بتا دے"۔ اوراس میں سے یہ بھی ہے کہ اسے اُس کے سب سے زیادہ پیارے نام کے ساتھ بلائے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تین چیزیں تیرے لیے تیرے بھائی کی محبت کو خالص کردیں گی۔ جب تو اُس سے ملے تو سلام کہہ، اُس کے لیے مجلس میں فراخی کر اور جو تجھے اس کا سب سے زیادہ پیارا نام معلوم ہو اس سے اُس کو پکار"

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ دوست کے جو اچھے احوال معلوم ہوں ان کو ایسے آدمی کے سامنے بیان کرے جس کے سامنے وہ ثنا کرنے کو پسند کرے۔ اسی طرح اُس کی اولاد اور اہل اور اُس کے افعال کی مدح کرے حتیٰ کہ اُس کے اخلاق، عقل، شکل، تحریر اور تصنیف کے متعلق بھی اور اُن کے علاوہ بھی جس سے وہ خوش ہو بیان کرے، لیکن افراط اور جھوٹ سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

اگر کوئی اس کی تعریف کرے تو اُسے خوش ہو کر بتائے کہ اس کا چھپانا محض حسد ہے اور اس سے یہ بھی ہے کہ اگر وہ تمھارے حق میں کوئی اچھا کام کرے، تو اس کا شکریہ ادا کر دا ور اگر کوئی پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کرے تو تم اس کی طرف سے مدافعت کرو، گویا اخوت کا یہ لازمی حق ہے کہ حمایت اور نصرت میں کمربستہ ہو جاؤ۔

صحیح حدیث میں ہے کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے دشمن کے سپرد کرتا ہے"۔ اگر دوست نے عزت سے مدافعت نہ کی تو گویا اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ اور تمھارے لیے اس میں دو معیار ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فرض کرو جو کچھ اُس کے متعلق کہا گیا ہے وہ اُس کی موجودگی میں تمھارے متعلق کہا جاتا تو کیا تم پسند کرتے ـــــــــ پس تم بھی اس کے متعلق وہی کہو۔

دوسرا یہ کہ تم فرض کرو کہ وہ دیوار کے پیچھے موجود ہے اور تمھاری باتیں سن رہا ہے، تو اس علم کی وجہ سے تمھارے دل میں جو تحریک پیدا ہو وہی اس کی عدم موجودگی میں ہونی چاہیے۔ جو اپنے بھائی چارے میں مخلص نہ ہو وہ منافق ہے۔

اور ان میں سے تعلیم اور خیرخواہی بھی ہے تو جتنی تیرے بھائی کو مال کی ضرورت ہے علم کی ضرورت بھی اس سے کم نہیں۔ اگر تو علم کی دولت سے غنی ہے تو اس کی ہمدردی اور اس کی راہنمائی کر۔

اگر نصیحت کرنے کی ضرورت ہو تو چاہیے کہ علیحدگی میں کرے ڈانٹ ڈپٹ اور خیرخواہی میں یہی فرق ہے۔ اعلانیہ نصیحت ڈانٹ ڈپٹ ہے اور علیحدگی میں نصیحت خیرخواہی، جیسا کہ مدارات اور مداہنت میں فرق ہے

اگر تم اپنے دین کی سلامتی اور اپنے بھائی کی اصلاح کے لیے چشم پوشی کرو تو یہ مدارات ہے، لیکن اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے اور اپنے مرتبہ کو بچانے کے لیے چشم پوشی کرو تو یہ مداہنت ہے۔

اور ان میں سے ایک چیز لغزشوں کو معاف کر دینا بھی ہے۔ اگر اس کی لغزش دین میں ہو تو اس کی خیر خواہی یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے نرمی سے وعظ و نصیحت کو نہ چھوڑے۔ اور اگر وہ روش نہ بدلے تو تعلقات ختم کرے۔

پانچواں حق یہ ہے کہ جو دعا تم اپنے لیے کرو وہ اپنے بھائی کے لیے بھی کرو۔ خواہ وہ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو۔

مسلم کے افراد میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان کی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لیے دعائے خیر کرتا ہے، تو مقررہ فرشتہ کہتا ہے آمین اور تیرے لیے بھی اسی طرح ہو"

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اپنے بھائیوں میں سے بے شمار لوگوں کے نام لے کر ان کے لیے دعا کرتے اور امام احمد بن حنبلؒ سحر کے وقت چھ آدمیوں کے لیے دعا کیا کرتے۔ موت کے بعد کی دعا کے متعلق عمروؒ بن حریث نے کہا "جب بندہ اپنے مردہ بھائی کے لیے دعا کرتا ہے، تو فرشتہ اس کی قبر پر اس کو لاتا ہے اور کہتا ہے، اے قبر والے پردیسی بندے، یہ تیرے ایک بھائی کا تحفہ ہے جو تجھ پر بڑا مہربان ہے"۔

چھٹا حق وفا اور اخلاص ہے۔ وفا کا معنیٰ ہے موت تک محبت پر قائم رہنا اور بھائی کی موت کے بعد اس کی اولاد اور اس کے دوستوں سے محبت رکھنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑھیا کی عزت افزائی کی اور فرمایا: "یہ خدیجہؓ کے وقت ہمارے پاس آیا کرتی تھی"۔

عہد کو اچھی طرح نباہنا ایمان کا حصہ ہے۔ اور وفا سے یہ بھی ہے کہ تواضع میں اپنے بھائی کے لیے تبدیل نہ ہو، اگرچہ اس کا مرتبہ بلند ہو جائے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وفا میں سے نہیں ہے کہ بھائی کی موافقت میں دین کی مخالفت کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے محمد بن حکم کو اپنا بھائی بنا رکھا تھا۔ وہ آپ کے پاس آتا اور آپ کے قریب رہتا۔ جب امام صاحب کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ سے پوچھا گیا: "اے عبداللہ، آپ کے بعد ہم کس کی مجلس میں بیٹھا کریں؟" تو محمد بن حکم نے جھانکا اور وہ آپ کے سر کے پاس کھڑا تھا تاکہ آپ اس کی طرف اشارہ کریں، لیکن آپ نے فرمایا: "ابو یعقوب بویطی کے پاس بیٹھنا" یہ سن کر محمد آپ سے الگ ہو گیا، حالانکہ اس نے امام شافعیؒ کا مذہب

اختیار کر لیا تھا، لیکن چونکہ بویطی زہد اور پرہیز گاری میں زیادہ قریب تھا اس لیے امام شافعی رحمۃ اللہ نے مسلمانوں کی خیر خواہی کی اور مداہنت کو چھوڑ دیا۔ ابن عبدالحکم آپ کے مذہب سے پلٹ گیا اور امام مالکؒ کے ساتھیوں میں سے ہو گیا، لیکن اندازہ ہونے کے باوجود آپ نے اس کی پروا نہ کی۔

اور وفا سے یہ بھی ہے کہ دوست کے متعلق لوگوں کی باتیں نہ سنے اور نہ اپنے دوست کے دشمن کو دوست بنائے۔

ساتواں حق تخفیف اور ترک تکلف و تکلیف ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کو ایسی تکلیف نہ دے جو اس پر شاق ہو۔ اپنے کام اور اپنی حاجت کے سلسلے میں اسے تکلیف نہ دے اور اس کے مال اور مرتبہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور نہ اپنی خبر گیری اور اپنے حقوق کی ادائیگی اور اپنے لیے تواضع کی اُسے تکلیف دے، بلکہ اس کا قصد صرف اللہ کی محبت۔ اُس کی دُعا سے برکت حاصل کرنے۔ ملاقات سے انس کے حصول۔ اس کے حقوق کی ادائیگی کا خیال اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اور پوری تخفیف یہ ہے کہ رکھ رکھاؤ کی بساط کو اس طرح لپیٹ دے کہ جس چیز کے کرنے سے اکیلے نہیں شرماتا اس کی موجودگی میں بھی نہ شرمائے۔

حضرت جعفرؒ بن محمد نے کہا: "میرے لیے سب سے زیادہ بوجھل میرے وہ بھائی ہیں جو میرے لیے تکلف کرتے ہیں اور میں ان سے رکھ رکھاؤ کرتا ہوں۔ اور میرے دل پر سب سے ہلکے وہ ہیں جن کے ساتھ میں ایسا ہوتا ہوں جیسا اکیلا ہوتا ہوں۔"

بعض حکماء نے کہا جہاں تکلف نہ ہو وہاں محبت ہمیشہ رہتی ہے اور اس معاملے کی تکمیل یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو اپنے سے بڑا سمجھو اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ خادم کی حیثیت میں خیال کرو۔

حُسنِ معاشرت

چاہیے کہ ہم اس باب کے آخر میں لوگوں کے ساتھ معاشرت کے آداب بھی کچھ بیان کر دیں، تو اچھی معاشرت میں سے یہ بھی ہے کہ تکبر کے بغیر وقار سے رہا جائے۔ ذلت کے بغیر تواضع اختیار کرو اور دوست دشمن کو خندہ پیشانی سے ملو جس میں نہ دشمن کا خوف ہو نہ دوست سے توقع۔ مجلس میں انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے یا ناک میں انگلی داخل کرنے اور زیادہ تھوکنے اور انگڑائیاں لینے سے پرہیز کرو۔

جو آدمی تجھ سے بات کرے، اُس کی بات غور سے سُن، اسے دوبارہ بیان کرنے کے لیے نہ کہہ اور اپنے بچے اور اپنی لونڈی کے ساتھ اپنی محبت لوگوں کو نہ جتا۔ عورتوں کی طرح زینت میں مبالغہ نہ کر اور نہ غلاموں کی طرح

اپنے نفس کو پست کرے۔ اپنے گھر والوں کو سختی کے بغیر ڈرا اور کمزوری کے بغیر ان کے لیے نرم ہو اور اپنی لونڈی اور اپنے غلام سے مذاق نہ کر کہ تیرا وقار ختم ہو جائے گا۔ راستہ چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کر۔ اور بادشاہ کی ہم نشینی اختیار نہ کر، اگر ہم نشین ہو تو گناہ اور غیبت سے اجتناب کر اور اس کے راز کو محفوظ رکھ۔ بادشاہ کے سامنے مذاق نہ کر اور اس کی موجودگی میں ڈکار نہ لے، نہ دانتوں میں خلال کر۔ اگر وہ تجھے اپنے قریب کرے تو اس سے بچاؤ کرتا رہ۔ اگر وہ تجھے بلانے کے لیے آدمی بھیجے تو اس کی طبیعت کے انقلاب سے بے خوف نہ رہ۔ اُس سے بچوں جیسی نرمی کر اور اُس کی پسند کی بات کر اور اس کے اور اُس کے گھر والوں کے درمیان مداخلت سے بچ۔ اپنے مال کو اپنی عزت سے اچھا نہ سمجھو جب تم کسی مجلس میں جاؤ تو تواضع کی حالت میں بیٹھو۔ رستے پر نہ بیٹھو۔ نگاہ نیچی رکھو۔ مظلوم کی مدد کرو۔ راہ بھولے کو راہ بتاؤ۔ قبلے کی طرف منہ کر کے نہ تھوکو اور نہ اپنی دائیں جانب بلکہ اپنے بائیں یا بائیں قدم کے نیچے۔ اور عوام میں نہ بیٹھا کرو اور اگر بیٹھو تو پھر ان کی بداخلاقیوں سے غافل نہ رہو۔ ان کی باتوں میں دخل نہ دو۔ زیادہ مذاق کرنے سے پرہیز کرو، کیونکہ عقلمند مذاق سے ناراض ہو گا اور بے وقوف تم پر دلیر ہو جائے گا۔

فصل ہفتم

قرابتداری اور ہمسائیگی کے حقوق

مسلمان کا حق یہ ہے کہ جب ملو تو سلام کہو۔ جب بلائے تو جاؤ اور وہ چھینک مارے تو جواب دو۔ وہ بیمار ہو تو اُس کی عیادت کرو۔ مر جائے تو اُس کے جنازے میں جاؤ۔ اُس کی قسم کو پورا کرو۔ جب تم سے خیر خواہی چاہے تو خیر خواہی کرو۔ غائبانہ طور پر اُس کی حفاظت کرو اور اُس کے لیے وہ کچھ پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو اُس کے لیے بھی ناپسند کرو۔

یہ تمام باتیں احادیث میں ہیں۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کو اپنے قول اور فعل سے تکلیف نہ دو۔ اور مسلمانوں کے لیے متواضع رہو۔ متکبر نہ بنو اور بعض کے متعلق بعض کی باتیں نہ سنو۔ اگر کوئی بات کان میں پڑ جائے تو دوسروں تک نہ پہنچاؤ۔

اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ اگر جھگڑا ہو تو تین دن سے زیادہ مسلمان سے قطع تعلق نہ کرے، کیونکہ اس میں مشہور حدیث ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے مومن بھائی سے قطع تعلق کرے۔ جب تین دن گزر جائیں تو اس سے ملے اور اس پر سلام کہے۔ اگر وہ سلام کا جواب دے تو دونوں اجر میں شریک ہو گئے اور اگر اس نے جواب نہ دیا تو سلام کرنے والا قطع تعلق کے گناہ سے بچ جائے گا۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ قطع تعلق کا یہ مسئلہ دنیاوی امور میں ہے۔ اگر دین کا حق ہو تو اہلِ بدعت اور خواہش پرست اور معصیت کے رسیا سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرے، جب تک کہ وہ حق کی طرف رجوع نہ کریں یا توبہ نہ کریں۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ جس سے بھی اچھا سلوک کر سکتا ہو اپنی ہمت کے مطابق اچھا سلوک کرے۔ کسی کے گھر اُس کی اجازت کے بغیر نہ جائے۔ دروازے پر رک کر تین دفعہ اجازت مانگے۔ اگر اجازت نہ ملے تو

واپس آجائے۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آئے اور یہ اس طرح ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اُس کے شایانِ شان طریقہ کے مطابق معاملہ کرے۔ جاہل سے علم کی، کھلنڈرے سے فقہ کی اور کُند ذہن سے علم بیان کی باتیں کرے گا تو خود بھی تکلیف پائے گا اور اُن کو بھی تکلیف دے گا۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ بڑوں کی عزت کرے اور بچوں پر شفقت اور تمام لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی اور نرم دلی سے پیش آئے۔ اُن سے کیے ہوئے وعدے پورے کرے اور اپنی طرف سے لوگوں سے انصاف کرے۔ اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کرے جو سلوک کرنا ضروری ہو۔

حضرت حسنؓ نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرف چار باتوں کی وحی کی اور فرمایا ان میں سے ایک میرے لیے اور ایک تیرے لیے اور ایک تیرے اور میرے درمیان اور ایک تیرے اور مخلوق کے درمیان ہے۔

میرے لیے یہ ہے کہ تو میری عبادت کر اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا۔

تیرے لیے یہ ہے کہ میں تیرے اعمال کا بدلہ تجھے اس وقت دوں گا جب تجھے اس کی بڑی ضرورت ہوگی۔

اور جو تیرے اور میرے درمیان ہے وہ تیری دعا ہے۔ تو دعا کر میں قبول کروں گا۔

اور جو تیرے اور لوگوں کے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ تو ان کے ساتھ اس طرح رہ جیسا کہ تو چاہتا ہے کہ وہ تیرے ساتھ رہیں۔

اور اس سے یہ بھی ہے کہ باوقار لوگوں کی زیادہ عزت کرے۔ باہمی تعلقات کی اصلاح کرے اور مسلمانوں کی پردہ پوشی کرتا رہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جو آدمی دنیا میں گناہگاروں کی پردہ پوشی کرے گا وہ اللہ کی منشا پوری کرے گا کہ اُس نے زنا میں چار عادل آدمیوں کی گواہی رکھی ہے، جو یہ گواہی دیں کہ اُنھوں نے اس طرح دیکھا ہے جیسے سُرمہ دانی میں سُرمچو۔ اور ایسا اتفاق نہیں ہوتا۔ اور دنیا میں اس کے کرم ہی کا یہ اثر ہے کہ آخرت میں بھی بخشش کی اُمید رکھی جا سکتی ہے۔

اور اُس میں سے یہ بھی ہے کہ تہمت کی جگہوں سے بچے، نہ لوگوں کے دلوں کو بدظنی اور اُن کی زبانوں کو غیبت سے بچائے۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کو بھی سفارش کی ضرورت ہو اُس کی سفارش کرے اور ان کی حاجت

پوری کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

اور اس سے یہ بھی ہے کہ ہر مسلمان کو کلام کرنے سے پہلے سلام کہے۔ مصافحہ کرنا بھی سنت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دو مسلمان آدمی ملاقات کریں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اُن کی دعا قبول کرے اور ہاتھ الگ کرنے سے پہلے ان کو بخش دے"

ایک اور حدیث میں ہے "جب مومن مومن سے مصافحہ کرتا ہے تو سو درجے رحمت نازل ہوتی ہے اور اُس میں سے ننانوے درجے اسے ملتی ہے جو زیادہ خندہ رُو اور اچھے خُلق والا ہو"

بزرگ عالم دین کے ہاتھوں کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں اور نہ گلے ملنے میں کوئی حرج ہے اور علماء کی تعظیم کے لیے ان کی رکاب کو تھامنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُنھوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رکاب تھامی۔ اسی طرح اہلِ فضل کی عزّت افزائی کے لیے اُٹھ کر کھڑا ہو جانا اچھا ہے، البتّہ جُھکنا منع ہے۔

اور اس سے یہ بھی ہے کہ مسلمان بھائی کی عزت، مال اور جان کو دوسروں کے ظلم سے بچائے اور اُس کی حمایت اور مدد کرتا رہے۔

اور یہ بھی ہے کہ جب کسی متکبّر سے واسطہ پڑے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق اُس سے بھی اچھا سلوک کرے، البتہ اس کے شر سے بچتا رہے۔

محمدؒ بن حنفیہ نے کہا: "وہ آدمی عقلمند نہیں جو ایسے آدمی سے بھلا سلوک نہ کرے جس کے ساتھ رہنا لازمی ہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی کشادگی پیدا کر دے"۔

اور یہ بھی ہے کہ امیروں کے ساتھ رہنے سے پرہیز کرے۔ زیادہ تر مسکینوں کے ساتھ رہے اور یتیموں سے اچھا سلوک کرے۔ جو بیمار ہوں اُن کی بیمار پُرسی کرے۔ بیمار پُرسی کے آداب یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ مریض پر رکھے اور اس سے پوچھے تمھارا کیا حال ہے؟ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھے۔ نرمی کا اظہار کرے۔ اس کے لیے تندرستی کی دعا کرے اور مکان میں رکھی ہوئی چیزوں کو نہ دیکھے، نگاہ نیچی رکھے۔

اور مریض کے لیے مستحب ہے کہ دعا اور اللہ کے کلام سے فائدہ اُٹھائے۔ حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ جب سے مسلمان ہوا ہوں جسم میں درد کی تکلیف ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جہاں تیرے جسم میں درد

ہے وہاں ہاتھ رکھا اور بسم اللہ تین مرتبہ اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھا اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ (میں ہر اُس چیز کی برائی سے جسے میں پاتا ہوں اور جس کا مجھے خوف ہے اللہ تعالیٰ کی عزت اور قدرت کی پناہ لیتا ہوں)

مریض کے لیے ضروری ہے کہ اچھی طرح صبر کرے۔ خدا کا شکوہ شکایت نہ کرے۔ دُعا خشوع سے کرے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے۔

اور یہ بھی ہے کہ مسلمان کے جنازہ کے ساتھ جائے اور قبروں کی زیارت کرے۔ جنازے کے ساتھ جانے کا مقصد مسلمانوں کا حق پورا کرنا اور عبرت حاصل کرنا ہے۔ حضرت اعمش رضؓ نے کہا: "ہم جنازہ میں حاضر ہوتے تو ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ کس سے تعزیت کریں۔ کیونکہ سب ہی لوگ سوگوار ہوتے۔" اور قبروں کی زیارت کا مقصد دُعا اور عبرت اور دل کا نرم کرنا ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے کے آداب یہ ہیں کہ پیدل چلے۔ پُرخشوع ہو۔ خاموش رہے۔ میّت کو دیکھتا جائے۔ موت کے متعلق سوچے اور اس کی تیاری کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ہمسائیگی اخوّتِ اسلامی کا تقاضا پورا کرنے کے علاوہ اور حقوق کا بھی مطالبہ کرتی ہے، یعنی ہمسایہ اسلام کے سارے حقوق کے علاوہ اور بھی کچھ حق رکھتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہمسائے تین ہیں۔ ایک جس کا ایک حق ہے اور ایک وہ جس کے دو حق ہیں اور ایک وہ جس کے تین حق ہیں۔ جس کے تین حق ہیں وہ مسلمان قرابتدار ہمسایہ ہے۔ اُس کے لیے ایک حق ہمسائیگی کا ہے۔ ایک اسلام کا اور ایک حق قرابت کا۔ اور وہ جس کے دو حق ہیں۔ یہ مسلمان ہمسایہ ہے جس کا ایک حق اسلام کا ہے اور ایک ہمسائیگی کا۔ اور جس کا صرف ایک حق ہے وہ مشرک ہمسایہ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ہمسائے کا حق صرف یہی نہیں کہ اُس کو تکلیف نہ دی جائے، بلکہ اُس کی طرف سے دی گئی ایذا کو برداشت کرنا۔ اُس سے نرمی کرنا۔ بھلائی میں ابتدا کرنا اور پہلے سلام کرنا بھی ہے۔ ہاں اُس سے طویل گفتگو نہ کرے۔ بیماری میں اُس کی عیادت کرے۔ مصیبت میں اُس کو صبر کی تلقین اور خوشی میں اس کو مبارکباد کہے۔ نیز اُس کی لغزشوں سے درگزر کرے۔ اُس کے گھر میں نہ جھانکے۔ اپنی دیوار پر اُس کے شہتیر رکھنے سے نہ روکے۔ اپنے پرنالے میں اُس کا پانی بہنے سے ناراض نہ ہو اور کبھی صحن میں مٹی یا کوڑا گر جائے تو ناراض نہ ہو اور جو چیز وہ گھر میں لے جائے اُس کو دیکھتا نہ رہے۔ اس کی کوئی بری بات معلوم ہو تو اس پر پردہ ڈال دے اور اُس کی گفتگو سننے کی کوشش نہ کرے۔ اُس کی بیوی کو نہ دیکھے اور جب ہمسایہ کہیں جائے تو اُس کے گھر والوں کی ضروریات کا خیال رکھے۔

فصل ہشتم

ذوی الارحام کے حقوق

اقارب اور رحم کے حقوق کے متعلق صحیح حدیث میں تاکید آئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رحم عرش سے چمٹا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ جو مجھ سے تعلق جوڑے گا اللہ اس سے تعلق جوڑے گا اور جو مجھ سے تعلق منقطع کرے گا اللہ اس سے تعلق منقطع کرے گا۔"

صحیح بخاری کے افراد میں ایک اور حدیث ہے کہ "بدلہ دینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی قرابت کا خیال نہ رکھا جائے تو بھی صلہ رحمی کرے۔"

مسلم کے افراد میں ایک اور حدیث ہے کہ ایک آدمی نے کہا: "اے اللہ کے رسول، میرے قرابتدار ہیں۔ میں اُن سے جوڑتا ہوں لیکن وہ کٹے رہتے ہیں۔ میں اُن سے اچھا سلوک کرتا ہوں، لیکن وہ مجھ سے بُرا سلوک کرتے ہیں۔ میں اُن کی بات پر صبر کرتا ہوں، لیکن وہ مجھ سے جہالت سے پیش آتے ہیں" تو آپ نے فرمایا: "اگر ایسا ہے جیسا تو کہتا ہے، تو گویا تو اُن کے منہ پر راکھ چھڑکتا ہے اور جب تک تو ایسا ہی سلوک کرتا رہے گا تیرے لیے اللہ کی طرف سے اُن کے مقابلہ میں ایک مددگار رہو گا۔" مطلب یہ کہ تو اُن پر غالب رہے گا اور قرابت کے حقوق پورے کرنے پر ان کی حجت ختم ہو جائے گی جیسے کہ اُس آدمی کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے جس کے منہ پر گرم راکھ چھڑک دی جائے۔

صلہ رحمی اور ماں باپ کے حقوق کی تاکید کے متعلق بہت سی حدیثیں ہیں۔

اولاد کے حقوق: معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کی طبیعت اپنے بچے کی طرف خود بخود مائل ہوتی ہے۔ اس کی تاکید کی ضرورت نہیں۔ ہاں کبھی بچے کی محبت باپ پر غالب آتی ہے، تو وہ اُس کی تعلیم و تادیب چھوڑ دیتا ہے۔ یہ چیز فرمانِ الٰہی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُوٓا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا[1] (اپنے کو

---

[1] سورہ تحریم۔ آیت: ۶

کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ)

مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اُن کو علم و ادب سکھاؤ۔

باپ کو چاہیے کہ اپنے بیٹے کا نام اچھا رکھے اور اس کی طرف سے عقیقہ کرے۔ جب وہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز کا حکم دے اور اُس کا ختنہ کرے اور جب بالغ ہو جائے تو اُس کا نکاح کرے۔

غلام کے حق یہ ہیں کہ اُس کو کھلائے۔ پہنائے۔ طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے۔ اُسے حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ اُس کی لغزشوں سے درگزر کرے۔ اگر اُس سے کوئی خطا ہو جائے تو اپنی لغزشیں یاد کرے اور اُمید رکھے کہ شاید اللہ مجھے بھی معاف کر دے۔

تنہائی اور گوشہ نشینی

لوگوں کا عزلت (تنہائی) اور میل جول (مخالطت) میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون افضل ہے۔ ان دونوں میں کچھ فائدے بھی ہیں اور کچھ نقصانات بھی، تاہم اکثر زاہدوں نے تنہائی کو پسند کیا ہے۔ جو عزلت کو پسند کرتے ہیں اُن میں سفیانؒ ثوری، ابراہیمؒ بن ادہم، داؤد طائیؒ ۔ فضیلؒ اور بشر حافیؒ وغیرہ بھی ہیں۔

جو مخالطت (میل جول) کو پسند کرتے ہیں اُن میں سعید بن مسیبؒ، شریحؒ، شعبیؒ اور ابنِ مبارکؒ وغیرہ شامل ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں دلائل ہیں۔ پہلے لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ صحیحین میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ پوچھا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ کونسا آدمی بہتر ہے؟ کہا وہ جو اپنے نفس اور مال سے جہاد کرتا ہے۔ اور جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا رہتا ہے اور لوگوں کو اپنی برائی سے بچاتا ہے۔"

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ نجات کس میں ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: "اپنی زبان کو بند رکھو اور اپنے گھر میں رہو اور اپنے گناہوں پر روؤ۔"

لہ جب ساتویں روز اس کی طرف سے عقیقہ کرے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔

عقیقہ: بچے کے پیدائشی بالوں کو کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "عزلت میں سے اپنا حصہ لو۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اور لوگوں کے درمیان ایک لوہے کا دروازہ ہو اور موت تک نہ میں کسی سے بولوں اور نہ کوئی مجھ سے بولے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "تم علم کے چشمے، رات کے چراغ، گھر کے ٹاٹ۔ نئے دلوں[1] والے اور پرانے کپڑوں والے بن جاؤ۔ تم آسمان والوں میں پہچانے جاؤ اور زمین والوں پر مخفی رہو۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "مسلمان کا بہترین عبادت خانہ اس کا اپنا گھر ہے۔ وہ اس کی زبان اور شرمگاہ اور آنکھوں کی حفاظت کرتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ بازار کی مجلسوں میں نہ بیٹھے کہ وہ انسان کو غافل اور ناکارہ کر دیتی ہیں۔"

حضرت داؤد طائی نے کہا: "لوگوں سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔"

حضرت ابو مہلہل نے کہا: "سفیان ثوریؒ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے جنگل کی طرف لے گئے۔ ہم ایک گوشے میں چلے گئے تو آپ رونے لگے پھر کہا: "اے مہلہل اگر تم ایسا کر سکو کہ زندگی بھر کسی سے نہ ملو تو ایسا کرو اور اپنی ہمّت کو اپنے سامان کی تیاری میں لگاؤ۔"

جو لوگوں میں رہنے کو پسند کرتے ہیں ان کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ "مومن جو لوگوں سے ملتا ہے اور ان کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔ وہ اس آدمی سے بہتر ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ اُن کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔" اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا[2] (اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق ہوئے اور مختلف ہوئے) یہاں یہ استدلال کمزور ہے، کیونکہ اس سے مراد آراء کا متفرق ہونا اور اصل شریعت میں مختلف مذاہب اختیار کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ: "تین دن سے زیادہ ہجرت نہیں ہے" وہ کہتے ہیں کہ عزلت پوری پوری ہجرت ہے۔ یہ استدلال بھی کمزور ہے کیونکہ اس سے مراد سلام اور کلام اور میل ملاپ کا قطع کرنا ہے۔

---

[1] نئے دل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دل کے ارادے نئے سے نئے اور ولولے تازہ سے تازہ ہوں۔

[2] سورۃ آل عمران - آیت: ۱۰۵

فصل نہم

گوشہ نشینی کے فوائد اور نقصانات کی وضاحت

معلوم ہونا چاہیے کہ عزلت میں لوگوں کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسا نکاح کرنے یا نہ کرنے کی فضیلت میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اشخاص اور اُن کے حالات کے اختلاف کی بنا پر اس کا حکم بدلتا ہے؛ چنانچہ پہلے ہم عزلت (گوشہ نشینی) کے فوائد بیان کرتے ہیں اور وہ چھ ہیں:

پہلا: عبادت کے لیے فارغ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی مناجات سے انس حاصل کرنا۔ یہ چیزیں فراغت چاہتی ہیں اور میل ملاپ میں فراغت نہیں ملتی۔ ہاں گوشہ نشینی اس کا ایک وسیلہ ہے خاص طور پر ابتداء میں۔

بعض بزرگوں سے پوچھا گیا کہ زہد اور خلوت سے اُنھیں کیا ملا؟ تو کہا: اللہ سے مانوس ہونا۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں نہیں جانتا کہ کوئی اپنے رب کو پہچانتا ہو اور پھر کسی اور چیز سے بھی اُنس رکھتا ہو"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جسے ہمیشہ کے ذکر سے اللہ کے ساتھ اُنس یا ہمیشہ کے فکر سے اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے تو اس کے لیے عزلت ہر اس چیز سے افضل ہے جو میل ملاپ میں حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا فائدہ: عزلت سے آدمی اُن گناہوں سے بچ جاتا ہے جنھیں عموماً مخالطت (میل جول) سے کرتا ہے اور وہ چار ہیں:

۱۔ غیبت، لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کی عزت کو چیلتے ہیں اور ان کی برائیاں بیان کر کے مزے لیتے ہیں۔ پھر اگر تو ان سے ملے اور ان کی موافقت کرے تو گنہگار ہوگا اور اللہ کی ناراضگی کا سامنا کرے گا۔ اور اگر خاموش رہے گا تب بھی ان کا شریک ہوگا کیونکہ سننے والا بھی غیبت کرنے والوں میں سے ایک ہوتا ہے! اور اگر تو اُن سے اختلاف کرے گا تو وہ تجھے بُرا سمجھیں گے اور تیری بھی غیبت کریں گے اور ان کی غیبت میں ایک اور غیبت کا اضافہ ہو جائے گا، بلکہ بسا اوقات گالی گلوچ تک پہنچیں گے۔

۲۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جو آدمی لوگوں سے میل ملاپ رکھے گا وہ لازماً منکرات کا مشاہدہ

کرے گا۔ پھر اگر خاموش رہے گا تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اگر انکار کرے گا تو کئی طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گوشہ نشینی میں ان سے حفاظت رہے گی۔

۳۔ یہ ریا ہے اور یہ ایک لاعلاج بیماری ہے جس سے بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ لوگوں کی مخالطت میں سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ بالعموم جھوٹ سے خالی نہیں ہوتا بعض اوقات شوقِ ملاقات ظاہر کرنے کے لیے پوچھا جاتا ہے کہ تُم نے کیسے صُبح کی یا شام کی ؟ سلف اس کا جواب دینے سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعض نے کہا جبکہ ان سے پوچھا گیا۔ آپ نے صبح کیسے کی ؟ تو کہا : ہم نے صبح کی کمزوری اور گناہ کی حالت میں۔ اپنی روزی کھا رہے ہیں اور موت کے منتظر ہیں"

معلوم ہونا چاہیے کہ جب سائل اپنے بھائی سے سوال کرتا ہے تم نے کیسے صبح کی ؟ تو اس پر اُسے شفقت اور محبت آمادہ نہیں کرتی ، بلکہ یہ الفاظ وہ محض تکلّف اور ریا سے کہتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس سوال کا محرّک کینہ اور عداوت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ چاہتا ہے کہ اُس کے حالات کا بگاڑ معلوم ہو۔ عزلت میں ایسی تمام باتوں سے خلاصی ہے۔ جو شخص لوگوں سے ملے اور اُن جیسے اخلاق نہ اپنائے تو وہ اُس سے ناراض ہوں گے۔ اُسے بوجھ سمجھیں گے۔ اُس کی غیبت کریں گے اور اس کی وجہ سے اُن کا دین برباد ہو گا اور خود اس کا دین اور دنیا اُن سے انتقام لینے میں برباد ہوں گے۔

یہ برائی کا اثر قبول کرنا ہے۔ طبیعت غیر محسوس طریقہ سے دوسروں کے اخلاق کو اپناتی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ عقلمند بھی شاذونادر ہی اس پر متنبہ ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی فاسق کے ساتھ ایک مدت تک اٹھے بیٹھے اور اُس کا اثر قبول نہ کرے۔ خواہ وہ محتاط رہے ، مگر جب وہ پہلے کی حالت سے موجودہ حالت کا مقابلہ کرے گا تو برائی سے نفرت کے جذبے میں بڑا فرق پائے گا۔ کیونکہ ہر وقت برائی کا مشاہدہ کرتے رہنے سے برائی کی کراہت کم ہو جاتی ہے۔ جب انسان دوسرے کے کبیرہ گناہوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اپنے صغیرہ گناہ حقیر معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ انسان جب سلف کی پرہیزگاری اور عبادت کے حالات ملاحظہ کرتا ہے تو اپنے نفس کو حقیر سمجھتا ہے اور اپنی عبادت کو معمولی جانتا ہے اور اس سے کوشش کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اس نکتہ سے قائل کے اس قول کا راز کھلتا ہے کہ "نیک لوگوں کا تذکرہ کرتے وقت رحمت نازل ہوتی ہے"۔

یہ بات کہ گناہ کے مسلسل مشاہدے سے اس کی کراہت کم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ نہیں رکھا تو بہت نفرت ظاہر کی جاتی ہے بلکہ اس کے کافر ہو جانے کا گمان کیا جاتا ہے لیکن نماز موخر کرنے یا ترک کرنے کو اتنا برا گناہ نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ ایک نماز کا چھوڑ دینا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ نماز سے غفلت اور سستی بالعموم دیکھی جاتی ہے اور اس بار بار کے مشاہدے سے گناہ کی شدّت کا احساس مر جاتا ہے۔

ایسے ہی اگر کوئی عالم ریشمی کپڑا یا سونے کی انگوٹھی پہن لے، تو لوگ اس پر سخت اعتراض کریں گے لیکن اسی عالم کو غیبت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسے کوئی اہمیّت نہیں دیتے، حالانکہ غیبت کرنا ریشم یا سونا پہننے سے بہت بڑا گناہ ہے، وجہ وہی ہے کہ غیبت کی کثرت کے باعث دلوں میں اس سے نفرت نہیں رہتی۔

ان باریک نکات کو سمجھو اور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرو کیونکہ تم ان میں زیادہ تر وہی چیزیں دیکھو گے جن سے تمھاری دنیا کی حرص بڑھے گی اور آخرت سے غفلت زیادہ ہو گی۔ بڑے گناہ بھی بے حقیقت معلوم ہونے لگیں گے اور عبادات کی رغبت کمزور ہو جائے گی۔ ہاں اگر تم کوئی ایسی مجلس پاؤ جس میں اللہ کا ذکر ہو تو اس سے الگ نہ رہنا کہ وہ مومن کے لیے غنیمت ہے۔

تیسرا فائدہ: یہ فتنوں اور جھگڑوں سے بچنا اور ان میں مشغول ہونے سے دین کو بچانا ہے۔ شاذو نادر ہی کوئی ایسا شہر ہو گا جس میں تعصب اور لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا ذکر کیا اور ان کو بیان کر کے فرمایا: جب تم لوگوں کو دیکھو کہ وہ عہد کی پروا نہیں کرتے اور امانت ختم ہو گئی ہے اور لوگ اس طرح ہو جائیں" آپؐ نے اپنی انگلیاں انگلیوں میں ڈالیں تو میں نے عرض کیا آپؐ اس صورتِ حالات میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "اپنے گھر بیٹھے رہو۔ اپنی زبان بند رکھو۔ اچھے کام کرتے جاؤ۔ برے چھوڑ دو۔ برے چھوڑ دو۔ خواص کا خیال رکھو اور عوام سے اجتناب کرو۔"

اسی مضمون کی اور بھی احادیث مروی ہیں۔

چوتھا فائدہ: لوگوں کی برائی سے بچنا ہے۔ وہ تجھے کبھی غیبت سے تکلیف دیں گے۔ کبھی چغلی سے۔ کبھی بدظنی سے۔ کبھی تہمت سے اور کبھی جھوٹا لالچ دینے سے۔ جو بھی لوگوں سے ملے جلے گا اس کے حاسد اور دشمن بھی ضرور ہوں گے۔ اس کے علاوہ دیگر تکلیفیں جو انسان کو انسانوں سے پہنچتی ہیں اسے پہنچیں گی۔ البتہ گوشہ نشینی میں آدمی

ان سب فتنوں سے بچا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا:

۱۔ تیرے دشمن دوستوں ہی سے پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا زیادہ دوست مت بنا۔

۲۔ اکثر بیماریاں جو تم دیکھتے ہو وہ کھانے پینے سے پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "گوشہ نشینی میں برے ساتھیوں سے نجات ہے"۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے کہا: "جس کو تو نہیں جانتا اس کو جاننے کی کوشش نہ کر اور جسے جانتا ہے اس سے انجان ہو جا"۔

ایک آدمی نے اپنے بھائی سے کہا: "کیا میں حج تک آپ کے ساتھ رہوں؟" تو اس نے کہا: "ہمیں چھوڑ دو کہ ہم اللہ کی پناہ میں رہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کوئی ایسی چیز دیکھیں کہ اس پر ناراض ہو جائیں"۔

عزلت کا ایک اور فائدہ ہے اور وہ ہے دین اور مروّت اور ستر کی ساری چیزوں کا چھپا رہنا۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کی امیدیں تجھ سے اور تیری ان سے منقطع ہو جائیں گی۔ باقی رہیں ان کی امیدیں، تو ان کی رضا مندی ایک ایسی بات ہے جس تک پہنچنا مشکل ہے۔ جو ان سے الگ ہو گیا اس نے ان کے شادی بیاہ اور ولیموں وغیرہ میں شامل ہونے کی امیدوں کو منقطع کر دیا۔ کہا گیا ہے۔ جس نے سب کو محروم کیا اس سے سب خوش رہے۔

جس آدمی نے دنیا کی زینت اور ترو تازگی کو دیکھا اس کی حرص میں حرکت پیدا ہو گی اور حرص کی قوت سے امید اور لالچ پیدا ہو گا اور زیادہ امیدوں کی ناکامی دیکھ کر وہ تکلیف میں مبتلا ہو گا۔

حدیث میں ہے: "اپنے سے نیچے کو دیکھو اور اپنے سے اوپر کو نہ دیکھو کہ اس سے تم اللہ کی نعمت کو اپنے لیے حقیر نہ سمجھو گے"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾[1]۔

(اور ہم نے جو ان کو طرح طرح کی دنیا کی زندگی کی زینت دی ہے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو)۔

چھٹا فائدہ: یہ ثقیل الطبع اور بے وقوفوں کے مشاہدہ اور ان کے برے اخلاق کو برداشت کرنے سے نجات پانا ہے۔ جب آدمی ثقیل الطبع سے تکلیف اٹھاتا ہے تو لازماً اس کی غیبت بھی کرتا ہے۔ پھر اگر وہ اس کی مذمت کرے اور اس کا بدلہ لے تو معاملہ دین کے فساد اور بگاڑ تک پہنچ گیا۔ عزلت میں اس سے سلامتی ہے۔

---

[1] سورۃ طٰہٰ۔ آیت: ۱۳۱

فصل دہم

عُزلت کے نقصانات

معلوم ہونا چاہیے کہ بعض دینی اور دنیاوی مقاصد ایسے ہیں جو دوسروں کی مدد کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے اور ان کے حاصل ہونے کی صورت صرف مخالطت ہے۔ اور مخالطت کے فوائد یہ ہیں:

علم سیکھنا اور سکھانا۔ نفع دینا اور نفع حاصل کرنا۔ ادب سکھانا اور سیکھنا۔ انس حاصل کرنا اور مانوس کرنا۔ حقوق پورا کرنے میں ثواب کا حاصل ہونا اور تواضع کی عادت اختیار کرنا۔ مشاہدے سے تجربات کا فائدہ اٹھانا۔ اور اُن سے عبرت حاصل کرنا وغیرہ۔ یہ مخالطت کے عام فوائد ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

پہلا فائدہ: علم سیکھنا اور سکھانا۔ کتاب العلم میں ہم ان کی فضیلت بیان کر چکے ہیں۔ جس نے معلوم کیا کہ دوسرے علوم میں مشغول ہونا اس کے بس میں نہیں، اور وہ عبادت میں مشغول ہونا چاہیے تو عزلت اختیار کرے، لیکن اگر علوم شرع میں آگے بڑھ سکتا ہو تو علم حاصل کرنے سے پہلے عزلت اختیار کرنا اُس کے حق میں انتہائی نقصان دہ ہے۔

حضرت ربیعؒ بن خثیم نے کہا "پہلے علم حاصل کر، پھر عزلت اختیار کرنے کی بابت سوچ۔ علم دین کی بنیاد ہے۔ عوام کے لیے عزلت میں کوئی بھلائی نہیں۔

بعض علماء سے سوال کیا گیا: "جاہل کی عزلت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" تو کہا: "تباہی اور وبال۔" پھر پوچھا گیا: "عالم کی عزلت کیسی ہے؟" تو کہا "تمھیں اُس سے کیا تعلق۔ اُس کو چھوڑ دو۔ اُس کے پاس اس کے جوتے اور مشکیزہ ہیں وہ پانی پر جائے گا اور درخت کھائے گا یہاں تک کہ اُس کا مالک اُسے پا لے گا۔"[1]

---

[1] عالم کی عزلت کو اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اُس کے پاس اُس کے جوتے اور پانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اونٹ چلنے اور سفر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ پانی کے گھاٹ پر جا کر پانی پیئے گا اور درختوں کے پتے کھائے گا اور درندہ جانوروں سے اپنی حفاظت کرے گا۔ یہی عالم کی عزلت کا حال ہے کہ وہ شیطان اور نفس آمارہ سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ ایک نسخے میں "غذا اور پانی" کے الفاظ ہیں۔

علم سکھانا: اگر اس میں نیت صحیح ہو تو یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔ لیکن اگر جاہ حاصل کرنا اور تابعداروں کی کثرت مقصود ہو تو یہ کام ہلاکت ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر یہی مقصد ہوتا ہے؛ چنانچہ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اُن سے الگ رہا جائے۔ ہاں کوئی اللہ کا طالب ہو اور علم کے ساتھ اللہ کا تقرب حاصل کرنا چاہے تو اس سے الگ رہنا جائز نہیں اور نہ اُس سے علم کو چھپانا مناسب ہے۔ اُس آدمی کے قول سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جس نے کہا "ہم نے غیر اللہ کے لیے علم حاصل کیا، لیکن علم نے غیر اللہ کے لیے ہونے سے انکار کر دیا" اُس شخص نے دراصل علوم قرآن وحدیث اور سیرت انبیاء وصحابہ کی طرف اشارہ کیا اور ان علوم میں ڈرانا اور تنبیہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اگرچہ وہ فوری طور پر اثر نہ کریں۔ لیکن بالآخر ضرور اثر کریں گے۔

باقی رہے علم کلام اور علم اختلاف تو یہ علوم دنیا کے طالب کو اللہ کی طرف نہیں آنے دیتے، بلکہ ان علوم کا جاننے والا آخر عمر تک حرص میں بڑھتا ہی جاتا ہے۔

دوسرا فائدہ نفع دینا اور نفع لینا ہے۔ لوگوں سے نفع حاصل کرنا تو کسب اور معاملے سے ہوتا ہے اور جو اس کا محتاج ہے وہ عزلت کو ترک کرنے پر مجبور ہے۔ ہاں اگر اس کے پاس اتنا کچھ ہو کہ بآسانی گزارہ ہو سکے تو اس کے لیے عزلت افضل ہے، مگر یہ کہ اپنی کمائی سے صدقہ کرنے کا ارادہ کرے تو یہ عزلت سے بہتر ہے۔

نفع پہنچانا تو یہ ہے کہ اپنے مال یا جسم کے قوتوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ جو آدمی شریعت کی حدود کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس پر قادر ہو تو اس کے لیے یہ عزلت سے بہتر ہے اور اگر وہ ان لوگوں سے ہو جن پر دائمی ذکر و فکر سے دل کے عمل کی راہ کھل چکی ہے تو ایسے آدمی کی برابری کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تیسرا فائدہ ادب سکھانا اور ادب سیکھنا ہے اور اس سے ہمارا مطلب ہے کہ لوگوں کی سختیوں سے تربیت حاصل کرنا اور ان کی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی کوشش کرنا۔ نفس کو دبانا اور شہوت پر غالب آنا اُس آدمی کے حق میں عزلت سے بہتر ہے جس کے اخلاق ابھی مہذب نہ ہوئے ہوں۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ریاضت مقصود بالذات نہیں۔ جیسا کہ چوپائے کی ریاضت مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اسے سواری کے قابل بنایا جائے۔ بدن بھی ایک سواری ہے جس پر آخرت کی راہ طے کی جاتی ہے اور اس میں خواہشات بھی ہیں۔ اگر ان کو نہ توڑا جائے گا تو راستے میں سوار کے قابو میں نہیں آئے گا۔

جو آدمی ساری زندگی ریاضت ہی میں مشغول رہے وہ ایسا ہے جیسے گھوڑے کو ساری عمر سکھاتا رہے

اور اس پر سوار نہ ہو۔ اس سے اتنا فائدہ تو ہو گا کہ اس کے کاٹنے اور اس کی دولتیوں سے بچا رہے گا اور یہ بھی ایک قسم کا فائدہ ضرور ہے، لیکن بڑا اور اصلی مقصود یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک راہب سے کہا گیا: "اے راہب!" تو اس نے کہا: "میں راہب نہیں ہوں۔ میں تو کاٹنے والا کتا ہوں۔ میں نے اپنے نفس کو باندھ رکھا ہے۔ کہ لوگوں کو نہ کاٹوں" اور کاٹنے والے کی بہ نسبت یہ بھی ایک خوبی ہے، لیکن اسی پر معاملہ ختم نہ ہو جانا چاہیے۔

تادیب یہ ہے کہ دوسرے کو ادب سکھائے اور یہ بھی کچھ آسان کام نہیں۔ غیر محسوس طور پر نفسیاتی خواہشات کی دخل اندازی ہوتی ہے۔ پس لازم ہے اپنے قلب کی نگرانی کرتا رہے۔ جیسے کہ اس باب میں پہلے بیان کیا گیا۔

چوتھا فائدہ اُنس حاصل کرنا یا مانوس کرنا ہے اور کبھی یہ مستحب ہوتا ہے، جیسا کہ پرہیزگار لوگوں سے انس۔ اور کبھی اس کا مقصد تنہائی کی مصیبت سے دل کو آرام دینا ہوتا ہے۔ اگر مقصد انس ہے تو چاہیے کہ ایسے لوگوں کے پاس بیٹھے جو اس کے کام کو خراب نہ کریں اور کوشش کرے کہ جب ان سے ملاقات ہو تو امورِ دین کے متعلق گفتگو کی جائے۔

پانچواں فائدہ ثواب حاصل کرنا یا ثواب دینا ہے۔ اور ثواب حاصل کرنا اس طرح ہے کہ جنازے میں شرکت کرے۔ بیمار کی عیادت کے لیے جائے۔ بیاہ شادی کی تقاریب اور دعوتِ طعام میں شامل ہو۔ ان کاموں میں اس لیے ثواب ہے کہ ان سے مومن کا دل خوش ہوتا ہے۔

ثواب دینا اس طرح ہے کہ اپنا دروازہ لوگوں کے لیے کھول دے کہ وہ آکر اس سے تعزیت کریں یا اس کو مبارکباد دیں یا اس کی بیمار پرسی کریں کہ وہ اس کی وجہ سے ثواب حاصل کریں گے۔ اگر وہ طبقۂ علماء سے ہے، تو لوگوں کو اپنی زیارت کرنے کی اجازت دے، لیکن چاہیے کہ اس میل جول کے نفع اور نقصان کا موازنہ کرتا رہے اور اس کے مطابق گوشہ نشینی یا میل ملاپ کو ترجیح دے۔ اکثر سلف عزلت کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

چھٹا فائدہ تواضع ہے۔ ظاہر ہے تنہائی میں آدمی تواضع نہیں کر سکتا، بلکہ بعض اوقات عزلت کے اختیار کرنے کا سبب تکبر بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محفلوں میں اس کی عزت و تعظیم کم ہو جاتی ہے لہٰذا وہ ان میں شامل نہیں ہوتا۔ نیز بعض دفعہ وہ لوگوں سے اس لیے نہیں ملتا کہ اپنے آپ کو عوام سے بلند مرتبہ سمجھتا ہے، اسی طرح کی اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔

جس شخص میں یہ اخلاقی کمزوری ہو اس کی علامت یہ ہے کہ وہ پسند کرے گا کہ لوگ آکر اس کی زیارت کریں لیکن

خود دوسروں کی زیارت کے لیے نہ جائے گا۔ ہاں بادشاہوں اور امراء کے ہاتھوں کو بوسہ دینا پسند کرے گا۔ حالت یہ ہو تو عزلت اختیار کرنا جہالت ہے۔ کیونکہ تواضع آدمی کے منصب کو کم نہیں کرتی۔

جب تجھے عزلت کے فوائد اور نقصانات معلوم ہو گئے اور تجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ عزلت کی نفی یا اثبات پر مطلقاً افضلیت کا حکم لگانا غلط ہے تو کسی شخص کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے اس بات پر ضرور غور کر کہ اس نے عزلت یا مخالطت کیوں اختیار کی ہے اور اسے کیا نقصان یا نفع حاصل ہو رہا ہے۔ اسی صورت میں تجھ پر حق کھلے گا۔

امام شافعیؒ رحمۃ اللہ نے کہا: "لوگوں سے دل تنگ ہونا عداوت پیدا کرتا ہے۔ اور ان سے خوش رہنا برائی لاتا ہے۔ تو تم بسط اور قبض کے درمیان رہو" جس نے اس کے سوا ذکر کیا ہے وہ کوتاہ فہم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ امام شافعیؒ نے صرف اپنا حال بیان کیا ہے۔ اگر کسی کے حالات اس کے مخالف ہیں، تو اس پر یہ حکم لگانا جائز نہیں۔

اگر کہا جائے کہ عزلت کے آداب کیا ہیں؟ تو ہم کہتے ہیں کہ عزلت اختیار کرنے والے کو چاہیے یہ نیت کرے کہ لوگوں کو تکلیف نہ پہنچائے گا۔ خود بُرے لوگوں کی برائی سے محفوظ رہے گا اور مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی آفت سے محفوظ ہو گا اور پھر اپنی ہمت کو ہر وقت اللہ کی عبادت کے لیے فارغ رکھے۔ یہی عزلت کے واضح آداب ہیں۔

انسان کو چاہیے عزلت گزیں ہو تو ذکر و فکر پر مداومت کرے۔ اپنی مشقت کے ثمرات حاصل کرنے کی طرف متوجہ رہے اور لوگوں کو اپنے پاس زیادہ آنے جانے سے روکے اور شہر کی بے حقیقت افواہوں پر کان نہ رکھے۔ کانوں میں خبروں کا پڑنا ایسا ہی ہے جیسے زمین میں بیج ڈالنا۔ اگر اس طرف سے محتاط نہ ہو گا تو دل میں وسوسے پیدا ہوں گے، یہاں تک کہ نماز کی حالت میں بھی ان سے نجات نہ ملے گی۔ ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ قناعت کو اپنا شعار بنائے۔

اسی طرح یہ بھی چاہیے کہ لوگوں کی تکالیف پر صبر کرے اور عزلت کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کریں تو اس پر کان نہ رکھے۔ وہ ترک مخالطت پر اس کی مذمت کریں تو وہ بھی نہ سنے کیونکہ یہ چیزیں دل پر ضرور اثر کرتی ہیں۔ اور آدمی آخرت کی راہ کی سیر سے رک جاتا ہے۔

چاہیے کہ اس کا کوئی نیک ساتھی ہو جس کے پاس ہمیشہ کی مشقت سے کسی وقت آ کر آرام کر سکے۔ اس

سے باقی وقت پر اسے مدد ملے گی۔ عزلت میں صبر اس طرح پورا ہوتا ہے کہ دنیا کے طمع کو ختم کردے اور طمع اس صورت میں ختم ہوگی کہ آرزوؤں کو ختم کرے۔ یہ سمجھے کہ صبح ہوگئی ہے تو شام نہیں ہوگی اور جب شام ہوجائے تو صبح نہیں ہوگی۔

چاہیے کہ موت کا تذکرہ اکثر کرتا رہے۔ جب بھی تنہائی سے دل گھبرائے تو قبر کی تنہائی کو یاد کرے اور یہ سمجھ لے کہ جس کا دل اللہ کے ذکر اور اس کی معرفت سے مانوس نہیں ہے وہ موت کے بعد تنہائی کی وحشت برداشت نہ کرسکے گا۔ جو اللہ کے ذکر اور اس کی معرفت سے مانوس ہوگا وہ موت سے بھی مانوس ہوگا، کیونکہ موت انس اور معرفت کے محل کو نہیں گرا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے شہداء کے حق میں فرمایا: بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ[1] (بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں)۔

جو اپنے نفس کے جہاد میں اللہ کے لیے گوشہ نشین ہوا وہ بھی شہید ہے۔ جیسا کہ بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: "ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے"۔

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۶۹

کتاب السّیاحت

- آدابِ سفر
- کچھ اور مسائل
- مسافر کے لیے لازمی چیزیں

فصل اوّل

آدابِ سفر

سفر ذریعہ ہے مرغوب چیز کی طرف پہنچنے کا یا ناپسندیدہ چیز سے خلاصی پانے کا۔ اور سفر دو قسم کا ہے: ظاہری وجود کے ساتھ اپنے وطن سے سفر کرنا اور دل کی توجّہ سے انتہائی پستی سے آسمانوں کی بادشاہی کی طرف جانا۔ اور یہ سفر بہت افضل ہے کیونکہ اسی حالت پر ٹھہر جانے والا جس پر پیدائش کے بعد اس کی پرورش ہوئی اور اسی حال پر رُک جانے والا جو باپ دادا کی تقلید سے اس کو ملا، کم درجے کو اپنے لیے لازم کرنے والا۔ نقص کے رتبے پر قناعت کرنے والا اور زمینوں اور آسمانوں کی وسعتوں کے مقابلے میں قید خانے کا اندھیرا اور جیل کی تنگی قبول کرنے والا ہے۔

میں نے لوگوں کے عیبوں میں کوئی ایسا عیب نہیں دیکھا جو ان لوگوں کے عیب کی طرح ہو جو کامل ہونے کی قدرت رکھنے کے باوجود ناقص رہتے ہیں۔

بدن کا سفر کئی قسم کا ہے۔ اس کے فائدے بھی ہیں اور اس میں بڑی آفتیں بھی ہیں۔ گویا یہ بھی عزلت اور مخالطت پر غور کرنے کی طرح ہے۔ سفر کا محرک یا تو بُری چیز سے فرار ہوگا یا پسندیدہ چیز کی طلب۔ اور پھر فرار یا تو کسی ایسی چیز سے ہوگا جو دنیاوی امور میں نقصان دہ ہے، جیسا کہ کسی علاقے میں طاعون پھیل جائے یا فتنے اور جنگ کا خوف۔ یا وہ علاقہ قحط کی زد میں آگیا ہو۔

یا کوئی ایسا معاملہ ہو جو دین میں نقصان دہ ہے، جیسا کہ کوئی آدمی اپنے شہر میں مرتبہ یا مال یا فراخئ اسباب کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جائے یا بدعت کے ارتکاب یا کسی غلط منصب کی ذمہ داری ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور وہ ان فتنوں سے فرار چاہے۔

دوسری غرض دینی ہوگی جیسے دین کا علم، اپنی ذات میں غور و فکر، یا زمین میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی میں غور۔

صحابہ کے زمانے سے لے کر آج تک جس قابلِ ذکر عالم نے بھی علم حاصل کیا ہے وہ سفر کرکے ہی

حاصل کیا ہے۔

حصولِ علم کی طرح اپنے نفس اور اخلاقِ عالیہ کا علم بھی بڑی اہم بات ہے کیونکہ آخرت کی راہ اخلاق کی تہذیب اور تحسین ہی سے طے ہوتی ہے۔

سفر کو سفر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ انسان کے اچھے بُرے اوصاف کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وطن میں طبیعت کی کمزوریاں ظاہر نہیں ہوتیں کیونکہ اردگرد کی کوئی چیز بھی نامانوس نہیں ہوتی۔ پھر جب سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے اور پسند کی چیزیں اسے نہیں ملتیں۔ غریب الوطنی کی مشقت میں پڑتا ہے تو اس کی کمزوریاں کھل جاتی ہیں۔

باقی رہیں زمین میں آیاتِ الٰہی، تو عقلمندوں کے لیے ان کے مشاہدے میں بہت سے فوائد ہیں۔

زمین کے مختلف ٹکڑے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور اس میں پہاڑ، جنگل، سمندر اور وسیع میدان ہیں۔ طرح طرح کے جانور اور مختلف نباتات اس کی زینت ہیں۔ اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت دیتی اور زبانِ حال سے تسبیح میں مصروف رہتی ہے، لیکن اس کو وہی سن سکتا ہے جس کا دل حاضر ہو اور اس طرف کان لگائے۔ کان سے ہماری مراد باطن کا کان ہے۔ اسی سے زبانِ حال کے الفاظ کا ادراک ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر کئی قسم کی شہادتیں نہ دیتا ہو۔

سفر کے فوائد میں سے حکومت اور مرتبے اور کثرتِ تعلقات سے گریز بھی ہے، کیونکہ دین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ دل ماسوی اللہ سے فارغ نہ ہو جائے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان ضروری حاجات اور مہماتِ دنیا سے بالکل فارغ ہو جائے لیکن ان کی تخفیف اور کمی بالکل ممکن ہے۔ تخفیف کرنے والے نجات پا گئے اور بوجھل ہلاک ہوئے! اور تخفیف کرنے والا وہ ہے جس نے امورِ دنیا ہی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد نہ بنایا ہو۔

فصل دوم

کچھ اور مسائل

سفر کے اقسام میں سے یہ بھی ہے کہ سفر مباح ہو جیسے تروتازگی اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے سفر کرنا، باقی رہا بغیر مقصد کے زمین میں سیاحت اور ایسے مقام کی طرف سفر کرنا جو جانا پہچانا ہو ممنوع ہے۔

حضرت طاؤس نے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام میں نہ رہبانیت ہے اور نہ بغیر نکاح کے رہنا اور نہ بے مقصد سیاحت کرنا۔"

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا: "اسلام میں (بے مقصد) سیاحت کوئی چیز نہیں اور نہ کسی نبی یا کسی نیک آدمی کا فعل ہے اور چونکہ سفر میں دل پریشان ہو جاتا ہے اس لیے مرید کو چاہیے کہ علم کی جستجو یا شیخ کی زیارت کے ارادے کے سوا سفر نہ کرے۔ شیخ کی زیارت اس لیے کہ اس کی سیرت کی اقتداء کا جذبہ پیدا ہو۔

سفر کے کچھ معروف آداب ہیں جو مناسک حج کی کتابوں میں مذکور ہیں اور ان میں سے کچھ یہ ہیں:

پہلے بندوں کے حق ادا کرے۔ قرض ادا کرے۔ جن کے اخراجات کا ذمہ دار ہے ان کے اخراجات مہیا کرے اور امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کرے۔

کوئی نیک ساتھی انتخاب کرے۔

بیوی بچوں اور دوستوں کو الوداع کہے۔

استخارہ کی نماز پڑھے اور جمعرات کے روز صبح سے اپنا سفر شروع کرے۔

اکیلا سفر نہ کرے اور اکثر رات کو سفر کرے[1]۔

جب منزل پر پہنچے، کسی بلندی پر چڑھے یا کسی وادی میں اترے تو دعاؤں اور ذکر، اذکار سے غافل نہ رہے۔

اپنے ساتھ ایسا سامان لے جائے جس کی سفر میں عام طور پر ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً مسواک، کنگھی، شیشہ اور سرمہ دانی وغیرہ۔

---

[1] فاضل مصنف نے یہ بات غالباً اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ ان دنوں صحراؤں میں رات کے وقت ہی سفر موزوں رہتا تھا۔

مسافر کے لیے لازمی چیزیں

مسافر کو چاہیے کہ دنیا اور آخرت کے لیے خرچ ساتھ لے۔ دنیا کا خرچ کھانے پینے اور ضروری چیزیں ہیں۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اللہ پر توکل کر کے نکلتا ہوں۔ زادِ راہ نہیں لیتا۔ یہ جہالت ہے کیونکہ خرچ کا لینا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

آخرت کا خرچ علم ہے جس کا انسان اپنی طہارت اور عبادات میں محتاج ہے۔ تجھے سفر کی رخصتوں کا علم ہونا چاہیے، مثلاً: دوگانہ اور دو نمازوں کا جمع کرنا اور روزہ افطار کرنا اور سفر میں موزوں پر مسح کرنے کی مدت اور تیمم کرنا اور چلتے ہوئے نفل ادا کرنا وغیرہ۔ یہ تمام مسائل اپنی شرائط کے ساتھ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

مسافر کے لیے ضروری ہے کہ دورانِ سفر میں قبلے کی سمت اور اوقاتِ نماز سے پوری طرح آگاہ ہو۔ یہ علم سفر میں حضر کی نسبت زیادہ مؤکد ہے۔

مسافر کو چاہیے کہ سمتِ قبلہ پر ستاروں، سورج، چاند، ہواؤں، پانی کے بہاؤ، پہاڑوں اور مجرّۃ[1] (کھتیوں) سے استدلال کرے۔ مجرّہ (کھتیاں) اول رات میں نمازی کے بائیں کندھے پر قبلہ کی طرف لمبی ہوتی ہیں۔ پھر وہ اپنا رُخ تبدیل کرتی رہتی ہیں یہاں تک کہ پچھلی رات میں دائیں کندھے پر آجاتی ہیں اور مجرّۃ کو "آسمان کے چراغ" بھی کہا جاتا ہے۔

اور نمازوں کے اوقات کچھ یوں ہیں۔ سورج ڈھلنے پر ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ مسافر کو چاہیے کہ ایک لکڑی زمین میں سیدھی گاڑ دے۔ اگر سایہ مرکز سے کم ہو تو سمجھے ابھی ظہر کا وقت نہیں ہوا۔ پھر جب سایہ زیادہ ہو جائے تو سمجھ لے کہ سورج ڈھل گیا ہے اور ظہر کا وقت ہو گیا ہے، لیکن یہ ظہر کا ابتدائی وقت ہے۔ ظہر کا آخری وقت وہ ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے۔ اس کے بعد عصر کا ابتدائی وقت شروع ہو جائے گا اور عصر کا آخری وقت وہ ہے جب سایہ چیز سے دُگنا ہو جائے۔

امام احمدؒ سے مروی ہے کہ عصر کا آخری وقت سورج زرد ہونے تک ہے۔ پھر پسندیدہ وقت ختم ہو جاتا ہے اور سورج غروب ہونے تک جواز کا وقت باقی رہتا ہے۔ نمازوں کے باقی اوقات معروف ہیں۔

---

[1] بنات النعش، سات ستاروں کا جھمکا جسے عقدِ ثریا بھی کہا جاتا ہے۔

کتاب معروفات و منکرات

- بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا
- برائی سے روکنے کے مدارج اور اس کے متعلق بعض روایات
- درجات و آداب
- محتسب کے فرائض
- اُن برائیوں کا بیان جو ہماری عادات میں شامل ہو چکی ہیں
- اُمراء و سلاطین کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا
- سماع کے احکام
- آدابِ معیشت و اخلاقِ نبوّت
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

فصل اوّل

بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

معلوم ہونا چاہیے کہ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا دین کا مرکزی ستون ہے اور یہ وہ اہم مقصود ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اگر اس کی بساط لپیٹ دی جائے تو دین کی قوت و شوکت باقی نہ رہے گی اور زمین میں فسادِ عظیم برپا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[1] (چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "تم میں سے ایک جماعت" کہا ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ تم سب بھلائی کا حکم دینے والے بنو۔ پھر اگر کچھ لوگ اس فریضے کو ادا کریں گے، تو باقی سے ساقط ہو جائے گا لیکن کامیابی انہی کے لیے مخصوص فرمائی ہے جو اس فریضے کو ادا کریں گے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا:

"اللہ کی حدود پر قائم رہنے والوں اور مداہنت کرنے والوں کی مثال ایسی ہے کہ کچھ لوگ جہاز پر سوار ہوئے اُن میں سے بعض کو نچلے حصّے میں جگہ ملی اور بعض کو اوپر کے حصے میں، تو جو نیچے تھے وہ جب پانی لینا چاہتے تو اُوپر جاتے جس سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی اور وہ انھیں روکتے۔ اس پر نیچے والوں نے مشورہ کیا کہ ہم اپنے حصے میں جہاز کی ایک لکڑی پھاڑ دیں اور وہاں سے پانی لے لیا کریں۔ اب اگر اوپر والے اُن کو یہ کام کرنے دیں تو سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر اُن کا ہاتھ پکڑ لیں تو سب نجات پا جائیں گے۔"

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۰۴

برائی سے روکنے کے مدارج اور اُن کے متعلق بعض روایات

مسلم کی مشہور حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اُسے اپنی طاقت سے ختم کر دے۔ اگر اتنی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے برا جانے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے: "ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "جب تو میری امت کو دیکھے کہ ظالم کو ظالم کہنے سے خوف کھاتی ہے تو سمجھ لے ان سے دین رخصت ہو گیا۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: "اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ[1] (اے ایمان والو، تم اپنی فکر کرو جب تم ہدایت پر ہو گے تو گمراہ کی گمراہی تمھیں نقصان نہ دے سکے گی) اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا: لوگ جب برائی ہوتی دیکھیں اور اس کی روک تھام نہ کریں تو قریب ہے اللہ ان سب پر عذاب بھیج دے۔" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے ورنہ اللہ تمھارے بروں کو تمھارے نیکوں پر مسلط کر دے گا۔ پھر تمھارے نیک دعا کریں گے تو اُن کی دعا قبول نہ کی جائے گی۔"

---

[1] سورۂ مائدہ - آیت: ۱۰۵

فصل دوم

درجات و آداب

معلوم ہونا چاہیے کہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے چار رکن ہیں:

پہلا یہ کہ روکنے والا بالغ مسلمان اور روکنے کی قدرت رکھنے والا ہو اور یہ انکار کے وجوب کی شرط ہے کیونکہ ہوش والا بچہ جو قریب البلوغ ہو برائی پر گرفت کر سکتا ہے۔ اُسے اس کا ثواب بھی ہوگا لیکن اُس پر واجب نہیں ہے۔

روکنے والے کا عادل ہونا کچھ لوگوں نے لازمی قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فاسق کو محاسبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے! اور اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو) اور اس آیت میں ان کے لیے کوئی حجّت نہیں ہے۔

کچھ لوگوں نے روکنے والے پر یہ شرط لگائی ہے کہ اُسے امام یا والی کی طرف سے اجازت حاصل ہو۔ وہ رعیّت کے ہر ایک آدمی کو محاسبے کی اجازت نہیں دیتے، لیکن یہ نظریہ غلط ہے، کیونکہ آیات و احادیث عام ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ جو بھی برائی دیکھ کر خاموش رہے وہ گنہگار ہے۔ امام کی اجازت سے اسے خاص کرنا زبردستی ہے۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ شیعہ حضرات نے اس پر یہ شرط بھی زیادہ کی ہے کہ جب تک امام معصوم نہ آجائے اس وقت تک برائی سے روکنا اور بھلائی کا حکم دینا جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جب قاضی کے پاس اپنے حقوق کے مطالبے کے لیے آئیں، تو ان سے کہا جائے "تمھاری مدد کرنا نیکی کا حکم ہے اور ظالم کے ہاتھ سے تمھارے حقوق دلوانا، اُن کو بُرائی سے روکنا ہے اور ابھی امام معصوم کا زمانہ نہیں آیا، لہٰذا تمھارے حقوق بھی ابھی نہیں دلوائے جا سکتے۔"

اگر یہ کہا جائے کہ امر بالمعروف میں ایک قسم کا غلبہ اور جسے حکم دیا جا رہا ہے اس پر حکمرانی ہے، چنانچہ اسی لیے

کافر مومن کو بھلائی کا حکم نہیں دے سکتا۔ حالانکہ بھلائی کا حکم دینا حق ہے، لہٰذا چاہیے کہ بادشاہ کے حکم کے بغیر رعیت کے کسی فرد کو بھی یہ حق نہ دیا جائے۔ تو ہم کہیں گے کہ کافر کو اس لیے اس سے روکا گیا ہے کہ اس میں ایک طرح کا غلبہ اور عزت ہے اور مسلمان اس عزت کے دین اور معرفت کی وجہ سے مستحق ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ محاسبے کے پانچ مراتب ہیں:

۱۔ گناہ کی صرف نشاندہی کرنا۔

۲۔ نرم الفاظ سے نصیحت کرنا۔

۳۔ سختی اور درشتی سے برائی کو روکنا۔ مثلاً یہاں تک کہہ دینا کہ "اے احمق" "اے جاہل! کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا" وغیرہ۔

۴۔ برائی سے روکنے میں طاقت استعمال کرنا۔ مثلاً آلاتِ طرب کو توڑ دینا اور شراب وغیرہ کو بہا دینا۔

۵۔ مجرم کو مارنا تاکہ وہ اس بُرے کام سے باز آئے یا اُسے مار کا خوف دلانا اور یہ آخری مرتبہ بادشاہ (حاکم) کے سپرد ہے، کیونکہ اس سے بعض اوقات فتنہ پیدا ہوتا ہے۔

والیانِ حکومت پر سلف کی مسلسل گرفت اس کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ اگر کہا جائے کیا بیٹا باپ کا، غلام مالک کا، بیوی شوہر کا اور رعیت والی کا محاسبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ اصل ولایت تو ہر ایک کے لیے ثابت ہے۔ ہم نے اس کے پانچ مراتب مقرر کیے ہیں:

بیٹا گناہ کی نشاندہی، اور نہایت نرم انداز سے نصیحت کر سکتا ہے۔ اور پانچویں مرتبے میں سے وہ آلات طرب کو توڑ سکتا ہے۔ شراب گرا سکتا ہے۔ بس اسی ترتیب کو غلام اور بیوی کے لیے سمجھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ رعیت کا بادشاہ سے معاملہ بیٹے سے زیادہ سخت ہے۔ وہ صرف پہلے اور دوسرے مرتبے میں محاسبہ کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ محاسبہ کرنے میں محاسبے کی طاقت ہونا شرط ہے۔ عاجز تو برائی کو صرف اپنے دل سے برا سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح جب معلوم ہو کہ اس کے روکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو اس کی بھی چار حالتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اس کے قول یا فعل سے بغیر کسی تکلیف پہنچنے کے برائی ختم ہو جائے گی، تو اس پر فرض ہے کہ برائی کو روکے۔

دوسری یہ کہ اُسے معلوم ہو اس کے کہنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر بولے گا، تو اسے مارا جائے گا۔ ایسی

صورت میں اس پر برائی کو روکنا واجب نہیں۔

تیسری یہ کہ اُسے معلوم ہو اس کے کہنے کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا اور اسے کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچے گی تو فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے اُس پر کہنا واجب نہیں ہوگا، لیکن شعائرِ اسلام کے اظہار اور دین کے ذریعے نصیحت کے لیے کہنا مستحب ہوگا۔

چوتھی یہ کہ اسے معلوم ہو کہ اُسے تکلیف ضرور پہنچے گی، لیکن اُس کے اس فعل سے برائی ختم ہو جائے گی مثلاً یہ کہ سارنگی کو توڑ دے اور شراب انڈیل دے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بعد اُسے مار پڑے گی، تو اُس سے روکنے کا وجوب اُٹھ جائے گا اور استحباب باقی رہ جائے گا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے"

اس میں اختلاف نہیں کہ اکیلے مسلمان کو جائز ہے کہ کافروں کی صفوں پر حملہ کر دے۔ اگرچہ اُسے معلوم ہو کہ قتل ہو جائے گا، لیکن اگر اُسے معلوم ہو کہ وہ کافروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ مثلاً اندھا اپنے آپ کو کافروں کی صف پر پھینک دے تو ایسا کرنا اس پر حرام ہے۔ اسی طرح اگر ایسے فاسق کو دیکھے جس کے پاس شراب کا پیالہ ہو اور اُس کے ہاتھ میں تلوار بھی ہو اور اسے معلوم ہو کہ اگر اُسے شراب پینے سے منع کرے گا تو وہ اُسے قتل کر دے گا، تو اسے ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دین میں اُس کا کوئی ایسا اثر نہیں ہے جس پر وہ اپنی جان قربان کر دے۔ اگر برائی کو ختم کرنے پر قادر ہو یا اُس کے فعل کا فائدہ معلوم ہو تو برائی سے روکنا مستحب ہے جیسے کہ کوئی آدمی کافروں کی صف پر حملہ کرے وغیرہ۔

اگر روکنے والے کو معلوم ہو کہ محاسبہ کرنے سے میرے ساتھ میرے ساتھیوں کو بھی مارا جائے گا۔ تو اُسے محاسبہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ برائی کو روکنے سے عاجزی ہے۔ اگر کسی آدمی کا غالب گمان یہ ہو کہ اسے تکلیف پہنچے گی تو اس پر برائی سے روکنا واجب نہیں ہے۔ ہاں غالب گمان یہ ہو کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی، تو اس پر واجب ہوگا۔ اس گمان میں بزدل یا انتہائی دلیر آدمی کی حالت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ معتدل طبیعت اور سلیم الطبع آدمی کی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اور "تکلیف" سے مراد مار پیٹ یا قتل ہے یا مال کا لوٹ لینا اور منہ کالا کر کے شہر میں پھرانا وغیرہ، صرف گالی گلوچ کا ہونا خاموش رہنے کا عذر نہیں ہے کیونکہ نیکی کا حکم دینے والے کو عموماً ان باتوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

دوسرا رکن یہ ہے کہ جس چیز میں محاسبہ ہو وہ منکر ہو۔ موجود فی الحال ہو، ظاہر ہو۔ اور منکر ہونے کا مطلب

یہ ہے کہ شریعت میں اُس کا وقوع ناجائز ہو اور مُنکر (برائی جس سے روکا جا رہا ہو) معصیت سے عام ہے۔ جو شخص بچے یا دیوانے کو شراب پیتے دیکھے اُس پر لازم ہے کہ شراب کو انڈیل دے اور اس سے منع کرے۔ اسی طرح اگر کسی دیوانے کو دیوانی عورت سے یا کسی جانور سے بدفعلی کرتے دیکھے تو اُس پر لازم ہے کہ منع کرے۔

ہمارا یہ کہنا کہ "موجود فی الحال" ہو یہ شرط اس لیے ہے کہ جو شراب پی کر فارغ ہو چکا ہو اُسے اس فعل سے روکنا خارج از بحث ہے اور نہ یہ افرادِ رعیت کا کام ہے۔ اور اس قید سے وہ منکر بھی نکل گیا جو آئندہ ہونے والا ہے۔ جیسے کسی آدمی کی حالت سے معلوم ہو کہ یہ آج رات شراب پینے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اُس پر محاسبہ نہیں ہے، مگر وعظ کی صورت میں۔

ہمارا یہ کہنا کہ "وہ ظاہر ہو" یہ شرط اس لیے ہے کہ کوئی آدمی اپنے گھر میں دروازے بند کرکے چھپ کر گناہ کرے تو کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس کی جاسوسی کرے، مگر اس حال میں کہ اس سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو کہ گھر سے باہر والا آدمی اُس سے معلوم کر سکے۔ جیسے کسی ساز کی آواز، تو جو آدمی ایسی آوازیں سُنے اُس پر لازم ہے کہ گھر میں داخل ہو کر اُن آلات کو توڑ دے۔ اسی طرح اگر شراب کی بُو محسوس کرے تو اسے روکنا جائز ہے۔

مُنکر سے روکنے میں یہ بھی شرط ہے کہ بغیر اجتہاد کے اس کا منکر ہونا معلوم ہو۔ جس چیز میں اجتہاد ہو گا اس میں محاسبہ نہیں ہے۔ مثلاً حنفی کا حق نہیں کہ وہ شافعی کو ایسے جانور کا گوشت کھانے سے روکے جس پر بھول کر بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو۔ اور نہ کسی شافعی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حنفی کو نبیذ پینے سے روکے جو کہ مستی لانے والی نہیں ہے۔

تیسرا رکن "منکر علیہ" کے متعلق ہے اور اس کی صفت میں اتنا ہی کافی ہے کہ وہ انسان ہو۔ اُس کا مکلّف ہونا شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بچے اور دیوانے کو روکنا بھی ضروری ہے۔

چوتھا رکن۔ نفسِ محاسبہ ہے اور اس کے کچھ درجات و آداب ہیں۔ مثال کے طور پر:

پہلا درجہ یہ ہے کہ مُنکر کو بغیر تجسّس کے پہچانے۔ کسی کے مکان پر جا کر کان لگانا درست نہیں کہ باجے وغیرہ کی آواز سُن سکے اور نہ سونگھنے کی کوشش کرے کہ شراب کی بو معلوم کر سکے اور نہ کپڑے سے ڈھکی ہوئی چیز کو ٹٹولے کہ سارنگی کی شکل پہچانے اور نہ اُس کے ہمسایوں سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اس کے حالات کی اطلاع دیں۔ ہاں اگر از خود دو معتبر آدمیوں نے خبر دی ہو کہ فلاں آدمی شراب پیتا ہے، تو اس صورت میں مکان میں داخل ہو کر برائی

کو روکنا چاہیے۔

دوسرا درجہ تعریف ہے (یعنی برائی کے مرتکب کو برائی کا ذہن نشین کرانا) کیونکہ جاہل آدمی بعض اوقات اس وجہ سے برائی کا ارتکاب کرتا ہے کہ اسے اس کے بُرا ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ اسے سمجھانا چاہیے اور وہ سمجھ جائے تو اُسے چھوڑ دیتا ہے، تو ضروری ہے کہ نرم لہجے میں اُس کی برائی اس کے ذہن نشین کرائے۔ انسان پیدائشی عالم تو نہیں ہوتا۔ خود ہم بھی شریعت کے امور سے ناواقف تھے۔ یہاں تک کہ علماء نے ہمیں بتایا۔ نرم نرم باتیں کرے تاکہ بغیر کسی تکلیف کے اس کو اس کی برائی کا پتہ چل جائے۔ جو برائی سے خاموش رہنے کے گناہ سے تو بچے، لیکن بے ضرورت مسلمان کو تکلیف پہنچائے تو اُس نے گویا خون کو پیشاب سے دھویا۔

تیسرا درجہ وعظ اور نصیحت اور اللہ کا خوف دلا کر برائی سے روکنا ہے۔ وعید کی احادیث سنائے اور سلف کی سیرت اس کے سامنے بیان کرے۔ اور یہ سب کچھ نہایت شفقت اور نرمی سے ہو۔ غصّے اور ناراضگی سے نہ ہو۔ یہاں ایک بہت بڑی آفت ہے جس سے بچنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ عالم آدمی جب گناہ کی برائی بتاتا ہے تو علم کی وجہ سے اپنے آپ کو معزز اور دوسرے کو جہالت کی وجہ سے ذلیل سمجھتا ہے۔

اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو دوسرے کو آگ سے بچاتے ہوئے اپنے آپ کو جلا لے۔

شیطانی دھوکہ اور اس کے فریب اور اثر سے بچنے کا ایک معیار اور ایک کسوٹی ہے۔ چاہیے کہ محاسبہ کرنے والا پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرلے۔ دوسروں کو برائی سے روکنے سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ انسان خود برائی سے رُکے۔ دوسروں کی برائیاں تلاش نہ کرے اور یہ خواہش ہو کہ احتساب کا فرض اس کے بجائے کوئی اور انجام دے تو اچھا ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو یہ اپنے نفس کی خواہش کا مُتّبع ہے اور وہ اصلاح کے بجائے اپنے مرتبے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اُسے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور پہلے اسے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

حضرت داؤد طائی سے کہا گیا: "اس آدمی کے متعلّق کیا خیال ہے جو امراء کے پاس جائے اور ان کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے؟" فرمایا: "مجھے خوف ہے کہ اس کی پشت پر کوڑے پڑیں گے۔" کہا گیا: "اگر وہ یہ ظلم برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہو؟" تو کہا: "مجھے اس پر تلوار کا خوف ہے۔" کہا گیا: "وہ اس کے برداشت کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔" تو کہا: "مجھے اس پر پوشیدہ بیماری، یعنی عُجب (غرور) کا ڈر ہے۔"

چوتھا درجہ: سخت کلامی اور سخت گیری کا ہے اور یہ روش تب اختیار کرے جب نرمی کا اثر نہ ہوا ور مخاطب گناہ پر اصرار کرتا جائے اور وعظ و نصیحت کا مذاق اڑائے۔ سخت گیری سے ہماری مراد فحش گوئی اور جھوٹ

نہیں ہے بلکہ ہم اسے کہیں گے۔" اے فاسق، اے احمق، اے جاہل! کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا؟"

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ[1] (میں تم سے بھی بیزار ہوں اور اللہ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو ان سے بھی بیزار ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)

پانچواں درجہ برائی کو ہاتھ سے روکنا ہے۔ جیسے آلاتِ طرب کا توڑ دینا اور شراب کا انڈیل دینا اور چھینے ہوئے مکان سے غاصب کو نکالنا۔ اس درجے میں دو ادب ہیں:

پہلا یہ کہ ایسی کارروائی اس وقت کرے جب دوسرے طریقوں سے اصلاح کرنے میں کامیابی نہ ہو۔ مثلاً اگر چھینی ہوئی زمین سے نکلنے کا پابند کر سکتا ہے تو دھکے دینا اور کھینچنا جائز نہ ہوگا۔

دوسرا یہ ہے کہ آلاتِ طرب کو صرف اتنا توڑے کہ ان میں فساد کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ شراب بہانے میں اگر ہو سکے تو برتن توڑنے سے پرہیز کرے اور اگر ان کو پھینکنے یا توڑنے کے سوا چارہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ برتنوں کی قیمت ساقط ہو جائے گی۔ اگر شرابی شراب کو اپنے بدن سے ڈھانپ لے تو شراب کو ضائع کرنے کے لیے اس کے جسم کو تکلیف پہنچانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر شراب تنگ منہ والی بوتل میں ہو اور گمان یہ ہو کہ شراب بہانے میں دیر لگے گی اور فاسق آ کر اسے پکڑ لیں گے اور شراب بچا لیں تو اسے بوتل کو توڑ دینا چاہیے۔

اگر کہا جائے کہ زجر اور توبیخ کی خاطر توڑنا کیوں جائز نہیں ہے؟ اور اسی طرح زجر کی خاطر چھینے ہوئے گھر سے کھینچ کر نکالنا کیوں جائز نہیں؟ تو ہم کہیں گے یہ صرف والی کے لیے جائز ہے۔ رعیّت کے کسی آدمی کے لیے جائز نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور دلیلِ اجتہاد ظاہر نہیں۔

چھٹا درجہ۔ ڈانٹ ڈپٹ اور خوفزدہ کرنے کا ہے جیسا کہ کہے۔ یہ کام چھوڑ دو ورنہ میں تمہارے ساتھ اس اس طرح کروں گا اور چاہیے کہ اگر ممکن ہو تو مار پیٹ سے پہلے ڈانٹ ڈپٹ کا حربہ استعمال کرے اور اس میں ادب یہ ہے کہ ایسی وعید کی دھمکی نہ دے جس کا وقوع میں لانا جائز نہ ہو۔ مثلاً یہ کہے کہ میں تیرا گھر لوٹ لوں گا۔ تیری بیوی کو اٹھا کر لے جاؤں گا وغیرہ، کیونکہ اگر اس نے ایسا کرنے کے عزم سے

---

[1] سورۃ الانبیاء۔ آیت : ۶۷

کہا ہے تو یہ حرام ہے اور اگر عزم کے بغیر کہا ہے تو جھوٹ ہے۔

ساتواں درجہ یہ ہے کہ برائی سے روکنے میں ہاتھ، پاؤں سے مارنا اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں ہتھیاروں کے علاوہ استعمال کرنا رعایا کے افراد کے لیے ضرورت اور حاجت پر اکتفا کی شرط سے جائز ہے۔ جب برائی ختم ہو جائے تو رک جائے۔

آٹھواں درجہ یہ ہے کہ اگر اکیلا برائی کو ختم کرنے پر قادر نہ ہو، مسلح مددگاروں کا محتاج ہو کیونکہ بسا اوقات مجرم نہتا نہیں ہوتا اور یہ صورت جنگ تک بھی پہنچ سکتی ہے، تو مناسب یہ ہے کہ ایسی صورت میں امام سے اجازت حاصل کرے کیونکہ اس سے فتنہ اور فساد پھیل سکتا ہے۔ ویسے بعض اکابر امام کی اجازت ضروری نہیں سمجھتے۔

فصل سوم

محتسب کے فرائض

ہم نے محتسب کے آداب مفصل طور پر بیان کر دیے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ تین صفات ہیں:

۱۔ احتساب کے مواقع اور حدود اور اوقات کا علم ہونا تاکہ شریعت کی حد پر رک جائے۔

۲۔ پرہیزگاری۔ کبھی آدمی کو کسی چیز کا علم تو ہوتا ہے، لیکن کسی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتا۔

۳۔ اچھا خلق۔ اور یہ بنیاد ہے تاکہ وہ حد پر رک سکے، کیونکہ جب آدمی غصے میں آجاتا ہے تو صرف علم اور پرہیزگاری اس کے غصہ کو ختم نہیں کر سکتے جب تک کہ اُن کے ساتھ آدمی اچھے اخلاق کا مالک بھی نہ ہو۔

بعض سلف نے کہا معروف کا حکم نہ دے مگر وہ جو اس میں نرمی کرتا ہو اور جس چیز سے روکے اُس میں بھی نرمی کرنے والا ہو۔ جس کا حکم دے اُس میں بردباری کا مظاہرہ کرے اور جس سے روکے اُس میں بھی بُردبار ہو۔ جس چیز کا حکم دے اُس کا فقیہہ ہو اور جس سے روکے اس کا بھی فقیہہ ہو۔

ضروری آداب میں سے یہ بھی ہے کہ تعلقات تھوڑے رکھے اور مخلوق سے طمع نہ رکھے تاکہ مداہنت ختم ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کے پاس ایک بلی تھی اور وہ ہر روز اپنے ہمسائے قصاب سے اس کے لیے چھیچھڑے لیا کرتے تھے۔ ایک دن اُس قصاب کو کوئی بُرا کام کرتے دیکھا۔ اُسے منع کرنے سے پہلے اپنے گھر آئے اور بلّی کو نکال دیا۔ پھر قصاب کے پاس گئے اور اسے روکا۔ اُس نے کہا کہ میں آج کے بعد بلّی کے لیے آپ کو کچھ نہ دوں گا تو فرمایا "میں نے بلّی کو نکالنے اور تجھ سے طمع منقطع کرنے کے بعد تجھے روکا ہے۔" جو دو باتوں میں لوگوں سے طمع نہ چھوڑے گا وہ ان کو برائی سے نہ روک سکے گا: ایک ان کی مہربانی کی توقع اور دوسری ان کی خوشنودی کا خیال اور یہ توقع کہ وہ اس کی تعریف کریں۔

باقی رہا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نرمی سے کام لینا تو یہ متعیّن ہے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا[1]

---

[1] سورۃ طٰہٰ - آیت ۴۴

(اس سے نرم بات کرنا)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے۔ اس نے کوئی گناہ کیا تھا اور لوگ اسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: "بتاؤ اگر تم اسے کنوئیں میں گرا ہوا دیکھو تو اسے نکالو گے یا نہیں؟"

انھوں نے کہا: "کیوں نہیں" تو فرمایا: "پھر اپنے بھائی کو گالی نہ دو اور اللہ کی تعریف کرو جس نے تم کو اس گناہ سے بچایا ہے۔" لوگوں نے کہا: "کیا آپ اسے بُرا نہیں سمجھتے؟" کہا: "میں اس کے اعمال کو بُرا سمجھتا ہوں پر اس کو چھوڑ دے گا تو وہ میرا بھائی ہے۔"

ایک نوجوان تہبند زمین پر کھینچتے ہوئے گزرا تو صلہؒ بن اشیم کے ساتھیوں نے سخت الفاظ سے اُس پر گرفت کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ محسوس کر کے صلہؒ نے کہا: "تم مجھے اجازت دو تمھارا یہ کام میں کرتا ہوں۔" پھر نوجوان بھتیجے سے کہا: "اے میرے بھتیجے مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔" اس نے کہا: "کیا کام ہے؟" تو کہا: "میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا تہبند ٹخنوں سے اوپر کر لو۔" اس نے کہا: "ضرور، چشم ما روشن دلِ ما شاد۔" اور اپنا تہبند اوپر اٹھا لیا۔ اب صلہؒ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "جو تم کرنا چاہتے تھے کیا یہ طریقہ اس سے بہتر نہیں؟ اگر تم اسے گالی دیتے یا تکلیف پہنچاتے تو وہ بھی جواب میں تم کو گالی دیتا۔"

حضرت حسنؓ کو ایک شادی میں بلایا گیا اور آپ کے سامنے چاندی کے پیالہ میں حلوہ رکھا گیا۔ آپ نے اس حلوے کو روٹی پر پلٹ لیا اور کھانے لگے۔ ایک آدمی نے کہا: "یہ خاموشی سے برائی کی روک تھام ہے۔"

فصل چہارم

اُن برائیوں کا بیان جو ہماری عادات میں شامل ہو چکی ہیں

امراء و سلاطین کو برائی سے روکنے اور اُن کو بھلائی کا حکم دینے کے متعلق ضروری باتیں ہم فصل ہذا اور آئندہ فصل ہی بیان کریں گے۔

جو برائیاں ہماری عادات میں شامل ہو چکی ہیں وہ بے شمار ہیں، لیکن ہم چند ایسی برائیوں کا ذکر کریں گے جن سے باقی کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مساجد میں عموماً مشاہدہ ہوتا ہے کہ رکوع و سجود میں عدم طمانیت سے نماز کو خراب کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی دوسری باتیں ہیں جو نماز کو بگاڑ دیتی ہیں، مثلاً نادانستہ طور پر کپڑوں کا ناپاک ہو جانا یا اندھیرا ہونے کی وجہ سے رُخ صحیح طور پر قبلہ کی طرف نہ ہونا۔ نابینا ہونے کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے اور انہی برائیوں میں سے ایک گانے کے انداز میں قراءت کرنا ہے۔

ان برائیوں کی روک تھام کرنا اور ان سے آگاہی حاصل کرنے میں مشغول ہونا نفلی نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

مؤذنوں کا خواہ مخواہ اذان کو لمبا کرنا اور اس کے کلمات کھینچنا بھی ایسی ہی برائیوں میں سے ہے۔

نیز ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خطیب نے ریشمی کپڑے پہن رکھے ہوں یا اس کے ہاتھ میں سونے کے دستے کی تلوار ہو۔

مساجد میں جھوٹی باتیں کرنا یا ایسی گفتگو میں مصروف ہونا جس سے فتنے پیدا ہوں ناپسندیدہ ہے۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مردوں اور عورتوں کا آپس میں اختلاط ہو۔ اس بات سے ضرور منع کرنا چاہیے۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جمعہ کے دن ادویات۔ تعویذات اور خورد و نوش کی اشیا فروخت کرنے، مانگنے اور اشعار گانے کے لیے مجمعے لگائے جائیں۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مطلق حرام اور بعض مکروہ ہیں۔

۲۔ بازار کی برائیاں بھی بہت ہیں اور ان میں سے لین دین میں جھوٹ بولنا اور اشیاء کے عیب کو مخفی

رکھتا ہے۔ جو آدمی کہے میں نے یہ سامان دس درہم میں خریدا ہے اور ایک درہم اس پر منافع لے رہا ہوں اور وہ اس میں جھوٹا ہو تو وہ فاسق ہے۔

جس آدمی کو تاجر کے جھوٹے ہونے کا علم ہو اُس پر واجب ہے کہ خریداروں کو اُس کے جھوٹ سے مطلع کردے۔ اگر وہ بیچنے والے کی رعایت کرتے ہوئے خاموش رہے گا، تو یہ بھی اُس کی خیانت میں شریک ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ کسی چیز کے عیب کو جانتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ خریدار کو بتا دے۔ اگر کسی کی ترازو یا گز وغیرہ میں فرق ہو تو جس کو معلوم ہو جائے اُس پر فرض ہے کہ اس کو خود درست کرائے۔ ایسا نہ کر سکتا ہو تو حاکم کو اطلاع دے کر تبدیل کرا دے۔

ان میں سے ناجائز شرطیں لگانا۔ سود کا لین دین اور راگ رنگ کے آلات اور جاندار چیزوں کے مجسّموں کی تجارت کرنا وغیرہ بھی ہے۔

۳۔ گلیوں کی برائیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے مملوکہ مکان یا دکان کا تھڑا وغیرہ باہر گلی میں نکال دینا اور گلی میں درخت لگانا جس سے راستہ تنگ ہو جائے اور گزرنے والوں کو تکلیف ہو۔ رستے میں اتنی مقدار میں لکڑیاں یا غلّہ وغیرہ لا کر رکھ دینا جو کہ عموماً گھروں میں لایا جاتا ہے جائز ہے کیونکہ اس ضرورت میں سب ہی مشترک ہیں۔

جانوروں کا گلی میں باندھ دینا جس سے راستہ تنگ ہو جائے اور لوگوں کو تکلیف ہو ناجائز ہے۔ اس سے منع کرنا واجب ہے۔ ہاں اگر اتنی سی دیر کے لیے ہو جو سواری سے اُترنے یا سوار ہونے کے لیے درکار ہوتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان میں سے یہ بھی ہے کہ جانوروں پر ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ لادا جائے اور راستے میں کوڑا کرکٹ پھینک دیا جائے یا خربوزہ وغیرہ کے چھلکے ڈال دیے جائیں یا اتنا پانی چھڑک دیا جائے جس سے لوگوں کے پھسلنے کا خطرہ ہو یا پرنالے وغیرہ کا پانی گلی میں جمع ہوتا ہو۔ ان خرابیوں کا انسداد حکومت کا کام ہے۔ عام آدمی تو اس میں صرف وعظ و نصیحت ہی کر سکتے ہیں۔

۴۔ حمام کی برائیوں میں سے ان کے دروازوں یا عمارت کے اندر جانوروں کی تصاویر کا ہونا ہے اور اس میں اتنا کافی ہے کہ تصاویر کے منہ مٹا دیے جائیں یا ان پر سیاہی مل دی جائے جس سے تصویر باطل ہو جائے۔ جو آدمی اس سے منع نہ کر سکے اس کے لیے بہت مجبوری کے سوا ایسے حمام میں داخل ہونا

جائز نہیں۔ اُسے کسی دوسرے حمام میں غسل کرنا چاہیے۔

اور ان میں سے ستر کا ننگا کرنا اور دیکھنا اور میل کچیل اتارنے والے کے لیے ناف سے نیچے ران تک ملنے کے لیے ننگا کرنا اور ملنے والے کا شرمگاہ کو ہاتھ لگانا ہے۔

اور ان میں سے تھوڑے پانی میں پلید ہاتھ یا پلید برتن ڈبونا بھی ہے۔ اگر کوئی مالکی ایسا کرے تو اس پر اعتراض نہ کیا جائے بلکہ نرمی سے کہے "بھائی کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ میری طہارت ضائع کر کے مجھے تکلیف نہ دو"۔

۵ - مہمانی کی برائیوں میں سے مردوں کے لیے ریشمی فرش بچھانا اور سونے چاندی کی انگیٹھی میں عود وغیرہ جلانا اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا ہے۔ نیز گلاب کے عطر کا استعمال کرنا، منقش پردے لٹکانا اور مزامیر اور گانے والیوں کے گانے سننا ہے۔ جوان مردوں پر عورتوں کا اس طرح جھانکنا جس سے اُن کے فتنے میں مبتلا ہونے کا ڈر ہے تو یہ سب بری باتیں ہیں! ان کو تبدیل کرنا واجب ہے۔ اور جو ان کو تبدیل نہ کر سکے تو اس پر لازم ہے کہ وہاں سے چلا جائے۔

قالین اور تپائی پر اگر تصاویر ہوں تو نا جائز نہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لیے ریشمی فرش اور سونے چاندی کا استعمال بھی جائز ہے، البتہ سونے کی بالیاں پہننے کے لیے بچی کے کان میں سوراخ کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ تکلیف دینے والا زخم ہے۔ گلو بند اور کنگن میں اس سے کفایت ہو سکتی ہے۔ اس کام کے لیے کسی کو اجرت دینا اور اجرت لینا دونوں حرام ہیں۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ ضیافت میں کوئی بدعتی شامل ہو جو اپنی بدعت کے متعلق باتیں کرتا ہو۔ اس کے ساتھ جانا جائز نہیں، سوائے اس آدمی کے جو اس کی باتوں کی تردید کر سکے یا بدعتی بدعت کی تبلیغ نہ کرتا ہو لیکن ایسی صورت میں بھی اس سے کراہت کا اظہار کرے۔

اگر وہاں جھوٹ اور فحش باتوں سے لوگوں کو ہنسانے والا ہو تو نہ جائے۔ اُسے روکنا واجب ہے۔ البتہ اگر ایسا مزاح ہو جس میں جھوٹ اور فحش نہ ہو تو تھوڑا بہت جائز ہے، لیکن اُسے ایک عادت بنانا جائز نہیں۔

عام برائیوں سے اجتناب بھی ضروری ہے۔ اگر یقین ہو کہ ایک برائی بازار میں ہمیشہ رہتی ہے یا کسی خاص وقت میں ہوتی ہے اور وہ اس کو دور کرنے پر قادر ہو تو اسے جائز نہیں کہ گھر میں بیٹھا رہے، بلکہ اس پر فرض ہے کہ باہر نکلے اور اگر اس کا کچھ حصہ بھی دور کر سکتا ہو تو دور کر دے۔

برائیاں دور کرنے کے سلسلے میں ہر مسلمان پر واجب ہے کہ یہ کام اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش سے شروع کرے۔ اپنے نفس کی اصلاح فرائض کی ادائیگی اور محرمات کے ترک سے کرے۔ پھر اپنے عزیز و اقارب کو یہی تعلیم دے۔ پھر اپنے محلے اور ہمسایوں تک اس کو پہنچائے۔ پھر اپنے شہر اور اس کے مضافات تک اور پھر ساری دنیا تک۔

اگر کوئی نزدیک کا آدمی اس فریضے کو ادا کرے تو دور والے سے ساقط ہو جائے گا۔ ورنہ ہر وہ آدمی باہر نکلے جو اس پر قادر ہے۔

فصل پنجم

امراء وسلاطین کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

ہم نے امر بالمعروف کے درجات کا تذکرہ کیا ہے۔ بادشاہ کے ساتھ ان میں سے پہلے دو درجے جائز ہیں اور وہ ہیں گناہ کی نشاندہی اور وعظ و نصیحت، لیکن سخت بات کرنا مناسب نہیں۔ مثلاً یہ کہنا: "اے ظالم"۔ "اے وہ جو اللہ سے نہیں ڈرتا" وغیرہ۔ یہ احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ ایسے الفاظ کہنے سے فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جس کی تکلیف دوسروں کو بھی پہنچتی ہے، لیکن اگر صرف اپنے نفس ہی کا ڈر ہو تو جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے اور میرے خیال میں پھر بھی منع ہے۔ کیونکہ مقصود تو ہے برائی کا ازالہ اور بادشاہ کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرنا اس برائی سے بڑی برائی ہے جس کے ازالے کا قصد کرتا ہے۔

بادشاہ تعظیم کرانے کے عادی ہوتے ہیں اگر وہ رعیت کے کسی آدمی سے "اے ظالم"، "اے فاسق" وغیرہ کے الفاظ سنیں تو وہ اسے انتہائی ذلت سمجھتے ہیں اور ایسی باتوں پر صبر نہیں کر سکتے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: "بادشاہ کے پاس مت جاؤ کہ اس کی تلوار ہر وقت کھنچی رہتی ہے۔"

سلف امراء کے پاس جا کر نصیحت کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اُمراء علماء سے خوف کھاتے تھے۔ وہ اُن پر آزادانہ تنقید کرتے تو وہ اسے برداشت کرتے تھے۔

میں نے اپنی کتاب "المصباح المضئ" میں سلف کے وہ مواعظ جو اُنھوں نے اُمراء و خلفا کے سامنے کہے جمع کیے ہیں۔ اُن میں سے چند ایک حکایات کا انتخاب کر کے یہاں درج کرتا ہوں:

سعیدؒ بن عامر نے عمرؓ بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: "میں اسلامی باتوں کو جمع کرنے والے اور اسلام کے امتیازات پر مشتمل کلمات سے نصیحت کرتا ہوں۔ لوگوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اللہ کے معاملے میں لوگوں سے نہ ڈرو۔ تمھارا قول فعل کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ بہترین قول وہ ہے جس کی فعل تصدیق کرے۔ نزدیک اور دُور کے مسلمانوں کے لیے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے پسند کرتے ہو اور جہاں حق معلوم ہو وہاں خطرات کے باوجود گھس جاؤ اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو۔"

آپ نے کہا: "اے ابوسعید! ان ساری باتوں کی کون طاقت رکھ سکتا ہے؟"

کہا: "وہ آدمی جس کی گردن پر وہ بوجھ رکھا گیا ہو جو آپ کی گردن پر رکھا گیا ہے۔"

قتادہ رضؓ نے کہا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسجد سے نکلے اور آپ کے ساتھ جارودؓ بھی تھے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت راستے کے درمیان کھڑی ہوئی ہے۔ آپ نے اسے سلام کیا۔ اُس نے جواب دیا۔ یا اُس نے سلام کیا اور آپ نے جواب دیا پھر کہنے لگی: "اے عمرؓ، ٹھہر جاؤ اور میری بات سنو، میں تمھیں اس وقت سے جانتی ہوں جب تم چھوٹے سے تھے اور عکاظ کے بازار میں بچوں سے کُشتی لڑا کرتے تھے۔ پھر دن گزرتے گئے اور تمھارا نام عمر بن خطاب ہو گیا۔ پھر دن گزرتے گئے یہاں تک کہ تم امیرالمومنین بن گئے، تو رعیت کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو موت سے ڈرے گا وہی بھلائیوں کے چھوٹ جانے سے بھی ڈرے گا۔"

یہ سُن کر حضرت عمرؓ رونے لگے تو جارودؓ نے کہا: "اے عورت، خاموش ہو۔ تو نے امیرالمومنین پر جرأت کر کے ان کو رُلا دیا۔"

حضرت عمرؓ نے کہا: "اسے چھوڑ دو کیا تم اسے پہچانتے نہیں۔ یہ خولہ بنت حکیم ہے جس کی باتوں کو اللہ نے آسمانوں کے اوپر سنا۔ خدا کی قسم عمر کا زیادہ حق ہے کہ وہ اُس کی باتوں کو سُنے۔"

بنو ازد کا ایک بوڑھا امیر معاویہ کے پاس آیا اور کہا: "اے معاویہ، اللہ سے ڈر اور جان لے کہ تیری زندگی کا جو دن بھی جاتا ہے اور جو رات بھی تجھ پر آتی ہے اُس میں تو ہر روز دُنیا سے دُور اور آخرت سے قریب ہوتا جاتا ہے اور تیرے پیچھے ایک پکڑنے والا ہے جس سے تو بھاگ نہ سکے گا اور تیرے لیے ایک نشان کھڑا کر دیا گیا ہے جس سے تو آگے نہیں جا سکے گا۔ بس جلد ہی تو اس نشان تک پہنچ جائے گا اور جلد ہی تجھے پکڑنے والا پالے گا۔ اور یہ دنیا جس میں ہم اور تو ہیں سب زوال پذیر ہے اور جس کی طرف ہم جا رہے ہیں وہ باقی رہنے والی ہے۔ اگر بھلائی ہے تو بھلائی اور اگر برائی ہے تو برائی۔"

سلیمان بن عبدالملک مدینہ میں آیا اور یہاں تین دن رہا۔ کہنے لگا: "کیا یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھا ہو؟"

اُس سے کہا گیا: "یہاں ایک صاحب ہیں اُنھیں ابوحازمؒ کہا جاتا ہے۔"

اُن کے پاس ایک آدمی کو بھیجا تو وہ آ گئے۔

سلیمان نے کہا: "ابوحازم! یہ بے مروّتی کیسی ہے؟"

ابوحازمؒ نے کہا: "تو نے مجھ سے کون سی بے مروّتی دیکھی ہے؟"

اُس نے کہا: "میرے پاس مدینے کے سارے معزز آدمی آئے، لیکن آپ نہیں آئے۔"

اُنھوں نے کہا: "میری تجھ سے پہچان ہی نہیں کہ میں تیرے پاس آتا۔"

سلیمان نے کہا: "آپ سچ کہتے ہیں۔ اے ابوحازم! کیا بات ہے کہ ہم موت کو بُرا سمجھتے ہیں؟"

کہا: "اس لیے کہ تم نے اپنی دنیا آباد کی اور آخرت کو خراب کیا ہے۔ اب آبادی سے ویرانے میں جاتے ہوئے گھبراتے ہو۔"

اس نے کہا: "اے ابوحازم! آپ سچ کہتے ہیں۔ اچھا بتائیے اللہ کے پاس جانا کس طرح ہوگا؟"

انھوں نے کہا: "نیک تو اس طرح خوش ہو کر جائیں گے جیسے کوئی سفر سے اپنے گھر والوں کے پاس آئے۔ اور گنہگار یوں جیسے بھاگا ہوا غلام اپنے مالک کے پاس غمگین اور خوفزدہ آتا ہے۔"

یہ سُن کر سلیمان رونے لگا اور کہا: "اے ابوحازم! کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اللہ کے پاس ہمارے لیے کیا ہے؟"

ابوحازمؒ نے کہا: "اپنے آپ کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو معلوم ہو جائے گا کہ تمھارے لیے اللہ کے پاس کیا ہے۔"

سلیمان نے کہا: "اے ابوحازمؒ! کیا اللہ کی کتاب میں سے مجھے معلوم ہو جائے گا؟"

آپ نے کہا: "اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ[1] (یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں اور بدکردار دوزخ میں ہوں گے)۔"

سلیمان نے کہا: "اے ابوحازم! اللہ کی رحمت کہاں ہے؟"

فرمایا: قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ[2] (نیک لوگوں کے قریب)

سلیمان نے کہا: "اے ابوحازمؒ! سب سے زیادہ عقلمند کونسا آدمی ہے؟"

فرمایا: "جو خود حکمت سیکھے اور لوگوں کو سکھائے۔"

سلیمان نے کہا: "سب سے زیادہ بیوقوف کون ہے؟"

---

[1] سورۃ انفطار - آیات: ۱۳، ۱۴ [2] سورۃ اعراف - آیت: ۵۶

فرمایا: "جو کسی ظالم آدمی کی خواہش میں اپنے نفس کو برباد کرے اور دوسرے کی دنیا کے بدلے اپنی آخرت بیچ ڈالے۔"

سلیمان نے کہا: "اے ابو حازمؒ! کون سی دعا سب سے زیادہ جلد سنی جاتی ہے؟"

فرمایا: "اللہ کے سامنے فروتنی کرنے والوں کی دعا۔"

سلیمان نے کہا: "سب سے اچھا صدقہ کون سا ہے؟"

فرمایا: "تنگدست کا محنت کا کمایا ہوا مال۔"

سلیمان نے کہا: "اے ابو حازمؒ! ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "اس سے مجھے معاف فرمایا جائے۔"

سلیمان نے کہا: "کچھ نصیحت فرمائیے!" تو ابو حازم نے کہا: "کچھ لوگوں نے بغیر مسلمانوں کے مشورے اور اجماعی رائے کے حکومت کو زبردستی حاصل کر لیا اور دنیا طلب کرنے کے لیے بہت سے خون بہائے۔ پھر یہ حکومت چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ آگے جا کر انھوں نے کیا کہا اور ان سے کیا کہا گیا؟"

یہ سن کر اُن کے بعض ہم نشینوں نے کہا: "اے شیخ آپ نے بہت برا کہا۔"

ابو حازم بولے: "تم جھوٹ کہتے ہو، اللہ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ علم کو لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے چھپائیں گے نہیں۔"

سلیمان نے کہا: "اے ابو حازمؒ! آپ ہمارے ساتھ رہیں کچھ آپ ہم سے لیں گے، کچھ ہم آپ سے لیں گے۔"

آپ نے کہا: "میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

اُس نے کہا: "کیوں؟"

فرمایا: "میں ڈرتا ہوں کہ تمھاری طرف کچھ مائل ہو جاؤں تو اللہ مجھے زندگی اور موت کا دگنا عذاب چکھائے۔"

سلیمان نے کہا: "مجھے کچھ بتائیے۔"

فرمایا: "اللہ سے ڈر کہ وہ تجھے کسی ایسی جگہ دیکھے جہاں سے تجھے منع کیا ہے یا تجھے ایسی جگہ سے غیر حاضر پائے جہاں حاضری کا تجھے حکم دیا ہے۔"

کہا: "اے ابو حازمؒ! ہمارے لیے بھلائی کی دعا کرو۔"

آپ نے کہا: "اے اللہ! اگر سلیمان تیرا دوست ہے تو اس کے لیے بھلائی کو آسان کر دے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر بھلائی کی طرف لا۔"

سلیمان نے غلام سے کہا: "اے غلام! سو دینار لاؤ۔" پھر کہا: "اے ابو حازمؒ! ان کو لے لو۔"

آپ نے کہا: "مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اور دوسروں کا اس مال میں برابر کا حق ہے۔ اگر تم ہم سب کی خبر گیری کرو تو بہتر، ورنہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ دینا راس کلام کا معاوضہ ہو جو تم نے مجھ سے سنا۔"

ابو حازمؒ کے اس جواب سے سلیمان حیران رہ گیا۔ زہریؒ نے کہا: "یہ تیس سال سے میرا ہمسایہ ہے میں نے اس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔"

ابو حازمؒ نے کہا: "تم اللہ کو بھول گئے تو مجھے بھی بھول گئے۔"

زہری نے کہا: "کیا تم مجھے گالی دیتے ہو؟"

سلیمان نے کہا: "تم نے خود اپنے آپ کو گالی دی ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہمسائے کے ہمسائے پر کچھ حقوق ہوتے ہیں؟"

ابو حازم نے کہا: "بنی اسرائیل جب تک راہِ راست پر رہے امراء علماء کے محتاج رہے۔ علماء اپنا دین بچانے کے لیے ان سے بھاگتے تھے۔ پھر جب کمینے لوگوں نے یہ قدر افزائی دیکھی، تو انھوں نے دین کا علم حاصل کیا اور وہ علم لے کر امراء کے دروازے پر آ گئے اور قوم گناہ پر متفق ہو گئی۔ پھر وہ نیچے گرے اور اوندھے ہو گئے۔ اگر علماء اپنا دین اور علم ان سے بچانے تو امراء پر علماء کی ہیبت ہمیشہ رہتی۔"

زہری نے کہا: "گویا کہ آپ یہ باتیں مجھے سنا رہے ہیں؟"

کہا: "ہاں وہی ہے جو تم سن رہے ہو۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک اعرابی سلیمان بن عبدالملک کے پاس آیا اور کہنے لگا: "اے امیر المومنین! میں آپ سے چند ایک باتیں کہنا چاہتا ہوں ان کو قبول کریں، اگرچہ وہ آپ کو ناپسند ہوں کیونکہ اگر آپ ان کو قبول کریں گے تو ان کا نتیجہ آپ کے لیے اچھا ہو گا۔"

سلیمان نے کہا: "کہو کیا کہتے ہو؟"

اس نے کہا "اے امیر المومنین! آپ کے پاس کچھ آدمی اکٹھے ہو چکے ہیں جنھوں نے اپنے دین سے آپ کی دنیا خریدی ہے اور اللہ کو ناراض کر کے آپ کو خوش کیا ہے۔ اللہ کے بارے میں وہ آپ سے ڈرتے ہیں اور آپ کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے۔ انھوں نے دنیا آباد کی ہے اور آخرت ویران۔ اُن کی آخرت سے جنگ ہے اور دنیا سے صلح جس چیز پر اللہ نے آپ کو امین بنایا ہے وہ امانت ان کے سپرد نہ کریں۔ یہ امانت کے ضائع ہونے اور اُمت کے تباہ ہونے کی پروا نہیں کریں گے اور آپ اُن کے اعمال کے جواب دہ ہوں گے اور وہ آپ کے اعمال کے جواب دہ نہ ہوں گے۔ اپنی آخرت برباد کر کے ان کی دنیا درست نہ کریں، کیونکہ سب سے زیادہ خسارے والا وہ آدمی ہے جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنی آخرت بیچ ڈالے۔"

سلیمان نے کہا "تو نے تو اپنی زبان کھول دی ہے اور تیری زبان کی کاٹ تیری تلوار سے زیادہ ہے۔"

ابو حازم نے کہا: "ہاں اے امیر المومنین! لیکن آپ کے فائدے کے لیے نقصان کے لیے نہیں۔"

سلیمان نے کہا: "کیا تیری کوئی ذاتی حاجت ہے؟"

ابو حازم نے کہا: "دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ میری کوئی حاجت نہیں۔" پھر اٹھ کر باہر نکل گئے۔

سلیمان نے کہا: کمال ہے اس کا اصل کتنا شریف، اس کا دل کتنا مطمئن، اس کی زبان کتنی تیز، اس کی نیت کتنی سچی اور اس کا نفس کتنا پرہیزگار ہے۔ شرافت اور عقل ایسی ہی ہونی چاہیے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حضرت ابو حازمؒ سے کہا: "مجھے کچھ نصیحت کرو۔"

انھوں نے کہا: "تم جب لیٹو تو موت کو اپنے سر کے پاس سمجھو پھر دیکھو کہ ایسے وقت میں تم کیا کرنا پسند کرو گے۔ بس وہ ابھی سے کرنا شروع کر دو اور ایسے وقت میں جو کرنا تم ناپسند کرو گے اسے ابھی سے چھوڑ دو۔"

محمد بن کعب نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے کہا: "اے امیر المومنین! دنیا ایک بازار ہے۔ اس سے لوگ وہ سودا خرید کر نکلے جو ان کے لیے نقصان دہ ہے۔ فائدہ مند نہیں۔ ہماری طرح کتنے ہی لوگوں نے یہاں دھوکا کھایا۔ یہاں تک کہ ان کو موت آئی اور اُن کو سمیٹ لیا۔ وہ دنیا سے ملامت کیے ہوئے نکلے۔ نہ تو اُنھوں نے اپنی پسندیدہ آخرت کی کوئی تیاری کی اور نہ مکروہات سے کوئی ڈھال بنائی۔ ان کا مال وہ وارث تقسیم کر کے لے گئے جو ان کو اچھا نہ جانتے تھے اور اُن کو اس سے واسطہ پڑا جو ان کا کوئی عذر قبول نہ کرے گا۔ تو اے امیر المومنین، ہمارا حق ہے کہ ہم ان کے اعمال کو دیکھیں۔ خسارے کی باتوں میں ان کے جانشین نہ بنیں اور ان اعمال کو دیکھیں جن کا ہمیں ان پر خوف ہے تو ہم اُن سے باز آجائیں۔ رسول اللہ سے ڈرو اور دروازے

کھلے رکھو۔ دربان اُٹھادو۔ مظلوم کی مدد کرو اور ظالم کا حق دلواؤ۔ تین باتیں جس آدمی میں ہوں اُس کا اللہ پر پورا ایمان ہے: جب خوش ہو تو اس کی خوشی اُسے باطل میں داخل نہ کر دے۔ جب ناراض ہو تو اُس کی ناراضگی اسے حق سے نہ نکالے اور جب طاقت ہو تو اپنے حق کے سوا کسی دوسرے کی چیز نہ لے۔"

حضرت عطاءؒ بن ابی رباحؒ ہشام کے پاس آئے۔ اس نے خوش آمدید کہا اور پوچھا: "اے ابو محمدؒ! آپ کیسے آئے؟"

اس وقت ہشام کے پاس اشراف اور سرکردہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش ہو گئے۔ عطاءؒ نے مکّہ اور مدینے والوں کے وظائف اور روزینے کے متعلق تذکرہ کیا، تو ہشام نے کہا: "ٹھیک ہے۔ اے غلام! لکھو کہ مکہ اور مدینہ والوں کو ان کے وظائف دیے جائیں۔" پھر کہا: "اے ابو محمدؒ! کوئی اور کام بھی ہے؟"

آپ نے حجاز، نجد اور سرحد والوں کا تذکرہ کیا تو اُن کے متعلق بھی ایسا ہی حکم دیا گیا۔ پھر ذمّی لوگوں کا ذکر کیا کہ "اُن کی طاقت سے بڑھ کر ان کو تکلیف نہ دی جائے۔" تو اُس نے یہ بھی منظور کیا۔ اس کے بعد کہا: "اور بھی کوئی حاجت ہے؟"

کہا: "ہاں اے امیرالمومنین! اپنی جان کے متعلق اللہ سے ڈریے۔ آپ اکیلے پیدا ہوئے، اکیلے مریں گے اکیلے اٹھیں گے۔ اکیلے حساب دیں گے۔ خدا کی قسم! جن کو آج آپ قریب دیکھ رہے ہیں ان میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ ہوگا۔"

ہشام سر نیچا کر کے رونے لگا اور عطاءؒ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب دروازے کے پاس آئے تو آپ کے پیچھے ایک آدمی تھیلی لے کر آیا ہم نہیں جانتے کہ اُس میں درہم تھے یا دینار۔ اور کہا: "امیرالمومنین نے یہ تھیلی آپ کو دینے کے لیے حکم دیا ہے۔"

کہا: "میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ میری مزدوری اللہ رب العالمین کے ذمے ہے۔" پھر آپ چلے آئے۔ خدا کی قسم! ہشام کے پاس پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔

محمدؒ بن علی نے کہا: "میں خلیفہ منصور کی مجلس میں حاضر تھا اور ان میں ابنِ ابی ذئبؒ بھی تھے اور مدینے کا والی حسن بن زید بھی تھا۔ بنی غفار کے کچھ آدمی آئے اور انھوں نے حسن بن زید کے متعلق کچھ شکائتیں کیں۔ حسن نے کہا: "اے امیرالمومنین، ان کے متعلق ابن ابی ذئب سے پوچھیے۔"

منصور نے اس کے متعلق اُن سے پوچھا تو کہا: "میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ لوگ، لوگوں کو ذلیل و رسوا

کرنے کے عادی ہیں"۔

منصور نے کہا: "تم نے سن لیا؟"

غفاریوں نے کہا: "اُن سے حسن بن زید کے متعلق بھی پوچھیے تو اُس نے پوچھا۔ وہ بولے: "میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ حق کے فیصلے نہیں کرتا"۔

منصور نے کہا: "اے حسن! تو نے سن لیا؟"

اس نے کہا: "اے امیرالمومنین! ان سے ذرا اپنے متعلق بھی پوچھیے"۔

منصور نے کہا: "میرے متعلق کیا خیال ہے؟"

جواب دیا: "کیا امیرالمومنین مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

منصور نے کہا: "تجھے خدا کی قسم مجھے ضرور بتا"۔

کہا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے یہ مال لوگوں سے ناحق لیا ہے اور غیر مستحق لوگوں کو دے رہے ہیں"۔

منصور نے ابن ابی ذئب کی گردن پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا: "خدا کی قسم اگر میں نہ ہوتا، تو فارسی، رومی دیلمی اور ترک تجھے یہاں سے پکڑ لیتے"۔

ابن ابی ذئب نے کہا: "ابوبکرؓ و عمرؓ والی ہوئے، تو انھوں نے حق کے ساتھ لیا اور انصاف کے ساتھ تقسیم کیا اور فارس اور روم کی گردنیں نا پیں"۔

منصور نے ان کو چھوڑ دیا اور کہا: "خدا کی قسم اگر میں تم کو سچا نہ سمجھتا تو قتل کرا دیتا"۔

کہا: "اے امیرالمومنین! خدا کی قسم میں آپ کے بیٹے مہدی کی نسبت آپ کا زیادہ خیر خواہ ہوں"۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا: "میں ساحل پر تھا۔ منصور نے میرے پاس آدمی بھیجا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا اور سلام کیا تو اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا پھر پوچھا: "آپ نے دیر کیوں کر دی؟"

میں نے کہا: "اے امیرالمومنین! کیا بات تھی؟"

کہا: "میں آپ سے کچھ علم حاصل کرنا چاہتا تھا"۔

میں نے کہا: "اے امیرالمومنین! ایسے علم کا کیا فائدہ جس پر عمل نہ کریں"۔

یہ سن کر ربیع چیخ اٹھا اور اپنا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھایا۔ منصور نے اُسے ڈانٹا اور کہا: "یہ ثواب کی مجلس ہے، عذاب کی نہیں"۔ تو میرا دل خوش ہو گیا اور میں نے کھل کر گفتگو کی۔ کہا: "اے امیرالمومنین!

مجھے مکحول نے عطیہ بن بشر سے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بادشاہ اپنی رعیت سے خیانت کرتا ہوا مرے گا اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا" اے امیر المومنین! پہلے آپ صرف اپنی ذات کے کاموں میں مشغول تھے۔ اب آپ سرخ، سیاہ، مسلمان، کافر سب لوگوں کے بادشاہ ہو گئے اور عدل و انصاف کا ہر ایک کا حصہ آپ کے ذمہ فرض ہو گیا تو اس وقت آپ کا کیا حال ہو گا جب جماعتوں کی جماعتیں اٹھ کھڑی ہوں گی اور سب ہی آپ کی لائی ہوئی مصیبتوں کا شکوہ کر رہے ہوں گے یا آپ کے کسی ظلم کے خلاف دعویٰ کریں گے۔ اے امیر المومنین! مجھے مکحول نے حدیث سنائی جو اُن کو زیاد بن حارثہ نے اور ان کو حبیب بن سلمہ نے سنائی تھی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش طبعی سے ایک اعرابی کو چوک لگائی، تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا اے محمدؐ، اللہ نے آپ کو سرکش اور متکبر بنا کر نہیں بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کو بلایا اور کہا "مجھ سے بدلہ لے لو" اعرابی نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میں نے آپ کو معاف کیا اور بدلہ تو میں آپ سے کسی صورت نہیں لوں گا، خواہ آپ مجھے کتنا ہی مجبور کریں تو آپؐ نے اس کے لیے بھلائی کی دعا فرمائی۔ اے امیر المومنین! اپنے فائدے کے لیے اپنے نفس کو کھل دیجیے اور اپنے رب سے اس کے لیے امان طلب کیجیے۔

اے امیر المومنین! اگر پہلوں کی حکومت باقی رہتی تو آپ تک نہ پہنچتی اور یہ جس طرح دوسروں کے پاس نہیں رہی آپ کے پاس بھی نہیں رہے گی۔

اے امیر المومنین! آپ کے دادا سے اس آیت: مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا[1] (اس کتاب کو کیا ہے کہ نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے نہ بڑی) کی تفسیر ہمیں یہ پہنچی ہے کہ صغیرہ سے مراد تبسم ہے اور کبیرہ سے مراد ہنسنا، تو پھر سوچیے ہاتھوں کی کمائی اور زبان کی کٹائی کا کیا حال ہو گا!!

اے امیر المومنین! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی میری بے پروائی سے مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اس کے متعلق بھی مجھ سے سوال ہو گا تو جو آدمی آپ کے پاس ہوتے ہوئے بھی آپ کے انصاف سے محروم ہوں اُن کے متعلق کیا خیال ہے

---

[1] سورۂ کہف۔ آیت: ۴۹

اے امیرالمومنین! آپ کے دادا سے اس آیت یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی (اے داؤدؑ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا سو تو لوگوں میں انصاف سے فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر) کی تفسیر میں منقول ہے کہ اللہ نے فرمایا جب دونوں فریق تیرے سامنے بیٹھ جائیں اور ایک سے تجھے محبت ہو تو تیرے دل میں یہ خواہش نہ پیدا ہو کہ حق اس کی طرف ہو اور وہ دوسرے فریق پر غالب آئے۔ ورنہ میں تیرا نام انبیاء کے دفتر سے مٹا دوں گا اور تو میرا خلیفہ بھی نہ رہے گا۔ اے داؤدؑ! میں نے اپنے رسولوں کو اپنے بندوں کے چرواہے بنایا ہے، جیسے اونٹوں کے چرواہے کہ وہ چرانے کو جانتے ہیں اور نرمی سے سیاست کرتے ہیں۔ ٹوٹے کو جوڑتے ہیں۔ کمزور کو پانی اور گھاس پر خود لے جاتے ہیں۔ اے امیرالمومنین! آپ ایک ایسے کام کے امتحان میں پڑ گئے کہ اگر وہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا جاتا تو وہ اُس سے ڈر جاتے اور اس کو اٹھانے سے انکار کر دیتے۔

اے امیرالمومنین! مجھے یزیدؒ بن جابر نے حدیث سنائی اور ان کو عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ انصاری نے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری آدمی کو صدقے پر عامل مقرر کیا۔ چند دن کے بعد اس کو اپنے شہر میں مقیم دیکھا تو کہا: "تم اپنے کام پر کیوں نہیں گئے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ تم کو فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے کے برابر اجر ملے گا؟"

اُس نے کہا: "نہیں۔" پھر اُس نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا جو بھی مسلمانوں کے کسی کام کا والی ہو اُسے قیامت کے روز اس حال میں اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا کہ اُس کے ہاتھ گردن پر بندھے ہوں گے۔ اُسے جہنم کے پل پر کھڑا کیا جائے گا اور وہ پل اس کو اس طرح جھنجھوڑے گا کہ اسے اپنا ہر جوڑ اکھڑتا ہوا معلوم ہوگا۔ پھر اسے واپس لا کر اس کا حساب کیا جائے گا۔ اگر وہ نیک ہوگا تو اپنی نیکی کی وجہ سے نجات پا جائے گا اور اگر بُرا ہوگا تو وہ پل اس کے لیے پھٹ جائے گا اور وہ ستر سال کی راہ تک جہنم میں گرتا جائے گا۔"

پھر حضرت عمرؓ نے اُس سے کہا۔ "تم نے یہ حدیث کس سے سُنی ہے؟" تو اس نے کہا: "ابوذر اور سلمان رضی اللہ عنہما سے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس آدمی بھیج کر پوچھا اور ان دونوں نے کہا کہ ہم نے واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سُنا ہے، تو حضرت عمرؓ نے کہا۔ "ہائے عمر! ان خرابیوں کے

---

[1] سورۃ ص۔ آیت: ۲۶

بعد اس ولایت کو کون قبول کرے گا؟" تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا جس کی اللہ ناک کاٹے اور چہرے کو خاک آلود کرے وہ اس کو لے گا۔"

یہ سن کر منصور نے رومال اپنے چہرے پر ڈال لیا اور بلند آواز سے رونے لگا۔ یہاں تک کہ میں بھی رو دیا۔ پھر میں نے کہا: "اے امیر المومنین! آپ کے دادا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ یا طائف یا یمن کی حکومت کا سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کی خیر خواہی اور آپ پر شفقت کرتے ہوئے کہا: "اے چچا! اپنی جان کو اگر تم بچا لو تو یہ اس امارت سے بہتر ہے جس کا تم حساب نہ دے سکو" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے فرمایا: "میں اللہ کے ہاں آپ کے کسی کام نہیں آسکوں گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[1] (اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ) تو آپ نے فرمایا: "اے عباسؓ اور اے صفیہؓ اور اے فاطمہؓ میں اللہ کے ہاں تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ میرے لیے میرے عمل اور تمھارے لیے تمھارے عمل۔"

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: "لوگوں کے امور کا والی نہایت عقلمند آدمی ہونا چاہیے جسے اللہ کے بارے میں کسی کی ملامت کا ڈر نہ ہو۔" اور ان کا پورا کلام منصور سے ذکر کیا پھر کہا: "یہ خیر خواہی تھی والسلام"۔ پھر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے تو منصور نے پوچھا: "کہاں کا ارادہ ہے؟" تو کہا: "امیر المومنین کی اجازت ہو تو وطن کو واپس جاؤں۔"

منصور نے کہا: "اجازت ہے۔ میں تمھاری نصیحت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کو قبول کرتا ہوں اور اللہ ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہے اور وہی مددگار ہے اور میں اسی سے مدد چاہتا ہوں اور اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہی مجھے کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔ آئندہ بھی مجھے ایسی نصیحتوں سے بھول نہ جانا۔ آپ کی بات مقبول ہے اور آپ کی خیر خواہی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔"

میں نے کہا: "ان شاء اللہ میں ایسا ہی کروں گا۔" پھر اُن کے نکلنے کے بعد منصور نے آپ کے لیے کچھ مال کا حکم دیا تو آپ نے اُسے قبول نہ کیا اور کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور میں اپنی نصیحت تو ساری دنیا کے عوض بھی نہیں بیچنا چاہتا۔ منصور مال واپس کرنے پر ناراض نہ ہوا۔

---

[1] سورۃ شعراء ۔ آیت: ۲۶

جب ہارون الرشید نے حج کیا تو اس سے کہا گیا: "اے امیرالمومنین! شیبان بھی حج کے لیے آیا ہوا ہے۔" اس نے کہا: "اسے بلاؤ۔" اُن کو لائے تو کہا: "اے شیبان! مجھے کچھ نصیحت کرو۔"

اس نے کہا: "اے امیرالمومنین! میں تھتھلا آدمی ہوں اور پھر میں اچھی طرح عربی بھی نہیں بول سکتا۔ کوئی ترجمان بُلائیے جو میری بات سمجھے میں اس سے بات کروں گا۔" چنانچہ ایسا آدمی لایا گیا اور حضرت شیبان نے نبطی زبان میں کہا: "اے امیرالمومنین! امن کی جگہ میں پہنچنے سے پہلے جو آپ کو ڈراتا ہے وہ آپ کا زیادہ خیرخواہ ہے بہ نسبت اس آدمی کے جو آپ کو خوف کے مقام تک پہنچنے سے پہلے امن کی نوید سناتا رہے۔" تو ہارون الرشید نے کہا: "اس کا مطلب واضح کرو کیا ہے؟"

کہا: "جو آپ سے یہ کہتا ہے کہ اللہ سے ڈرو جس نے آپ کو لوگوں کا بادشاہ بنایا ہے، کیونکہ وہ پوچھے گا کہ آپ نے انصاف سے حکومت کی یا بے انصافی سے اور یہ تاکید کرتا ہے کہ رعیت میں انصاف کریں تقسیم برابر کریں اور خوشی کی حالت میں فیصلہ نافذ کریں اور اپنی ذات کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہیں یہ آپ کا خیرخواہ ہے۔ اس کی نصیحت پر عمل کرنے سے آپ امن کی جگہ پائیں گے۔ اس کے مقابلے میں جو یہ کہے کہ تم اہل بیت سے ہو، تمھارے سب گناہ بخشے ہوئے ہیں۔ تم نبی کے قرابتدار ہو اور ان کی شفاعت میں ہو تو یہ شخص آپ کو اگرچہ امن کی نوید دیتا ہے، لیکن حقیقت میں خوف کے مقام کی طرف دھکیل رہا ہے۔ قیامت کے دن جب حساب ہوگا تو بے عملی کی وجہ سے آپ گھاٹے میں رہیں گے۔"

یہ سن کر ہارون الرشید رونے لگا یہاں تک کہ موجود ساتھیوں کو اس پر ترس آنے لگا۔ پھر کہا: "کچھ اور نصیحت کرو۔"

کہا: "بس اتنی ہی کافی ہے۔"

علقمہ بن ابی مرثد کہتے ہیں کہ جب عُمر بن ہبیرہ عراق میں آیا تو حسنؒ اور شعبیؒ کی طرف آدمی بھیجا۔ اُن کو ایک مکان میں ٹھہرایا وہ اس میں مہینے کے قریب رہے۔ پھر وہ اُن کے پاس آیا اور ان کی تعظیم کرتے ہوئے بیٹھا پھر کہا: "امیرالمومنین! یزید بن عبدالملک مجھے خطوط لکھتا رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس کی ہدایات پر عمل کرنے میں ہلاکت ہے۔ اگر میں اس کی اطاعت کروں، تو اللہ کی نافرمانی کروں گا اور اگر میں نافرمانی کروں تو اللہ کی اطاعت کروں گا، تو کیا اُس کی پیروی میں آپ میرے لیے کوئی فراخی و کشادگی پاتے ہیں؟"

حسن نے کہا: "اے ابوعمرو! آپ امیر کی بات کا جواب دیں۔"

شعبی سے پوچھا تو انھوں نے معذور قرار دے کر امیر کی اطاعت کا مشورہ دیا۔ عمر بن ہبیرہ پھر حسن کی طرف متوجہ ہوا اور سوال کیا: "ابوسعید! اب آپ کیا کہتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: "اے عمرو بن ہبیرہ، قریب ہے کہ اللہ کے فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ تجھ پر نازل ہو جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرے گا۔ وہ تجھے محل کی فراخی سے نکال کر قبر کی تنگی میں لے جائے گا۔ اے عمر بن ہبیرہ! اگر تو اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تجھے یزید بن عبدالملک سے بچا لے گا، لیکن یزید بن عبدالملک تجھے اللہ سے نہیں بچا سکے گا۔ اے عمر بن ہبیرہ، اس طرف سے مطمئن نہ ہو کہ اللہ تجھے یزید بن عبدالملک کی اطاعت میں کسی برے کام پر دیکھے اور تجھ پر اپنی بخشش کا دروازہ بند کر دے۔ اے عمر بن ہبیرہ! میں نے اس امت کے پہلے لوگوں کو دیکھا ہے۔ دنیا ان کے پاس آ رہی تھی اور وہ اس سے بہت زیادہ منہ موڑتے تھے جتنا کہ تو اس کی طرف منہ کرتا ہے اور وہ تجھ سے منہ موڑتی ہے۔ اے عمر بن ہبیرہ، میں تجھے اس مقام سے ڈراتا ہوں جس سے تجھے اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَ خَافَ وَعِيْدِ[1] (یہ اس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب کے وعدوں سے ڈرے) اے عمر بن ہبیرہ! اگر تو اللہ کی اطاعت میں رہے گا تو اللہ تجھے یزید بن عبدالملک سے بچا لے گا اور اگر تو یزید بن عبدالملک کے ساتھ ہو کر اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اللہ تجھے اسی کے سپرد کر دے گا۔"

یہ سن کر عمر بن ہبیرہ رونے لگا اور آنسو بہاتا ہوا چلا گیا۔ دوسرے دن ان دونوں کو واپس جانے کی اجازت بھی دے دی اور عطیات بھی بھیجے۔ حسن کو زیادہ بھیجا اور شعبی کا عطیہ کم تھا۔

شعبی مسجد کی طرف نکلے اور کہا: "اے لوگو! جو آدمی مخلوق پر اللہ تعالیٰ کو ترجیح دے سکے تو ایسا ضرور کرے۔ خدا کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے حسن کو کوئی ایسی بات معلوم نہیں تھی جو میں نہیں جانتا تھا لیکن میں نے ابن ہبیرہ کو خوش کرنا چاہا تو اللہ نے مجھے اس سے دور کر دیا۔

محمد بن واسع رحمہ اللہ سخت گرمی کے دن بلال بن ابی بردہ کے پاس آئے۔ بلال اس وقت بہت آسودگی کی حالت میں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس برف کی سل پڑی تھی۔ انھوں نے واسع سے کہا: "اے ابوعبداللہ! ہمارا یہ مکان کیسا ہے؟"

---

[1] سورۃ ابراہیم - آیت ۱۴

کہا: "آپ کا مکان بہت اچھا ہے، لیکن جنت اس سے بھی زیادہ اچھی ہے۔"

اُس نے کہا: "تقدیر کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟"

کہا: "تیرے ہمسائے قبروں والے ہیں ان کے متعلق غور کر، تقدیر کی بحث کو چھوڑ۔"

کہا: "میرے لیے اللہ سے دعا کرو۔"

کہا: "میری دُعا کا کیا کرے گا، جبکہ تیرے دروازے پر بے شمار آدمی ہیں جو تیرے ظلم کا شکوہ کرتے ہیں۔ میری دعا سے پہلے ان کی دعائیں اللہ کے پاس پہنچیں گی۔ تو ظلم نہ کر اور میری دعا کا محتاج نہ ہو۔"

یہ ان حضرات کی مختصر باتیں ہیں جنھوں نے اُمراء کو نصیحت کی۔ جو زیادہ دیکھنا چاہے وہ "مصباح المضیٔ" کا مطالعہ کرے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں علماء کی سیرت و عادت اس طرح کی تھی۔ وہ بادشاہوں کی سطوت کی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں اللہ کے حکم کی تعمیل کو پسند کیا کرتے تھے۔

ہاں یہ بات بھی ہے کہ دوسری طرف بادشاہ بھی علم اور اس کی فضیلت کو جانتے تھے اور ان لوگوں کی نصیحت پر صبر کیا کرتے تھے، لیکن جو کچھ میں اب دیکھ رہا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ بادشاہوں سے دور بھاگو اور اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے تو نرمی کے ساتھ نصیحت کرنے پر اکتفا کرو اور اس کے دو سبب ہیں:

ایک تو واعظ کے متعلق ہے۔ اور وہ ہے اس کا بُرا ارادہ۔ دنیا کی طرف میلان اور ریاکاری۔ ان برائیوں کے ہوتے ہوئے اس کا وعظ خالص نہیں ہوگا۔

اور دوسرا اس کی ذات جسے وعظ کیا جاتا ہے۔ دنیا کی محبت نے اکثر لوگوں کو آخرت کی یاد سے غافل کر دیا ہے اور دنیا کی تعظیم نے ان سے علماء کی تعظیم بھلا دی ہے۔ پس مومن کو چاہیے اپنے نفس کو ذلیل نہ کرے۔

کتاب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ اختتام ہے۔

فصل ششم

سماع کے احکام

معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سماع جسے ہم راگ رنگ سے تعبیر کرتے ہیں ان تمام ذرائع سے بڑا ذریعہ ہے برائی کے فروغ کا جس کے واسطے سے ابلیس نے دلوں میں بگاڑ پیدا کیا۔ وہ اس کے ذریعے بے شمار عالموں اور زاہدوں کو دھوکہ دیتا ہے، پھر عوام کا کیا حال ہوگا!

یہ لوگ جب راگ باجے وغیرہ کے ساتھ سنتے ہیں، تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے دل اللہ کے حضور میں پہنچ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں سماع سے جو دلوں میں خوشی اور تحریک پیدا ہوتی ہے یہ وجد ہے جس کا آخرت سے تعلق ہے۔

تم حق معلوم کرنا چاہو تو قرنِ اوّل کو دیکھو کہ کیا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ نے ان میں سے کسی کام کو کیا ہے۔ پھر تابعین اور تبع تابعین اور فقہائے اُمّت، مثلاً امام مالکؒ ابوحنیفہ شافعی اور احمد رحمہم اللہ اجمعین کے اقوال کو دیکھو ان سب ہی نے راگ کی مذمت کی ہے یہاں تک کہ امام مالکؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر لونڈی خریدے، پھر معلوم ہو کہ وہ گانے والی ہے تو اس عیب کی بنا پر اسے واپس کر سکتا ہے۔ آپ سے گانے کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا "یہ فاسق لوگوں کا کام ہے۔"

حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ "ایک آدمی مر گیا اُس نے اپنے پیچھے ایک بیٹا اور ایک گانے والی لونڈی چھوڑی۔ اب بیٹا لونڈی کو بیچنا چاہتا ہے اور اگر وہ اسے مغنّیہ کی حیثیت سے بیچے تو وہ تیس ہزار کی ہے اور اس حیثیت سے نہ بیچی جائے تو اس کی قیمت شاید بیس دینار رہ جائے۔ فرمائیے اسے کس حیثیت سے فروخت کیا جائے؟"

فرمایا "وہ مغنیہ کی حیثیت سے نہیں بیچی جائے گی" اسی طرح تمام فقہا گانے بجانے سے ڈانٹنے اور منع کرنے پر متفق ہیں۔

متاخرین میں سے ابوالطیبؒ طبری جو امام شافعیؒ کے بڑے ساتھیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر

ایک کتاب تصنیف کی ہے اور مبالغے کی حد تک اس سے منع کیا ہے۔ البتہ کچھ دیوانے لوگ اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سلف کے کچھ لوگوں نے اس کی اجازت دی ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل نے ایک قوّال کا قول سنا تو کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے تو چاہیے کہ جس کے جواز کا آپ نے فتویٰ دیا ہے اس پر غور کیا جائے کہ وہ کیا تھا۔ وہ صرف زاہدانہ اشعار تھے۔ نہ اُن کے ساتھ لکڑی بجتی تھی نہ مزامیر وغیرہ تھے اور نہ ان کے ساتھ تالیاں بجتیں اور نہ رقص وغیرہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا جو دو گانے والی لڑکیوں کے متعلق ہے کہ اُنھوں نے وہ اشعار گائے جو بعاث کی جنگ میں انصار نے کہے تھے اور اس سے کوئی سرور پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یہ بات تو معلوم ہے کہ پہلے لوگوں کے پاس وہ آلاتِ طرب نہیں تھے جو پچھلوں نے ایجاد کر لیے مثلاً دَف۔ چھینٹے بجرہ وغیرہ۔

ہیجان انگیز اشعار ان مدفون خواہشات کو اُبھارتے ہیں جو نفس میں چھپی ہوتی ہیں اور تحریک کرتی ہیں۔ جاہل آدمی اس تحریک کو آخرت سے متعلق سمجھتا ہے حالانکہ ان میں بہت دُور کا فاصلہ ہے۔ کاش وہ کہتے کہ یہ کھیل تماشوں میں سے مباح چیز ہے۔ ہم اس سے دلی آرام پاتے ہیں، لیکن وہ تو اسے خدا کا قرب سمجھتے ہیں اور اس خوشی کو جو عقل کی تمام حدیں پھاند جائے وجد کہتے ہیں۔

بسا اوقات یہ خوشی وہ چیزیں پیدا کرتی ہے جو حلال نہیں ہیں۔ مثلاً کپڑوں کا پھاڑنا اور دیوانوں کی طرح جھومنا۔ یہ سب چیزیں سلف کے طریق کے خلاف ہیں۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے نفس کو دھوکہ نہ دے۔

صحیح وجد وہ ہے جو قرآن اور وعظ سننے سے دل میں پیدا ہو۔ اس وقت وعید سننے سے باطن میں خوف پھیل جاتا ہے اور وعدے سے شوق اُبھرتا ہے۔ تقصیرات پر ندامت ہوتی ہے۔ یہ سب باطن کی حرکات ہیں۔ ظاہر میں سکون قائم رہتا ہے۔ نہ اُچھل کود ہوتی ہے نہ تالیاں بجتی ہیں۔

قرآن اور وعظ اور پرہیز گاری کے اشعار نے کوئی کمی نہیں چھوڑی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دروازے کی طرف دلوں کو متوجہ کرنے کے لیے سلمیٰ اور سُعدیٰ کو یاد کریں اور ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ ان اشعار میں سے بعض میں ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی اشارہ پایا جاتا ہے مگر اکثر طور پر دل دنیا کے عشق کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اُس آدمی کی مثال جوان سے آخرت حاصل کرنا چاہے اس شخص کی سی ہے جو کہے کہ میں بے ریش خوبصورت لڑکوں کو اس لیے دیکھتا ہوں کہ ان میں قادر مطلق کی صنعت نظر آتی ہے۔ یہ شخص یقیناً رستہ بھول گیا کیونکہ شہوت کو اُبھارنے والی چیزیں دیکھتے وقت طبیعت جو چیز حاصل کرتی ہے وہ فکر کی راہ کو مکدر کر دیتی ہے۔ اور بھلائی کے کام کرنے سے روک دیتی ہے۔ اسی لیے ہم اس سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ چیزیں دیکھو جو دل کو مکدر کرنے والی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَوَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا[1] (کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسے بنایا اور کیسے زینت بخشی) جو آدمی یہ کہے کہ وہ چیز مجھ پر اثر نہیں کرتی جو دوسروں پر اثر کرتی ہے، تو وہ ایسا دعویٰ کرتا ہے جو فطرت کے خلاف ہے۔ اس کی بات پر توجہ نہیں کی جائے گی۔

میں نے ان تمام باتوں کی پوری طرح حقیقت اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں کھولی ہے۔ یہاں اس ذکر کو لمبا کرنا مناسب نہیں۔ واللہ اعلم۔

[1] سورۃ ق۔ آیت: ۶

فصل ہفتم

آدابِ معیشت و اخلاقِ نبوّت

معلوم ہونا چاہیے کہ ظاہر کے آداب باطن کے آداب کا عنوان ہیں اور اعضاء کی حرکات، خیالات کا پھل ہیں۔ اسی طرح اعمال اخلاق کے نتائج ہیں اور آداب معارف کا ثمرہ۔ دل کے خیالات ہی سے افعال پیدا ہوتے ہیں اور اندر کے انوار ہی ظاہر پہ چمکتے اور اسے خوبصورت اور مزیّن بنا دیتے ہیں۔

جس آدمی کا دل نہیں ڈرتا اس کے اعضاء بھی نہیں ڈرتے اور جس کا سینہ انوارِ الٰہیہ کا طاقچہ نہ ہو اس کے ظاہر پر آدابِ نبوّت کا فیضان نہیں ہوتا۔

ہم پہلے کچھ آداب کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس جگہ اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس باب میں ہم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ آداب و اخلاق بیان کریں گے کہ آداب کے ساتھ ایمان کی تاکید بھی آپ کے اخلاقِ کریمہ کو دیکھ کر اپنے قلوب میں جمع کرلیں۔ جن میں سے ایک ایک خُلق شہادت دیتا ہے کہ آپؐ تمام مخلوق سے زیادہ مکرم، زیادہ بلند مرتبہ اور سب سے بڑی قدر و منزلت والے تھے۔ پھر اگر یہ سب اکٹھے ہو جائیں تو قدرت کے اس شاہکار کا کیا کہنا!!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے کہا: "آپ کے اخلاق قرآن ہیں۔ جس پر قرآن ناراض ہوتا تھا اُس پر آپؐ ناراض ہوتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اخلاق کو مکمل کر دیا تو آپؐ کی تعریف کی: وَإِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ[1] (اور آپ کے اخلاق بڑے عظیم ہیں) پاک ہے وہ جس نے ایسے اخلاق دیے پھر اُن کی تعریف کی۔ اور یہ آپ کے اخلاق حسنہ اور صفاتِ عالیہ میں سے کچھ کا تذکرہ ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حوصلے والے، سب سے زیادہ سخی اور سب

---

[1] سورۃ قلم۔ آیت: ۵

سے زیادہ مہربان تھے۔

آپؐ اپنا جوتا مرمت کر لیتے۔ کپڑے کو پیوند لگا لیتے اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے۔

آپؐ پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرم و حیا والے تھے۔

آپؐ غلاموں کے بلانے پر چلے جاتے۔ بیماروں کا حال پوچھتے۔ کسی کو اکیلے چلتے دیکھتے تو سواری پر اپنے پیچھے بٹھا لیتے۔ ہدیہ قبول کرتے اور اسے کھاتے اور اس کا بدلہ بھی دیتے لیکن صدقہ نہ کھاتے۔

کبھی کبھی آپؐ کے پاس ردی کھجوریں بھی پیٹ بھرنے کے لیے نہ ہوتیں۔ آپ نے متواتر تین روز تک سیر ہو کر گندم کی روٹی نہ کھائی۔ بھوک کی شدت میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔

جو مل جاتا کھا لیتے اور کھانے میں عیب کبھی نہ نکالتے۔

آپؐ تکیہ لگا کر نہ کھاتے اور اپنے آگے سے کھاتے۔

تمام کھانوں میں آپؐ کو گوشت زیادہ پسند تھا اور بکری کا شانہ زیادہ پسند کرتے تھے۔ سبزیوں میں سے کدو۔ سالنوں میں سے سرکہ اور کھجوروں میں سے عجوہ پسند کرتے تھے۔

جو ملتا پہن لیتے تھے کبھی حبری چادر، کبھی اونی جبہ۔

کبھی اونٹ پر سوار ہوتے، کبھی خچر پر اور کبھی گدھے پر اور کبھی پیدل، ننگے پاؤں بھی چلتے۔

آپؐ خوشبو کو پسند کرتے اور بدبو سے نفرت کرتے تھے۔

اہلِ علم و فضل کی عزت اور شریف لوگوں سے پیار کرتے۔ کسی پر سختی نہ کرتے۔ اگر کوئی معذرت کرتا تو قبول کر لیتے۔

آپؐ خوش طبعی بھی کرتے، لیکن حق بات کہتے، ہنستے، لیکن قہقہہ نہ لگاتے۔ آپ کا وقت ہمیشہ اللہ کے کاموں میں صرف ہوتا یا اپنی ذات کے ضروری کاموں میں۔

آپ نے کبھی کسی عورت یا خادم پر لعنت نہ کی اور جہاد فی سبیل اللہ کے سوا اپنے ہاتھ سے کسی کو کبھی نہ مارا، جب تک اللہ کی حدود کو پامال نہ کیا جاتا آپؐ اپنی ذات کے لیے انتقام نہ لیتے۔ اگر دو چیزوں میں آپ کو اختیار دیا جاتا تو آسان چیز کو پسند کرتے الا یہ کہ آسان چیز گناہ یا قطع رحمی کی ہوتی ایسی صورت میں اُسے ترک کر دیتے۔

انسؓ نے کہا: "میں نے آپؐ کی دس سال خدمت کی۔ آپؐ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہا۔ اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپ نے کبھی نہ کہا کہ کیوں کیا اور اگر میں نے کوئی کام نہیں کیا تو آپ نے کبھی نہ کہا کہ کیوں نہیں کیا؟"

توریت میں آپؐ کی منقبت اس طرح ہے: "محمد اللہ کا رسول، میرا پسندیدہ بندہ، نہ سخت دل نہ سخت گیر

نہ بازاروں میں بلند آواز سے بولنے والا اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والا، معاف کرتا اور درگزر کرتا ہے۔"

آپؐ کے اخلاق میں سے تھا کہ پہلے خود سلام کہتے اور اگر کوئی آدمی آپؐ کو کسی ضرورت کے لیے علیحدہ لے جا کر بات کرتا تو جب تک وہ خود نہ چلا جاتا آپؐ اُس سے علیحدہ نہ ہوتے۔ اگر کسی سے مصافحہ کرتے تو دوسرا آدمی ہی آپؐ کے ہاتھ کو چھوڑتا۔

مجلس کے آخر میں ہی اپنے صحابہ میں شامل ہو کر بیٹھ جاتے۔ گویا کہ آپؐ بھی انہی میں سے ہیں۔ کوئی پردیسی آتا تو اسے معلوم نہ ہوتا کہ رسول اللہ کون سے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے متعلق سوال کرتا۔

آپ بڑی دیر تک خاموش رہتے۔ بولتے تو مسلسل نہ بولے جاتے، بلکہ تول کر بولتے اور مکرر کہہ کر ذہن نشین کراتے۔

طاقت ہوتے ہوئے معاف کر دیتے اور کسی سے ایسا سلوک نہ کرتے کہ اسے بُرا محسوس ہو۔

بات کے سب سے زیادہ سچے اور عہد کو سب سے زیادہ پورا کرنے والے تھے۔ طبیعت کے بہت نرم۔ معاشرہ میں سب سے معزز۔ جو آپؐ کو پہلی بار دیکھتا ہیبت زدہ ہو جاتا، لیکن جو آپؐ کے پاس رہتا وہ آپ سے محبت کرتا۔

صحابہؓ آپؐ سے دنیا کی کوئی بات کرتے، تو آپؐ بھی ان سے باتیں کرتے اور وہ جاہلیت کے زمانے کی باتیں کر کے ہنستے، تو آپ بھی تبسم فرماتے۔

آپؐ سب سے زیادہ دلیر تھے۔ بعض صحابہؓ نے کہا جب نیزے سُرخ ہونے لگتے اور لڑائی کا میدان گرم ہو جاتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں ہو کر اپنا بچاؤ کرتے۔

آپؐ کا قد نہ زیادہ لمبا تھا نہ بہت چھوٹا۔ آپ درمیانہ قد کے تھے۔ آپؐ کا رنگ سفید تھا گندمی نہ تھا۔

آپؐ کے بال کچھ کچھ گھنگھریالے تھے، نہ بالکل سیدھے نہ پورے گھنگھریالے۔ بیٹے کانوں کی لوؤں تک ہوتے۔

آپؐ کی پیشانی فراخ، بھویں باریک۔ آنکھیں بڑی اور سیاہ اور پلکیں لمبی تھیں۔ ناک اونچی۔ نرم رخسار اور گھنی ڈاڑھی والے تھے۔

آپؐ کی گردن ایسی تھی جیسے خوبصورت تصویر کی ہو۔ آپؐ کا سینہ چوڑا تھا۔ پیٹ اور سینہ برابر تھا۔ ہتھیلی فراخ تھی۔ بازو لمبے تھے اور آپؐ کا ہاتھ ریشم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

جس آدمی نے آپ کے حالات کا مشاہدہ کیا اور وہ احادیث سنیں جو آپ کے اخلاق، افعال، آداب اور مخلوق کی مصلحت کے سلسلے میں بے مثال تدابیر اور ظاہر شریعت کی تفصیلات کے اشارات پر مشتمل ہیں اور جن کی ابتدائی باریکیوں کے ادراک سے بھی عقلاء اور فصحاء ساری زندگی صرف کرنے کے بعد بھی عاجز نظر آتے ہیں، اس کے دل میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ کمالات کسبی نہیں۔ توفیقِ الٰہی اور تائید سماوی کے بغیر ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ ایسے کمالات کسی فریبی یا جھوٹے آدمی میں نہیں ہو سکتے۔ آپ کے خصائل حالات اور اوصاف آپ کی صداقت کے قطعی شاہد ہیں۔

آپ کا سب سے بڑا معجزہ اور واضح ترین دلیل قرآن کریم ہے جس کی مثل اور نظیر لانے سے ساری مخلوق درماندہ و عاجز ہے۔ ہر نبی کا معجزہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، لیکن یہ معجزہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

آپ کے دیگر معجزات میں سے چاند کا پھٹ جانا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا۔ تھوڑے سے کھانے سے زیادہ لوگوں کا سیر ہو جانا۔ دستِ مبارک سے تھوڑی سی کنکریاں پھینکنا اور ان کا لوگوں کی آنکھوں میں جا کر لگنا۔ ستون کا اس طرح بلبلانا جیسے گابھن اونٹنی بلبلاتی ہے۔ آپ کا غیبی خبریں دینا اور پھر ان کے مطابق ہی وقوع میں آنا۔ قتادہ کی آنکھ کو اپنے ہاتھ سے بغولۂ چشم میں بٹھانا اور اس آنکھ کا دوسری آنکھ کی نسبت زیادہ خوبصورت اور روشن ہو جانا اور حضرت علیؓ کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگانا اور ان کا فی الفور تندرست ہو جانا۔ بیشمار معجزے ہیں جو دنیا میں مشہور ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اوصاف کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ یقیناً وہ دعاؤں کا قبول کرنے والا اور سخی ہے۔ والحمد للہ رب العالمین۔

کتاب، وارداتِ قلب

- وارداتِ قلب کی تشریح
- دل کی کیفیّات

فصل اوّل

وارداتِ قلب کی تشریح

معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی جسم میں سب سے زیادہ اعلیٰ و افضل عضو دل ہے۔ یہی اللہ کو جانتا اس کے لیے عمل کرتا اور اس کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اللہ کے قریب کرنے والا اور صاحبِ مکاشفہ بھی یہی ہے اور اعضاء اس کے تابعدار اور خادم ہیں۔ وہ ان سے اس طرح کام لیتا ہے جیسے بادشاہ غلاموں سے۔ یہ سچ ہے کہ جس نے اپنے دل کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

اکثر لوگ اپنے دل اور اپنے نفس سے بے خبر ہیں، چنانچہ اسی لیے اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اس کا حائل ہونا یہ ہے کہ اس کو اپنی معرفت اور اپنے مراقبے سے روک دے، پس دل اور اس کی صفات کی پہچان دین کی جڑ اور سالکین کے طریقے کی بنیاد ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دل اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے ہدایت کو قبول کرتا ہے اور اپنی طبعی خواہشات اور شہوات کی بنا پر اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس کے اندر شیطان اور فرشتوں کے لشکروں کی ہمیشہ جنگ جاری رہتی ہے تاوقتیکہ دل ایک کے لیے فتح نہ ہو جائے۔ پھر وہ اس میں ڈیرہ لگاتا ہے اُسے اپنا وطن بناتا ہے اور دوسرے کا گزر اس میں صرف اختلاس (جھپٹ) کی صورت میں رہ جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ[1] (وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جانے والے کی برائی سے) اور یہ (شیطان) وہ ہے جو اللہ کے ذکر کے وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب غفلت واقع ہوتی ہے تو اس پر چھا جاتا ہے اور دل سے شیطانی لشکروں کو صرف اللہ کا ذکر ہی ہانک سکتا ہے کیونکہ وہ ذکر کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دل کی مثال قلعے کی سی ہے اور دشمن (شیطان) قلعے میں داخل ہونا اُس پر

---

[1] سورۃ الناس۔ آیت: ۵

حکومت کرنا اور غالب آنا چاہتا ہے۔ قلعے کی حفاظت اس کے دروازوں کی نگرانی سے ہی ہو سکتی ہے۔ اور جب تک دروازوں کی پہچان نہ ہو ان کی نگرانی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب تک شیطان کے اندر داخل ہونے کے راستے معلوم نہ ہوں اس وقت تک اس کی مدافعت نہیں ہو سکتی۔

شیطان کے اندر آنے کی راہیں اور دروازے بندے کی صفات ہیں۔ اور وہ بہت سی ہیں، ہم اُن میں سے بڑے بڑے دروازوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ایسی سڑکوں کی طرح فراخ ہیں جو شیطانی لشکروں کی کثرت سے بھی تنگ محسوس نہیں ہوتیں۔

ان بڑے دروازوں میں سے حسد اور حرص ہیں۔ جب بندہ کسی چیز کی حرص کرتا ہے تو وہ اُسے اندھا بہرہ کر دیتی ہے اور اس کی بصیرت کے نور کو ڈھانپ لیتی ہے جس سے وہ شیطانی راستوں کو پہچانتا تھا۔ اسی طرح جب انسان حاسد ہو گا، تو اُس وقت شیطان کو مداخلت کا موقع ملے گا۔ حریص کی نگاہ میں ہر وہ چیز اچھی ہو گی جو اس کی خواہش تک اس کو پہنچائے اگرچہ وہ خواہش بری اور فحش ہی کیوں نہ ہو۔

ان بڑے دروازوں میں سے غضب، شہوت اور تُندی و تیزی بھی ہے۔ غضب عقل کی تباہی ہے اور جب عقل کا لشکر کمزور ہو جاتا ہے تو شیطان اس پر حملہ کر دیتا ہے اور پھر وہ انسان کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس کہتا ہے جب کسی بندے میں سختی ہو تو ہم اس کو اس طرح لڑھکاتے ہیں جیسے بچہ گیند کو۔

ان دروازوں میں سے مکان، کپڑوں اور سامان کی خوبصورتی کی محبت بھی ہے۔ شیطان ہمیشہ انسان کو مکان کی تعمیر اور اس کی چھتوں اور دیواروں کی زیب و زینت اور کپڑوں اور سامان کی خوبصورتی کی دعوت دیتا رہتا ہے اور کم عقل انسان ساری زندگی انہی چیزوں میں برباد کر دیتا ہے۔

ان دروازوں میں سے سیر ہو کر کھانا بھی ہے کہ اس سے شہوت طاقت پکڑتی ہے اور وہ طاعت سے رُک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان میں سے لوگوں کی چیزوں کی طمع بھی ہے۔ جو آدمی کسی چیز کی طمع رکھے گا وہ اس کی ایسی تعریف کرے گا جو اس میں نہیں ہو گی اور اس سے مداہنت کرے گا اور اسے بھلائی کا حکم نہ دے گا اور برائی سے روک نہیں سکے گا۔

ان دروازوں میں سے جلد بازی اور تحقیق نہ کرنا بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جلد بازی

شیطان سے ہے اور غور و فکر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے "

ان دروازوں میں سے مال کی محبت بھی ہے۔ جب یہ دل میں راسخ ہو جاتی ہے تو دل کو بگاڑ دیتی ہے، اسے ہر طرح سے مال جمع کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسے بخیل بنا دیتی اور تنگدستی سے ڈراتی ہے یہاں تک کہ انسان کو لازمی حقوق سے بھی روک دیتی ہے۔

ان دروازوں میں سے عوام کو مذہبی تعصب پر اُبھارنا اور دین کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ کرنا بھی ہے۔

ان دروازوں میں سے عوام کو اللہ تعالیٰ کے اور اس کی صفات کے متعلق سوچنے اور ایسے امور پر غور کرنے پر آمادہ کرنا بھی ہے جہاں تک ان کی عقلیں نہ پہنچ سکیں۔ یہاں تک کہ ان کو اصل دین کے متعلق شک میں ڈال دیا جائے۔

ان دروازوں میں سے مسلمانوں پر بدگمانی بھی ہے، جو مسلمان سے بدگمان ہو گا وہ اس کو حقیر سمجھے گا۔ اُس کے متعلق زبانِ طعن دراز کرے گا اور اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھے گا۔ بدگمانی بدگمان کرنے والے کی خباثت سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ مومن، مومن کا عذر قبول کرتا ہے اور منافق اس کے عیبوں کو کریدتا ہے۔ انسان کو تہمت لگنے کے مقامات سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ اس کے متعلق بُرا گمان نہ ہو۔

یہ کچھ حصہ تھا شیطانی راستوں کے تذکرے کا۔ اور ان آفات کا علاج یہ ہے کہ بُری صفات سے دل کو پاک کر کے ان راستوں کو بند کیا جائے۔ اور ان شاء اللہ ان صفات پر آئندہ تفصیلی گفتگو ہو گی۔

جب دل سے بُری صفات کی جڑیں اکھیڑ دی جائیں گی تو بھی دل میں شیطانی خیالات کا گزر تو ہو گا لیکن وہ پائیدار نہ ہوں گے۔ ان خیالات کو اللہ کا ذکر روک سکتا ہے اور دل کی آبادی تقویٰ سے ہے۔

شیطان کی مثال اس بھوکے کُتے کی سی ہے جو تمھارے پاس آیا پھر اگر تمھارے سامنے گوشت اور روٹی نہیں ہو گی تو وہ تمھارے دُر دُر کہنے سے چلا جائے گا اور اگر تمھارے سامنے یہ چیزیں ہوں اور کُتا بھوکا ہو تو وہ صرف ڈانٹنے سے نہیں جائے گا۔ بس اسی طرح وہ دل ہے جو شیطان کی خوراک سے خالی ہو تو صرف ذکر سے شیطان وہاں سے چلا جائے گا، لیکن جس دل پر خواہشات غالب آ چکی ہوں وہ ذکر کو اپنے کناروں پر روک دیتا ہے۔ ذکر اس کے مرکز میں راسخ نہیں ہوتا، کیونکہ مرکز میں تو شیطان ڈیرہ لگا لیتا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنا چاہو تو اپنی نماز پر غور کرو اور دیکھو شیطان کس طرح

اس وقت دل میں خیالات ڈالتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دل کے خیالات معاف کر دیے گئے ہیں اور ارادہ بھی خیالات میں شامل ہے۔ جس نے اللہ سے ڈر کر گناہ کا ارادہ چھوڑ دیا اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے نہ چھوڑے تو بھی اس میں نرمی کی توقع ہے۔ ہاں اگر پختہ ارادہ ہو تو پھر نہیں کیونکہ گناہ پر پختہ ارادہ کرنا بھی گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب دو مسلمان تلوار اٹھا کر آمنے سامنے آجائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں"۔ پوچھا گیا: "مقتول کیوں دوزخی ہے؟" تو فرمایا "کیونکہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کی خواہش رکھتا تھا"۔

اور ارادے پر مواخذہ کیوں نہ ہو، جبکہ اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے۔ کبر، ریا اور عُجب وغیرہ یہ سب باطنی امور ہی تو ہیں۔ اگر کوئی آدمی اپنے بستر پر کسی اجنبی عورت کو پائے اور اسے اپنی بیوی سمجھ کر اس سے صُحبت کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر اپنی بیوی کو اجنبی سمجھ کر اس سے مجامعت کر لے تو وہ گنہگار ہوگا اور یہ سب کچھ دل کے ارادے ہی سے تو ہے!

فصل دوم

دل کی کیفیات

حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے: "اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ اور اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر لگا دے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ: "دل کی مثال پرندے کے پر کی سی ہے جسے ہوائیں جنگل میں الٹ پلٹ کرتی رہتی ہیں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ بھلائی یا برائی پر ثابت رہتے یا ان میں متردد ہونے میں دل تین طرح کے ہیں:

پہلا۔ وہ جو تقویٰ سے آباد ہے۔ ریاضت سے پاک ہو چکا ہے اور برے اخلاق سے صاف ہے۔ اس دل میں غیب کے خزانوں سے بھلائی کے خیالات آتے رہتے ہیں اور فرشتہ رہنمائی کرتا رہتا ہے۔

دوسرا۔ وہ جو ذلیل ہے۔ اس میں خواہشات بھری ہیں۔ اس میں گندگیاں ٹھونسی گئی ہیں اور برے اخلاق سے آلودہ ہے۔ اس پر شیطان کا غلبہ رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے جگہ بڑی فراخ ہے اور ایمان کا داعیہ کمزور ہو جاتا ہے۔ دل خواہشات کے دھوئیں سے بھر جاتا ہے اور روشنی ختم ہو جاتی ہے، گویا ایسے ہو جاتا ہے جیسے آنکھ دھوئیں سے بھری ہو۔ اس حالت میں وہ دیکھ نہیں سکتی۔ ایسے دل پر وعظ و نصیحت کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔

تیسرا: وہ ہے جس میں مختلف خیالات آتے ہیں۔ برے خیالات آتے ہیں تو وہ اسے برائی کی دعوت دیتے ہیں۔ پھر ایمان کے خیالات آتے ہیں تو وہ اسے نیکی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شیطان عقل پر حملہ کرتا ہے اور بری خواہش کے جذبے کو طاقت دیتا ہے۔ کہتا ہے کیا تو فلاں فلاں کو نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی خواہشات میں کیسے آزاد ہیں۔ یہاں تک کہ علماء کی ایک جماعت کو بھی گنتا ہے؛ چنانچہ نفس شیطان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ پھر فرشتہ، شیطان پر حملہ کرتا ہے اور انسان سے کہتا ہے۔ دنیا میں صرف وہی ہلاک ہوئے ہیں جو عاقبت کو بھول گئے۔ تم لوگوں کی غفلت سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر گرمی

کے موسم میں لوگ دھوپ میں کھڑے ہوں اور تمھارے پاس ٹھنڈا مکان ہو، تو کیا تم لوگوں کی موافقت کرو گے یا اپنی مصلحت دیکھو گے ؟ اور جب تم سورج کی گرمی میں اُن کی مخالفت کرو گے تو ان کاموں میں کیوں مخالفت نہیں کرو گے جن کا انجام دوزخ ہے ؟ اب نفس فرشتے کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور دونوں لشکروں میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دل پر وہ غالب آ جاتا ہے جو اس کا زیادہ حقدار ہے، جو بھلائی کے لیے پیدا ہوا اس کے لیے بھلائی آسان ہو جاتی ہے اور جو برائی کے لیے پیدا ہوا اس کے لیے برائی۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (جسے اللہ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں رکھنا چاہتا ہے اُس کا سینہ نہایت ہی تنگ کر دیتا ہے جیسا کہ وہ آسمان میں چڑھتا ہے) اے اللہ ہمیں اپنے پسندیدہ کاموں کی توفیق عطا فرما۔

لہ سورۃ الانعام - آیت : ۱۲۵

کتاب الاخلاق

- ریاضتِ نفس اور تہذیبِ اخلاق
- تہذیبِ اخلاق
- امراضِ دل کی علامات اور اپنے نفس کے عیب معلوم کرنے کا طریقہ
- اچھی بری خواہشات
- اچھے اخلاق کی علامات
- ابتدائی عمر میں بچوں کی ریاضت
- آخرت کا خوف

فصل اوّل

ریاضتِ نفس اور تہذیبِ اخلاق

معلوم ہونا چاہیے کہ حُسنِ خلق انبیاء اور صدیقین کی صفت ہے اور بُرے اخلاق مہلک زہر ہیں جو انسان کو شیطان کی لڑی میں پرو دیتے ہیں اور ایسی روحانی بیماریوں میں مبتلا کرتے ہیں جن سے ہمیشہ کے لیے عزّت برباد ہو جائے، تو چاہیے کہ تم پہلے بیماریوں کو پہچانو اور پھر ان کے علاج میں کمرِ ہمّت باندھو۔ ہم مختصر طور پر روحانی امراض اور ان کے علاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آئندہ یہ بحث ان شاء اللہ تعالیٰ بڑی تفصیل سے آئے گی۔

معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں نے حُسنِ خُلق کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا، بلکہ اس کے نتائج و ثمرات بیان کیے ہیں اور پھر ثمرات بھی سارے بیان نہیں کیے، بلکہ جو کچھ کسی کے ذہن میں آیا لکھ دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ اکثر حُسنِ خُلق کو حُسنِ خَلق کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے فلاں اچھّے خُلق اور خَلق والا ہے، یعنی اس کا ظاہر اور باطن دونوں اچھے ہیں۔

خَلق سے مراد ظاہری صُورت ہے اور خُلق سے مراد باطنی صورت اور یہ اس لیے کہ انسان جسم اور روح سے مرکب ہے جسم تو ظاہری آنکھ سے نظر آتا ہے، لیکن روح بصیرت (دل کی آنکھ) سے معلوم ہوتی ہے۔ دونوں کی ایک شکل وصورت ہے۔ اچھی یا بُری۔ اور روح جسے بصیرت سے دیکھا جاتا ہے وہ اس جسم سے زیادہ قیمتی ہے جو آنکھ سے نظر آتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے معاملے کو بلند فرمایا اور کہا: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] (میں مٹی سے ایک آدمی پیدا کرنے والا ہوں جب میں اس کو برابر کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں)

---

[1] سورۃ حجر - آیت: ۲۹

یہاں بتایا یہ گیا کہ جسم تو مٹی کی طرف منسوب ہے لیکن روح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تو خُلق نفس کی اس ہیئتِ راسخہ کا نام ہے جس سے افعال بغیر کسی فکر کے آسانی اور سہولت سے صادر ہوں۔ پھر اگر وہ افعال اچھے ہوں، تو اس کا نام اچھا خُلق ہے اور اگر بُرے ہیں تو بُرا خُلق۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاق کے تبدیل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جیسے کہ ظاہری شکل کو تبدیل کرنا ناممکن ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اخلاق ناقابلِ تغیر ہوتے تو وعظ و نصیحت کا کوئی معنی ہی نہ ہوتا۔ تم اخلاق کی تبدیلی کا انکار کیسے کر سکتے ہو حالانکہ دیکھتے ہو کہ وحشی جانور بھی مانوس ہو جاتے ہیں۔ کُتّے کو شکار "نہ کھانا" سکھایا جاتا ہے اور گھوڑا اچھی چال اور بہترین فرمانبرداری سیکھ جاتا ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بعض طبیعتیں اصلاح جلد قبول کر لیتی ہیں اور بعض مشکل سے۔

جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ جبلّت تبدیل نہیں ہوتی اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ ان صفات کو پوری طرح ختم کرنا مقصود نہیں۔ ریاضت کا مقصد صرف یہ ہے کہ خواہش کو اعتدال پر رکھا جائے جو کہ افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ پوری طرح ختم کرنا کوئی اچھا مقصد بھی نہیں کیونکہ شہوت (خواہش) کو بھی جبلّت میں ضروری فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر کھانے کی خواہش ختم ہو جائے تو انسان ہلاک ہو جائے۔ یا جماع کی خواہش ختم ہو تو نسل منقطع ہو جائے۔ اسی طرح اگر غضب پوری طرح ختم ہو جائے تو انسان مہلک چیزوں سے اپنی مدافعت نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ[1] (کافروں پر سخت گیر) اور سختی غضب ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اگر غضب ختم ہو جائے تو کفّار سے جہاد ناممکن ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ[2] (غصّے کو پی جانے والے) یہ نہیں کہا "غصّے کو ختم کر دینے والے"۔

اسی طرح کھانے کی خواہش میں بھی اعتدال مطلوب ہے کہ نہ زیادہ کھاؤ اور نہ بہت کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا[3] (کھاؤ پیو اور زیادتی نہ کرو)

شیخ مرید میں غضب اور شہوت کی طرف میلان دیکھے تو بہتر ہے کہ مطلق طور پر اُن کی مذمّت میں مبالغہ کرے، تاکہ اسے درمیان میں لایا جا سکے اور ریاضت کا مقصد بھی اعتدال پر لانا ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ

---

[1] سورۃ فتح۔ آیت: ۲۹ [2] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۳۴ [3] سورۃ اعراف۔ آیت: ۳۱

سخاوت ایسا خُلق ہے جو شرعًا مطلوب ہے اور وہ فضول خرچی اور تنگی کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی ہے: وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (اور وہ یہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کے درمیان ان کی سیدھی راہ ہے)

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اعتدال کبھی تو فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ کتنے ہی بچے پیدائشی طور پر سچے، سخی اور حلیم ہوتے ہیں۔ اور کبھی اعتدال کسبی ہوتا ہے، یعنی ریاضت سے حاصل ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ خُلقِ مطلوب کو پیدا کرنے والے اعمال پر نفس کو آمادہ کیا جائے۔ جو آدمی سخاوت کا خُلق حاصل کرنا چاہے وہ تکلف سے سخیوں کی طرح خرچ کرے، تاکہ یہ اس کی طبیعت بن جائے۔

اسی طرح جو آدمی اپنے اندر تواضع کی صفت پیدا کرنا چاہتا ہو تو وہ تواضع والوں کے کام تکلف سے بھی کرے۔ اسی طرح باقی اخلاقِ حمیدہ بھی ہیں کہ عادت کی اس میں تاثیر ہوتی ہے۔ جیسے کوئی آدمی اگر کاتب بننا چاہے تو وہ کتابت کے کام میں مشغول رہے گا یا فقیہ بننا چاہے تو فقہاء کے فعل تکرار میں مشغول رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کے دل پر فقہ کی صفت منقش ہو جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی تاثیر ایک دو دن میں پیدا ہونے کی توقع نہ رکھے ہمیشہ کرتا رہے گا تو اس کی تاثیر ہوگی جیسا کہ بچے کی نشو و نما میں پورا قد دو تین دن میں نہیں ہو جاتا اور ہمیشگی میں بڑی تاثیر ہے۔

اس نقطۂ نظر سے تھوڑی سی عبادت کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے بشرطیکہ اس پر مداومت کی جائے۔ اسی طرح تھوڑے سے گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔

جیسے فضائل کی باتوں پر ہمیشہ عمل کرنا نفس میں تاثیر پیدا کرتا ہے اور طبیعت کو تبدیل کر دیتا ہے، اسی طرح کام نہ کرنے سے سستی کی عادت ہو جاتی ہے اور آدمی اس کے سبب سے ہر بھلائی سے محروم ہو جاتا ہے۔

کبھی نیک لوگوں کی صحبت سے اخلاقِ حسنہ کا اکتساب کیا جاتا ہے کیونکہ انسان کی طبیعت چور ہے۔ بھلائی برائی کو چراتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہوتی ہے "کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہے۔ ہر کسی کو دیکھنا چاہیے کہ کس سے دوستی رکھتا ہے"۔

---

[1] سورۃ فرقان - آیت: ۶۷

فصل دوم

تہذیب اخلاق

یہ تو آپ کو معلوم ہوچکا کہ اخلاق میں اعتدال نفس کی صحت اور اعتدال سے نکل جانا بیماری ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ روح کے علاج کی مثال بھی بدن کے علاج جیسی ہے۔ جیسے بدن کامل پیدا نہیں ہوتا، بلکہ غذا اور تربیت سے مکمل ہوتا ہے اسی طرح روح بتدریج درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ تزکیہ اور تہذیب اخلاق علمی غذا سے مکمل ہوتی ہے۔

طبیب کا کام یہ ہے کہ صحت کی حفاظت کرے اور اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اس کا کام صحت کو واپس لانا ہے۔ اسی طرح نفس ہے کہ جب وہ پاک وصاف اور اخلاقِ حسنہ سے مزین ہو تو اس کی حفاظت کرے اور اسے زیادہ طاقت ور بنائے اور اگر اس میں کمال نہ ہو تو اس میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

جیسے امراضِ بدنیہ کا علاج بالضد کیا جاتا ہے۔ اگر گرمی ہو تو سردی سے اور سردی ہو تو گرمی سے۔ یہی حال بُرے اخلاق کا ہے۔ برائیاں دل کی بیماریاں ہیں۔ ان کا علاج بھی بالضد ہے۔ جہالت کی بیماری کا علاج علم سے کیا جائے گا اور بخل کا سخاوت سے، اسی طرح تکبر کا تواضع سے اور حرص کا پسندیدہ چیز چھوڑ دینے سے۔

جیسے بیمار بدن کی صحت کے لیے بعض اوقات کڑوی دوائیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور مرغوب چیزوں سے پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح دل کی بیماریوں میں بھی مجاہدے کی کڑواہٹ اور علاج میں صبر کرنا پڑتا ہے، بلکہ اس میں تو بطریق اولیٰ کرنا چاہیے کہ بدنی امراض سے تو موت کی صورت میں نجات مل جاتی ہے لیکن دل کی بیماری ایسا عذاب ہے جو موت کے بعد بھی ہمیشہ رہے گا۔

مُرشد کو چاہیے کہ مریدوں کے روحانی امراض کا علاج ایک ہی خاص فن کی ریاضت سے نہ کرے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات بیماریوں کی پہچان ہے، کیونکہ ہر مریض کا علاج ایک جیسا نہیں ہوتا۔

جب وہ کسی کو امورِ شریعت سے جاہل دیکھے تو اُسے علم سکھائے۔ کسی کو متکبّر پائے تو اُسے ایسے اعمال بتائے جن سے تواضع پیدا ہو اور اگر کوئی بڑا غصیل ہو تو اسے حلم اور برداشت کی تعلیم دے۔

اپنے نفس کا علاج کرنے والے کو سب سے زیادہ قوتِ عزم کی ضرورت ہے۔ اگر وہ متردد ہو گا تو اس کی کامیابی بہت مشکل ہے۔ جب وہ اپنے ارادے کی کمزوری معلوم کرلے تو اسے سختی سے روکے اور اگر اس کی عزیمت میں کمزوری دیکھے تو اسے سزا دے تاکہ دوبارہ ایسا نہ کرے۔ جیسا کہ ایک آدمی نے اپنے نفس سے کہا تو غیر ضروری باتیں کرتا ہے، میں تجھے ایک سال کے روزوں کی سزا دوں گا۔

امراضِ دل کی علامات اور اپنے نفس کے عیب

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر عضو ایک خاص فعل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی بیماری کی علامت یہ ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام نہ دے سکے، یا وہ کام تو کرے، لیکن اس میں کچھ اضطراب ہو، ہاتھ کی بیماری ہے پکڑ نہ سکنا، آنکھ کی بیماری ہے دیکھ نہ سکنا اور دل کی بیماری یہ ہے کہ وہ مخصوص کام نہ کر سکے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے اور وہ ہے علم اور حکمت اور معرفت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عبادت اور ان چیزوں کو ہر خواہش پر مقدم سمجھنا۔

اگر انسان ہر چیز کو جان لے اور اللہ تعالیٰ کو نہ جانے تو گویا اس نے کچھ بھی نہ جانا۔ معرفت کی پہچان محبت ہے۔ جو اللہ کو پہچانے گا وہ اس سے محبّت رکھے گا اور محبّت کی علامت یہ ہے کہ اپنی تمام محبوب چیزوں کو اس پر قربان کردے۔ تو جو آدمی کسی محبوب چیز کو اللہ پر ترجیح دے اس کا دل بیمار ہے، جیسا کہ وہ معدہ جو روٹی کھانے پر مٹی کھانے کو ترجیح دیتا ہے۔

اور دل کی بیماری اتنی مخفی ہوتی ہے کہ کبھی بیمار کو بھی اپنی بیماری کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی لیے اُس سے غافل رہتا ہے اور اگر جان بھی لے تو کڑوی دوا پر صبر کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کی دوا خواہش کی مخالفت ہے اور اگر اس پر صبر کر بھی لے تو کوئی ایسا حاذق طبیب نہیں ملتا جو اس کا علاج کر سکے۔ طبیب تو علماء ہیں۔ اور بیماری اُن پر بھی غالب آچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بیماری لاعلاج ہو چکی ہے۔ یہ علم مٹ چکا ہے اور دلوں کی طب اور دل کی بیماریاں غیر معروف ہو چکی ہیں۔ لوگ ایسے اعمال میں مشغول ہیں جن کا ظاہر عبادت اور باطن عادت ہے اور یہی اصل مرض ہے۔

بیماری سے بچے رہنا اور علاج کے بعد صحت کی طرف لوٹنا اس طرح سے ہے کہ اپنی بیماری کو دیکھے۔ مثلاً اس کی بیماری اگر بُخل ہے تو اس کا علاج مال خرچ کرنا ہے لیکن اسراف نہ کرے کہ فضول خرچی کی حد

تک پہنچ جائے تو یہ ایک دوسری بیماری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی آدمی ٹھنڈک کا علاج اتنی غالب حرارت سے کرے کہ جسم میں حرارت غالب آجائے۔ یہ بھی ایک بیماری ہوگی۔ مطلوب اعتدال ہے۔

اعتدال معلوم کرنا چاہو تو اپنے نفس کو دیکھو۔ اگر مال کا روک رکھنا اور جمع کرنا تمھارے نزدیک زیادہ لذت بخش ہو مستحق پر خرچ کرنے کے مقابلے میں تو جان لینا چاہیے کہ بُخل کی صفت غالب ہے۔ اب مال خرچ کرنے سے اپنے نفس کا علاج کرو۔ اور اگر بے ضرورت خرچ کرنا تمھارے نزدیک زیادہ آسان ہو بہ نسبت روکنے کے، تو تم میں فضول خرچی کی صفت غالب ہے۔ اب ہاتھ روکنے کی طرف توجہ رکھو، پھر ہمیشہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو اور افعال کے مشکل یا آسان ہونے سے اپنے اخلاق معلوم کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تمھارے دل کا مال سے تعلّق ٹوٹ جائے۔ نہ اس کا میلان جمع کرنے کی طرف رہے نہ خرچ کرنے کی طرف، بلکہ تمھارے نزدیک وہ پانی کی طرح ہو کہ نہ اس کو کسی محتاج کی حاجت سے روکو اور نہ کسی کی حاجت کے لیے اسے خرچ کرو۔ جو دل بھی اس طرح کا ہو جائے گا وہ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہوگا۔

نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی کسی شے سے بھی اس کا تعلّق باقی نہ رہ جائے اور جب دنیا سے کوچ کرے تو اس کے تمام علائق منقطع ہوں۔ کسی طرف بھی اس کی توجہ نہ ہو، نہ اس کے اسباب اسے مزیّن معلوم ہوں۔ اس صورت میں وہ اپنے رب کی طرف نفسِ مطمئنّہ کی طرح رجوع کرے گا۔

دونوں اطراف کے درمیان اعتدالِ حقیقی نہایت ہی مخفی ہے، بلکہ وہ بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، تو ضروری ہے کہ جو آدمی دنیا میں اس سیدھے رستے پر قائم رہے وہ آخرت میں ایسے ہی رستے سے گزر سکے اور چونکہ اس پر استقامت بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا بندے کو حکم ہے کہ وہ ہر روز کئی مرتبہ دعا کرے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (ہمیں سیدھے رستے پر چلا)

جو استقامت کی طاقت نہ رکھے وہ استقامت کے قرب کے لیے کوشش کرے۔ کیونکہ نجات عملِ صالح سے ہے اور اچھے اعمال اچھے اخلاق ہی سے صادر ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ اپنی صفات اور اخلاق کی نگرانی کرے اور یکے بعد دیگرے ان کے علاج میں مشغول ہو جائے۔

اہلِ عزم کو اس معاملے کی کڑواہٹ پر صبر کرنا چاہیے کہ وہ بہت جلد میٹھا ہو جائے گا جیسا کہ بچے کو بعد میں دودھ چھوڑنا اچھا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ابتدا میں وہ دودھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ دودھ چھوڑنے کے بعد اگر اسے ماں کی چھاتی کی طرف لایا جائے تو وہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ جس آدمی کو معلوم ہو جائے کہ آخرت کی زندگی کے مقابل دنیا کی عمر بہت تھوڑی ہے تو وہ ہمیشہ کی نعمت کے لیے چند دنوں کے سفر کی مشقت برداشت

کر لیتا ہے۔ صبح کے وقت لوگ رات کے کیے ہوئے سفر کی تعریف کرتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کا بھلا کرنا چاہتا ہے تو اُس کو اُس کے نفس کے عیوب دکھاتا ہے۔ پھر جس کی بصیرت کامل ہو اس پر اپنے عیوب مخفی نہیں رہتے۔ اور جب وہ عیوب کو پہچان لے گا، تو علاج کی بھی توقع ہوگی، لیکن اکثر لوگ اپنے عیوب سے ناواقف ہیں۔ ان کو اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

جو آدمی اپنے نفس کے عیوب معلوم کرنا چاہے اس کے لیے چار طریقے ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ کسی کامل شیخ کے سامنے بیٹھے جو اس کو نفس کے عیوب اور ان کے طریقۂ علاج سے مطلع کرے۔ ایسے لوگوں کا اس زمانے میں وجود نایاب ہے۔ اگر کسی کو ایسا آدمی مل جائے، تو اسے طبیب حاذق مل گیا۔ کسی حال میں بھی اس سے الگ نہ ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی دیندار، صاحبِ بصیرت، راستباز کو اپنا دوست بنائے اور اسے اپنے نفس پر نگران مقرر کرے تاکہ وہ اس کو اس کے بُرے اخلاق و افعال پر متنبہ کرتا رہے۔ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "اللہ اُس آدمی پر رحم فرمائے جو ہمارے عیوب ہم کو بتائے"۔

بیان کیا جاتا ہے ایک دن حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ نے اُن سے اپنے عیوب کے متعلق سوال کیا۔ اُنھوں نے کہا: "میں نے سُنا ہے کہ آپ کے دستر خوان پر دو دو کھانے ہوتے ہیں۔ اور آپ نے دو جوڑے کپڑے بنوا رکھے ہیں۔ ایک جوڑا رات کو پہنتے ہیں اور ایک دن کو"۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ان کے علاوہ بھی کوئی چیز سُنی ہے؟"

کہا: "نہیں"۔ تو آپ نے فرمایا: "یہ دونوں باتیں آئندہ آپ نہ سُنیں گے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کرتے تھے": کیا میں منافقوں میں سے ہوں؟" اور یہ اس لیے کہ جو آدمی بھی ہوشیاری میں بلند مرتبہ والا ہوگا وہ اپنے نفس کو زیادہ متہم کرے گا۔ ہاں اس زمانے میں ایسے دوست کمیاب ہیں جو مداہنت کو چھوڑ دیں اور عیب کی صحیح طور پر نشاندہی کریں یا حسد کو چھوڑ دیں اور ضرورت سے زیادہ بیان نہ کریں۔

سلف صالحین ایسے آدمیوں کو پسند کرتے تھے جو اُن کے عیوب اُن کو بتائیں، لیکن اس زمانے میں ان آدمیوں کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے جو ہمیں ہمارے عیوب سے مطلع کریں۔

بُرے اخلاق بچھوؤں کی طرح ہیں۔ اگر کوئی آدمی ہمیں مطلع کرے کہ ہمارے کپڑے کے نیچے بچھو ہے، تو ہمیں اُس کا ممنون ہونا چاہیے۔ اور بچھو کو مارنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ بُرے اخلاق بچھو سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کی زبان سے اپنے عیوب معلوم کرے کیونکہ دشمن کی آنکھ برائیاں ہی دیکھتی ہے اور یوں کینہ ور دشمن سے آدمی اپنے عیوب کی تشخیص میں زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، بہ نسبت مداہنت کرنے والے دوست کے، جو اُس کے عیوب کی پردہ پوشی کرے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں میں مل جُل کر رہے اور ان میں جو ناپسندیدہ باتیں دیکھے اُن سے پرہیز کرے۔

اچھی بُری خواہشات

ہم بیان کر چکے ہیں کہ نفس کی خواہشات کسی نہ کسی فائدے ہی کے لیے ہیں۔ اگر کھانے کی خواہش نہ ہو تو غذا کا حصول نہ ہوا ور اگر مجامعت کی خواہش نہ ہو تو نسل منقطع ہو جائے، البتہ اس سلسلے میں اچھی اور بُری خواہش کا فرق ضرور ہے۔ بری بات ناجائز خواہشات ہیں۔ کسی خواہش کا حد سے بڑھ جانا بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اس اندازے کو نہیں سمجھا، اس لیے وہ نفس کی تمام خواہشات کو دبا دیتے ہیں۔ حالانکہ نفس کے حق کو ساقط کرنا بھی ظلم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بنا پر بھی اس کا حق ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے"

ان میں سے بعض آدمی کہتے ہیں کہ "اتنے برس سے میرا نفس یہ خواہش کر رہا ہے اور میں اس کی خواہش پوری نہیں کرتا"۔ یہ حلال سے انحراف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ آپ حلوا اور شہد استعمال کرتے تھے جو آپ کو مرغوب تھے۔ تو کم علم زاہد کی طرف توجہ نہ کرو جس نے مطلق طور پر اپنے نفس کو خواہشات سے محروم کر رکھا ہے۔ وہ انصاف کی بہ نسبت ظلم کے زیادہ قریب ہے۔ ہاں خواہش کو اس وقت چھوڑ دینا چاہیے جب مطلوب شے کا حصول مشکل ہو۔ مثلاً مکروہ طریقے سے حاصل ہوتی ہو یا اس کے پورا کرنے سے عزم ٹوٹتا ہو کہ پھر نفس ہمیشہ اس کی خواہش کرنے لگے یا عبادت میں غفلت واقع ہوتی ہو۔ اس کے سوا نفس کی تقویت کے لیے خواہش کو پورا کرنا ایسے ہی ہے جیسے مریض کا علاج۔ نفس سے نرمی کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاکہ وہ عمل کی طاقت پائے۔

فصل چہارم

اچھّے اخلاق کی علامات

بعض اوقات مرید اپنے نفس سے مجاہدہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ برائی اور گناہ چھوڑ دیتا ہے۔ پھر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کے اخلاق اچھّے ہو گئے ہیں اور یوں وہ مجاہدے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی اسے مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اچھے اخلاق مومنوں کی صفات کا مجموعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد ہوا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ[1] (مومن وہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا[2] (یہی سچے مومن ہیں)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ[3] (توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے)

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ[4] (اور مومنوں کو خوشخبری سنا)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ[5] (مومن کامیاب ہو گئے)

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ[6] (یہی لوگ وارث ہیں)

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا[7] (اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں) آخر سورۃ تک۔

تو جس کو اپنا حال معلوم کرنا مشکل ہو وہ اپنے نفس کو ان آیات پر پیش کرے۔ ان تمام صفات کا موجود ہونا حُسنِ خُلق کی علامت ہے اور ان تمام علامتوں کا فقدان بد اخلاقی کی علامت۔

---

[1] سورۃ انفال - آیت: ۲
[2] سورۃ انفال - آیت: ۴
[3] سورۃ توبہ - آیت: ۱۱۲
[4] سورۃ توبہ - آیت: ۱۱۲
[5] سورۃ مومنون - آیت: ۱
[6] سورۃ مومنون - آیت: ۱۰
[7] سورۃ الفرقان - آیت: ۶۳

بعض صفات کا ہونا اور بعض کا نہ ہونا۔ اخلاق حسنہ کے ہونے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے تو جو موجود ہو اس کی حفاظت میں مشغول رہے اور جو نہیں ہے اسے حاصل کرے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں اور ان سب کو اخلاق حسنہ میں شمار کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" مجھے اس اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے اس وقت تک بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسائے کی عزت کرے۔ اور جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "سب سے کامل مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

حسن خلق میں سے تکالیف کا برداشت کرنا بھی ہے۔ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کھینچی۔ یہاں تک کہ آپ کے کندھے پر چادر کے کنارے کے نشان پڑ گئے۔ پھر اس نے کہا: اے محمد! اللہ کے اس مال میں سے کچھ مجھے بھی دو جو آپ کے پاس ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہنسے اور پھر اسے دینے کے متعلق حکم دیا۔

جب آپ کی قوم آپ کو تکلیف دیتی تو آپ کہتے "اے اللہ میری قوم کو بخش دے یہ جانتے نہیں ہیں۔"

حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ کو جب بچے پتھر مارتے تو کہتے "اے بھائیو! اگر ضرور ہی مارنے ہیں تو چھوٹے چھوٹے مارو تاکہ میری پنڈلی خون آلود نہ ہو کہ تم مجھے نماز سے روک دو۔"

حضرت ابراہیمؒ بن ادہم کسی جنگل کی طرف نکلے۔ آپ کو ایک سپاہی ملا۔ اس نے پوچھا شہر کس طرف ہے؟ آپ نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا، تو اس نے آپ کے سر پر پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ یہ ابراہیمؒ ہیں تو ان کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا تو آپ نے کہا۔ جب اس نے میرے سر پر پتھر مارا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے جنت کا سوال کیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے مارنے کی وجہ سے

مجھے اجر ملے گا۔ میں نے یہ پسند نہ کیا کہ مجھے تو اس کی وجہ سے بھلائی ملے اور اسے میری وجہ سے برائی۔

کوئی بزرگ بازار سے گزر رہے تھے کہ مکان کی چھت سے آپ پر راکھ پھینک دی گئی۔ اُن کے ساتھی بولنے لگے تو بزرگ نے کہا: "اگر آگ کے مستحق سے راکھ پر صلح ہو جائے تو اُسے ناراض نہیں ہونا چاہیے"۔

اُن لوگوں کے نفوس ریاضت سے نرم ہو چکے تھے۔ ان کے اخلاق معتدل ہو گئے تھے اور اُن کے باطن کھوٹ سے پاک وصاف۔ اس کا نتیجہ رضا بالقضاء کی صورت میں نکلا۔ جو اپنے نفس میں وہ علامات نہ دیکھے جو ان لوگوں میں تھیں، تو اسے ریاضت پر مداومت کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی اس بلند مقام پر پہنچ سکے۔ اس لیے کہ وہ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچا۔

فصل چہارم

ابتدائی عمر میں بچّوں کی ریاضت

معلوم ہونا چاہیے کہ بچّہ ماں باپ کے پاس امانت ہے اور اُس کا دل ایک سادہ وصاف جوہر. وہ ہر نقش کو قبول کر سکتا ہے۔ اگر اُسے نیکی کی عادت ڈالی جائے گی تو اُس کی نشو ونما اُسی پر ہوگی اور اُس کے ماں باپ اور اُستاد اس کے ثواب میں شریک ہوں گے اور اگر اُسے بُرائی کی عادت ڈالی جائے گی، تو اُسی پر بڑھتا چلا جائے گا اور اس کا بوجھ اُس کے سرپرستوں پر ہوگا، تو چاہیے کہ اُسے بُرائی سے بچائیں اور ادب و تہذیب اور اچھے اخلاق سکھائیں۔ بُرے ساتھیوں کے پاس بیٹھنے سے روکیں۔ نازونعمت کی عادت نہ ڈالیں اور آرام اور زینت کے اسباب اس کی نظروں میں محبوب نہ بنائیں، کیونکہ وہ بڑا ہو کر پھر انہی کی طلب میں اپنی زندگی برباد کرے گا۔

اوّل عمر ہی سے بچّے کی نگرانی کرنی چاہیے۔ اُسے دودھ پلانے اور پرورش کرنے والی کوئی نیک اور متدیّن عورت تلاش کرنی چاہیے جو حلال کی روزی کھاتی ہو کیونکہ حرام کی خوراک سے حاصل ہونے والے دودھ میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ پھر جب اس میں تمیز کے آثار معلوم ہونے لگیں اور سب سے پہلے شرم وحیا ہوگی اور یہ شرافت کی علامت ہے اور یہ بالغ ہونے کے بعد کمال عقل کی بشارت بھی ہے، تو اس کی اسی صفت سے اس کی تادیب اور تہذیب میں مدد لی جائے۔

سب سے پہلے جو صفت بچّے پر غالب آئے گی وہ کھانے کی خواہش ہے، تو چاہیے کہ اُسے کھانے کے آداب سکھائے اور اُسے عادت ڈالے کہ کبھی کبھی وہ رُوکھی روٹی بھی کھائے تاکہ سالن کو ہر وقت ضروری نہ سمجھے اور اُسے بتائے کہ زیادہ کھانا بُرا اور زیادہ کھانے والا چار پایوں کی طرح ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اُسے سفید کپڑوں کی ترغیب دلائے۔ ریشمی اور رنگین کپڑوں سے پرہیز کرائے اور بتائے کہ یہ عورتوں اور مخنّثوں کا لباس ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے نازونعمت میں رہنے والے بچّوں سے الگ رکھے۔ وہ کچھ بڑا ہو جائے (ہمارے ملک میں پانچ یا چھ سال کی عمر) تو اُسے مدرسہ میں قرآن و حدیث اور نیک لوگوں کے حالات کی تعلیم میں مشغول کرے

تاکہ اس کے دل میں نیک لوگوں کی محبت پیدا ہو اور وہ عشقیہ اشعار یاد نہ کرے۔

جب بچے سے کوئی اچھا فعل یا اچھا خلق ظاہر ہو تو اُس پر اُس کی عزت کی جائے اور جس چیز سے وہ خوش ہو اُسے وہ تحفے کے طور پر دی جائے اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اگر کسی وقت اس کے خلاف اُس سے کوئی فعل ظاہر ہو، تو اس سے چشم پوشی کی جائے، اُس کے کام کو ظاہر نہ کیا جائے۔ اگر دوبارہ کرے تو اسے پوشیدہ طور پر ملامت کرے اور ڈرائے کہ لوگوں کو میں اس کی اطلاع دے دوں گا۔ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔ کہ اس سے ملامت کا سننا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت اپنی ہیبت کو برقرار رکھے۔

ماں کو چاہیے کہ بچے کو باپ کا خوف دلائے اور اُسے دن کو نہ سونے دے کہ اس سے سستی پیدا ہوتی ہے۔ رات کو سونے سے نہ روکے، لیکن اُسے نرم اور آرام دہ بستر نہ دے تاکہ اس کے اعضاء سخت ہو جائیں اور وہ بستر اور لباس اور طعام میں سختی کا عادی ہو جائے۔ اسے چلنے پھرنے حرکت کرنے اور ورزش کی عادت ڈالے، تاکہ اس پر سستی غالب نہ ہو۔ اُسے ماں باپ کے کمالات یا اپنے کھانے اور لباس پر فخر کرنے سے روکے اور اپنے ساتھیوں سے تواضع سے پیش آنے کی تاکید کرے۔ نیز اس بات سے بھی روکے کہ وہ کسی بچے سے کوئی چیز لے۔ اسے بتائے کہ لینا "کمینگی" ہے۔ بلندی "دینے" میں ہے۔ اُس کے ذہن سے سونے چاندی کی محبت نکالے اور اُسے عادت ڈالے کہ نہ مجلس میں تھوکے نہ ناک صاف کرے۔ نہ دوسروں کی موجودگی میں جماہی، ہچکی یا انگڑائی لے اور نہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹے۔ زیادہ بولنے سے بھی اُسے روکے۔ عادت ڈالے کہ وہ صرف جواب میں بولے۔ یہ بھی سمجھائے کہ جب کوئی آدمی گفتگو کرے، تو اُسے غور سے سُنے۔ اپنے سے بڑے کے لیے کھڑا ہو جائے اور اُس کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھے۔

بُری گفتگو اور بُرے لوگوں کی مجلس سے روکے، کیونکہ بچوں کی اصلی حفاظت یہ ہے کہ اُن کو بُرے ساتھیوں سے بچایا جائے؛ تاہم مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد اُسے اچھے کھیل سے نہ روکا جائے کہ تعلیم و تربیت کی تھکاوٹ سے آرام پائے جیسا کہ کہا گیا ہے: "راحت پانے والے دل نصیحت قبول کرتے ہیں"۔

بچے کو والدین اور اُستاد کی اطاعت اور تعظیم سکھانا چاہیے۔ جب وہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دے اور طہارت کے چھوڑنے میں چشم پوشی نہ کرے۔ اسے جھوٹ اور خیانت سے ڈرائے اور جب بلوغت کے قریب ہو تو کوئی کام اس کے سپرد کر دے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ کھانا دوا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کے لیے بدن میں قوت پیدا ہو جائے۔

یقیناً یہ دنیا فانی ہے۔ موت دنیا کی نعمتیں ختم کر دے گی۔ چاہیے کہ ہر وقت اس کا انتظار رہے۔ عقلمند وہ ہے جو آخرت کا سامان بنا لے۔

اگر بچے کی تربیت صحیح ہو گی تو یہ سب باتیں اس کے دل میں اس طرح بیٹھ جائیں گی جیسے پتھر میں نقش ہوتا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: "میں تین برس کا تھا اور رات کے وقت کھڑا ہو کر اپنے ماموں محمد بن سوار کو نماز پڑھتے دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن انھوں نے کہا: کیا تو اللہ کا ذکر نہیں کرتا جس نے تجھے پیدا کیا ہے؟ میں نے کہا: میں اس کا ذکر کیسے کروں؟ تو انھوں نے کہا: اپنے دل میں بغیر زبان ہلائے تین مرتبہ کہو: اَللّٰہُ مَعِیَ۔ اَللّٰہُ نَاظِرٌ اِلَیَّ۔ اَللّٰہُ شَاھِدِیْ (اللہ میرے ساتھ ہے۔ اللہ مجھے دیکھتا ہے۔ اللہ میرا گواہ ہے) میں نے کئی رات ایسا ہی کیا۔ پھر آپ کو بتایا تو کہا: اسے ہر رات گیارہ مرتبہ پڑھا کرو۔ میں نے ایسا ہی کیا تو میرے دل میں اس کی لذت پیدا ہو گئی۔ پھر ایک سال گزر گیا، تو ماموں نے مجھ سے کہا: جو میں نے تجھے سکھایا ہے اس کو یاد رکھ اور قبر میں جانے تک اس پر مداومت کر۔ چنانچہ میں نے کئی سال تک اس کی پابندی کی اور مجھے اپنے باطن میں اس کی لذت معلوم ہوئی۔ پھر میرے ماموں نے کہا: اے سہل! جس کے ساتھ اللہ ہو اور وہ اس کو دیکھ رہا ہو اور وہ اس کا نگران بھی ہو تو کیا ایسا شخص اللہ کی نافرمانی کر سکتا ہے؟ اللہ کی نافرمانی سے بچ۔"

پھر میں مدرسہ میں چلا گیا اور میں نے چھ یا سات سال کی عمر میں قرآن پاک یاد کر لیا۔ اب میں ہمیشہ روزے رکھتا اور میری غذا جَو کی روٹی تھی۔ میں ساری رات قیام بھی کرنے لگا۔"

آخرت کا خوف

معلوم ہونا چاہیے کہ جس نے آخرت کو اپنے دل سے یقینی طور پر دیکھ لیا وہ لازماً اسی کو چاہے گا اور دنیا سے بے رغبت ہو گا۔ جس کے پاس کوڑیاں ہوں وہ ایک نفیس ہیرا دیکھ لے، تو کوڑیوں کی طرف اُس کی رغبت نہیں رہے گی۔ اگر اس سے کہا جائے کہ کوڑیوں سے ہیرا خرید لو، تو وہ بڑی جلدی

کرے گا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جس کو اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر تنبیہ کر دے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ گناہوں سے بچے۔ یہ اجتناب گویا ایک قلعہ ہے جس میں وہ محفوظ رہے گا۔ اُس پر لازم ہے کہ نفس کی مخالفت کرے اور وظائف و اوراد میں اعتدال کو ملحوظ رکھے۔

ریاضت کی انتہا یہ ہے کہ دل ہمیشہ اللہ کے ساتھ ہو اور یہ غیر اللہ سے خالی ہونے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ خوبی بلے مجاہدے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

یہ ہے مرید کی ریاضت کا طریقہ اور اُس کی تدریجی تربیت۔ باقی رہی ہر صفت میں ریاضت کی تفصیل تو وہ ان شاء اللہ عنقریب آئے گی۔

کتاب التزکیہ

حصہ اوّل

- شکم اور جنس کی خواہشات کا سدّ باب
- زبان کی آفات
- غیبت پر آمادہ کرنے والے اسباب اور اُن کا حل
- غضب، کینہ اور حسد کی مذمّت
- حلم اور عفو و درگزر
- دنیا کی مذمّت
- مال کی مذمّت، مدح اور قناعت و سخاوت
- قناعت کے فوائد
- بُخل اور اُس کی مذمّت
- ایثار کی فضیلت
- حُبّ جاہ کا علاج
- حقیقی اور مصنوعی زُہد

فصل اوّل

شکم اور جنس کی خواہشات کا سدِّباب

معلوم ہونا چاہیے پیٹ کی شہوت سب سے زیادہ ہلاکت آفرین ہے۔ اسی کی وجہ سے آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے۔ دراصل پیٹ ہی کی شہوت سے شرمگاہ کی شہوت اور مال کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے بے شمار آفتیں آتی ہیں اور یہ سب پیٹ بھرنے کی مستی کے باعث ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ: "ابنِ آدم نے پیٹ سے بُرا برتن اور کوئی نہیں بھرا۔ آدم کے بیٹے کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔ پھر اگر پیٹ بھرنا ہی ضروری ہو تو (پیٹ کا) ایک حصہ کھانے کے لیے رکھے۔ دوسرا پانی کے لیے اور تیسرا سانس لینے کے لیے"۔

حضرت عقبہؓ راسبی نے کہا: "میں حسن کے پاس گیا وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کہنے لگے آؤ کھاؤ۔ میں نے کہا: میں تو اتنا کھا آیا ہوں کہ اب گنجائش نہیں ہے"۔ انھوں نے کہا: "سبحان اللہ! کیا مسلمان اتنا کھاتا ہے کہ گنجائش ہی باقی نہ رہے"!

زاہدوں کی ایک جماعت نے تھوڑا کھانے اور بھوک پر صبر کرنے میں مبالغہ کیا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب میں ہم نے اس کے نقصان بیان کیے ہیں۔ کھانے میں انصاف کی بات یہ ہے کہ کچھ بھوک ہو تو ہاتھ اٹھا لے اور اس مقام میں سب سے بہترین قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ ایک حصّہ کھانے کے لیے ایک پانی کے لیے اور تیسرا سانس کے لیے رکھے۔

اعتدال سے کھانے سے جسم تندرست رہتا ہے۔ بیماری دور ہوتی ہے اور یہ اس طرح ہے کہ بھوک کے بغیر کھانا نہ کھائے اور خواہش ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھا لے۔ بالکل ہی کم کھانے سے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنا کھانا پینا کم کیا، تو بالآخر وہ فرائض ادا کرنے سے رہ گئے۔ لوگوں نے اپنی جہالت

سے اس کو فضیلت سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اور جس نے بھوک کو اچھا کہا ہے اس نے اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

پیٹ کی شہوت کو توڑنے کی ریاضت کا طریقہ یہ ہے کہ جو ہمیشہ سیر ہو کر کھانے کا عادی ہو اُسے چاہیے کہ اپنے کھانے میں سے تھوڑا تھوڑا ہر روز کم کرتا جائے، یہاں تک کہ اس اعتدال کی حد تک پہنچ جائے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ بہترین کام اوسط درجے کے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اتنا کھائے جس سے عبادات میں رکاوٹ نہ ہو اور قوت کے باقی رہنے کا سبب بنے۔

کھانے والا نہ تو بھوک محسوس کرے اور نہ بالکل سیر ہو۔ اسی صورت میں بدن صحیح اور ہمت اکٹھی رہے گی۔ اور فکری قوت صاف ہو گی۔ زیادہ کھائے گا تو اس سے زیادہ نیند اور کند ذہنی پیدا ہو گی کیونکہ دماغ میں بخارات زیادہ ہو جاتے ہیں جو فکر کی جگہ اور ذکر کے مقام کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ نیز کچھ اور بیماریاں بھی پیدا کرتے ہیں۔

جو آدمی خواہشات میں سے کسی کو چھوڑے، تو اُسے ہوشیار رہنا چاہیے کہ اس میں ریا کی آفت نہ پیدا ہو جائے۔ اور بعض سلف پسندیدہ خواہش کی چیز خرید لیتے اور اپنے گھر میں اسے لٹکا دیتے اور اسے استعمال نہ کرتے۔ وہ اپنے زہد کو چھپاتے۔ یہی حقیقی زہد ہے کہ زہد کا اظہار اس کی ضد سے کیا جائے اور یہ صدیقین کا عمل ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے نفس کو دو مرتبہ صبر کا پیالہ پلایا اور یہ پیالہ دوسری مرتبہ تو بہت زیادہ کڑوا ہے۔

باقی رہی شرمگاہ کی شہوت، تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی میں جماع کی خواہش دو فائدوں کے لیے پیدا کی گئی ہے:

پہلا فائدہ بقائے نسل ہے اور دوسرا لذت کا ادراک کہ اس پر آخرت کی لذتوں کو قیاس کرے کیونکہ جو جنس ذوق سے معلوم نہ ہو اس کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اس شہوت کو اعتدال پر نہ رکھا جائے، تو اس سے بہت سی آفتیں اور آزمائشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عورتیں شیطان کا جال نہ ہوتیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے اپنے پیچھے مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر زیادہ نقصان دہ کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔"

بعض صالحین نے کہا: "اگر کوئی آدمی مجھے بیت المال پر امین مقرر کر دے تو اُمید ہے کہ میں اُس کی امانت اُسے ادا کر دُوں گا، لیکن اگر کسی کالی کلوٹی عورت پر امین مقرر کر دے کہ میں ایک گھڑی اُس کے ساتھ خلوت میں رہوں تو میں اپنے نفس پر مطمئن نہیں ہوں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ جائے کہ تیسرا ان میں شیطان آجائے گا"۔

کبھی اس شہوت میں افراط انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کا خیال عورت سے کثرتِ جماع کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اُسے آخرت کی یاد بُھلا دیتا ہے۔ (یہاں تک کہ (بدکار عورتوں میں) بعض اوقات بدکاری اور عشق تک نوبت جا پہنچتی ہے)

خواہشات میں بدترین خواہش یہی ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

کبھی لوگوں میں مال، مرتبے اور چوسر، شطرنج اور طنبورے وغیرہ کا عشق پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اُن کے دلوں پر غالب آجاتی ہیں اور وہ اُن سے صبر نہیں کر سکتے۔

ابتداء میں تو ان چیزوں سے بچنا آسان ہے، لیکن آخر میں بڑے سخت علاج کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی تو سخت علاج بھی کارگر نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی گھوڑے کی لگام پھیر دے جبکہ وہ کسی دروازے میں داخل ہونا چاہے تو لگام پھیر دینے سے گھوڑے کو روک لینا آسان ہے لیکن جو آدمی بیماری راسخ ہونے کے بعد اس کا علاج کرنا چاہے اُس کی مثال ایسی ہے کہ گھوڑے کو چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ دروازے میں داخل ہو کر آگے نکل جائے پھر اُسے دُم سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچے اور ان دونوں صورتوں میں کتنا بڑا فرق ہے!

فصل دوم

زبان کی آفات

زبان کی آفات بہت سی ہیں اور کئی طرح کی ہیں۔ مثلاً دل میں اُن سے حلاوت پیدا ہوتی ہے۔ اور طبیعت اس کا سبب ہے۔ زبان کے خطرات سے نجات صرف خاموشی میں ہے؛ چنانچہ پہلے ہم خاموشی کی فضیلت بیان کریں گے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ آفات کا مفصّل ذکر ہو گا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ خاموشی سے ہمت مجتمع اور فکر فارغ ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی مجھے اپنے دونوں جبڑوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیزوں کی ضمانت دے میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے: "کسی بندے کا ایمان سیدھا نہیں ہوتا جب تک اس کا دل سیدھا نہ ہو اور دل اس وقت تک سیدھا نہیں ہوتا جب تک زبان سیدھی نہ ہو۔"

حضرت معاذؓ کی حدیث کے آخر میں ہے کہ: اس (زبان) کو بند رکھ: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم سے زبان کی باتوں پر بھی مواخذہ ہوگا؟ تو فرمایا: "معاذ! تیری ماں تجھے گُم کرے۔ جہنم میں مونہوں کے بل (یا فرمایا) ناک کے بل لوگوں کو زبان کی کٹائی کے علاوہ اور کونسی چیز گرائے گی؟"

ایک اور حدیث میں ہے: "جس نے اپنی زبان روک لی اللہ نے اس کی پردہ پوشی کر دی۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میری زبان سے زیادہ لمبی قید کی اور کوئی چیز مستحق نہیں ہے۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "اپنے منہ سے اپنے کانوں کو انصاف دلاؤ۔ تمھیں کان دو عنایت کیے گئے ہیں اور منہ ایک تاکہ بولنے سے زیادہ سنو۔"

مخلد بن حسین نے کہا: "میں نے پچاس سال سے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے مجھے معذرت کرنی پڑے۔"

کلام کی آفتیں

پہلی آفت بے مقصد گفتگو کرنا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جس نے اپنے وقت کی قیمت کو جان لیا جو اُس کا اصل سرمایہ ہے، وہ اسے بے فائدہ خرچ نہیں کرے گا اور یہ جان لینا بے فائدہ گفتگو کرنے سے زبان کو روکنے کا سبب ہے۔ جو اللہ کا ذکر چھوڑ کر بے فائدہ گفتگو میں مشغول ہو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ہیرا حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو، لیکن وہ مٹی کا ڈھیلہ اُٹھالے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کا اچھا اسلام یہ ہے کہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔"

لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ کو یہ حکمت کس طرح ملی؟ تو کہا "بے ضرورت میں کوئی سوال نہیں کرتا اور بے مقصد گفتگو نہیں کرتا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ لقمان حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپ زرہ بنا رہے تھے۔ لقمان دیکھ کر متعجب ہوئے اور اُس کے متعلق پوچھنے کا ارادہ کیا لیکن آپ کی حکمت مانع ہوئی؛ چنانچہ آپ نے نہ پوچھا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام فارغ ہوئے تو اُٹھ کر زرہ پہنی۔ کہا: "جنگ کے لیے بہت اچھی ہے۔"

لقمان نے کہا: "خاموش رہنے میں کئی حکمتیں ہیں لیکن اس کو اپنانے والے کم ہیں۔"

دوسری آفت باطل گفتگو کرنا ہے اور وہ ہے گناہوں کی گفتگو۔ جیسے شراب کی مجالس اور بدکرداروں کے مقامات کا تذکرہ۔ اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بندہ کبھی ایسی گفتگو کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ مشرق و مغرب کے فاصلہ سے بھی زیادہ جہنم کی گہرائی میں جا گرتا ہے۔"

اور اسی سے قریب ہے مناظرہ کرنا اور دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بحث مباحثہ جس کا اصل سبب بڑا بننے کی خواہش ہوتی ہے۔

انسان کو چاہیے کہ بُری بات کا انکار اور درست بات بیان کرے۔ اگر اس سے قبول کیا جائے تو فبہا ورنہ مناظرہ چھوڑ دے، لیکن یہ جب ہے کہ معاملہ دین کا ہو اور اگر دنیاوی کام ہوں تو اس میں مناظرہ بازی کا کوئی جواز نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اُس تکبر کو توڑے جو اُسے بڑا بننے پر ابھارتا ہے اور جھگڑا کرنا

مناظرہ سے بڑھ کر ہے، کیونکہ مناظرہ سے زائد چیز ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "اللہ کے نزدیک سب سے برا آدمی بدخو، جھگڑالو ہے۔" اور یہ جھگڑا وہ ہے جو باطل پر یا لاعلمی پر مبنی ہو۔ اگر کسی کا حق ہو، تو بھی بہتر یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے جھگڑے سے بچے کیونکہ اس سے دل گرم ہوتا ہے۔ غصہ بھڑکتا ہے، کینہ پیدا ہوتا ہے جو دوسرے کی بے عزتی کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

تیسری آفت کلام میں تصنع کرنا ہے اور وہ ہے منہ بنا کر بات کرنا اور تکلف سے قافیہ بندی۔

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے نزدیک قیامت کے دن مبغوض ترین اور زیادہ بداخلاق زیادہ باتیں بنانے والے، زبان مروڑ کر اور منہ بھر کر باتیں کرنے والے ہوں گے۔" اور قافیہ بندی کی کراہت، اور تصنع میں تذکیر کے وہ الفاظ داخل نہیں ہیں جو کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوں کیونکہ ان سے دلوں میں تحریک اور شوق وغیرہ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ فخر اور تکبر کے اظہار کی غرض سے استعمال نہیں کیے جاتے۔

چوتھی آفت بے حیائی، گالی گلوچ اور فحش گوئی ہے اور یہ مذموم ہے۔ شریعت نے اس سے روکا ہے، کیونکہ اس کا منبع خباثتِ نفس اور کمینگی ہے۔ حدیث میں ہے کہ: "تم فحش گوئی سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ فحش گوئی اور فحش گو بننے کو پسند نہیں کرتا۔ ہر بے حیا پر جنت حرام ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "مومن نہ طعنے دیتا ہے نہ لعنت اور نہ فحش گوئی اور بے حیائی کرتا ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ فحش اور بذاء (بے حیائی) یہ ہے کہ قبیح امور کو صاف لفظوں میں بیان کیا جائے اور ان میں سے اکثر جماع وغیرہ کے متعلق ہوتے ہیں، نیک لوگ ایسی باتوں سے بچتے اور کنایہ سے کام لیتے ہیں۔

ایسے ہی آفات میں سے گانا بجانا بھی ہے۔ اس سے پہلے اس پر مفصل گفتگو گزر چکی ہے۔

پانچویں آفت ہنسی مذاق ہے، ہاں اگر سچ ہو اور کبھی کبھی ہو تو ممانعت نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض اوقات مذاق کرتے، لیکن سچ کہتے۔ آپ نے ایک آدمی سے کہا: "او کانوں والے۔" اور ایک آدمی سے کہا: "ہم تجھے اونٹ کے بچے پر سوار کریں گے۔" اور ایک بڑھیا سے کہا: "جنت میں کوئی بڑھیا نہیں جائے گی۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا﴾[1] (بے شک ہم نے پیدا کیا ان کو

[1] سورۂ واقعہ۔ آیت: ۳۵

پیدا کرنا اور بنایا ہم نے ان کو کنواریاں) اور ایک عورت سے کہا: تیرا شوہر وہی ہے نا جس کی آنکھیں سفید ہیں؟
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تین چیزیں پائی گئیں: پہلی یہ کہ مزاح مبنی بر صداقت ہوتا۔ دوسری یہ کہ ان عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں سے ہوتا جن کی تادیب کی ضرورت ہوتی اور تیسری یہ کہ کبھی کبھی ہوتا، اس سے اس کو دلیل نہیں لینی چاہیے جو ہمیشہ مذاق کا عادی ہو کیونکہ کبھی کبھار کا وہ حکم نہیں ہوتا جو ہمیشہ کا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی دن رات حبشیوں کے ساتھ پھرتا رہے اور ان کا کھیل دیکھتا رہے اور دلیل میں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور ان کو حبشیوں کی طرف دیکھنے کی اجازت دی تھی، تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ ایسا ایک ہی دفعہ ہوا تھا۔ بہرحال مزاح میں افراط اور مداومت کرنا منع ہے کیونکہ اس سے وقار ختم ہوتا ہے اور کینہ و عداوت پیدا ہوتی ہے۔
تھوڑا بہت مذاق کرنا جائز ہے۔ اس سے طبیعت میں خوشی و انبساط پیدا ہوتا ہے۔

چھٹی آفت استہزاء اور مسخرہ پن ہے اور مسخرہ پن کا مطلب ہے دوسرے کو ذلیل کرنا اور اس کے عیوب اور نقائص کو اس طرح بیان کرنا کہ لوگ اس سے ہنسیں۔ اور کبھی تو یہ قول و فعل کی نقل اتارنے سے ہوتا ہے اور کبھی اشارے اور ایماء سے اور یہ سب شریعت میں منع ہے۔ کتاب وسنت میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

ساتویں آفت کسی کے راز کو ظاہر کرنا۔ وعدہ خلافی اور ریاست اور قسم میں جھوٹ بولنا ہے اور یہ ساری باتیں منع ہیں، سوائے بیوی یا جنگ میں حیلہ کرنے کے۔ اور اس کا اصول یہ ہے کہ اگر مقصود اچھا ہو اور توریہ کے بغیر حاصل نہ ہو سکتا ہو تو اس میں ایسا کرنا جائز ہے۔ توریہ سے مراد ہے ذو معنی بات۔ اگر مقصود واجب ہو تو یہ بھی واجب ہوگا۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے جھوٹ سے بچے۔
اور توریہ کرنا جائز ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: توریہ میں جھوٹ سے بچنے کی راہ ہے۔
ضرورت کے لیے توریہ جائز اور بے ضرورت مکروہ ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کی مشابہت ہے۔

س کے متعلق احادیث و آثار بہت زیادہ اور مشہور ہیں۔
غیبت کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا ایسا تذکرہ کرو کہ اگر اسے معلوم ہو جائے تو اسے برا محسوس ہو۔ برا یہ ہے کہ وہ اس کے بدن کا نقص ہو جیسے چُندھا، بھینگا، اندھا، گنجا، لمبا، ٹھنگنا وغیرہ۔ یا اس کے سب کا نقص ہو کہ اس کا باپ نبطی یا ہندی یا فاسق یا کمینہ وغیرہ ہے یا اس کے اخلاق کا نقص ہو۔ مثلاً وہ بد خلق یا بخیل یا متکبر ہے یا اُس کے کپڑے کا نقص ہو جیسے اُس کا دامن لمبا ہے۔ اُس کی آستینیں فراخ

ہیں یا اُس کے کپڑے گندے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تُو اپنے بھائی کا ایسا تذکرہ کرے جسے وہ ناپسند کرے۔ کہا اے اللہ کے رسول! اگر واقعی وہ چیز میرے بھائی میں ہو تو پھر؟ آپ نے فرمایا! اگر تیرے بھائی میں وہ ہو جو تو کہتا ہے تو تُو نے اس کی غیبت کی اور اگر جو تُو کہتا ہے اُس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جس چیز سے بھی مذمت سمجھی جائے وہ غیبت میں داخل ہے اور برابر ہے کہ وہ منہ کی بات سے ہو یا اشارے، کنائے یا قلم سے۔ کہ قلم بھی دو زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔

اور غیبت کی بدترین قسم وہ ہے جس کا ارتکاب ریاکار زاہدوں کی مجالس میں ہوتا ہے۔ مثلاً اُن کے پاس کسی انسان کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں "اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں بادشاہوں کے پاس جانے کے فتنے سے بچایا اور دنیا کے مال کی ذلت سے محفوظ رکھا" یا کہتے ہیں "ہم قلتِ حیا سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں" "یا ہم اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں" یوں وہ دوسرے کی مذمت اور اپنی تعریف کو جمع کر لیتے ہیں۔

بعض اوقات کسی انسان کے تذکرے کے وقت کہتے ہیں "اس مسکین کی بڑی آفت سے آزمائش ہوئی ہے اللہ ہم پر اور اس پر رحمت کرے" ظاہر میں تو دعا کرتا ہے، لیکن باطن میں دوسروں کے عیب ظاہر کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ غیبت سننے والا بھی اس گناہ میں شریک ہوتا ہے۔ وہ سننے کے گناہ سے نہیں بچے گا مگر اس صورت میں کہ زبان سے اس کا انکار کرے۔ دل سے بُرا سمجھے اور وہاں سے اُٹھ کر آجائے۔ اگر بات کاٹنے کی طاقت ہو تو اس پر ایسا کرنا واجب ہے۔

توریہ کی مثال ہے وہ واقعہ جو ہمیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق پہنچا ہے کہ آپ نے اپنی لونڈی سے صحبت کی۔ ان کی بیوی کو معلوم ہو گیا وہ چھری لے کر آئی اور آپ فارغ ہو چکے تھے بیوی نے کہا کیا تم نے یہ کام کیا ہے؟ تو کہا میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تو کہنے لگی قرآن پڑھو ورنہ میں تمھارا پیٹ چھری سے پھاڑ دوں گی تو انھوں نے یہ اشعار پڑھے ؎

۱۔ وَفِينَا رَسُولُ اللهِ يَتْلُو كِتَابَهُ   إِذَا انْشَقَّ مَعْرُوفٌ مِنَ الْفَجْرِ سَاطِعُ

۲۔ يَبِيتُ يُجَافِي جَنْبَهُ عَنْ فِرَاشِهِ　　إِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْكَافِرِينَ الْمَضَاجِعُ
۳۔ أَرَانَا الْهُدٰى بَعْدَ الْعَمٰى فَقُلُوبُنَا　　بِهِ مُوقِنَاتٌ أَنَّ مَا قَالَ وَاقِعُ

ترجمہ۔ ۱: ہم میں اللہ کے رسول ہیں جو صبح طلوع ہوتے وقت اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔
۲۔ رات کو اُن کے پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں جبکہ کافروں کے بستر بوجھل ہوتے ہیں۔
۳۔ ہم اندھے تھے آپ نے ہمیں راہ دکھائی تو اب ہمارے دل یقین کرتے ہیں کہ آپ نے جو کہا وہ واقع ہونے والا ہے۔

بیوی نے کہا میں اللہ پر ایمان لائی۔ میں اپنی آنکھ کو جھوٹا کہتی ہوں۔

امام نخعی رحمہ کو جب بلایا جاتا تو آپ لونڈی سے کہتے۔ اُن سے کہو "اُن کو مسجد میں تلاش کرو۔"

آٹھویں آفت غیبت ہے اور قرآن مجید میں اس کی ممانعت آئی ہے اور غیبت کرنے والے کو مردار خور سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور حدیث میں ہے: "کہ تمھارے خون اور تمھارے مال اور تمھاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔"

ابوبرزہ اسلمی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اے وہ لوگو، جو زبان سے ایمان لائے ہو اور ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ تم مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور نہ ان کے عیوب تلاش کرو کہ جس کے عیوب کا اللہ پیچھا کرے گا اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رسوا کردے گا۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "غیبت سے بچو کہ غیبت زنا سے بھی بری ہے۔ ایک آدمی زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے، تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والے کو اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ صاحب حق اُسے نہ بخشے۔"

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے کہا: "غیبت سے بچو کہ وہ انسانی کتوں کا سالن ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کے پاس کسی مسلمان کو ذلیل کیا جا رہا ہو اور وہ اس کی مدد کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور مدد نہ کرے تو اللہ اُسے سب لوگوں کے سامنے ذلیل کرے گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے کسی منافق سے مومن کو بچایا کہ وہ اُس کے عیب بیان کر رہا تھا۔ تو اللہ قیامت کے دن ایک فرشتہ مقرر کرے گا جو اُس کے گوشت کو جہنم کی آگ سے بچائے گا۔"

عمرو بن عتبہ رضی نے اپنے غلام کو ایک آدمی کے ساتھ دیکھا۔ وہ کسی کی غیبت کر رہا تھا تو اُس سے کہا:

"تجھ پر افسوس! اپنے کانوں کو بدزبانی سے پاک رکھ، جیسے کہ تُو اپنے نفس کو اس کے کہنے سے پاک رکھتا ہے۔ سننے والا قائل کا شریک ہے۔ اُس نے اپنے برتن کی برائی کو دیکھا تو اسے تیرے برتن میں انڈیل دیا۔" اگر بے وقوف کی بات اس کے منہ میں لوٹا دی جائے تو تردید کرنے والا خوش نصیب ہو گا جیسا کہ کہنے والا بدبخت ہو گا۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جو حقوق ہیں اُن کے بارے میں اور بہت سی احادیث وارد ہیں۔

فصل سوم

غیبت پر آمادہ کرنے والے اسباب اور اُن کا حل

غیبت پر آمادہ کرنے والے اسباب بہت سے ہیں:

پہلا: کسی آدمی سے کوئی ایسی بات ہوئی کہ غصّہ آگیا۔ جب کسی کا غصّہ بھڑک اُٹھتا ہے تو وہ اپنے ساتھی کی غیبت کرکے دل ٹھنڈا کرتا ہے۔

دوسرا: ساتھیوں کی موافقت اور ہم آہنگی ہے۔ جب وہ کسی کی عزت سے کھیل کر ہنستے ہیں، تو یہ سمجھتا ہے کہ اگر ان کی بات سے اختلاف کرے گا، تو وہ اسے برداشت نہیں کریں گے اور وہ اُن کی موافقت کرتا ہے اور اسے حُسنِ معاشرت سمجھتا ہے۔

تیسرا سبب دوسرے کی تنقیص کرکے اپنے نفس کو بلند کرنا ہے۔ کہتا ہے فلاں جاہل ہے۔ وہ بے سمجھ ہے وغیرہ اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اپنی فضیلت بیان کرے اور ان کو بتائے کہ میں سب سے زیادہ عالم ہوں۔ اسی طرح حسد ہے کہ لوگ کسی آدمی کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے محبّت کرتے اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ تو یہ اُس کی مذمّت کرتا ہے کہ اُن کے دلوں سے یہ چیزیں زائل ہو جائیں۔

چوتھا سبب کھیل اور مذاق ہے۔ وہ مزاح کے طور پر دوسروں کا تذکرہ اس انداز سے کرتا ہے کہ لوگ اس کی بات سن کر ہنستے ہیں۔ بعض لوگوں کا تو یہی معاش ہے۔

غیبت کا علاج یہ ہے کہ انسان اس کے گناہ ہونے سے آگاہ ہو۔ اُسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ غیبت کرکے اللہ کی ناراضگی اور غصّے کا نشانہ بن گیا ہے اور اس کی نیکیاں اُس کو دی جا رہی ہیں جس کی غیبت کرتا ہے اور اگر اُس کے پاس نیکیاں نہیں ہیں تو دشمن کے گناہ اس کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ جو آدمی ان باتوں کو سمجھ لے گا۔ وہ غیبت سے اپنی زبان کو روک لے گا۔

اسی طرح یہ چاہیے کہ جب غیبت کرنے کا موقع پیدا ہو اپنے نفس کے عیوب پر غور کرے اور شرم کرے کہ جب اپنی ذات میں اس قدر عیب ہیں، تو دوسروں کی خامیاں زبان پر لانا کب جائز ہے، جیسا کہ بعض نے کہا:

۱- اگر تو لوگوں کے عیب بیان کرے اور خود تجھ میں بھی ایسے ہی عیب ہوں تو یہ مناسب نہیں کہ دوسروں کو بُرا کہے۔ جو خود بھینگا ہو وہ لوگوں کے عیب کس طرح بیان کرے گا۔

۲- اور اگر تو لوگوں کے وہ عیب بیان کرے جو ان میں نہیں ہیں، تو یہ اللہ اور لوگوں کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔

اور اگر یہ سمجھے کہ خود عیوب سے بچا ہوا ہے، تو اللہ کے اس احسان پر شکر ادا کر۔ بدترین عیب، یعنی غیبت سے اپنے آپ کو ملوّث نہ کر اور جیسے کہ تو یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی تیری غیبت کرے، تو خود بھی لوگوں کی غیبت سے پرہیز کر۔

پھر اس سبب پر غور کر جو غیبت پر آمادہ کرتا ہے اور اس کو دُور کرنے کی کوشش کر، کیونکہ بیماری کا علاج سبب کے دور کرنے سے ہوتا ہے۔

ہم نے بعض اسباب کا تذکرہ کر دیا ہے چاہیے کہ اپنے مرض کا علاج ان چیزوں سے کرے جو عنقریب کتاب الغضب میں بیان ہوں گی۔

ساتھیوں کی ناراضگی کا علاج یہ ہے کہ جان لے اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے جو مخلوق کو راضی کرنا چاہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو ایسے ساتھیوں کو خوش کرنے کے بجائے اُن سے ناراض ہونا چاہیے۔ ایسی ہی اور خرابیوں کا بھی یہی علاج ہے۔

غیبت سے بچاؤ اور کفّارہ

کبھی بدظنی کے باعث بھی انسان غیبت کرتا ہے اور یہ بعض اوقات محض اپنے دل کی بدگمانی ہوتی ہے؛ لہٰذا تجھے مسلمانوں پر بدگمانی نہ کرنی چاہیے۔ ہاں اگر کوئی معاملہ کھل کر سامنے آجائے جس کی تاویل نہ ہوسکے۔ اور اگر تجھے کوئی عادل خبر دے اور تیرا دل اس کی تصدیق کی طرف مائل ہو، تو تُو معذور رہوگا؛ تاہم تجھے تحقیق کرنی چاہیے کہ کہیں یہ عداوت اور حسد تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو یہ تہمت اسی سبب سے ہے۔ کسی مسلمان کے متعلق بدگمانی پیدا ہو، تو اس کی زیادہ رعایت کرنی چاہیے اور اس کے لیے بھلائی کی دعا کرنی چاہیے۔ اس سے شیطان غصّے میں آئے گا اور ایسے خیالات کو تجھ سے روکے گا۔ تیرے دل میں بُرے خیال نہ ڈالے گا کیونکہ وہ ڈرے گا کہ تو مخالف کے لیے دعا میں مشغول ہو جائے گا۔

اگر کسی مسلمان کی لغزش عیاں طور پر معلوم ہو جائے تو اُسے پوشیدہ طور پر سمجھانا چاہیے۔ اچھی طرح سمجھ لے کہ بدگمانی کا نتیجہ تجسّس ہے کیونکہ دل صرف گمان پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ تحقیق طلب کرتا ہے اور تجسّس میں مشغول ہو جاتا ہے اور یہ ناجائز ہے کیونکہ اس سے مسلمان کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ اگر تجھ پر راز نہ کھلے تو تیرا دل مسلمان کے لیے صاف رہے گا۔

یہ باتیں اپنی جگہ، لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ دوسروں کی خامیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے اور اسے غیبت نہیں کہا جا سکتا۔ اُن میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ کسی کے ظلم کا حال بیان کیا جائے۔ مظلوم کو یہ حق ہے کہ ظالم اس پر زیادتی کرے تو اس کے ظلم کا تذکرہ اُس آدمی سے کرے جو اُس کا حق اُسے دلا سکے۔

دوسرا یہ ہے کہ برائی کو دور کرنے کے لیے مدد حاصل کرے اور ظالم کو اصلاح کی راہ پر لانے کی نیّت ہو۔

تیسرا یہ کہ فتویٰ پوچھے۔ مثلاً مفتی سے کہے کہ فلاں آدمی نے مجھ پر ظلم کیا ہے یا اُس نے میرا حق دبا لیا ہے، اس سے نجات کا کیا طریقہ ہے؟ اس صورت میں اگرچہ ظالم کا نام لینا جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اشارے سے کام لے۔ مثلاً کہے کہ اُس آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس پر اُس کے باپ یا بھائی وغیرہ نے ظلم کیا ہے؟

نام لینے کے جواز کی دلیل ہندہ کی حدیث ہے جبکہ اُس نے کہا: ابوسفیان بخیل آدمی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہ کیا۔

چوتھا یہ کہ مسلمانوں کو بچانا ہے۔ مثلاً تو دیکھے کہ کوئی طالب علم کسی بدعتی یا فاسق آدمی کے پاس آتا جاتا ہے اور تجھے خوف ہو کہ یہ اس کی طرف مائل ہو جائے گا، تو تجھے اس کا حال بیان کر دینا چاہیے۔ اسی طرح اگر تجھے اپنے غلام کی چوری یا فسق و فجور کا علم ہو تو تجھے اس کے خریدار سے بیان کر دینا چاہیے۔ نکاح کرنے یا امانت رکھنے کے متعلق کوئی مشورہ طلب کرے، تو چاہیے کہ جو کچھ جانتا ہو خیر خواہی کے طریقے پر بیان کر دے نہ کہ غیبت کے ارادہ سے۔

پانچواں یہ کہ کوئی شخص کسی لقب سے مشہور ہو، جیسے لنگڑا یا چچا تو اگر کوئی اس طرح اس کا تذکرہ کرے تو یہ کوئی گناہ نہیں؛ البتہ کوئی اور صورت بیان کرنے کی ہو تو وہ بہتر ہے۔

چھٹا یہ کہ کوئی شخص علی الاعلان فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو اور ایسے تذکرے سے اس کو برا نہ محسوس ہوتا ہو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا "جو آدمی شرم وحیا کی چادر اتار کر پھینک دے اس کی کوئی غیبت نہیں"۔

حسن سے کہا گیا کہ جو فاجر علی الاعلان فجور کا مرتکب ہو کیا اس کے گناہ کا تذکرہ غیبت ہے؟ کہا نہیں، لیکن اچھی بات بھی نہیں ہے۔

باقی رہا غیبت کا کفارہ، تو معلوم ہونا چاہیے کہ غیبت کرنے والے نے دو گناہ کیے ہیں:

پہلا اللہ تعالیٰ کے حق کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا تھا، تو اس کا کفارہ توبہ اور ندامت ہے۔

دوسرا مخلوق کی عزت پر حملہ۔ اس کا تدارک یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہو اس کے پاس جا کر معافی مانگ لے اور اپنے اس فعل پر شرمندگی کا اظہار کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر مال یا عزت میں ظلم کیا ہو تو وہ اس کے پاس آ کر اس دن سے پہلے پہلے معافی مانگ لے جس دن اس کے پاس نہ درہم ہو گا نہ دینار۔ پھر اگر اس کے پاس نیکیاں ہوں گی تو مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ ورنہ اس کے گناہ اس پر رکھ دیے جائیں گے۔

اگر غیبت کرنے کا حال اس شخص کو معلوم نہ ہوا ہو تو اس سے معافی مانگنے کے بجائے اس کے لیے استغفار کرے۔ جس چیز کا اسے علم نہیں وہ بتا کر اس کے سینے کو گرم نہ کرے۔

حدیث میں آیا ہے کہ "جس کی غیبت کی گئی ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کے لیے استغفار کرے"۔

مجاہد نے کہا ہے کہ "تو نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کی تعریف کرے اور اس کے لیے بھلائی کی دعا کرے۔ اور اگر وہ فوت ہو چکا ہے تو بھی ایسا ہی کرے"۔

زبان کی آفتوں میں سے نویں آفت چغلخوری ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چغلخور جنت میں نہ جائے گا"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ عموماً چغلخوری کا لفظ کسی انسان کے قول کو نقل کرنے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہے کہ فلاں آدمی تیرے متعلق اس اس طرح کہتا ہے، لیکن یہ گناہ اسی سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کرنا برا ہے اسے بیان کرنا چغلی ہے۔ اور برابر ہے کہ وہ اقوال ہوں یا افعال۔

یہاں تک کہ اگر اس نے کسی کو اپنا مال دفن کرتے دیکھا ہو تو اس کا بیان کرنا بھی چغلخوری ہے۔

جس کے پاس چغلخوری کی جاتی ہے مثلاً اُسے کہا جاتا ہے کہ تیرے متعلق فلاں آدمی نے ایسی ایسی بات کہی ہے یا ایسا کیا ہے، تو اس کے لیے یہ چھ باتیں ضروری ہیں:

پہلی یہ کہ چغلخور کو سچا نہ سمجھے کیونکہ وہ فاسق ہے اور اُس کی شہادت مردود ہے۔

دوسری یہ کہ اُس کو اس سے منع کرے اور نصیحت کرے کہ ایسے گناہ کا ارتکاب نہ کرنا چاہیے۔

تیسری یہ کہ اُس سے اللہ کے لیے بغض رکھے کہ اس نے اللہ کو ناراض کیا ہے۔

چوتھی یہ کہ اپنے غیر موجود بھائی کے متعلق بدگمانی نہ کرے۔

پانچویں یہ کہ جو کچھ اُس نے بیان کیا ہے اس کی تحقیق نہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "تجسس نہ کیا کرو"[1]

چھٹی یہ کہ جس بات سے چغلخور کو منع کیا ہے خود اس کا ارتکاب نہ کرے یعنی اس کی چغلی کو بیان نہ کرے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے ایک آدمی سے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم میری غیبت کرتے ہو اور اس اس طرح کہتے ہو۔" اُس آدمی نے کہا: "میں نے ایسا نہیں کیا" سلیمان نے کہا "مجھے بتانے والا سچا آدمی ہے۔" اس آدمی نے کہا: "چغلخور سچا نہیں ہوتا۔" یہ سن کر سلیمانؒ نے کہا: "تم نے سچ کہا، سلامتی سے چلے جاؤ۔"

یحییٰ بن ابی کثیرؒ نے کہا: "چغلخور ایک گھڑی میں اتنا نقصان کر دیتا ہے کہ اتنا نقصان جادوگر ایک مہینے میں بھی نہیں کر سکتا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے ایک غلام کا سودا کیا تو اُس کے مالک نے کہا اس کی چغلخوری اور جھوٹ کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، تو اُس نے کہا ٹھیک ہے تم اس سے بری ہو اور اُسے خرید لیا۔ غلام نے اپنے مالک سے کہا تیری بیوی بدکردار ہے اور وہ تجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ پھر عورت سے کہا تیرا خاوند اور نکاح کرنا چاہتا ہے وہ تجھ پر سوکن لائے گا۔ اگر تو چاہے تو میں اُس کو تجھ پر مائل کروں اور وہ دوسرا نکاح نہ کرے، تو جب وہ سوئے تو اُسترا لے کر اُس کی گردن کا ایک بال مونڈ کر مجھے

---

[1] سورۃ حجرات - آیت: ۱۲

لا دے۔ پھر اس کے مرد سے کہا کہ وہ تجھے سوتے میں قتل کرے گی۔ مرد امتحان کے لیے بظاہر لیٹ کر سو گیا تو وہ عورت اُسترا لے کر آئی کہ اُس کی گردن کا مال مونڈے۔ مرد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے مار ڈالا۔ عورت کے وارث آئے۔ انھوں نے اُس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔

دسویں آفت دوغلے شخص کا کلام ہے جو دو دشمنوں کے درمیان آتا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ وہ ہر ایک سے اس کی مرضی کی بات کرتا اور یقین دلاتا ہے کہ میں تیرا حمایتی ہوں۔

منہ پر تعریف اور بعد میں برائی کرنے والا بھی ایسا ہی ہے۔

حدیث میں ہے کہ بدترین آدمی دوغلہ ہے جو ایک منہ سے اس طرف بات کہتا ہے اور دوسرے منہ سے اُس طرف۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ عام حالت میں ہے۔ اگر امراء کی مدارات کے لیے مجبور ہو تو جائز ہے۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا "ہم کچھ لوگوں کے منہ پر تبسم کرتے ہیں اور ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر طاقت ہو کہ ان کی موافقت کا اظہار نہ کرے تو جائز نہ ہوگا۔

گیارھویں آفت مدح ہے اور اس میں کئی آفتیں ہیں۔ مثلاً کچھ وہ ہیں جو مدح کرنے والے کے متعلق ہیں اور کچھ ممدوح کے متعلق۔

مدح کرنے والے کے متعلق یہ ہیں کہ کبھی وہ ایسی بات کہتا ہے جس کی اسے تحقیق نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی اطلاع ہو سکتی ہے۔ جیسے یہ کہے کہ فلاں پرہیزگار اور زاہد ہے اور کبھی وہ ثنا میں مبالغہ کر کے جھوٹ تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی ایسے لوگوں کی مدح کرتا ہے جو مذمت کے قابل ہیں۔

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ جب فاسق کی مدح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

حسنؒ نے کہا "جس نے ظالم کے باقی رہنے کی دُعا کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کو پسند کیا"

ممدوح میں کبھی تکبر اور غرور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دونوں باتیں مہلک ہیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک آدمی کو ایک آدمی کی تعریف کرتے سنا تو فرمایا: "تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی" یہ مشہور حدیث ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے پاس

دُرّہ تھا۔ لوگ بھی آپ کے پاس بیٹھے تھے کہ جارود آ گیا۔ ایک آدمی نے کہا یہ قبیلہ ربیعہ کا سردار ہے۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے بھی یہ بات سنی اور جارود نے بھی سن لی۔ جب وہ قریب آیا تو حضرت عمرؓ اُسے دُرّے مارنے لگے۔ اُس نے کہا: "اے امیرالمومنین! مجھ سے آپ کی ناراضگی کیا ہے؟" کہا: "کیا تو نے وہ بات نہیں سُنی جو اُس شخص نے کہی تھی؟" کہا: "میں نے سنی تھی پھر کیا ہوا؟" کہا: "میں ڈرا کہ تیرے دل میں اس سے غرور نہ پیدا ہو جائے۔ میں نے اُسے تجھ سے دُور کر دیا"۔

جب انسان کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ اپنے آپ سے خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مقصود کو پہنچ گیا۔ پھر وہ عمل کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی"۔

ہاں اگر مدح ان آفتوں سے پاک ہو تو مدح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح فرمائی ہے۔

ممدوح کو چاہیے کہ تکبر اور غرور کی آفت اور عمل میں سُستی کرنے سے پرہیز کرے۔ اور ان آفتوں سے صرف اسی صورت میں نجات مل سکتی ہے کہ اپنے نفس کو پہچانے اور سوچے کہ اگر مدح کرنے والے کو ان باتوں کا علم ہو جائے جو وہ اپنے متعلق جانتا ہے تو کبھی اُس کی تعریف نہ کرے۔

بیان کیا جاتا ہے ایک نیک آدمی کی تعریف کی گئی، تو اُس نے کہا: "اے اللہ یہ مجھے نہیں جانتے اور تو مجھے جانتا ہے"۔

بارھویں آفت دینی امور سے تعلّق رکھنے والے کلام کے مفہوم میں غلطی کرنا ہے۔ خصوصاً کسی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا جو اللہ تعالیٰ سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان الفاظ کو صحیح طور پر عالم اور فصیح لوگ ہی ادا کر سکتے ہیں۔ جو آدمی عالم یا فصیح نہ ہو اس کا کلام لغزش سے پاک نہیں ہو سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ جہالت کی وجہ سے معاف کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی بھی مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) نہ کہا کرے، بلکہ اس طرح کہے مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شِئْتَ (جو اللہ چاہے اور پھر آپ چاہیں) کیونکہ عطفِ مطلق میں شرکت اور برابری ہے۔

اسی طرح وہ بات ہے جس میں آپؐ نے خطیب کے قول پر اعتراض کیا جبکہ اس نے کہا: وَمَن

یَعْصِھِمَا فَقَدْ غَوٰی (اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوا) فرمایا اس طرح کہو: وَمَنْ یَعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (اور جو اللہ کی نافرمانی کرے اور اس کے رسول کی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی تم میں سے میرا بندہ اور میری بندی نہ کہے، تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں۔ ہاں اس طرح کہو: میرا غلام اور میری خادمہ"

امام نخعیؒ نے کہا "جب کوئی آدمی کسی سے کہے اے گدھے! اے خنزیر! تو قیامت کے دن اُسے کہا جائے گا کیا تو نے میرے متعلق یہ سمجھا کہ میں نے اسے گدھا بنایا اور خنزیر پیدا کیا ہے"۔

ان جیسی اور بہت سی باتیں کلام میں داخل ہیں، ان سب کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ جو آدمی ان باتوں پر غور کرے گا جس کا ہم نے آفاتِ لسان میں ذکر کیا ہے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو بھی اپنی زبان کو بے لگام چھوڑے گا وہ بچ نہیں سکے گا اور اُسے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا راز معلوم ہوگا کہ "جو خاموش رہا اس نے نجات پائی" کیونکہ یہ تمام آفتیں ہلاک کرنے والی ہیں اور یہ سب بولنے والے کی راہ میں ہیں۔ پھر اگر خاموش رہا تو بچ گیا"۔

آفات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے کلام کے متعلق سوال کیا جائے۔ شیطان عام آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ اگر تو علمی بحث کرے گا تو تُو بھی علماء اور اہل فضل میں سے ہو جائے گا اور یہ چیز اسے بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ کفر کی بات کہہ جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قریب ہے کہ لوگ سوال کریں۔ یہ اللہ ہے جس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟"

علم کی گہری باتوں کے متعلق عوام کا سوال کرنا بہت بڑی مصیبت ہے۔ اُن کا اللہ کی صفات کے معانی سے بحث کرنا اُن کو بگاڑتا ہے سنوارتا نہیں، کیونکہ ان پر واجب صرف مان لینا ہے۔ عام آدمی کے لیے بہتر یہ ہے کہ جو کچھ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے، یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلایا ہے اس پر بلا چون و چرا ایمان لے آئے اور عبادات میں مشغول رہے۔ عام آدمی کا علم کے اسرار کے متعلق بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسا جانوروں کے چرواہے کا حکومت کے رموز و اسرار پر بحث کرنا۔

فصل چہارم

غضب، کینہ اور حسد کی مذمت

معلوم ہونا چاہیے کہ غضب آگ کا شعلہ ہے۔ غصے کے وقت انسان کا شیطان لعین سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کا قول نقل فرمایا: خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ[1]۔ (تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو مٹی سے پیدا کیا)

مٹی کی خاصیت ہے سکون اور وقار اور آگ کی خاصیت ہے بھڑکنا اور حرکت اور بے قراری۔

کینہ اور حسد غضب کے نتائج میں سے ہیں۔ غضب کی مذمت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ ایک آدمی نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت کیجیے تو آپ نے فرمایا: "غضب میں نہ آ۔" اس نے کئی مرتبہ یہ سوال دہرایا۔ آپ یہی فرماتے رہے "غصہ نہ کر"

ایک اور حدیث میں ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجھے اللہ کے غضب سے کون سی چیز دور کرے گی؟ تو آپ نے فرمایا: "غصہ نہ کر۔"

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پہلوان وہ نہیں جو مقابل کو گرا دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔"

عکرمہؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا[2] (اور سید اور نکاح نہ کرنے والا) کی تفسیر میں فرمایا: سید وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے اور اس کا غصہ اس پر غالب نہ ہو۔"

بیان کیا گیا ہے کہ ذوالقرنین کی ایک فرشتہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا مجھے کوئی ایسا علم سکھاؤ جس سے میرا ایمان اور یقین زیادہ ہو جائے۔ فرشتے نے کہا: "غصہ نہ کر شیطان سب سے زیادہ غصے کے وقت ہی ابنِ آدم پر قابو پاتا ہے۔"

---

[1] سورہ اعراف۔ آیت: ۱۲

[2] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۳۹

اپنے آپ پر قابو پا کر غصّے کو روکو اور اُسے بردباری سے ختم کر دو۔ جلد بازی سے بچو کہ جلد بازی سے کام لو گے تو غلطی کرو گے۔ دُور و نزدیک سب کے لیے نرم ہو جاؤ۔ سرکش اور ضدی مت بنو۔

بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس لعین، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: "اے موسیٰ! تیزی" سے بچو۔ میں تیز طبیعت آدمی سے اس طرح کھیلتا ہوں جیسے بچّے گیند سے، اور عورتوں سے بچو کہ میرا سب سے مضبوط پھندا جس پر مجھے بڑا اعتماد ہے وہ عورت کا پھندا ہے۔ اور بخیلی سے بچو کہ میں بخیل کی دنیا اور آخرت دونوں برباد کر دیتا ہوں"۔

غضب ایمان کو اس طرح لگاڑتا ہے جیسے مُصبّر شہد کو کڑوا کر دیتا ہے۔ غضب عقل کا دشمن ہے۔

اور غضب کی حقیقت یہ ہے کہ انتقام کے لیے دل کے خون میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان غصّے میں آتا ہے تو غضب کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے جس سے دل کا خون اُبلنے لگتا ہے اور رگوں میں پھیل جاتا ہے اور جسم کے اوپر کے حصّہ کی طرف چڑھتا ہے جیسے کہ ہانڈی اُبلنے سے پانی جوش مارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چہرہ، آنکھیں اور چمڑا سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ سب اپنے پیچھے خون کی سُرخی کا پتہ دیتی ہیں، جیسا کہ شیشہ اپنے اندر کی چیز کا رنگ ظاہر کرتا ہے۔

خون اس صورت میں پھیلتا ہے جبکہ اپنے سے کمزور پر غصّہ آئے اور سمجھے کہ میں اس پر غلبہ پا سکتا ہوں۔ اگر اپنے سے طاقتور پر غصّہ آئے اور اس کے ساتھ ہی انتقام سے مایوسی ہو تو اس صورت میں جلد کے ظاہر سے دل کے جوف میں خون گھٹ جاتا ہے اور غم کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اگر غصّہ اپنے جیسے پر ہو جس میں انتقام کا شک ہو تو خون میں کبھی انبساط پیدا ہوتا ہے اور کبھی انقباض اور چہرہ کبھی سرخ ہوتا ہے کبھی زرد اور طبیعت میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

انتقام قوّتِ غضبیہ کی خوراک ہے اور قوتِ غضبیہ میں لوگوں کے تین مراتب ہیں۔ افراط، تفریط اور اعتدال۔ قوتِ غضبیہ میں افراط کوئی محمود اور اچھی چیز نہیں، کیونکہ وہ دین اور عقل دونوں کو اپنے کام سے روک دیتی ہے اور انسان کے اندر غضب کے افراط کی حالت میں نہ قوتِ فکر باقی رہتی ہے نہ اختیار۔

یہ بات اپنی جگہ، لیکن قوتِ غضبیہ میں کمی بھی بری ہے کیونکہ اس سے نہ حمیّت باقی رہتی ہے نہ غیرت۔ جس میں قوتِ غضبیہ بالکل ہی نہ ہو وہ اپنے نفس کی ریاضت سے عاجز آ جاتا ہے، کیونکہ ریاضت شہوت پر غصّے کو مسلط کرنے سے پوری ہوتی ہے۔ جب نفس گندی خواہشات کی طرف مائل ہوگا تو وہ اپنے نفس پر

غصہ کرے گا۔ غرض قوتِ غضب کا نہ ہونا بھی بُرا ہے۔ چاہیے کہ دونوں حالتوں میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جب غُصے کی آگ طاقتور ہوکر بھڑک اٹھتی ہے، تو آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔ وہ ہر نصیحت سے بہرہ ہوجاتا ہے۔ غضب دماغ کی طرف چڑھتا ہے تو فکر کے خزانے کو ڈھانپ لیتا ہے اور کبھی حس کے مرکز کی طرف دوڑتا ہے، تو اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اُس کا دماغ ایسے غار کی طرح ہو جاتا ہے جس میں آگ جلائی گئی ہو۔ اُس کی فضا سیاہ اور جگہ گرم ہوجائے اور وہ دھوئیں سے بھر جائے۔ اگر اس میں کمزور سا چراغ روشن بھی تھا تو بجھ گیا۔ ایسے غار میں انسان ثابت قدم رہتا ہے نہ اس میں بات سنی جاتی ہے اور نہ اس میں کوئی شکل نظر آتی ہے۔ یہی حال غصہ، دل اور دماغ کا کر دیتا ہے یہاں تک کہ غصہ زیادہ ہوتا ہے تو آدمی، آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔

ظاہر میں غضب کے آثار یہ ہوتے ہیں کہ رنگ بدل جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ افعال میں ترتیب نہیں رہتی۔ جسم تحلیل ہونے لگتا ہے اور انسان دیوانوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ اگر کبھی کوئی غضب کی حالت میں اپنی بدصورتی کو دیکھے تو اپنے نفس سے نفرت کرے۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ باطن کی بدصورتی ظاہر کی بدصورتی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

غضب کو بھڑکانے والے اسباب اور اُن کا علاج

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہر بیماری کا علاج اس کا مادہ ختم کرنے اور اس کے اسباب زائل کرنے سے ہوتا ہے۔ اور غضب کے اسباب ہیں: غرور، تمسخر، جھگڑا، عداوت، دھوکا اور مال و جاہ کی حرص میں شدت۔ اور یہ سب بُرے اخلاق ہیں۔ چاہیے کہ ہر ایک کا مقابلہ اس کی ضد سے کرے اور غضب کے مادے کو جلانے اور اس کے اسباب کو زائل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اور اگر غصہ بھڑک ہی اُٹھے، تو دین کی تعلیمات پر غور کر کے اُسے ٹھنڈا کرے۔ ان میں پہلی بات ان احادیث و اخبار پر غور کرنا ہے جو غصے کو پی جانے اور معاف کرنے اور حوصلہ اور بُردباری سے کام لینے کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اُس کو اجازت دی تو اُس نے آپ سے کہا: "اے

خطاب کے بیٹے! نہ تو تو ہمیں زیادہ مال دیتا ہے اور نہ ہم میں انصاف سے فیصلے کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ غصے میں آ گئے۔ آپ نے اُس کو سزا دینے کا ارادہ کیا تو حُر بن قیسؓ نے کہا: "اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ[1] (معاف کرنے کو لازم پکڑو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیرو) اور یہ جاہل لوگوں میں سے ہے، تو خدا کی قسم! جب حضرت عمرؓ کو آیت پڑھ کر سنائی گئی تو پھر آپ نے اس سے آگے کچھ بھی نہ کیا اور آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے پاس ڈٹ جانے والے تھے۔

دوسری بات یہ کہ اپنے نفس کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے اور اس طرح کہے جتنی مجھے اس انسان پر قدرت ہے اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو مجھ پر قدرت حاصل ہے۔ اگر میں اپنے غصے کو اس پر نکالوں گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنا غصہ مجھ پر نازل کر دیں گے اور اس وقت مجھے عفو کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتابوں میں فرمایا: "اے آدم کے بیٹے! غضب کے وقت مجھے یاد رکھ میں بھی غضب کے وقت تجھے یاد رکھوں گا! ورجن کو میں برباد کروں گا، اُن میں تجھ کو برباد نہ کروں گا۔"

تیسری بات یہ کہ دشمنی اور انتقام کے انجام اور اپنی بے عزتی اور مصیبت پر دشمن کے خوش ہونے سے اپنے نفس کو ڈرائے، کیونکہ انسان مصائب سے تو خالی نہیں ہوتا۔ اگر اسے آخرت کا خوف نہ بھی ہو تو دنیا کی ان باتوں سے اپنے نفس کو ڈرانا چاہیے۔

یاد رکھنا چاہیے غضب پر خواہش کو مسلط کرنے سے ثواب نہیں ہو گا کیونکہ یہ تو بعض خواہشات کو بعض پر مقدم کرنا ہے۔ ہاں اگر اس کی حالت ایسی تبدیل ہو جائے جو اُسے آخرت میں مدد دے تو اس پر ثواب ہو گا۔

چوتھی بات یہ کہ غضب کے وقت اپنی بدشکلی پر غور کرے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اس وقت کاٹنے والے کتے یا حملہ آور درندے کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور انبیاء و اولیاء کے اخلاق سے اس کا کچھ تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس پہلو پر غور کرنے سے غصے کی شدت کم ہو جائے گی۔

پانچویں بات یہ کہ اس سبب پر غور کرے جو اسے انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔ مثلاً اس کے غضب کا سبب

---

[1] سورۃ الاعراف۔ آیت: ۱۹۹

یہ خیال ہو کہ اگر تو نے انتقام نہ لیا تو اس سے تیری عاجزی اور کمینگی اور ذلت اور حقارتِ نفس ظاہر ہو جائے گی اور تو لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جائے گا، تو اپنے نفس سے کہے آج تو اتنی بات برداشت کرنے کو ناپسند کرتا ہے اور قیامت کی رسوائی اور ذلت ناپسند نہیں کرتا جب کہ اللہ تعالیٰ تیرا ہاتھ پکڑے گا اور تجھ سے انتقام لے گا، تو لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونے سے ڈرتا ہے اور اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور نبیوں کے سامنے ذلیل ہوگا!

کیسا بھی اشتعال ہو اپنے غصے کو پی جانا چاہیے۔ اس سے اللہ کے نزدیک معزز ٹھہرے گا۔ لوگوں سے کیا کام؟ کیا تو پسند نہیں کرتا کہ جب قیامت کے روز آواز دی جائے کہ "جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے وہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے!" اور صرف وہی کھڑا ہوگا جس نے معاف کیا ہوگا، تو تو بھی اس وقت کھڑا ہونے والوں میں ہو۔

چھٹی بات یہ کہ تجھے معلوم ہونا چاہیے غضب ایسی چیز پر ہے جو اللہ کے ارادے سے جاری ہوئی نہ کہ تیرے اپنے ارادے سے، تو کسی پر غصہ کر کے اپنے ارادے کو اللہ کے ارادے پر کیسے مقدم کر سکتا ہے؟

باقی رہا عمل تو تجھے چاہیے کہ سکون اختیار کرے۔ اللہ سے پناہ مانگے۔ اپنی حالت کو تبدیل کرے۔ اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہے تو لیٹ جائے۔ ہمیں غضب کے وقت وضو کا حکم بھی دیا گیا ہے اور یہ امور احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

غضب کے وقت وضو کرنے کی حکمت تو حدیث میں وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ ابو وائل ؒ نے کہا: ہم عروہ ؒ بن محمد ؒ کے پاس تھے۔ ایک آدمی نے آپ سے گفتگو کی تو آپ بڑے غصے میں آ گئے پھر اٹھے اور وضو کیا۔ پھر آئے اور کہا: "مجھ سے میرے باپ نے میرے دادا عطیہ ؓ سے روایت کیا ہے اور آپ صحابی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غضب شیطان سے ہے اور شیطان آگ کی مخلوق ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ جب تم میں سے کوئی غضب میں آئے تو وضو کرے"۔

رہا بیٹھنا اور لیٹ جانا، تو ممکن ہے کہ اس کا حکم اس لیے دیا گیا ہو کہ وہ زمین سے قریب ہو جائے جس سے پیدا ہوا ہے اور اپنی اصل کو یاد کرے۔ ایسا کرنے سے تکبر ٹوٹے گا۔

ابو سعید ؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی میں غصہ پیدا ہو وہ اپنا رخسارہ زمین پر لگا دے"۔

بیان کیا جاتا ہے مہدی عباسی ایک آدمی پر غضب ناک ہوا اور کوڑے مارنے والے کو بلایا۔ شبیبؒ نے اس کے غضب کی شدت اور لوگوں کے گردنیں جھکانے کو دیکھا کہ وہ کوئی بات نہیں کر رہے تو کہا: "اے امیرالمومنین! اللہ کے لیے اس سے زیادہ غصہ نہ کیجیے جتنا اس کا گناہ ہے۔" مہدی نے کہا، "اسے چھوڑ دو۔"

فصل پنجم

غصہ پی جانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ[1] (اور غصے کو پی جانے والے) اور اس کو مدح کے مقام میں ذکر کیا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے غصے پر باوجود اس کو نافذ کرنے کی طاقت ہونے کے قابو پا لیا، اللہ تعالیٰ اُس کو برسرِ عام بلائے گا اور اختیار دے گا کہ جو بھی حور چاہو پسند کر لو۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: "جو اللہ سے ڈرا وہ اپنا غصہ جاری نہ کرے گا۔ اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اپنی مرضی نہ کرے گا۔ اور اگر قیامت کا دن نہ ہوتا تو جو دیکھتے ہو دنیا کا یہ رنگ نہ ہوتا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علم تو علم سیکھنے سے آتا ہے اور بُردباری حوصلہ کرنے سے۔ علم حاصل کرو اور اس کے ساتھ سکون اور بردباری بھی حاصل کرو۔ اپنے شاگردوں سے بھی نرمی کرو اور اپنے استادوں سے بھی۔ اور جابر اور سخت گیر علماء سے نہ ہو جاؤ کہ تمھارے جاہل تم پر غالب آ جائیں گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج بن قیس سے فرمایا: "تیری دو عادتیں اللہ اور اس کے رسول کو بڑی پسند ہیں۔ بُردباری اور جلدبازی نہ کرنا۔"

ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو گالی دی۔ جب وہ بات کر چکا، تو آپ نے فرمایا: "اے عکرمہ! دیکھو اس آدمی کی کوئی حاجت ہے جو ہم پوری کریں؟" تو اس آدمی نے اپنا سر جھکا لیا اور شرمندہ ہوا۔

ایک آدمی نے امیر معاویہؓ سے بدکلامی کی تو اُن سے کہا گیا: "آپ اس کو سزا کیوں نہیں دیتے؟" تو فرمایا:

---

[1] سورۃ آل عمران - آیت : ۱۳۴

مجھے شرم آتی ہے کہ میرا حوصلہ میری رعیت کے گناہ سے بھی کم ہو۔"

امیر معاویہؓ نے چمڑے کے بچھونے تقسیم کیے۔ دمشق کے ایک بوڑھے آدمی کو بھی بھیجا۔ وہ اُسے پسند نہ آیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ میں یہ امیر معاویہ کے سر پر ماروں گا۔ پھر وہ امیر معاویہ کے پاس آیا اور اُسے اپنی قسم کے بارے میں بتایا تو امیر معاویہ نے کہا: "اپنی نذر پوری کرو"۔ اور اس بوڑھے سے نرمی سے پیش آئے۔

حضرت ابوذرؓ کا غلام آیا۔ اُس نے آپ کی بکری کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ آپ نے اُس سے کہا: "اس کی ٹانگ کس نے توڑی ہے؟" اُس نے کہا: "میں نے جان بوجھ کر توڑی ہے تاکہ آپ غصّے میں آئیں اور مجھے ماریں اور گنہگار ہوں"۔ آپ نے فرمایا: "جس نے تجھے میرے غصّے پر بھڑکایا ہے میں اُس کو غصّے میں ڈالوں گا"۔ پھر اُس کو آزاد کر دیا۔

ایک آدمی نے عدیؓ بن حاتم کو گالی دی۔ آپ خاموش رہے۔ جب وہ خاموش ہو گیا، تو اس سے کہا: "اگر کچھ اور کہنا چاہتے ہو تو وہ بھی میرے قبیلے کے نوجوانوں کے آنے سے پہلے پہلے کہہ لو کیونکہ اگر وہ سنیں گے کہ اُن کے سردار کو تم اس طرح کہہ رہے ہو تو وہ پسند نہ کریں گے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اندھیری رات میں مسجد میں آئے۔ ایک آدمی سویا ہوا تھا اُس کے پاؤں پر پاؤں جا پڑا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور کہا: "کیا تو پاگل ہے؟" حضرت عمرؒ نے کہا: "نہیں"۔ آپ کے محافظ نے اُس کو مارنے کا قصد کیا، تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: "رک جاؤ! اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کیا تو دیوانہ ہے؟ تو میں نے کہا نہیں!"

ایک آدمی علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے ملا اور آپ کو گالی دی۔ غلام اس پر حملہ کرنے لگے تو آپ نے فرمایا: "چھوڑ دو"۔ پھر اُس آدمی کی طرف توجہ کی اور فرمایا: "ہماری جو چیزیں تجھ سے مخفی ہیں وہ اس سے بھی بڑی ہیں۔ کیا تیری کوئی حاجت ہے کہ ہم مدد کریں؟" وہ آدمی شرمندہ ہو گیا۔ آپ نے اپنی چادر اتار کر اُس کو دی اور حکم دیا اسے ایک ہزار درہم دے دو۔ اس کے بعد وہ آدمی کہا کرتا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ کی اولاد ہیں۔

ایک آدمی نے وہب بن منبہؒ سے کہا: "فلاں آدمی نے آپ کو گالی دی ہے"۔ آپ نے فرمایا: "کیا شیطان کو تیرے سوا کوئی ایلچی نہ ملا؟"

فصل ششم

حلم اور عفوو درگزر

معلوم ہونا چاہیے کہ عفو کا مطلب ہے تمھارا کوئی حق تھا جو تم نے چھوڑ دیا اور تم نے اس کی طرف سے قصاص یا تاوان خود ادا کر دیا۔ اور یہ خُلق ہے جو بُردباری اور غصہ پی جانے کے علاوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ[1] (اور لوگوں کو معاف کر دینے والے) اور فرمایا: فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ[2] (جو آدمی معاف کر دے اور دُرستی کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے)۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صدقہ مال کو کم نہیں کرتا اور معاف کر دینے سے اللہ عزت بڑھاتا ہے۔ اور جو آدمی اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اسے بُلند کرتا ہے۔"

عقبہؓ بن عامر نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عقبہ، کیا میں تجھے دنیا اور آخرت کے رہنے والوں کے بہترین اخلاق نہ بتاؤں؟ جو تجھ سے قطع تعلق کرے تو اس سے صلہ رحمی کر۔ اور جو تجھے نہ دے تو اُسے دے اور جو تجھ پر ظلم کرے تو اس کو معاف کر دے۔"

بیان کیا جاتا ہے قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ جن کا اجر اللہ کے ذمے ہے وہ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں تو صرف وہی کھڑا ہو گا جس نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کیا ہو گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ خود بھی نرم ہیں اور نرمی کو پسند کرتے ہیں اور نرمی پر اللہ تعالیٰ وہ کچھ دے دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیتے۔"

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔"

ایک اور حدیث میں ہے: "کہ جو نرمی سے محروم ہوا وہ سب بھلائیوں سے محروم ہوا۔"

---

[1] سورۃ آلِ عمران - آیت ۱۳۴
[2] سورۃ الشوریٰ - آیت: ۴۰

فصل ہفتم

کینہ اور حسد

جب غصّہ کو اس لیے دبا یا جائے کہ وہ اس کو نکال نہیں سکتا ، تو وہ غصّہ باطن میں جمع ہو جاتا ہے اور یہی کینہ بن جاتا ہے۔ اور اس کی علامت ہے آدمی سے بغض رکھنا۔ اُسے برداشت نہ کرنا اور اس سے نفرت کرنا ، گویا کینہ غضب کا نتیجہ ہے اور حسد کینے کا نتیجہ۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں پہلی اُمتوں کی بیماری چل کر آئے گی جو حسد اور بغض ہے۔"

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "نہ آپس میں بغض رکھو نہ قطع تعلق کرو، نہ حسد کرو اور نہ پیٹھ پیچھے غیبت کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑیوں کو۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "اس راستے سے تمہارے پاس ایک جنتی آدمی آئے گا۔ تو ایک آدمی آیا۔ اُس سے اُس کے عمل کے متعلق پوچھا گیا ، تو اُس نے کہا۔ میرے دل میں کسی مسلمان کے متعلق نہ حسد ہے نہ کینہ کسی بھی بھلائی پر جو اُس کو اللہ نے عطا کی ہو۔"

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: "حاسد آدمی میری نعمت کا دشمن ہے۔ میرے فیصلے سے ناراض ہے اور بندوں میں میری تقسیم پر خوش نہیں ہے۔"

ابن سیرینؒ نے کہا: "میں نے کسی پر بھی کبھی دنیاوی امور میں حسد نہیں کیا کیونکہ یا تو وہ جنتی ہوگا تو میں اُس کے کسی دنیاوی کام میں حسد کیوں کروں ، جبکہ وہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور اگر وہ دوزخی ہے ، تو میں اُس کے کسی دنیاوی کام پر کیا حسد کروں جبکہ وہ دوزخ کی طرف جا رہا ہے۔"

ابلیس لعین نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا: حسد سے بچو کہ اسی حسد نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔

اللہ تعالیٰ تیرے بھائی کو کوئی نعمت عطا کرے تو اس میں تیری دو حالتیں ہیں : پہلی یہ کہ تو اس نعمت کو ناپسند کرے اور چاہے کہ یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے، تو یہ حسد ہے! اور دوسری یہ کہ تو نہ تو نعمت کو اس کے پاس برا سمجھے اور نہ اس کا زوال چاہے، لیکن یہ چاہے کہ مجھے بھی اس طرح کی نعمت ملے، تو اس کا نام غبط (رشک) ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے کہا: "میں کہتا ہوں کہ میں نے کسی کو کماحقہ حسد کی تحقیق کرتے نہیں دیکھا۔ میں اس کی تشریح کرتا ہوں:

معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کا نفس بلندی کی محبت پر پیدا کیا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی ہم جنس اس سے بلند ہو جائے۔ پھر جب کوئی اس سے بلند ہو جاتا ہے تو اسے شاق گزرتا ہے اور اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے، تاکہ یہ اور وہ برابر ہو جائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "تین چیزیں ہیں جن سے کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا: ظن، فال اور حسد"

میں تم کو بتاؤں گا ان سے نجات کی کیا صورت ہے۔ جب تو کوئی ظن (گمان) کرے تو اس کو سچ نہ مان اور جب تو کوئی فال لے تو اس کی پروا نہ کر اور اپنے ارادے پر قائم رہ اور جب حسد کرے تو اس چیز کی خواہش نہ کر جس کے باعث دل میں حسد پیدا ہوا ہے۔

حسد کا علاج کبھی تو رضا بالقضاء سے ہوتا ہے کبھی دنیا کی بے رغبتی سے اور کبھی ان پریشانیوں اور حساب آخرت پر غور و فکر کرنے سے جو اس نعمت سے متعلق ہیں۔ ایسا کرنے سے اس کی تسلی ہو جائے گی اور جب نفس کے تقاضے کے مطابق کام نہ کرے گا تو فطری خواہش بھی اسے نقصان نہ دے گی۔

جو آدمی کسی نبی کی نبوت پر حسد کرے اور چاہے کہ وہ نبی نہ ہوتا۔ یا کسی عالم کے علم پر حسد کرے کہ اسے علم نہ ملتا۔ یا یہ نبوت یا علم ان سے چھین لیا جائے اس کی حالت پر غور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کافر یا شریر نفوس کے علاوہ یہ کسی کی بھی جبلّی خواہش نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی آدمی اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھنا چاہتا ہو یا وہ کسی ایسی چیز پر مطلع ہو جس پر وہ مطلع نہیں ہیں، تو وہ اس سے گنہگار نہ ہوگا کیونکہ اس نے ان کی نعمت کا زوال نہیں چاہا، بلکہ ان سے اپنے بلند ہونے کی خواہش کی ہے کہ اس کے رب کے پاس اس کا حصہ زیادہ ہو، جیسے دو غلام اپنے مالک کی خدمت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ[1] (اور اس میں ریس کرنے والے ریس کریں)

---

[1] سورۃ مطففین۔ آیت: ۲۶

صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا چاہیے۔ ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید عطا کیا ہوا اور وہ دن رات اس سے قیام کرتا ہو۔ اور ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا ہوا اور وہ اُسے حق کی راہ میں دن رات خرچ کرتا ہو۔"

اور حسد کے بہت سے اسباب ہیں اور ان میں سے کچھ عداوت، تکبر، غرور، سرداری کی خواہش۔ خباثتِ نفس اور بخل ہے۔ اور ان میں سب سے زیادہ سخت عداوت اور بغض ہے کہ جس کو کسی انسان نے کسی سبب سے کوئی تکلیف پہنچائی ہو یا مخالفت کی ہو تو اس کا دل اس سے ناراض ہوا اور وہ اسے تکلیف پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس کیفیت سے دل میں کینہ راسخ ہو جاتا ہے۔ اور کینہ انتقام اور بدلہ لینے کا تقاضا کرتا ہے؛ چنانچہ جب اس کے دشمن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ ہے۔ اسی طرح جب اسے کوئی نعمت ملتی ہے تو اُسے بُری لگتی ہے۔ گویا حسد، بغض اور عداوت لازم و ملزوم ہیں۔

پرہیزگاری یہ ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ اگر کوئی کسی انسان سے بغض رکھے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کے نزدیک اس کی بُرائی اور بھلائی برابر ہو۔

تکبر یہ بھی ہے کہ اس کے بعض برابر والوں کو مال یا حکومت کا کوئی عہدہ مل جاتا ہے، تو وہ ڈرتا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے بڑا ہو جائے گا۔ گویا وہ اس کی بڑائی کو برداشت نہیں کرتا یا وہ آدمی جسے یہ چیزیں مل جائیں اُس سے کم درجے کا ہو تو وہ اس کی بلندی یا اُس کی برابری برداشت نہ کر سکے۔ کافروں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد قریباً اسی طرح کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ[1] (اور کہنے لگے یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا)

مومنوں کے متعلق فرمایا: أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا[2] (کیا یہی ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان فرمایا ہے)

ایک اور آیت میں فرمایا: مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا[3] (تم ہمارے جیسے آدمی ہی تو ہو)

---

[1] سورۃ زخرف - آیت: ۳۱ [2] سورۃ انعام - آیت: ۵۳ [3] سورۃ یٰسٓ - آیت: ۱۵

فرمایا: وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ[1] (اگر تم اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کرو گے تو یقیناً خسارہ اٹھاؤ گے)

انھوں نے تعجب کیا اور انکار کر دیا کہ ان جیسا کوئی آدمی رسالت کے مرتبے پر فائز ہو اس لیے انھوں نے آپ پر حسد کیا۔

سرداری اور مرتبے کی محبت کی مثال یہ ہے کہ وہ آدمی جو کسی فن میں بے مثال بننا چاہتا ہے اور جب اس پر تعریف کی محبت غالب ہو جاتی ہے تو یہی سُن کر خوش ہوتا ہے کہ وہ زمانے میں بے مثال اور اپنے فن میں یگانہ روزگار ہے اور جب وہ دُنیا کے کسی خطّے میں اپنا نظیر پیدا ہونے کے متعلق سنتا ہے تو اُسے یہ بات بُری معلوم ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ مر جائے یا اس کی وہ نعمت زائل ہو جائے جس سے وہ اس کا شریک بن گیا ہے۔ علم، شجاعت، عبادت، صناعت یا دولت یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز جو سرداری کی علامت ہے وہ اس میں اکیلا رہے۔

علمائے یہود صرف اپنی ریاست و سرداری کے ختم ہو جانے کے خوف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اور پہچان سے انکار کرتے تھے اور آپ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ باقی رہی نفس کی خباثت اور اللہ کے بندوں پر بخیلی تو تم کچھ لوگوں کو پاؤ گے کہ وہ نہ ریاست چاہتے ہیں نہ اُن میں تکبّر ہوتا ہے لیکن اُن کے سامنے جب کسی آدمی کا اچھا حال بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ نے اس پر احسان کیا ہے، تو یہ چیز ان کو شاق گزرتی ہے اور جب اُن سے لوگوں کا مضطرب ہونا اور ان کی مصیبت اور اُن کی زندگی کی پراگندگی بیان کی جاتی ہے، تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ لوگوں کی بدحالی کو پسند کرتے ہیں اور بندوں پر اللہ کی نعمت کا بخل کرتے ہیں۔ گویا وہ اُن کی ملکیت اور ان کے خزانہ سے لے رہے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ بخیل وہ ہے جو اپنے مال سے بخل کرے اور شحیح وہ ہے جو دوسروں کے مال سے بخل کرے۔ تو یہ آدمی بندوں پر اللہ کی نعمت کا بخل کرتا ہے، حالانکہ اُن کے اور اُس کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ کوئی عداوت ہے پس سوائے خباثتِ نفس اور گندی طبیعت کے اس کا اور کوئی سبب نہیں ہوتا۔ اس مرض کا علاج بڑا مشکل ہے کیونکہ اس کا کوئی سبب نہیں ہوتا کہ اس کو زائل کیا جائے بلکہ اس کا سبب

---

[1] سورۂ مومنون۔ آیت: ۳۴

فطری خباثت ہوتی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں میں اکثر حسد انہی اسباب سے ہوتا ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور یہ عموماً ہمسر اور برابر کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً بھائیوں اور چچا زاد بھائیوں میں۔ کیونکہ حسد کا سبب مختلف اغراض کا ایسے مقاصد پر توارد ہے جن میں باہمی ٹکراؤ ہو۔ تم دیکھو گے کہ عالم، عالم سے حسد کرے گا نہ کہ عابد سے۔ اور عابد، عابد سے حسد کرے گا نہ کہ عالم سے۔ اسی طرح تاجر، تاجر کا حاسد ہوگا اور موچی، موچی کا۔ ان میں سے کوئی بزاز سے حسد نہ کرے گا، مگر یہ کہ کوئی اور وجہ ہو۔

عداوت کا اصل ایک ہی غرض میں مزاحمت ہے۔ ایک غرض دو دُور رہنے والوں کو جمع نہیں کرتی جیسے دو شہروں میں رہنے والوں میں کوئی غرض مشترک نہیں ہوتی، اس لیے ان کے مابین حسد بھی نہیں ہوتا، مگر جس شخص پر اقتدار حاصل کرنے کی حرص غالب ہو وہ ہر اس آدمی پر حسد کرے گا جسے وہ اپنی صفات میں ہم مرتبہ خیال کرے گا۔ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصّے میں رہتا ہو۔

ان سب چیزوں کی بنیاد دراصل دنیا کی محبت ہے اور دُنیا ان لوگوں پر تنگ ہو جاتی ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عاقبت کی بھلائی چاہنے والوں کے لیے تنگی نہیں۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی زمین اور آسمان کی بادشاہی کی معرفت حاصل کرے گا اور اللہ سے محبّت رکھے گا وہ کسی آدمی سے حسد نہ کرے گا کیونکہ معرفت عارف لوگوں پر تنگ نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی معلوم کو لاکھوں جہاں پہچانتے ہیں اور دوسروں کی معرفت سے خوش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق میں ایک دوسرے سے حسد نہیں کرتے۔ اُن کا مقصود اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور وہ ایک وسیع سمندر ہے جس میں کوئی تنگی نہیں۔ اور ان کا مقصد اللہ کے نزدیک مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

اس کی سب سے بڑی نعمت خود اس کی ملاقات کی لذت ہے اور اس میں نہ ممانعت ہے نہ مزاحمت، بلکہ کثرت سے اُن کی محبّت زیادہ ہوتی ہے۔ ہاں اگر علماء کا مقصد مال و جاہ ہو تو وہ حسد کرتے ہیں۔

علم اور مال میں فرق ہے۔ مال ایک ہاتھ میں اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ دوسرے کے ہاتھ سے نہ جائے، لیکن علم عالم کے دل میں ٹھہرا رہتا ہے اور بغیر اس کے کہ اُس کے دل سے نکلے اس کے بتانے سے دوسرے کے سینہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے جلال، اُس کی عظمت اور اس کے ملک میں غور کرنے کی عادت ہو جائے تو یہ

اس کے نزدیک تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ اس کے دل میں کسی سے حسد نہیں ہوگا اگر کوئی اور اُسی کی طرح معرفت حاصل کرے گا تو اُس کی لذّت میں کوئی کمی نہیں آئے گی، بہر حال اب تم کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ حسد ایک ایسے مقصود پر مٹنے والوں میں ہوتا ہے جو سب کو نہ مل سکے۔ تم لوگوں کو دیکھوگے کہ آسمان کی زینت دیکھنے کے لیے کبھی مزاحمت نہیں کرتے، کیونکہ اُس کے کنارے بڑے وسیع ہیں وہ تمام دیکھنے والوں کا ذوقِ دید پورا کر سکتے ہیں۔

اگر تم اپنے نفس کے خیر خواہ ہو تو وہ نعمتیں طلب کرو جن میں مزاحمت نہیں۔ اور ایسی لذّتیں حاصل کرو جو مکدّر نہ ہوں۔ اور دنیا میں ایسی نعمت اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ملکوت کے عجائبات کے سوا اور کوئی نہیں۔ لیکن معرفت میں بھی اس نعمت کی طلب نہیں کی جاتی۔ اگر تمھیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا شوق نہیں اور نہ تمھیں اس کی لذّت حاصل ہوتی ہے، تو تم مردِ دانا نہیں ہو۔ یہ حال مُردوں کا ہے، کیونکہ شوق ذوق کے بعد ہے اور جس نے نہ چکھا اُس نے نہ پہچانا اور جس نے نہ پہچانا اسے شوق نہ ہوا اور جسے شوق نہ ہوگا، وہ طلب نہ کرے گا اور جو طلب نہ کرے گا نہ پائے گا اور جو نہ پائے گا وہ محروم ہی رہے گا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ حسد دل کی بہت بڑی بیماریوں میں سے ہے۔ اور امراضِ قلوب کا علاج علم اور عمل ہی سے ہوتا ہے۔ اس بیماری کے لیے نافع علم یہ ہے کہ تو اس حقیقت کو جان لے کہ حسد سے سراسر تیرا اپنا ہی نقصان ہے، دین کا بھی اور دنیا کا بھی۔ جس پر حسد کیا جاتا ہے اس کا نہ دین میں کچھ نقصان ہے نہ دنیا میں، بلکہ اُس کو اُلٹا فائدہ پہنچتا ہے۔ جان لے کہ تیرے حسد سے محسود کی نعمت زائل نہیں ہوگی۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ تو حسد سے بچے کیونکہ اس میں دل کی تکلیف ہے، فائدہ کچھ بھی نہیں، تو پھر جب تمھیں آخرت کے عذاب کا علم بھی ہے تو پھر سوچو تمھارا کیا حال ہوگا!

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ محسود کا کوئی نقصان نہیں، نہ دین میں نہ دنیا میں، بلکہ تمھارے حسد سے اس کا فائدہ ہے، دین کا بھی اور دنیا کا بھی۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں لکھی ہے ضروری ہے کہ وہ مدت مقرّرہ تک اس کے پاس رہے۔ تمھارے حسد کرنے سے اس کی نعمت ہرگز کم نہ ہوگی۔ اس کا فائدہ یوں ہوگا کہ تمھارے حسد کی وجہ سے اس کی حیثیت مظلوم کی ہوگی۔ باقی رہا خود تمھارا معاملہ، تو مخالفت کی اہم غرض دشمن کو غم میں ڈالنا ہوتی ہے اور جس مرض میں تم مبتلا ہو اس سے خود مبتلائے عذاب ہوگئے۔ اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوگا!

ہماری مذکورہ باتوں پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ تم اپنے نفس کے دشمن ہو اور حسد تمھارے دشمن کا دوست ہے۔ گویا تمھاری مثال اس آدمی جیسی ہے جو دشمن کو قتل کرنے کے لیے پتھر مارے، لیکن وہ اُسے لگنے کے بجائے پلٹ کر اُس کی اپنی دائیں آنکھ پر لگے اور اُسے پھوڑ دے۔ پھر اس کا غصّہ اور بڑھے اور دوبارہ پہلے پتھر سے بھی زیادہ بڑا پتھر اُس کو مارے اور وہ پتھر بھی واپس آکر اس کی دوسری آنکھ پھوڑ دے اور وہ اندھا ہو جائے۔ پھر اُسے تیسرا پتھر مارے تو وہ واپس آکر اس کے سر کو کچل دے اور اس کا دشمن صحیح سلامت کھڑا ہنس رہا ہو۔

یہ ہیں علمی دوائیں۔ جب انسان اُن میں غور کرے گا تو اُس کے دل سے حسد کی آگ بجھ جائے گی۔

نافع عمل یہ ہے کہ تکلیف اُٹھا کر بھی اپنے نفس کی ارذل خواہشات کو کچل ڈالے۔ جب اسے محسود سے کینہ اور اس کی مذمت کرنے پر آمادہ کرے تو اپنے نفس کو اُس کی مدح اور ثنا کرنے پر مجبور کرے اور اگر اُسے تکبر پر ابھارے تو اپنے اوپر تواضع کو لازم کرے اور اگر اسے محسود پر انعام کرنے سے روکے تو اپنے نفس پر انعام زیادہ کرنا لازم کرے۔

سلف کی ایک جماعت کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو معلوم ہوتا کہ کسی آدمی نے اُن کی غیبت کی ہے تو اس کو ہدیہ بھیج دیتے۔ برائیوں کے انسداد کی یہ بڑی مفید دوائیں ہیں۔ ہاں کڑوی ضرور ہیں لیکن ان کا پینا اس طرح آسان ہو جاتا ہے کہ آدمی جان لے کہ اس کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی، تو اس لیے وہ نفس سے کہے اسی کا ارادہ کرو جو ہو رہا ہے اور یہ پورا علاج ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل ہشتم

دنیا کی مذمّت

دنیا کی مذمت اور اس سے بے رغبتی میں قرآن عزیز کی بے شمار آیات وارد ہوئی ہیں اور اس کے لیے بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ .... اِلٰی قَوْلِہٖ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ[1] (لوگوں کو خواہشات کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے ...... یہاں تک کہ فرمایا ـــ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس بہت اچھی جگہ ہے)

اور فرمایا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ[2] (اور دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے)

فرمایا: اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ[3] (دنیا کی زندگی کی مثال پانی جیسی ہے، جسے ہم نے آسمان سے اُتارا)

فرمایا: اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ[4] (جان لو کہ دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشا اور زینت ہے)

فرمایا: وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ[5] (اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور تیرے رب کے نزدیک آخرت پرہیزگاروں کے لیے ہے)

فرمایا: فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ[6] (جس نے ہماری یاد سے منہ پھیرا اور صرف دنیا کی زندگی چاہی اس سے تم بھی منہ پھیر لو اُن کے علم کی رسائی یہیں تک ہے)

صحیحین میں مستورد بن شداد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخرت کے مقابلے میں

---

[1] سورۃ آل عمران - آیات: ۱۴ - ۱۵ [2] سورۃ آل عمران - آیت: ۱۸۵ [3] سورۃ یونس - آیت: ۲۴
[4] سورۃ حدید - آیت: ۲۰ [5] سورۃ زخرف - آیت: ۳۵ [6] سورۃ نجم - آیات: ۲۹، ۳۰

دنیا ایسی ہے جیسے کوئی تم میں سے اپنی انگلی سمندر میں ڈبوئے تو دیکھو انگلی کے ساتھ سمندر کا کتنا پانی آ گیا؟
ایک اور حدیث میں ہے کہ "دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت" (مسلم)
ایک اور حدیث میں ہے کہ "اگر اللہ کے نزدیک دنیا ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی قیمت رکھتی تو کسی کافر کو پانی پینا نصیب نہ ہوتا"۔ (ترمذی و صححہ)
ایک اور حدیث میں ہے کہ "دنیا اور دنیا کی سب چیزیں ملعون ہیں سوائے ان چیزوں کے جو اللہ کے لیے ہوں"۔
حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپؐ نے فرمایا: "جس نے دُنیا سے محبّت رکھی اس نے اپنی آخرت کا نقصان کیا اور جو آخرت سے محبّت رکھے گا اس کی دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ تو باقی رہنے والی کو فانی پر ترجیح نہ دو"۔
حضرت حسنؒ نے عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف دنیا کی مذمت میں ایک طویل مراسلہ بھیجا۔ اس میں یہ بھی تھا:
"اما بعد، دنیا کوچ کا مقام ہے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ آدم علیہ السلام کو یہاں سزا کے طور پر اتارا گیا تھا، تو اے امیرالمومنین! اس سے بچ کر رہو۔ اس سے زادِ راہ نہیں چھوڑنے سے ہے۔ جو یہاں غنی ہے وہ دراصل فقیر ہے۔ جو اسے عزیز رکھے گا ذلیل ہو گا۔ یہ زہر کی طرح ہے کہ ناواقف اس کو کھاتا ہے حالانکہ وہ اس کی موت ہے، تو اس دھوکے اور فریب کے گھر سے بچو۔ جس حال میں ہو خوش رہو۔ اس حال میں زیادہ ڈرو جس میں تم دنیا کے لیے ہو جاؤ۔ اس کی خوشی میں غم کی آمیزش ہے۔ اس کے صاف میں بھی کدورت ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے اس کے متعلق کچھ نہ بتایا ہوتا اور اس کے لیے کوئی بھی مثال بیان نہ فرمائی ہوتی تو بھی عقل کی رُو سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر چیز فانی اور عارضی ہے۔ پھر جبکہ اللہ نے اس سے تنبیہ بھی کر دی۔ پھر اب کونسا عذر ہے۔ اللہ کے نزدیک نہ اس کی کوئی قدر ہے نہ وزن۔ جب سے اسے پیدا کیا ہے تو اس کی طرف دیکھا تک نہیں ہے۔
اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے خزانے اور اُن کی کنجیاں پیش کی گئیں اور کہا گیا مچھر کے پَر کے برابر بھی اللہ کے نزدیک ان کا درجہ کم نہ ہو گا، تو پھر بھی آپؐ نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جسے اُس کے خالق نے ناپسند کیا، اُس کو پسند کرنا برا سمجھا۔ اللہ نے اپنی پسند سے اسے نیک لوگوں سے دُور رکھا اور اپنے دشمنوں کو تکلیف دینے کے لیے پھیلا دیا۔ جو آدمی اس کے دھوکہ میں ہے دنیا اس کے پاس ہے۔ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا عطا کر کے اس کی عزت کی گئی ہے؟ نہیں! وہ یہ بات بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے۔

خدا کی قسم جسے دنیا کی فراخی ملی اور اُسے یہ ڈر پیدا نہ ہوا کہ اس کے ساتھ چال کی گئی ہے، تو اس کی عقل ناقص ہے اور جس بندے کو دنیا نہ ملی اور اس نے یہ نہ سمجھا کہ میرا بھلا کیا گیا ہے، تو اس کی عقل بھی ناقص ہے۔

حضرت مالک بن دینارؒ نے کہا: جادوگرنی سے بچو، یعنی دنیا سے۔ یہ علماء کے دلوں پر جادو کرتی ہے۔

دنیا کی مثالوں میں ایک یہ بھی ہے کہ یونسؒ بن عبید نے کہا: "دنیا کی مثال سوئے ہوئے آدمی کی ہے کہ وہ خواب میں اچھی اور بری چیزیں دیکھتا ہے اور پھر اس کے بعد بیدار ہو جاتا ہے"۔

اسی طرح کا یہ قول بھی ہے کہ "لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مر جائیں گے تو بیدار ہوں گے"۔

مطلب یہ ہے کہ موت سے جاگ اٹھتے ہیں، لیکن ان کے ہاتھ میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہوتی جن کی طرف مائل تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھا، اس کے منہ میں دانت نہیں تھے لیکن وہ ہر طرح کی زیب و زینت سے آراستہ تھی۔ آپ نے اُس سے کہا: تیرے کتنے شوہر ہو چکے؟ کہنے لگی: بے شمار۔ آپ نے فرمایا: کیا سب مر گئے یا انھوں نے تجھے طلاق دے دی؟ کہنے لگی: میں نے سب کو مار ڈالا۔ تو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیرے باقی شوہروں کا برا ہو وہ تیرے پہلے شوہروں سے عبرت کیوں نہیں حاصل کرتے۔ تو کس طرح ان کو یکے بعد دیگرے مارتی جاتی ہے اور وہ پھر بھی تجھ سے پرہیز نہیں کرتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن دنیا کو ایک سفید بالوں والی بڑھیا کی شکل میں لایا جائے گا۔ آنکھیں نیلی، دانت باہر کو نکلے ہوئے اور بدشکل، وہ لوگوں کے سامنے آئے گی، تو کہا جائے گا اس کو پہچانتے ہو؟ لوگ کہیں گے، اس کے پہچاننے سے اللہ کی پناہ، تو کہا جائے گا یہ وہ دنیا ہے جس پر تم جھگڑے اور قطع رحمی کی اور آپس میں حسد و بغض رکھا، اور تم نے دھوکا کھایا۔ پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ تو وہ کہے گی۔ اے میرے رب! میرے تابعدار اور ساتھی کہاں ہیں؟ تو حکم ہوگا اس کے ساتھیوں اور تابعداروں کو بھی اسی کے ساتھ پھینک دو۔

حضرت ابو العلاءؒ نے کہا: میں نے خواب میں ایک بہت بوڑھی عورت دیکھی۔ اس پر ہر طرح کی زینت تھی اور لوگ اُس پر امڈے ہوئے تھے اور بہت شوق سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا، تیرا

ستیاناس! تو کون ہے؟ کہنے لگی مجھے نہیں جانتے؟ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگی میں دنیا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں تیری برائی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ کہنے لگی۔ اگر میری برائی سے پناہ چاہتے ہو تو روپے پیسے کو برا سمجھو۔

بعض نے کہا: ہم نے دنیا کو ایک بدشکل کبڑی بڑھیا کی شکل میں دیکھا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارے تین حال ہیں: ایک وہ حالت تھی جب تم کچھ نہیں تھے یعنی تمھارے پیدا ہونے سے پہلے کی حالت۔

دوسری حالت تمھاری موت سے لے کر ہمیشگی کی زندگی تک۔ تمھاری روح جسم سے نکلنے کے بعد وجود اختیار کرے گی اور تم جنت یا دوزخ میں داخل کیے جاؤ گے۔ اور وہ ہمیشہ کا رہنا ہوگا۔

ان دونوں حالتوں کے درمیان ایک متوسط حالت ہے اور وہ ہے تمھاری دنیا کی زندگی۔ تو اس مقدار کو دیکھو اور دونوں حالتوں سے اس کا تناسب معلوم کرو، تو معلوم ہوگا کہ تمھاری دنیا کی زندگی پلک جھپکنے سے بھی کم ہے۔

جس نے دنیا کو اس نگاہ سے دیکھا وہ اس کی طرف مائل نہ ہوگا اور نہ پروا کرے گا کہ اس کے دن کیسے گزرے۔ تنگی میں یا تکلیف میں۔ یا فراخی اور آرام میں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی مکان بنایا نہ کنواں کھودا، فرمایا: "میرا اور دنیا کا آپس میں کیا تعلق؟ میری اور دنیا کی مثال ایک سوار جیسی ہے جس نے کسی درخت کے نیچے دوپہر کو آرام کیا اور پھر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: "دنیا ایک پل ہے اس سے گزر جاؤ اسے آباد نہ کرو۔"

یہ ایک واضح مثال ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کے لیے ایک پل ہے جس کا پہلا ستون پنگھوڑا ہے اور دوسرا ستون لحد۔

بعض لوگوں نے نصف پل عبور کر لیا اور بعض نے دو تہائی اور بعض ایسے ہیں جن کا صرف ایک ہی قدم باقی رہ گیا ہے اور وہ اس سے بے خبر ہیں جس طرح بھی اسے عبور کرنا ہے، پھر جو آدمی پل پر عمارت بنانے لگے اور اسے سجائے تو وہ انتہائی بے وقوف اور جاہل ہے۔

کہا گیا ہے کہ دنیا کے طالب کی مثال سمندر کا پانی پینے والے جیسی ہے وہ جتنا زیادہ پیتا ہے، اسی تناسب سے اس کی پیاس بھڑکتی ہے۔ یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔

بعض سلف اپنے ساتھیوں سے کہتے: "آؤ تمھیں دنیا دکھائیں۔ وہ ان کو بڑی کوڑی[1] پر لے جاتے اور کہتے دیکھو یہ اس کے پھل ہیں، یہ مرغیاں ہیں، یہ شہد ہے اور یہ اس کا گھی ہے۔"

---

[1] پنجابی زبان میں روڑی۔ گندگی کا ڈھیر۔ وہ جگہ جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری، تمھاری اور دنیا کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو ایک ویران جنگل میں جا رہے تھے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ کتنا چل کر آ گئے اور کتنا باقی ہے۔ اُن کی خوراک ختم ہو گئی اور سواریاں مر گئیں اور وہ جنگل میں پریشان تھے۔ نہ اُن کے پاس خرچ تھا، نہ سواری۔ انھیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ اسی حالت میں تھے کہ ان کے پاس ایک خوش لباس آدمی آیا۔ اُس کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ شخص ایسے سرسبز علاقے سے آیا ہے جو قریب ہی ہے۔ جب وہ ان کے پاس پہنچا تو کہا۔ تم کس حال میں ہو؟ انھوں نے کہا: دیکھ ہی رہے ہو۔ تو اس نے کہا۔ اگر میں جاری پانی اور سبز باغ کی طرف تمھاری رہنمائی کروں تو تم کیا کرو گے؟ کہنے لگے: ہم کبھی تیری نافرمانی نہ کریں گے۔ اُس نے کہا: اللہ کی قسم اور اللہ کا عہد دو، تو انھوں نے اللہ کی قسمیں اور اللہ کا عہد دیا کہ اس کی نافرمانی نہ کریں گے اور وہ اُن کو جاری پانی اور سرسبز باغ میں لے آیا۔ پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا وہ اُن میں رہے۔

پھر اس نے کہا: اے لوگو! کُوچ۔ کوچ! کہنے لگے اب کہاں؟ اُس نے کہا: اُس پانی کی طرف جو اس پانی سے بہتر ہے اور اُس باغ کی طرف جو اس باغ سے بہتر ہے۔ تو اکثر لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! مایوسی کے بعد ہی تو ہمیں یہ باغ ملا تھا اور اس سے بڑھ کر عیش ہم کیا کریں گے؟ بس تھوڑے لوگوں نے کہا: کیا تم نے اس کو اللہ کا عہد اور اس کی قسمیں نہ دی تھیں کہ تم اُس کی نافرمانی نہ کرو گے؟ اُس نے پہلی بات میں بھی سچ بولا تھا اور دوسری بات میں بھی وہ سچ کہے گا۔ تو پھر جنھوں نے اس کا کہا مانا وہ اُن کو لے کر چلا گیا۔ باقی پیچھے رہ گئے۔ پھر دشمن نے حملہ کیا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ قید ہو گئے۔"

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری اور میری بعثت کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا۔ اے میری قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے لشکر آتا دیکھا ہے اور میں واضح طور پر مطلع کر رہا ہوں، تم بچ جاؤ، تو اُس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس کا کہا مان لیا۔ وہ رات کو نکلے اور مہلت سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے اور نجات پا گئے، لیکن ایک جماعت نے جھٹلایا وہ اپنی جگہ پر رہے تو اُن کے ٹھکانے پر لشکر نے حملہ کیا اور ان کو ہلاک و برباد کر دیا۔ یہ مثال ہے اُس آدمی کی جس نے میری اور میری تعلیم کی پیروی کی اور اس کی مثال جس نے میری نافرمانی کی اور میری سچی تعلیم کو جھٹلایا۔"

دنیا کی حقیقت

بہت سے لوگوں نے مطلقاً دنیا کی مذمّت سُن رکھی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا ان موجودات کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں، تو انھوں نے کھانے پینے کی اشیاء سے منہ موڑا جو کہ بدن کی مصلح ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے طبائع میں ان چیزوں کا شوق رکھا ہے جو ان کی مصلح ہیں۔ یہ لوگ اس فطری خواہش کو دباتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہی وہ زہد ہے جو مطلوب ہے۔ یہ لوگ نفس کے حقوق سے ناآشنا ہیں اور اکثر مصنوعی زاہدوں کا یہی طریقہ ہے۔ یہ لوگ ایسا اپنی کم علمی کی وجہ سے کرتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا عبارت ہے انسان کے لیے موجود اشیاء سے جن میں اس کا حصّہ ہے۔ اور وہ زمین اور اس کی سب چیزیں ہیں۔ زمین انسان کے رہنے کی جگہ ہے اور جو اشیاء اس پر ہیں وہ کھانے پینے اور پہننے اور نکاح وغیرہ کے لیے ہیں۔ اور یہ سب بدن کی سواری اور اس کی خوراک ہیں جو کہ اللہ کی طرف سفر کر رہا ہے۔ بدن ان مصالح ہی سے باقی رہے گا۔ جیسا کہ حج کے راستے میں اونٹنی چارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، تو جس نے اسے جائز طریقہ پر حاصل کیا وہ اچھا ہے۔ اور جس نے ضرورت سے زیادہ لالچ کر کے لیا وہ بُرا ہے۔ کیونکہ دنیا کے حصول میں لالچ کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس سے نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس آدمی کی مثال ایسی ہے جو اونٹنی کو چارہ کھلائے، پانی پلائے اور اس پر رنگ رنگ کے کپڑے ڈالے اور بھول جائے کہ ساتھی جا چکے ہیں۔ اس غفلت کے باعث وہ اور اس کی اونٹنی جنگل میں درندوں کی خوراک بن جائیں گے۔

ضرورت سے کم لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ مناسب خوراک ہی سے اونٹنی سفر کی طاقت رکھے گی۔ سلامتی کی راہ اعتدال کی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ چلنے کے لیے بقدر ضرورت دنیا لے۔ اگرچہ اُس کی خواہش بھی ہو کیونکہ نفس کو اس کی پسندیدہ چیز دینا اس کی مدد بھی ہے اور اس کے حق کی ادائیگی بھی ہے۔

سفیان ثوریؒ بعض اوقات بڑا اچھا کھانا کھاتے اور سفر میں اپنے ساتھ فالودہ بنا کر لے جاتے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم بعض اوقات بڑا اچھا کھانا کھاتے اور کہتے "جب ہمیں مل جاتا ہے تو مَردوں کی طرح کھاتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو ہم مَردوں کی طرح صبر کرتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سیرت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ نہ تو وہ دنیا کے حاصل کرنے میں افراط سے کام لیتے اور نہ نفس کے حقوق میں کوتاہی کرتے تھے۔

چاہیے کہ نفس کی خواہشات پر غور کیا جائے۔ اگر اُس کی خواہش میں اس کی حفاظت، اصلاح اور بھلائی کے لیے خوشی سے آمادگی ہو تو اُس کو اُس سے نہیں روکنا چاہیے۔ اور اگر اس کی خواہش صرف لذّت پر مبنی ہو اور مصالح مذکورہ سے متعلّق نہ ہو، تو وہ خواہش بری ہے۔ اُس سے رُک جانا حقیقی زہد ہے۔

فصل نہم

مال کی مذمّت، مدح اور قناعت وسخاوت

معلوم ہونا چاہیے کہ مال بذاتِ خود برا نہیں، بلکہ مناسب یا نامناسب استعمال سے اچھا یا بُرا ہو جاتا ہے اور یہ یا تو انتہائی لالچ ہے، یا حرام طریقے سے حاصل کرنا، یا اس کو حق میں خرچ نہ کرنا، یا اس کو ناحق خرچ کرنا یا اس پر فخر کرنا وغیرہ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ [1] (تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہیں)

سنن ترمذی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "اتنا دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلے میں نقصان نہیں کرتے جتنا کہ مرتبہ اور مال کی محبت انسان کے دین کو برباد کرتی ہے۔"

سلف مال کے فتنے سے ڈرا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتوحات دیکھتے تو روتے اور کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ سے ان کو روک کر اُن سے برائی کا ارادہ نہ کیا اور نہ عمر سے بھلائی کا ارادہ کر کے اس کو دے دیں۔

یحییٰ بن معاذؒ نے کہا: "روپیہ پیسہ بچھو ہے، اگر تم اس کا منتر اچھی طرح نہیں جانتے، تو اس کو ہاتھ مت لگاؤ کہ اگر تم کو ڈس لے گا تو اس کا زہر تم کو مار ڈالے گا۔" پوچھا گیا۔ اس کا منتر کیا ہے؟ تو کہا: اس کو حلال طریقے سے حاصل کرنا اور جائز جگہ میں خرچ کرنا۔" اور کہا:

"موت کے وقت مال میں بندے پر دو مصیبتیں ہوتی ہیں کہ ان جیسی مصیبت کسی نے کبھی نہیں سنی"۔ پوچھا گیا۔ وہ کیا ہیں؟ تو کہا: "اس سے مال سارا لے لیا جاتا ہے اور حساب سارے مال کا دینا پڑتا ہے۔"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ مال بذاتِ خود بُرا نہیں ہے، بلکہ مدح کے لائق ہے کیونکہ وہ دین و دنیا کے مصالح کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا نام خیر رکھا ہے۔ سورۃ نساء کے ابتداء

---

[1] سورۃ انفال ۸ آیت: ۲۸

میں فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (اور بیوقوفوں کو اپنا وہ مال نہ دو جن کو اللہ نے تمھارے قائم رہنے کا سبب بنایا ہے)

حضرت سعید بن مسیب ؒ نے کہا: "جو حلال طریقے سے بھی مال جمع نہیں کرتا اس میں کوئی بھلائی نہیں کہ اس سے اپنی عزت کو بچائے اور صلہ رحمی کرے اور اس سے حقداروں کا حق ادا کرے۔"

حضرت ابو اسحاق ؒ سبیعی نے کہا: "سلف مال کی فراخی کو دین کا معاون سمجھتے تھے۔"

حضرت سفیان ؒ ثوری نے کہا: "ہمارے اس زمانے میں مال مومن کا ہتھیار ہے۔"

بحث کا حاصل یہ ہے کہ مال سانپ کی طرح ہے۔ اس میں زہر بھی ہے اور تریاق بھی۔ اس کا تریاق اس کے فائدے ہیں اور اس کی تباہ کاریاں اس کا زہر ہے، تو جس نے اس کے فائدے اور ہلاکت کو جان لیا، ممکن ہے وہ اس کی برائی سے بچا رہے اور اس کی بھلائی حاصل کرے۔

اس کے فائدے دینی اور دنیاوی دو طرح کے ہیں: دنیوی فوائد تو لوگوں کو معلوم ہیں اور اسی لیے اس کی طلب میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔

دنیوی فوائد تین طرح کے ہیں: ایک یہ کہ اس کو اپنے نفس پر خرچ کرے یا عبادت میں۔ جیسے حج اور جہاد یا عبادت میں مدد دینے کے لیے۔ جیسے کھانا پینا اور مکان وغیرہ۔ اگر یہ ضرورتیں میسّر نہ ہوں گی تو دل دین اور عبادت کے لیے فارغ نہ ہوگا تو دین پر مدد حاصل کرنے کے لیے بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرنا دینی فوائد سے ہے اور اس میں ضرورت سے زیادہ لینا داخل نہیں۔

دوسری قسم وہ ہے جو لوگوں پر خرچ کرے اور اس کی چار قسمیں ہیں: پہلی صدقہ ہے اور اس کے فضائل بے شمار اور مشہور ہیں۔ دوسری مروّت ہے یعنی وہ مال جو دولتمندوں اور اشراف پر ضیافت اور ہدیہ اور تعاون وغیرہ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور یہ بھی دینی فوائد میں سے ہے۔ کیونکہ اس سے انسان بھائی اور دوست بنا سکتا ہے۔ تیسری یہ ہے کہ آدمی مال خرچ کر کے اپنی عزّت محفوظ کرے۔ مثلاً شاعروں کی ہجو اور بے وقوفوں کی غیبت اور ان کی زبان بندی اور ان کی برائی کو روکنے کے لیے خرچ کرے۔ اور یہ بھی دینی فوائد میں سے ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جو مال آدمی اپنی عزّت بچانے کے لیے خرچ کرے وہ صدقہ ہے۔" چوتھی یہ ہے کہ اپنا کوئی کام کرانے کے بدلے تنخواہ یا مزدوری ادا کرے۔ آدمی اپنے سارے کام خود ہی انجام دے گا تو اس کا وقت ضائع ہوگا اور ذکر و فکر کے ذریعے سے جو کہ سالک کے مقامات میں سے ہیں محروم ہو جائے گا تو ہر

وہ کام جو دوسرا کر سکتا ہو، اور اس سے مقصد حاصل ہو سکتا ہو، اس میں خود مشغول ہونا سراسر نقصان ہے۔

تیسری قسم وہ ہے کہ مال کسی معین کام میں تو خرچ نہیں ہوتا، لیکن اس سے بہت سی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔ جیسے مسجد اور پل کی تعمیر اور ایسے ہی دیگر کام۔ یہ سب مال کے دینی فائدے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور فوائد بھی ہیں۔ مثلاً سوال کی ذلت اور غربت کی حقارت سے بچنا۔ لوگوں میں معزز ہونا اور دلوں میں احترام اور وقار حاصل کرنا وغیرہ۔

اب رہیں مال کی آفتیں اور تباہیاں، تو یہ بھی دو قسم کی ہیں یعنی دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ ان میں سے دینی تین ہیں: پہلی یہ کہ مال عموماً گناہ کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ مال دل میں طاقت اور تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور یہ احساس گناہ کی طرف تحریک کرتا ہے۔ اگر انسان پریشان حال ہو تو گناہ کا خیال بھی نہیں آتا۔

اور بچاؤ کی ایک صورت یہ ہے کہ مال نہ ہو۔ کیونکہ صاحب قدرت کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہو گی تو اسے پورا کر کے ہلاک ہو گا اور اگر صبر کرے گا تو اسے صبر کی سختی کی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ گویا دولت کا فتنہ تنگدستی کے فتنے سے بڑا ہے۔

دوسری یہ کہ مال مباح چیزوں سے تعیش کی تحریک کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ اس سے صبر نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ یہ اہتمام بھی نہیں رکھ سکتا کہ جو مال حاصل ہوتا ہے وہ ہر قسم کے شبہات سے پاک ہو۔ پھر وہ مداہنت اور نفاق کی آفتوں میں ترقی کرتا ہے کیونکہ جس کے پاس مال زیادہ ہو گا اس کا لوگوں سے میل جول بھی زیادہ ہو گا اور جب اُن سے ملے گا تو نفاق اور عداوت اور حسد و غیبت سے محفوظ نہ رہے گا اور یہ سب اصلاح مال کی ضرورتیں ہیں۔

تیسری یہ ہے جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا اور وہ یہ ہے کہ مال اسے اللہ کی یاد سے غافل کرے گا اور یہ بہت مہلک بیماری ہے کیونکہ عبادت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اُس کے جلال و عظمت میں غور و فکر ہے اور یہ فارغ دل کا تقاضا کرتا ہے۔ زمیندار آدمی دن رات کاشتکاروں کے جھگڑوں اور ان کے محاسبے میں متفکر رہے گا۔ پانی اور حدود کے جھگڑے نمٹائے گا۔ حکومت کے کارندوں سے خراج اور مزدوروں سے زمین کی آبادی میں کوتاہی کے متعلق پوچھ گچھ کرے گا۔

اسی طرح تاجر آدمی دن رات اپنے شرکاء کی خیانت، کام میں کوتاہی اور مال ضائع کرنے کے متعلق غور کرے گا۔ غرض اس طرح مال کی تمام قسموں والے یہاں تک کہ جس کے پاس روپیہ جمع اور محفوظ ہے وہ بھی اس کی حفاظت اور ضائع ہونے کے خوف پر غور کرے گا۔ لیکن جس کے پاس بقدر روز کھانا آئے گا۔ وہ ان سب چیزوں سے محفوظ رہے گا اور یہ سب مصیبتیں ان کے سوا ہیں جو دولتمندوں کو دنیا میں پیش آتی ہیں۔ خوف، غم، پریشانی اور مشقت وغیرہ۔

حُبِ مال کا تریاق یہ ہے کہ اس سے روٹی کھاؤ اور باقی نیک کاموں میں خرچ کر دو۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ زہر اور آفت ہے۔

حرص و طمع کی مذمت اور قناعت کی مدح

معلوم ہونا چاہیے کہ فقر (تنگدستی) اچھی چیز ہے لیکن فقیر کو چاہیے کہ قناعت کرے۔ مخلوق سے طمع نہ رکھے۔ جو اُن کے پاس ہے اُس پر توجہ نہ کرے۔ اور جس طرح بھی ہو مال کے کمانے پر حریص نہ ہو، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ بقدرِ ضرورت کھانے اور لباس پر قناعت نہ کرے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ نجات پا گیا جو مسلمان ہوا اور اسے بقدرِ کفایت روزی ملی اور اللہ نے اسے اپنے دیے پر قناعت عطا فرمائی۔"

حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے کہا "ہم نے ہر طرح کی زندگی کا تجربہ کیا ہے، نرم کا بھی اور سخت کا بھی، تو ہم نے دیکھا کہ ادنیٰ چیز سے کفایت ہو سکتی ہے۔"

حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قناعت ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔"

حضرت ابو حازمؒ نے کہا: "جس آدمی میں تین چیزیں ہوں اس کی عقل کامل ہے (۱) اپنے نفس کو پہچان لے۔ (۲) اپنی زبان کو محفوظ رکھے اور (۳) اللہ کے دیے پر قناعت کرے۔"

بعض حکماء نے کہا، "جب تک تم قناعت کرو گے معزز رہو گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص سے منع کیا اور فرمایا، "اے لوگو! اچھی روزی تلاش کرو کیونکہ آدمی کو وہی ملے گا جو اُس کے لیے لکھا گیا ہے۔" طمع سے منع فرمایا اور کہا "لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے پوری طرح مایوس ہو جاؤ۔"

بعض سلف نے کہا، "اگر طمع کرنے والے سے پوچھا جائے تیرا باپ کون ہے؟ تو کہے گا خدا کی تقسیم میں شک، اور اگر اس سے پوچھا جائے تیرا پیشہ کیا ہے؟ تو کہے گا ذلت حاصل کرنا اور اُس سے کہا جائے تیری انتہا کیا ہے؟ تو کہے گا محرومی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ طمع امیر کو ذلیل کرتی ہے اور لوگوں سے بے پروا ہونا فقیر کو معزز کر دیتا ہے۔

فصل دہم

حرص اور طمع کا علاج

معلوم ہونا چاہیے کہ قناعت تین ارکان سے مرکب ہے : صبر، علم اور عمل - اور ان کا مجموعہ پانچ چیزیں ہیں :

پہلی : معیشت میں میانہ روی اور خرچ کرنے میں نرمی - تو جو قناعت کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ حتی الامکان اخراجات کا دروازہ اپنے نفس پر بند کر دے اور نفس کو صرف وہی چیزیں دے جس کے بغیر چارہ نہیں - جو کھانا ملے اس پر قناعت کرے - تھوڑے سے سالن اور ایک کپڑے کا اپنے نفس کو پابند کرے - اور اگر اُس کے بال بچے ہوں تو اسی انداز سے پر ہر ایک کو عادی بنائے -

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "وہ تنگدست نہیں ہوتا جو میانہ روی اختیار کرے"

ایک اور حدیث میں ہے : " تدبیر کرنا آدھی معیشت ہے "

ایک اور حدیث میں ہے " تین چیزیں نجات دینے والی ہیں - ظاہر اور باطن میں اللہ کا ڈر، دولتمندی اور تنگدستی میں میانہ روی، اور رضا اور غضب دونوں حالتوں میں انصاف کرنا "

دوسری یہ کہ جب موجودہ وقت کے لیے بقدر کفایت مل جائے، تو مستقبل کے لیے بے چین اور مضطرب نہ ہو - اس معاملے میں اس کے مددگار رہیں - تھوڑی آرزوئیں رکھنا اور اس بات کا یقین کہ اس کا رزق لازماً اس کو ملے گا - اور وہ یہ جان لے کہ شیطان اسے تنگدستی سے ڈراتا ہے -

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "روح القدس نے میرے دل میں القاء کیا کہ کوئی آدمی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنا رزق اور اپنی مدت حیات پوری نہ کر لے - تو اللہ سے ڈرو اور طلب رزق میں بہتر طریقہ اختیار کرو اور اگر رزق ملنے میں دیر ہو جائے تو حرام طریقے سے اس کو حاصل نہ کرو کیونکہ جو اللہ کے پاس ہے وہ اس کی اطاعت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے - اور جب وہ ذریعہ باقی نہ رہے جس سے اسے رزق حاصل ہونے کی اُمید تھی تو اس کا دل بیقرار نہ ہونا چاہیے -

کیونکہ حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اُسے گمان نہیں ہوتا۔"

تیسرے یہ کہ جان لے کہ قناعت میں بے نیازی کی کتنی عزت ہے اور طمع اور حرص میں کتنی ذلت!

قناعت میں خواہشاتِ زائدہ سے صبر آتا ہے اور آخرت کا ثواب الگ ملے گا۔ جو آدمی اپنی خواہش پر اپنی عزت کو ترجیح نہ دے وہ کمزور عقل والا اور ناقص الایمان ہے۔

چوتھا یہ کہ یہود و نصاریٰ اور کمینے اور بے وقوف لوگوں کی عیش و عشرت پر اکثر غور کرے۔ پھر انبیاء اور صالحین کے حالات بھی دیکھے۔ ان کی احادیث سنے اور حالات کا مطالعہ کرے اور عقل سے کہے کہ تو دنیا جہان کے ذلیل لوگوں سے مشابہ ہونا چاہتی ہے یا اللہ کی پسندیدہ مخلوق سے۔ یہاں تک کہ تھوڑے پر صبر اور قلیل پر قناعت اس کے لیے آسان ہو جائے۔ اگر وہ کھانے کو نعمت سمجھتا ہے تو چارپائے اس سے زیادہ کھاتے ہیں اور اگر مجامعت کو خوبی سمجھتا ہے تو چڑا (کنجشک) اس سے زیادہ جماع کر سکتا ہے۔

پانچواں یہ کہ سمجھ لے مال جمع کرنے میں کیا کچھ خطرات ہیں۔ یا تو فقر کے ثواب کو دیکھے اور یہ بات اس طرح کامل ہو گی کہ دنیا میں اپنے سے نیچے کو دیکھے اور دین میں اپنے سے اوپر والے کو۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اور اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو یہ زیادہ مناسب ہے کہ تم اپنے رب کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

اس کام کا ستون صبر اور امید کم کرنا ہے اور یہ جان لے کہ دائمی نفع کے لیے دنیا میں اس کے صبر کے ختم ہونے میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ ایسا کرے تو اُس مریض کی طرح ہو گا جو تندرستی کی امید میں دوا کی کڑواہٹ پر صبر کرتا ہے۔

قناعت کے فوائد

جس کے پاس مال نہ ہو اسے قناعت اختیار کرنی چاہیے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور جس کے پاس مال ہو وہ سخاوت اور ایثار اور بھلائی کے کاموں میں اسے خرچ کرے، کیونکہ سخاوت انبیاء کے اخلاق میں سے ہے اور وہ نجات کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جبریل نے کہا اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں اسلام ایک دین ہے جسے میں نے پسند کیا اور اس کی اصلاح، سخاوت اور حسنِ خلق سے ہے، تو جب تک تم مسلمان ہو ان دونوں سے اسلام کی عزت کرو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"سخی کے گناہوں سے درگزر کرو کہ جب بھی وہ کوئی لغزش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "جنت سخیوں کا گھر ہے اور جتنے بھی ولی ہوئے ہیں وہ سب سخی تھے۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری اُمت کے ابدال عبادت اور روزوں کے سبب جنت میں داخل نہیں ہوں گے، بلکہ وہ نفس کی سخاوت اور سینے کی سلامتی اور مسلمانوں کی خیر خواہی سے جنت میں داخل ہوں گے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ "تم بھلائی کرنے کو لازم پکڑو کہ یہ بُری موت سے بچاتی ہے۔"

ابنِ سماکؒ نے کہا: "مجھے اُس آدمی پر تعجب ہے جو اپنے مال سے غلام خریدتا ہے، وہ اپنی سخاوت سے آزاد لوگوں کے دل کیوں نہیں خریدتا؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ آندھی سے بھی زیادہ سخاوت میں تیز رَو تھے اور آپ سے کبھی کسی چیز کا اس طرح سوال نہیں کیا گیا کہ آپ نے "نہیں" کہا ہو۔

ایک آدمی نے آپ سے سوال کیا تو آپ نے اُس کو دو پہاڑوں کے درمیان کی ساری بکریاں دے دیں۔ وہ آدمی اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم مسلمان ہو جاؤ محمدؐ اس آدمی کی طرح دیتا ہے جسے تنگدستی کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ذمّے پچاس ہزار درہم قرضہ تھا۔ آپ مسجد کی طرف آئے تو حضرت طلحہؓ نے آپ سے کہا آپ کا مال تیار ہے وہ لے لیں۔ انھوں نے کہا: "اے ابو محمد وہ آپ کی مروت کے کاموں میں اعانت ہے۔"

ایک دیہاتی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور سوال کیا اور یہ بھی بتایا کہ میری آپ سے قرابت ہے۔ آپ نے فرمایا قرابت کے واسطہ سے تجھ سے پہلے مجھ سے کسی نے سوال نہیں کیا۔ یہ فرما کر اسے تین لاکھ درہم دیے۔

حضرت عروہؓ نے کہا: "میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا آپ نے ستر ہزار درہم تقسیم کیے اور آپ کی قمیص کو پیوند لگے ہوئے تھے۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم لوگوں میں تقسیم کیے۔ جب شام ہوئی تو لونڈی سے فرمایا: "ہمارے لیے روزے کی افطاری لے آؤ"۔ وہ روٹی اور زیتون کا تیل لائی اور کہا: آپ نے اتنا روپیہ خرچ کیا اگر افطاری کے لیے گوشت منگا لیتیں تو کیا بات تھی؟ فرمایا اگر تم مجھے یاد کرا دیتی تو میں ایسا کر لیتی۔

عبداللہؓ بن عامر نے خالدؓ بن عقبہ سے ان کا وہ مکان جو بازار میں تھا نوے ہزار درہم میں خریدا۔ رات ہوئی تو خالد کے گھر والوں کے رونے کی آواز سنی۔ اپنے گھر والوں سے پوچھا یہ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے کہا مکان کے فروخت ہو جانے کی وجہ سے۔ تو آپ نے کہا: اے غلام، ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم مال اور مکان دونوں رکھو۔

عبداللہ کی طرف ایک آدمی نے پیغام بھیجا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تم گائے کا دودھ پیا کرو۔ آپ مجھے ایک گائے بھیج دیں کہ میں اس کا دودھ پیا کروں، تو آپ نے اُس کو سات سو گائیں اور ان کے چرواہے بھیج دیے اور کہا وہ بستی بھی تمھاری ہے جس میں یہ گائیں چرا کرتی تھیں۔

علی بن حسین حضرت محمد بن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے آئے، تو وہ رونے لگے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ کہا مجھ پر قرضہ ہے۔ پوچھا کتنا ہے؟ کہا پندرہ ہزار دینار یا انیس ہزار دینار، تو آپ نے کہا وہ میرے ذمّہ ہوا۔

ایک آدمی نے معنؒ سے سوال کیا، تو آپ نے کہا۔ اے غلام! میری فلاں اونٹنی اور ایک ہزار دینار اس کو دے دو۔ اُس نے دے دی حالانکہ آپ اسے جانتے بھی نہ تھے۔

معنؒ کے متعلق ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ ایک شاعر مدّت تک ان کے دروازے پر ٹھہرا رہا لیکن اُن سے ملاقات نہ ہو سکی، تو اُس نے ان کے کسی خادم سے کہا۔ جب امیر باغ میں داخل ہوں تو مجھے ان کو دکھانا؛ چنانچہ جب وہ باغ میں آئے تو خادم نے اس کو بتا دیا۔ شاعر نے لکڑی پر ایک شعر لکھا اور پانی میں ڈال دیا جو باغ میں داخل ہو رہا تھا۔ جب معنؒ نے لکڑی دیکھی تو اس کو پکڑ لیا۔ اس پر لکھا تھا ؎

أَيَا جُودَ مَعْنٍ نَاجِ مَعْنًا بِحَاجَتِيْ فَمَالِيْ إِلَىٰ مَعْنٍ سِوَاكَ شَفِيْعُ

ترجمہ: اے معن کی سخاوت میری حاجت کے متعلق معن سے گفتگو کر کہ تیرے سوا اُن کی خدمت میں میرا کوئی سفارشی نہیں ہے۔

پوچھا یہ کس نے لکھا ہے؟ انھیں شاعر کے متعلق بتایا گیا۔ اُسے بُلا کر دریافت کیا میری سخاوت کے بارے میں کس نے بتایا؟ اس نے پھر شعر پڑھا تو آپ نے اس کو دس "بدرے" دینے کا حکم دیا (بدرہ ہزار یا دس ہزار درہم کا تھیلا) اس نے لے لیے اور امیر نے اس لکڑی کو اپنے فرش کے نیچے رکھ دیا۔ دوسرے دن پھر اسے فرش کے نیچے سے نکال کر پڑھا اور شاعر کو بلا کر پھر ایک لاکھ درہم عنایت کیے۔ شاعر نے لے لیے تو اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ امیر اس سے واپس نہ لے لے اور وہ چلا گیا۔

جب تیسرا دن ہوا تو پھر اس کو پڑھا اور شاعر کو بلوایا۔ معلوم ہوا کہ وہ چلا گیا ہے تو کہا "میں اس کو دیتا جاتا یہاں تک کہ میرے خزانے میں کوئی درہم و دینار باقی نہ رہتا۔"

قیس بن سعد بن عبادہ بیمار ہوئے تو اُن کے دوستوں نے بیمار پرسی میں دیر کی۔ پوچھا تو ان سے کہا گیا چونکہ وہ آپ کے مقروض ہیں۔ آپ کے سامنے آنے سے شرم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "اللہ مال کو ذلیل کرے جس نے میرے بھائیوں کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔" پھر منادی کا حکم دیا کہ آواز دے۔ قیس کا جس پر کوئی قرضہ ہے وہ اسے معاف ہے۔ کہا جاتا ہے عشاء کے وقت تک آپ کی عیادت کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے آپ کی سیڑھی ٹوٹ گئی۔

ایک آدمی نے کھڑے ہو کر سعیدؓ بن عاص سے سوال کیا۔ آپ نے اس کو ایک لاکھ درہم دیئے تو وہ رونے لگا۔ سعید نے پوچھا۔ کیوں روتا ہے؟ کہا میں زمین پر روتا ہوں کہ وہ تیرے جیسے آدمی کو بھی کھائے گی۔ تو آپ نے اس کو ایک لاکھ درہم اور دیے۔

فصل یازدہم

بُخل اور اُس کی مذمت

حضرت ابو سعیدؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دو عادتیں کسی مومن میں اکٹھی نہیں ہوتیں۔ بُخیلی اور بد خُلقی۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان اور حرص کسی بندے کے دل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔"

مسلم کے افراد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ فرماتے تھے "اے اللہ! میں بزدلی اور بخیلی سے تیری پناہ لیتا ہوں۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سلمہ سے پوچھا تمہارا سردار کون ہے؟ کہنے لگے جدّ بن قیس، لیکن ہم اُسے بخیل سمجھتے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا "بُخل سے بڑھ کر بری بیماری کونسی ہے؟ بلکہ تمہارا سردار بشر بن براء بن معرور ہے۔" اور یہ عمروؓ بن جموح کے ذکر سے زیادہ صحیح ہے اور بعض راویوں نے غلطی کھائی اور براء بن معرور کہہ دیا۔ حالانکہ براء ہجرت سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: بخیلی جس کی پیروی کی جائے اور خواہش جس کا پیچھا کیا جائے اور آدمی کا اپنے نفس کو پسند کرنا۔"

خطابی نے کہا شُحّ نہ دینے میں بُخل سے زیادہ بلیغ ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا "جب سخی مرتا ہے، تو زمین اور اس کے نگران فرشتے کہتے ہیں اے رب! اپنے بندے کو اس کی سخاوت کی وجہ سے معاف کر دے۔ اور جب بخیل مرتا ہے تو کہتے ہیں اے اللہ! اس بندے کو جنّت سے روک دے، جیسا کہ اس نے تیرے بندوں کو دُنیا میں اس چیز سے روکا جو تُو نے اُس کے ہاتھ میں دی تھی۔"

بعض حکماء نے کہا "بخیل کے مال کا وارث اس کا دشمن ہوتا ہے۔"

ایک اعرابی نے ایک قوم کی مذمّت کی اور کہا وہ بھلائی سے روزہ رکھتے ہیں اور بے حیائی پر افطار کرتے ہیں۔

ایک اور اعرابی نے ایک آدمی کی صفت بیان کی اور کہا: "وہ میری نگاہ میں چھوٹا ہے کیونکہ دنیا اس کی نگاہ میں بڑی ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ حاجب عرب کا ایک بہت امیر آدمی تھا لیکن بخیل ایسا تھا کہ رات کو اس لیے آگ نہ جلاتا کہ کوئی اُس کی روشنی سے فائدہ اٹھائے گا۔ بہت ہی ضرورت کے وقت آگ جلاتا، لیکن جیسے ہی یہ گمان گزرتا کہ کوئی روشنی سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو اُس کو بجھا دیتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مروان بن ابی حفصہ سب سے زیادہ بخیل آدمی تھا۔ ایک دن وہ خلیفہ مہدی عباسی کے پاس آنے لگا تو اُس کی بیوی نے کہا: "اگر تمہیں کچھ انعام ملا تو مجھے کیا دو گے؟"

کہنے لگا: "اگر مجھے ایک لاکھ درہم ملے تو تجھے ایک درہم دے دوں گا۔"

خلیفہ نے اسے ساٹھ ہزار درہم دیے، تو اُس نے بیوی کو چار دانق دیے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بخیل بہت دولتمند تھا۔ ایک دن اُس نے بازار سے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں اور مزدور کو بلایا اور کہا ان اشیاء کو اٹھانے کا کیا لوگے؟

اس نے کہا: "ایک حبّہ" (چاندی کا سکّہ جو دو جَو کے وزن کا تھا)

کہنے لگا: "کچھ کم کرو۔"

مزدور بولا: "حبّہ سے کم کیا کروں کہ سب سے چھوٹا سکّہ تو یہی ہے۔"

بخیل نے کہا: "ہم ایک حبّہ کی گاجریں لیتے ہیں پھر دونوں مل کر کھا لیتے ہیں۔"

ایثار کی فضیلت

معلوم ہونا چاہیے کہ سخاوت اور بخل کے کئی درجے ہیں اور سخاوت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ایثار ہے جو یہ ہے کہ اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دی جائے۔ اسی طرح بخل کا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ ضرورت کے باوجود آدمی اپنی ذات پر بھی خرچ نہ کرے۔ کتنے ہی بخیل ہیں جو مال دار ہونے کے باوجود اپنا علاج بھی نہیں کراتے اور دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو بخل پوری نہیں کرنے دیتا۔ کتنا فرق ہے اس آدمی میں جو ضرورت کے باوجود اپنی ذات پر بھی خرچ نہ کرے، اور اُس آدمی میں جو حاجت کے باوجود اپنا مال دوسروں کو دے دے۔ دراصل اخلاق، اللہ تعالیٰ کی خاص بخشش ہے

جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

سخاوت میں ایثار سے بڑھ کر اور کوئی درجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مدح ایثار سے فرمائی۔ ارشاد ہوا: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[1] (اور وہ اپنی جانوں پر بھی دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو)

اس آیت کے نازل ہونے کا سبب حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جبکہ اُنھوں نے ایک بھوکے آدمی کو اپنی اور اپنے بچوں کی روٹی کھلا دی۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے۔

یرموک کی جنگ میں عکرمہؓ بن ابوجہل، سہیلؓ بن عمرو، حارث بن ہشام اور بنو مغیرہ کی ایک جماعت شہید ہو گئی۔ جب وہ زخمی ہو کر گرے ہوئے تھے، تو ان کے پاس پانی لایا گیا۔ وہ پانی ایک دوسرے کی طرف بھیجتے رہے۔ یہاں تک کہ سب شہید ہو گئے اور پانی کسی نے بھی نہ پیا۔

حضرت عکرمہؓ کے پاس پانی لایا گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ سہیلؓ بن عمرو پانی کو دیکھ رہے ہیں۔ تو کہا پہلے ان کو پلاؤ۔ سہیلؓ نے حارثؓ کو دیکھا کہ وہ پانی کو دیکھ رہے ہیں، تو کہا پہلے ان کو پلاؤ۔ یونہی ہر ایک پانی پینے میں دوسرے کو ترجیح دیتا رہا یہاں تک کہ سب ہی پانی پینے سے پہلے شہید ہو گئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے تو کہا: "میری جان تم پر قربان ہو"

ایک صحابی کو بکری کی سری ہدیہ میں دی گئی تو انھوں نے کہا "میرے بھائی کو اس کی زیادہ ضرورت ہے" اور یہ سری اور کی طرف بھیج دی۔ یہاں تک کہ وہ سات گھروں سے ہو کر پھر پہلے کے پاس آ گئی۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اپنی زمین کی طرف نکلے، تو ایک باغ کے پاس سے گزرے۔ اس میں ایک حبشی غلام کام کرتا تھا۔ غلام کی روٹی آئی، ساتھ ہی ایک کُتا باغ میں داخل ہوا اور غلام کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ غلام نے اس کی طرف ایک روٹی پھینکی۔ اس نے کھا لی۔ پھر دوسری پھینکی تو وہ بھی کھا گیا۔ پھر تیسری پھینکی وہ بھی کھا گیا۔

عبداللہؓ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے کہنے لگے: "اے شخص! تجھے روزانہ کتنی روٹیاں ملتی ہیں"؟ اس نے کہا: "جتنی آپ نے دیکھیں"۔ پھر کہا: "تو نے کُتے کو کیوں کھلا دیں"؟ تو اس نے کہا: "اس علاقے میں کُتے نہیں

---

[1] سورۃ حشر۔ آیت: ۹

ہوتے۔ یہ دور کی مسافت طے کر کے آیا تھا اور بھوکا تھا۔ میں نے اس کو لوٹا نا پسند نہ کیا۔" پوچھا "اب تم کیا کرو گے؟" کہا: "میں آج بھوکا رہ لوں گا۔" عبداللہؓ بن جعفر نے کہا: مجھے سخاوت پر ملامت کی جاتی ہے اور یہ مجھ سے بھی زیادہ سخی ہے۔ پھر اُس باغ، اُس کے آلات اور اس غلام کو خریدا اور اُسے آزاد کر کے وہ باغ اُس کو ہبہ کر دیا۔

ایک جگہ فقیروں کی ایک جماعت اکٹھی ہوئی۔ اُن کے پاس چند روٹیاں تھیں جو ان کو کافی نہ تھیں انھوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کیے اور چراغ گُل کر کے کھانے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد چراغ جلایا گیا تو کھانا اسی طرح پڑا تھا۔ اپنے ساتھیوں پر ایثار کرتے ہوئے کسی نے ایک نوالہ بھی نہ کھایا تھا۔

لوگوں نے بُخل اور سخاوت کی تعریف میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم نے بُخل کی تعریف یہ کی ہے کہ واجبات ادا نہ کرے، جو واجبات ادا کرے وہ بخیل نہیں ہے، لیکن یہ تعریف کافی نہیں، کیونکہ جو آدمی اپنے بچوں کو صرف اتنا ہی دے جتنا حاکم نے مقرر کیا ہے۔ اس کے بعد انھیں ایک لقمہ یا ایک کھجور بھی نہ دے، تو وہ بخیل ہے بُخل سے بریّت تب ہوتی ہے جب شریعت کے واجبات اور مروّت کے لوازمات خوشی سے ادا کرے۔ اور شریعت کے واجبات، زکوٰۃ اور بال بچوں کے اخراجات ہیں۔ اس کے علاوہ مروّت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ بچوں پر تنگی نہ کرے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا حساب نہ لیتا ہے۔ یہ رویّہ ناپسندیدہ ہے۔

ہر شخص کے حالات اُس کی حیثیت کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔ کئی چیزیں دولتمند کے لیے بُری ہیں۔ فقیر کے لیے بُری نہیں ہیں، لیکن اپنے بال بچوں، قرابت داروں اور ہمسایوں پر تنگی کرنا بہرحال بُرا ہے؛ البتہ کسی اجنبی کی ضرورت کا خیال نہ کرنا برائی سے نہیں۔ بُخل یہ ہے کہ ایسی چیزوں کو روک لے جن کو روکنا نہ چاہیے۔ جو شریعت کے واجبات اور مروّت کے لوازمات ادا کرے بخیل نہیں۔

بعض نے کہا سخی وہ ہے جو دے کر احسان نہ جتلائے، نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ سخی وہ ہے جو دے کر خوش ہو۔

رہا بُخل کا علاج، تو معلوم ہونا چاہیے کہ بُخل کا سبب مال کی محبت ہے اور مال کی محبت کے دو سبب ہیں، پہلا سبب خواہشات میں اُلجھ جانا اور لمبی آرزوؤں میں مبتلا ہو جانا۔ ان میں وہ آرزوئیں بھی شامل ہیں جو انسان اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے۔

دوسرا سبب یہ کہ بذاتِ خود مال کی محبت ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس ضرورت سے

بھی بہت زیادہ دولت ہوتی ہے ۔ وہ عمر کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہوتے ہیں، اولاد سے بھی محروم ہوتے ہیں، لیکن حال یہ ہوتا ہے کہ خاص اپنی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں کرتے۔ صاف نظر آرہا ہوتا ہے کہ ان کی موت کے بعد یہ مال دوسروں کے قبضے میں چلا جائے گا لیکن دولت کی حرص انھیں خرچ کرنے سے روکے رکھتی ہے یہ ایک لاعلاج مرض ہے ۔

ایسے شخص کی مثال اس آدمی جیسی ہے جسے کسی سے محبت ہو۔ پھر اس کا ایلچی آئے تو ایلچی سے محبت کرنے لگے اور اپنے محبوب کو بھول جائے۔ یہ دنیا ایلچی ہے حقیقی منزل کی طرف لے جانے والی ہے۔ جو شخص اس سے محبت کرے اور حقیقی منزل کو بھول جائے اس سے بڑھ کر بدنصیب کون ہوگا؟

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر بیماری کا علاج اس کے اسباب کی رعایت سے ہوتا ہے۔ مثلاً خواہشات کی محبت کا علاج قناعت اور صبر ہے اور لمبی آرزوؤں کا علاج موت کا اکثر تذکرہ کرنا۔ اسی طرح اگر اولاد کی محبت میں دل اُلجھ گیا ہو، تو اس کا علاج یہ خیال کرنا ہے کہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے اُس نے اُن کی روزی بھی پیدا کی ہے۔ کتنے ہی آدمی ہیں جنھیں کوئی چیز وراثت میں نہ ملی اور وہ وارث ہونے والوں سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اسے چاہیے اس صورت سے ڈرے کہ بچوں کے لیے تو بھلائی چھوڑ جائے اور خود اللہ کے پاس بُرائی لے کر جائے۔ اگر اُس کی اولاد نیک ہوگی تو اللہ ان کا مددگار ہے اور اگر بُری ہوگی تو ان کے لیے ایسا مال نہ چھوڑ جائے جس سے گناہوں پر ان کو مدد ملے۔

بخل کی مذمت اور سخاوت کی مدح میں ہم نے جو ذکر کیا ہے اسے بار بار سنتا رہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں محبوب جتنے زیادہ ہوں گے مصائب بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ جو مال کی آفت کو جان لے گا وہ اس سے پیار نہ کرے گا۔ اور جو آدمی بقدر ضرورت مال حاصل کرے اور اسے اپنی ضرورت کے لیے روک رکھے تو وہ بخیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اپنی امت پر سب سے بڑا خوف ریا اور پوشیدہ خواہش کا ہے۔"

اس پوشیدہ خواہش کی تباہ کاریوں پر بعض اوقات بڑے بڑے علما بھی آگاہ نہیں ہوسکتے، چہ جائیکہ عام عبادت گزار واقف ہوں اور اس بیماری میں وہ علماء اور عابد مبتلا ہوتے ہیں جو آخرت کی راہ طے کرنے کے لیے کمر ہمت باندھتے ہیں۔ جب یہ اپنے نفسوں کو مغلوب کر لیتے ہیں اور اُن کی خواہشات اُن سے چھڑا دیتے ہیں اور عبادات کے اسباب پر اُن کو مجبور کر دیتے ہیں تو نفس ظاہری گناہوں سے مایوس ہو جاتے ہیں

جو کہ اعضاء سے صادر ہوتے ہیں۔ تو وہ علم اور عمل کے اظہار میں راحت پانا چاہتے ہیں۔

لوگوں کا ان کو وقار اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھنا اور خلقت میں مقبول ہونا ایسی باتیں ہوتی ہیں جن سے نفس کو لذتِ عظیم حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابل گناہ کا چھوڑنا ان کو بالکل حقیر معلوم ہوتا ہے۔ پھر کوئی ان میں سے خیال کرتا ہے کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہے حالانکہ وہ منافقین کے دفتر میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ شیطان کا ایک بہت بڑا مکر ہے اس سے مقرب لوگ ہی بچ سکتے ہیں؛ چنانچہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ صدیقین کے دماغ سے جو آخری چیز نکلتی ہے، وہ مرتبہ وجاہ کی محبت ہے اور چونکہ یہی ایک پوشیدہ بیماری ہے اور یہی شیطان کا سب سے بڑا جال ہے، تو ضروری ہے کہ ہم اس کے اسباب اور حقیقت اور اقسام کو بہ تفصیل بیان کریں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جاہ و مرتبہ کا اصل شُہرت اور چرچا کا پھیلنا ہے۔ اور یہ بہت بڑا خطرہ ہے۔ سلامتی گمنامی میں ہے۔ نیک لوگ شہرت نہیں چاہتے اور نہ اُس کے اور اُس کے اسباب کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا ہو جائے تو اس سے بھاگتے اور گمنامی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اپنے گھر سے نکلے تو ایک جماعت آپ کے پیچھے چلنے لگی۔ آپ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "میرے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟ خدا کی قسم! جو میں اپنے گھر کے اندر کرتا ہوں اگر تم کو معلوم ہو جائے تو تم میں سے میرے پیچھے دو آدمی بھی نہ آئیں۔" ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "واپس چلے جاؤ یہ پیچھے آنے والے کے لیے ذلت اور متبوع کے لیے فتنہ ہے۔"

ابو العالیہ رحمہ اللہ کی مجلس میں جب چار آدمیوں سے زیادہ بیٹھ جاتے، تو آپ مجلس سے اُٹھ جاتے اور خالد بن معدان رحمہ اللہ کا حلقہ جب بڑا ہو جاتا تو آپ ناپسند کرتے اور اُٹھ کر چلے جاتے۔

زہری رحمہ اللہ نے کہا "ہم نے سب سے کم زہد ریاست میں دیکھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مال اور کھانے کی پروا نہیں کرتا، لیکن جب ریاست میں اُس سے جھگڑا کیا جائے تو اُس کی حفاظت کرتا ہے اور اُس پر لڑتا ہے۔"

ایک آدمی نے بشر حافی رحمہ اللہ سے کہا: "مجھے کچھ وصیت فرمائیے" تو کہا "اپنے کو گمنام کر دو، خواہ کھاؤ اچھا کھاؤ۔ اور فرمایا": آدمی آخرت کی لذت نہیں پاتا جو دنیا میں شہرت کا طالب ہو۔"

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عمر بن سعدؓ سوار ہو کر اپنے باپ سعد کی طرف گئے جو مدینہ سے

باہر اپنی بکریاں چرا رہے تھے۔ جب آپ نے اُس کو دیکھا تو کہا: "میں اس سوار کی بُرائی سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔" جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو کہا: "ابا جان! کیا آپ اعرابی بن کر اپنی بکریوں ہی میں رہیں گے لوگ مدینہ میں حکومت کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں" تو سعد نے اُن کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا: "خاموش رہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ پرہیزگار، بے نیاز اور گمنام آدمی کو پسند کرتا ہے۔"

ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ رشک وہ مومن ہے جو غریب ہو، نماز خوب پڑھتا ہو۔ اپنے رب کی عبادت اچھی طرح کرے۔ پوشیدگی میں بھی اس کی اطاعت کرتا ہو اور لوگوں میں گمنام ہو۔ انگلیوں سے اس کی طرف اشارے نہ ہوتے ہوں اور اس کا رزق محض گزارے کے لیے ہو۔ پھر وہ اس پر صبر کرے۔" پھر ہاتھ سے زمین کریدنے لگے اور فرمایا: "اس کی موت جلدی ہو جائے۔ اس کے رونے والے تھوڑے ہوں۔ اس کی میراث تھوڑی ہو۔"[1] (حدیث حسن)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو وصیت کرتے اور فرماتے "تم بن جاؤ علم کے چشمے، ہدایت کے چراغ، گھروں میں بیٹھ رہنے والے، رات کے چراغ، نئے دلوں والے، پرانے کپڑوں والے، تم آسمان میں پہچانے جاؤ اور زمین والوں پر مخفی رہو۔"

اگر اعتراض کیا جائے کہ اس میں گمنامی کی فضیلت اور شہرت کی مذمت ہے۔ اور انبیاء اور ائمہ و علماء کی شہرت سے بڑھ کر اور کس کی شہرت ہے؟

تو ہم کہتے ہیں انسان کا شہرت طلب کرنا بُرا ہے۔ اور اگر طلب کے بغیر اللہ کی طرف سے یہ چیز مل جائے تو بُری نہیں۔ اس کا وجود کمزوروں کے لیے فتنہ ہے۔ کمزور کی مثال اس غرق ہونے والے کی طرح ہے جو تیرنا نہ جانتا ہو۔ اگر کوئی اس کو پکڑے گا تو خود بھی غرق ہو جائے گا اور اگر پیراکی میں ماہر ہو تو ڈوبنے والے کی نجات اور خلاصی کا سبب بن جائے گا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جاہ اور مال دنیا کے دو ستون ہیں۔ مال کا معنی ہے چیزوں کا مالک ہونا جن سے فائدہ حاصل کیا جائے اور جاہ کا معنی ہے دلوں کا مالک ہونا جن سے تعظیم اور اطاعت مطلوب ہو اور ان میں

---

[1] مسند احمد ۵: ۲۵۵۔ ترمذی نمبر ۲۳۴۸۔ ابن ماجہ ۴۱۱۷

تصرّف کر سکے۔

جاہ (مرتبہ) لوگوں کے دلوں میں منزلت کا قیام ہے۔ اور وہ اس شخص میں کسی کمال کی صفت کا دل میں اعتقاد ہے، خواہ وہ علم ہو یا عبادت، نسب، قوت، خوبصورتی یا اور کوئی چیز جسے لوگ کمال سمجھتے ہوں، تو جتنا ان کے متعلق کسی کا عقیدہ ہوگا اتنا ہی دل اس کی اطاعت، مدح، خدمت اور عزت کے لیے فرمانبردار ہوگا۔ پس معلوم ہوا جاہ محبوب بالطبع ہے اور یہ مال کی محبت سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ مال بذاتہٖ محبوب نہیں، بلکہ وہ محبوب چیزوں کے حصول کا وسیلہ ہے۔ مال اور جاہ کا سبب میں مشترک ہونا محبت کے اشتراک کا تقاضا کرتا ہے اور جاہ مال سے زیادہ راجح ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جاہ (مرتبہ) اچھا بھی ہے اور بُرا بھی۔ یہ تو معلوم ہے کہ انسان کے لیے مال ضروری ہے کہ اس سے کھانے اور لباس وغیرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اسی طرح لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے جاہ و مرتبہ بھی لازمی چیز ہے کیونکہ انسان کو بادشاہ سے بھی حاجت ہے جو اس کی حفاظت کرے اور ساتھی کی بھی جو اسے مدد دے اور خادم کی بھی جو اس کی خدمت کرے، تو اس کی محبت بھی بُری نہیں ہے کیونکہ مال کی طرح مرتبہ بھی اغراض کے حصول کا وسیلہ ہے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ مال اور جاہ بذاتِ خود محبوب نہ ہوں۔ جب آدمی اپنے مرتبے کا قیام کسی صفت کی وجہ سے جس سے وہ موصوف ہو صحیح غرض کے لیے کرے جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کہا تھا اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ[۱] (مجھے زمین کے خزانے سپرد کر دو میں حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں)۔

یا اپنے کسی عیب کو چھپانا مقصود ہو تاکہ اس کی منزلت ختم نہ ہو تو یہ جائز ہے۔ اور اگر منزلت لوگوں سے کسی ایسی صفت پر عقیدے کے سبب مطلوب ہو جو اس میں نہیں ہے، مثلاً علم، پرہیزگاری اور نسب، تو یہ جائز نہیں۔

اسی طرح اگر لوگوں کے سامنے اچھی طرح نماز پڑھے تاکہ لوگ اس کے خشوع کے معتقد ہوں، تو یہ اس میں ریاکار ہوگا۔ فریب سے دلوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور دھوکے سے مال کا مالک ہونا جائز نہیں۔

---

[۱] سورۃ یوسف۔ آیت: ۵۵

فصل سیزدہم

حُبِّ جاہ کا علاج

معلوم ہونا چاہیے کہ جس کے دل پر حُبِّ جاہ غالب ہو اس کا انتہائی مقصد مخلوق کی خوشنودی بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں ان کے پاس آنے جانے اور ان کو اپنے اچھے اعمال دکھلانے کا خیال ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسے اقوال و افعال کی طرف توجہ کرتا ہے جن سے لوگوں کے نزدیک اس کی منزلت بڑھے۔ یہ نفاق کا بیج اور فساد کی جڑ ہے، کیونکہ جو لوگوں کے دلوں میں منزلت چاہے گا وہ منافقت سے ایسی باتوں کا اظہار کرے گا جو اس میں نہیں ہیں، اور یہ چیز اسے عبادت میں ریاکاری اور ممنوعات کے ارتکاب اور دلوں کا شکار کرنے کی طرف لے جائے گی۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال اور جاہ کی محبّت اور ان کے دینی نقصان کو دو بھوکے بھیڑیوں سے تشبیہ دی ہے جنھیں بکریوں میں چھوڑ دیا جائے۔

ایسی صورت میں جاہ کی محبت مہلک ہے۔ اس کا علاج ضروری ہے۔ اور اس کا علاج علم اور عمل سے مرکّب ہے۔ علم سے تو اس طرح کہ وہ جان لے کہ وہ سبب جس کی وجہ سے وہ جاہ سے محبّت رکھتا ہے اور وہ ہے لوگوں اور ان کے دلوں پر کمال درجے کی قدرت، تو یہ اگر مکدّرات سے صاف اور بچی ہوئی بھی ہو تو انجام کار موت ہے۔ اُسے چاہیے اُن آفات و خطرات پر غور کرے جو مرتبہ والوں کو دنیا میں لاحق ہوتے ہیں۔ ان سے حسد کیا جاتا ہے۔ اُن کو ایذائیں دینے کے ارادے ہوتے ہیں؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مرتبہ کے زوال سے ڈرتے رہتے ہیں اور لوگوں کے دلوں سے اپنی قدر و منزلت کے تبدیل ہونے سے بچتے رہتے ہیں۔

دل تو ابلتی ہوئی ہنڈیا سے بھی جلدی بدل جاتے ہیں۔ ان کی رعایت میں مشغول ہونا دنیا کے غم ہیں جو مرتبے کی حفاظت کو مکدّر کرتے ہیں، تو دنیا کی امیدیں اس کے خوف کی برابری نہیں کر سکتیں اور آخرت کا نقصان اس کے علاوہ ہے۔

علمی حیثیت سے علاج یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے اپنی جاہ و منزلت کو ایسے افعال سے ختم کر دیا جائے جو انھیں پسند نہ ہوں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک زاہد کی زیارت کے لیے ایک بادشاہ آیا۔ جب وہ اُس سے قریب ہوا تو اُس نے عمدہ کھانا منگایا اور بے تحاشا کھانے لگا۔ منہ میں بڑے بڑے لقمے ڈالتا۔ بادشاہ نے اُسے اس طرح کھاتے دیکھا تو خیال کیا یہ شخص زاہد نہیں ہو سکتا اور عقیدت کا اظہار کیے بغیر لوٹ گیا۔

ابراہیم نخعی کو جب قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا تو آپ نے سُرخ قمیص پہنی اور بازار میں آکر بیٹھ گئے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ زاہد کا لوگوں سے الگ تھلگ رہنا لوگوں میں اس کے مرتبہ کو پیدا کرتا ہے۔ پھر جب اس فتنے سے ڈرے تو سلامتی کے طریقے پر اُن سے میل جول رکھے۔ بازاروں میں چلے پھرے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدے اور اٹھا کر لائے اور ان کی دنیا سے امیدیں منقطع کرے۔ اس طرح اس کی مراد پوری ہوگی۔

حقیقی اور مصنوعی زہد

معلوم ہونا چاہیے اکثر لوگ دوسروں کی مذمت کے خوف اور ان کی مدح کی محبت میں ہلاک ہوتے ہیں۔ ان کی تمام حرکات مدح کی اُمید اور مذمت کے خوف کی وجہ سے لوگوں کی مرضی کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ چیز سراسر ہلاکت ہے۔ اس کا علاج کرنا ضروری ہے۔

اس برائی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس صفت کو دیکھو جس کی وجہ سے کوئی تمھاری مدح کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تم میں موجود ہے، تو پھر یا تو وہ ایسی صفت ہوگی جس پر خوش ہونا چاہیے، جیسے علم اور پرہیزگاری یا پھر وہ ایسی ہوگی جو خوش ہونے کے قابل نہیں۔ مثلاً عزت وجاہ اور دولت وغیرہ۔

پہلی صورت میں بُرے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ اس کا خوف مدح کی خوشی سے غافل کر دے گا۔ ہاں اگر حسنِ خاتمہ کی اُمید پر خوش ہوتے ہو تو تم پر اللہ کا فضل ہے کہ تم کو علم اور پرہیزگاری ہی پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ لوگوں کی مدح وثنا پر۔

دوسری صورت میں جبکہ مال اور جاہ کی وجہ سے مدح ہو تو یہ یوں ہے جیسے زمین کی زرخیزی پر خوش ہونا کہ وہ بہت ہی جلد چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اس پر تو کوئی بیوقوف ہی خوش ہوگا۔ اور اگر تم اس صفت سے خالی ہو جس کی وجہ سے تمھاری مدح ہو رہی ہے تو اس مدح پر خوش ہونا انتہائی پاگل پن ہے۔

ہم نے پہلے آفاتِ زبان کے بیان میں مدح کی آفات کا ذکر کیا ہے تو اس پر خوش نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے ناپسند کرنا چاہیے۔ جیسا کہ سلف اسے ناپسند کرتے تھے اور ایسا کرنے والے پر ناراض ہوتے تھے۔

مذمت کو ناپسند کرنے کا علاج مدح کی محبت کے علاج سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے برخلاف ہے اور اس میں مختصر بات یہ ہے کہ جو تمھاری مذمت کرتا ہے، اگر وہ اس بات میں سچا ہے اور تمھارا خیر خواہ ہے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس نے تمھارے عیوب کا ہدیہ تمھاری خدمت میں پیش کیا ہے اور اگر اُس نے خیر خواہی کا ارادہ نہیں کیا تو اس نے خود اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ چاہیے کہ اُس کے قول سے فائدہ اٹھاؤ۔ اُس نے تمھیں وہ بات بتا دی ہے جو تمھیں معلوم نہ تھی اور تمھارے وہ گناہ یاد کرائے جو تم بھول چکے تھے۔

اگر اس نے تم پر جھوٹا الزام لگایا ہے، تب بھی تین چیزوں پر غور کرنا چاہیے: پہلی یہ کہ اگرچہ تم اس عیب سے پاک ہو، لیکن اس جیسے دوسرے عیوب سے پاک نہیں، تو جن عیوب پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے وہ بہت زیادہ ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمھیں تمھارے عیوب پر مطلع نہیں کیا۔
دوسری یہ کہ الزام گناہوں کا کفارہ ہے۔ تیسری یہ کہ حاسد نے اپنے دین کا نقصان کیا اور اللہ کے غضب کے سامنے آیا، تو چاہیے کہ تم اللہ سے اُس کے لیے معافی مانگو، یہ تمھارے لیے باعثِ اجر ہوگا۔
بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے ابراہیم بن ادھم کو زخمی کر دیا۔ آپ نے اُس کے لیے بخشش کی دعا کی اور کہا میں اس کے سبب سے اجر کا مستحق ہوا۔ اُسے میرے سبب سے عذاب نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے یہ حکایت بردباری کی فضیلت میں بیان ہو چکی ہے۔

كِتَابُ التَّزكِيَة

حصّہ دوم

- ریا، اُس کی حقیقت، اقسام اور مذمّت
- عبادات میں ریا
- کونسی ریاء سے عمل ضائع ہو جاتا ہے
- ریا کے امراض کا علاج
- عبادت میں تساہل اور اُس کا سدّباب
- ریا کی اقسام اور ان کا علاج
- تکبّر اور غرور کی مذمّت
- تکبّر کے درجے
- تکبّر کا علاج اور تواضع کا حصول
- عُجب کے متعلّق تصریحات
- دھوکا اور اُس کے درجات
- گمراہوں کی قسمیں
- ریاکار صوفی
- دولت مند لوگ

فصل اوّل

ریا، اُس کی حقیقت، اقسام اور مذمّت

ریا کی مذمت کتاب وسنت میں بکثرت بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ[1] (ان نمازیوں پر افسوس ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں)

فرمایا: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا[2]۔ (پھر جو اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو وہ اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو آدمی کوئی ایسا عمل کرے جس میں میرے سوا کسی اور کو بھی شریک ٹھہرائے، تو وہ عمل اسی کا ہے جس کو شریک ٹھہرایا۔ میں اس سے بری ہوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے سب سے زیادہ خوف تم پر چھوٹے شرک کا ہے۔" صحابہؓ نے پوچھا "اے اللہ کے رسول! چھوٹا شرک کیا ہے؟" آپ نے فرمایا "ریا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا تو اُن سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ جن کو تم دنیا میں اعمال دکھایا کرتے تھے۔ کیا ان کے پاس تمھارے لیے کوئی بھلائی ہے؟"

حضرت بشر حافیؒ نے کہا: "اگر میں دنیا کا بجا کر حاصل کروں، تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے کہ میں اسے دین کا وسیلہ بنا کر حاصل کروں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ ریا رؤیت سے مشتق ہے اور سمعہ سماع سے مشتق ہے۔ ریاکار لوگوں کو وہ چیز دکھاتا ہے جس سے ان کے نزدیک اسے عزت حاصل ہو۔ اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً: پہلی قسم دین میں ریاکاری ہے اور یہ بھی کئی طرح کی ہے: ایک بدن کے لحاظ سے ہے کہ جسم کی کمزوری اور زردی اور ویرانی کا اظہار کیا جائے

---

[1] سورۃ ماعون۔ آیت: ۴ تا ۶
[2] سورۃ کہف۔ آیت: ۱۱۰

اور لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ شخص دینی کاموں میں بڑی مشقت برداشت کرتا ہے اور اس پر خوفِ خدا غالب ہے۔ دین میں ایسا مستغرق ہے کہ اسے بال درست کرنے کی بھی فرصت نہیں۔
یہی حال ہے آواز نیچی رکھنے، آنکھیں گہری کرنے اور ہونٹ خشک دکھانے کا کہ معلوم ہو یہ ہمیشہ روزے رکھتا ہے۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو اپنے سر کو تیل لگائے اور کنگھی کرے اور یہ اس لیے کہ روزہ دار پر ریا کی آفات کا خوف ہے" یہ تو دین داروں کی جسم کے لحاظ سے ریاکاری ہے۔

دنیا دار جسم کے موٹاپے، رنگت کی صفائی، جسم کے اعتدال، چہرے کی خوبصورتی اور بدن کی صفائی سے بھی ریاکاری کرتے ہیں۔

دوسری قسم لباس اور حالت کی ریاکاری ہے۔ جیسے تکلفاً گردن جھکا کر چلنا۔ چہرے پر سجدے کے نشان کو باقی رکھنا۔ موٹے کپڑے پہننا۔ ادنیٰ لباس رکھنا۔ تہبند اونچا باندھنا۔ قمیص کے کف چھوٹے اور کپڑے میلے کچیلے رکھنا وغیرہ۔

انہی میں سے بے ضرورت پیوند لگے کپڑے پہننا۔ صوفیوں سے مشابہت پیدا کرنے کے لیے پیلا رنگ استعمال کرنا اور پگڑی کے اوپر چادر اوڑھنا ہے کہ اس امتیاز کی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھیں۔

ریاکاروں کے کئی طبقے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو نیک لوگوں میں زہد کے اظہار سے مقبول ہونا چاہتے ہیں۔ وہ گندے، میلے کچیلے اور موٹے کپڑے ریاکاری کے لیے پہنتے ہیں۔ اگر ان کو اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کو کہا جائے جیسا کہ سلف پہنتے تھے، تو یہ ان کے نزدیک ذبح ہو جانے کی طرح ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ پہلے یہ آدمی زاہد تھا اور اب اس راہ سے لوٹ آیا ہے۔

ایک طبقہ وہ ہے جو نیک لوگوں، دنیا داروں، بادشاہوں، امراء اور تاجروں سب میں مقبول ہونا چاہتا ہے۔ اس کے لباس کا کپڑا قیمتی لیکن وضع قطع علماء کے لباس کی سی ہوتی ہے۔

ان لوگوں کو اگر میلے یا موٹے کپڑے پہننے کو کہا جائے تو اُن کے لیے موت کے برابر ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ بادشاہوں اور دولتمندوں کی نگاہ سے گر جائیں گے اور اگر اُن کو باریک اور قیمتی سوتی سفید کپڑے پہننے کو کہا جائے تو یہ بھی ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ نیک لوگوں کی نگاہ سے گر جائیں گے۔

ہر ریاکار کا ایک مخصوص لباس اور ہیئت ہوتی ہے۔ اس سے نیچے یا اوپر ہونا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے بجائے لوگوں کی مذمت سے ڈرتے ہیں۔

دنیاداروں کی ریاکاری نفیس لباس، اچھی سواری، تزئین کی مختلف اقسام، مکان اور اعلیٰ سازوسامان سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھروں میں تو موٹے جھوٹے کپڑے پہن لیتے ہیں، لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں معمولی لباس میں دیکھیں۔

تیسری قسم باتوں کی ریاکاری ہے۔ دینداروں کی ریا موقع بے موقع وعظ و نصیحت اور احادیث و آثار بیان کرتے رہنا اور بحث مباحثے میں مصروف رہنا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اُن کے علم کی کثرت معلوم ہو، وہ سلف کے حالات پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔ لوگوں کی مجلس میں اپنے ہونٹ ہلاتے رہتے ہیں اور لوگوں کے سامنے برائیوں پر بڑے غصّے کا اظہار کرتے ہیں۔ آواز نیچی رکھتے ہیں اور قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ گناہوں کے غم اور اللہ کے خوف میں مبتلا ہیں۔

چوتھی قسم عملی ریا کی ہے، جیسے کوئی نمازی لمبا قیام اور لمبے رکوع وسجود کرے اور خواہ مخواہ خشوع کا اظہار کرتا رہے اور یہی کیفیت روزے، جہاد، حج اور صدقے وغیرہ کی بھی ہے۔

دنیاداروں کی ریاکاری فخر، تکبر، غرور، ہاتھوں کو حرکت دینے، چھوٹے چھوٹے قدم رکھنے اور چادر کا کنارہ پکڑنے اور کندھے جھکانے سے ہوتی ہے تاکہ اُن کی حشمت معلوم ہو سکے۔

پانچویں قسم دوستوں اور زائرین سے ریاکاری ہے جیسے وہ آدمی جو تکلف سے کسی عالم یا عابد کی زیارت کرتا ہے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں نے فلاں کی زیارت کی ہے۔ دیندار لوگ اس کے پاس آتے جاتے ہیں اور اس سے برکت حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ ہیں جو شیوخ کی کثرت سے ریا کرتے ہیں، تاکہ لوگ کہیں کہ اس نے بڑے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔

کچھ لوگوں کا مقصد صرف جاہ و مرتبہ کا حصول ہوتا ہے۔ کتنے ہی عبادت گزار ہیں جو پہاڑوں میں بیٹھے ہیں اور کتنے ہی راہب گرجوں میں سمٹے پڑے ہیں۔ ان کو مال کی طمع بالکل نہیں۔ وہ صرف مرتبہ و جاہ و منزلت کے طلبگار ہیں۔

بعض کا مقصد دولت کا حصول ہوتا ہے اور بعض کا مدح و ثنا اور شہرت کا۔

اگر سوال کیا جائے کہ ریاکاری حرام ہے، مکروہ ہے، مباح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ریاکاری عبادات میں ہوگی یا دوسری چیزوں میں۔ اگر عبادات میں ریاکاری ہے تو وہ حرام ہے۔ جو آدمی نماز، صدقہ، اور حج وغیرہ میں ریاکاری کرتا ہے وہ عاصی اور گنہگار ہے کیونکہ وہ اس سے غیر اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے اور اللہ اکیلا مستحق عبادت ہے، تو ریاکار اس سے اللہ کے غضب کی زد میں ہے۔

اور اگر عبادات کے علاوہ ہے تو وہ طلب مال کی طرح ہے۔ اس حیثیت سے حرام تو نہیں کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں صرف اپنا وقار بنانا چاہا، لیکن جیسے مال کمانا تلبیسات اور ممنوع اسباب سے ممکن ہوتا ہے اسی طرح جاہ و منزلت بھی ہے۔ اگر اس نے بقدر ضرورت تھوڑا سا مال کمایا جس کا انسان محتاج ہے تو وہ محمود ہے اور یہی حال جاہ کا بھی ہے اور یہی وہ منزلت ہے جس کو یوسف علیہ السلام نے اپنے ان الفاظ سے طلب کیا تھا کہ: اِنی حفیظ علیم (میں حفاظت کرنے اور جاننے والا ہوں) یہ جاہ و منزلت حرام نہیں، مگر جبکہ یہ صاحب منزلت کو ناجائز چیزوں پر آمادہ کرے جیسے کہ ہم مال میں ذکر کر چکے ہیں تو خرابی سے پاک نہیں۔

جاہ و منزلت کی وسعت میں کچھ حرج نہیں، اگر اسے حرص سے طلب نہ کیا جائے اور اس کے جاتے رہنے سے انسان غم میں مبتلا نہ ہو کیونکہ کسی کا بھی مرتبہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان علمائے دین سے جو آپ کے بعد ہوئے بڑا نہیں ہے، لیکن اپنی ساری توجہ جاہ و منزلت کے حصول میں صرف کر دینا دین کا نقصان ہے، بہرحال اسے حرام نہیں کہہ سکتے۔

اچھے کپڑے بنانا جنھیں آدمی لوگوں کے پاس جاتے وقت اظہار امارت کے لیے پہنتا ہے تاکہ لوگ اسے بڑا آدمی سمجھیں اور یہی حال ہے ہر تجمل کا جو لوگوں کے لیے کیا جائے۔ یہ منع نہیں ہے۔ اور اس سے بھی مقصد مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو گھٹیا نظروں سے کسی حالت میں نہ دیکھیں۔

مسلم کے افراد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا" تو ایک آدمی نے کہا کہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا اچھا ہو، تو آپ نے فرمایا: "اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر ہے حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔"

بعض آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار چاہتے ہیں اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بھی دیا ہے۔

---

[1] سورۃ یوسف۔ آیت: ۵۴

فصل دوم

عبادات میں ریا

معلوم ہونا چاہیے ریا کے کئی درجات ہیں۔ ان میں سب سے سخت اور بُرا یہ ہے کہ عبادت سے ثواب کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ جیسے وہ آدمی جو لوگوں کے سامنے تو نماز پڑھے اور اکیلا ہو تو نہ پڑھے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ ریا کے ساتھ کچھ کمزور سا ارادہ ثواب کا بھی ہو کہ اگر وہ الگ ہو تو عمل نہ کرے۔ یہ بھی پہلی قسم کے قریب ہے۔ یہ دونوں اللہ کی نگاہ میں بہت بُرے ہیں۔

تیسرا یہ ہے کہ ثواب اور ریا دونوں کا ارادہ مساوی ہو کہ اگر ایک چیز دوسری سے خالی ہو تو اسے عمل پر آمادہ نہ کر سکے، تو اس نے جتنا بگاڑا اتنا سنوارا اور یہ بھی گناہ سے نہیں بچے گا۔

چوتھا یہ ہے کہ اگر لوگ اس کی نیکی پر مطلع ہو جائیں، تو اس کی خوشی میں اضافہ ہو۔ اور اگر کوئی مطلع نہ ہو تو بھی وہ اس عمل کو نہ چھوڑے۔ اس کو اس کے صحیح ارادے پر ثواب ملے گا اور فاسد ارادے پر سزا۔ اسی طرح وہ ریا ہے جو عبادت کے اوصاف کے متعلق ہو نہ کہ اصل عبادت سے۔ جیسے وہ نمازی جس کا ارادہ تھا کہ رکوع سجود ہلکا کرے گا اور قرات لمبی نہ کرے گا، تو جب لوگوں نے اس کو دیکھ لیا تو اس نے نماز کو اچھا کر دیا۔ یہ بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ اس میں بھی خلق کی تعظیم ملحوظ ہے، لیکن یہ اس ریا سے کم تر ہے جو اصل عبادت کے متعلق تھا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ریا جلی بھی ہے اور خفی بھی۔

ریاءِ جلی تو وہ ہے جو انسان کو عمل پر آمادہ کرے اور اُبھارے اور پوشیدہ وہ ریا ہے جو صرف دکھاوے کی وجہ سے آدمی کو عمل پر آمادہ نہیں کرے گی۔ یہ اس کام کو ہلکا کر دیتی ہے جس سے اللہ کی رضا مطلوب تھی۔ جیسے کوئی آدمی تہجد پڑھتا تو ہو، لیکن یہ نماز اس پر بھاری ہو مگر جب اس کے پاس کوئی مہمان آئے تو اس خیال سے پابندی کرے کہ مہمان اسے تہجد گزار سمجھے گا۔ اس سے بھی زیادہ خفی وہ ریا ہے جو عمل اور آسانی میں کوئی اثر نہیں کرتی، لیکن اس کے باوجود وہ دل میں مخفی ہوتی ہے۔ جب دعا کام نہ کرے تو اس کا پتہ

صرف علامات سے چلتا ہے اور ریا کی سب سے کھلی علامت یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی دینداری کا پتہ چلے تو وہ خوش ہو۔ بہت سے مخلص بندے ایسے ہوتے ہیں جو عمل خالص کرتے ہیں اور ریا کا قصد بھی نہیں کرتے، بلکہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور تمام عمل اسی خلوص پر ہوتا ہے، لیکن جب لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جائے تو یہ بات انھیں پسند آتی ہے اور اس پر خوش ہوتے ہیں۔ عبادت کی مشقت و کلفت ان کے دل سے دور ہو جاتی ہے۔ یہ خوشی مخفی ریا پر دلالت کرتی ہے۔ اگر دل کی توجہ لوگوں کی طرف نہ ہو تو اُن کے مطلع ہونے سے اُس کے دل میں خوشی پیدا نہ ہو۔ معلوم ہوا دل میں ریا پوشیدہ تھی، جیسے پتھر میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔ لوگوں کی اطلاع نے اُس کی خوشی اور سرور کو ظاہر کر دیا۔ پھر جب اطلاع کی وجہ سے لذت محسوس کرتا ہے تو اس کا مقابلہ کراہت سے نہیں کرتا، بلکہ کوئی خفیف سی حرکت کرتا ہے، یا اشارے سے لوگوں کو مطلع کرنے کا تکلف کرتا ہے۔

کبھی ریا اس سے بھی مخفی ہوتی ہے۔ انسان نہ تو بول کر صراحۃً اس کا اظہار کرتا ہے نہ اشارۃً، لیکن عادات سے اظہار کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی کمزوری، زرد رنگت، نیچی آواز۔ ہونٹوں کی خشکی، آنسوؤں کے نشان اور نیند کے غلبے وغیرہ سے جو کہ لمبی نماز تہجد پر دلالت کرتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ مخفی یہ ہے کہ انسان عمل اس طرح چھپ کر کرتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے لیکن اس کے باوجود جب لوگوں کو دیکھتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ اسے پہلے سلام کریں۔ خندہ پیشانی سے ملیں۔ اس کا کام خوشی سے کریں۔ معاملے میں اُس سے نرمی کریں اور محفل میں اس کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ اگر کوئی اس معاملے میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کے دل پر بوجھ ہوتا ہے۔ گویا کہ اس کا نفس اس طاعت پر جو چھپ کر کی تھی احترام کا تقاضا کرتا ہے۔

جب تک انسان اس طرح عبادت نہ کرے کہ اللہ کے سوا کوئی خیال ہی نہ رہے ریا کی مخفی ملاوٹ سے خالی نہیں ہوگا۔ ان سب باتوں سے ایمان کی ہوتی ہے جن کا ذکر کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ریا کے گناہ سے صرف صدیق ہی بچ سکتے ہیں۔

ہمیں وہبؒ بن منبہ کی روایت پہنچی ہے کہ عبادت گذاروں میں سے ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "بے شک ہم نے مال اور اولاد سے سرکشی پیدا ہونے سے ڈر کر علیحدگی اختیار کی اور ہم ڈرتے ہیں کہ وہی سرکشی ہم میں دنیاداروں اور دولتمندوں سے زیادہ آچکی ہے کہ ہم میں سے کوئی آدمی جب کسی سے ملاقات کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے دین کی وجہ سے اس کی تعظیم کی جائے۔ اگر اس کا کوئی کام ہو تو پورا کیا جائے

اور اگر کوئی چیز خریدے تو اُس کے دین کی وجہ سے اُسے ارزاں قیمت پر دی جائے۔"

یہ بات ملک کے بادشاہ تک پہنچی تو وہ سواروں کا ایک دستہ لے کر اُس زاہد سے ملنے کے لیے آیا۔ زاہد نے پوچھا یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ بتایا گیا۔ بادشاہ سلامت آپ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ سُن کر اس نے کہا میرے پاس کھانا لاؤ۔ اور جب کھانا لایا گیا تو اس نے منہ بھر بھر کر کھانا شروع کیا اور بے تحاشا کھایا۔ بادشاہ نے اُسے اِس حال میں دیکھا تو کہا۔ اس کے پاس تو کچھ بھی بھلائی نہیں ہے اور واپس چلا گیا۔ بادشاہ چلا گیا تو زاہد نے کہا" تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے اُس کو مجھ سے پھیر دیا اور وہ ملامت کرتا چلا گیا۔"

مخلص لوگ ہمیشہ ریاءِ خفی سے ڈرتے رہے۔ وہ اپنے نیک اعمال کے متعلق لوگوں کو بے خبر رکھنے کی اتنی ہی کوشش کرتے ہیں جتنی کوشش لوگ اپنی برائیوں کو چھپانے کی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے عمل خالص رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن ان کے اخلاص کا بدلہ دے۔

ریاءِ خفی کی ملاوٹ بے شمار طریقوں سے ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے نفس میں لوگوں کے اپنی عبادت پر مطلع ہونے یا نہ ہونے میں فرق محسوس کرتا ہے تو اس میں بھی ریاء کا شائبہ ہے۔ لیکن ہر شائبہ نہ اجر کو ضائع کرتا ہے نہ عمل کو برباد کرتا ہے، بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

اگر کہا جائے کہ طاعت کا پتہ چل جائے، تو ہر آدمی خوش ہوتا ہے، تو کیا یہ خوشی مذموم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی خوشی بُری بھی ہے اور اچھی بھی۔ اچھی تو یوں ہے کہ اس کا ارادہ تو مخفی رکھنے کا تھا، لیکن جب لوگ مطلع ہو گئے تو اس نے جانا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اچھے حال کو لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ گویا اللہ تعالیٰ اُس کے حسنِ معاملہ پر خوش ہوا۔ اس کی اطاعت کو ظاہر کر دیا اور نافرمانی پر پردہ ڈال دیا اور برائی پر پردہ ڈالنے اور بھلائی کو ظاہر کرنے سے بڑھ کر اور کیا مہربانی ہو سکتی ہے؛ چنانچہ وہ اس سے یہ اندازہ کیوں نہ کرے کہ جیسے اللہ نے دنیا میں اُس کی بھلائی کو ظاہر کیا اور اُس کے گناہوں کی پردہ پوشی کی ایسا ہی معاملہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ کرے گا۔ یہ مضمون حدیث میں بھی آیا ہے۔

اور اگر وہ لوگوں کے مطلع ہونے سے یوں خوش ہو کہ اُن کے دلوں میں اس کی عقیدت پیدا ہو گی اور وہ اس کی مدح کریں گے، اس کی تعظیم کریں گے اور اس کی حاجتیں پوری کریں گے تو یہ خوشی مکروہ اور بری ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ ایک آدمی نے کہا:" اے اللہ کے رسول، ایک آدمی چھُپ کر نیک عمل کرتا ہے، لیکن اگر کوئی اس پر مطلع ہو جائے، تو اُسے اچھا لگتا ہے؟

تو آپ نے فرمایا" اس کے لیے دو اجر ہیں ایک پوشیدہ عمل کرنے کا اور دوسرا ظاہر عمل کرنے کا"۔
تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسے صرف ترمذی نے روایت کیا ہے اور بعض اہل علم نے
اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو اس کو پسند آئے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
"تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو"
مسلم کے افراد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! ایک آدمی نیک
عمل کرتا ہے اور اس پر لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا" یہ مومن کے لیے دنیا میں بشارت ہے"۔
ہاں اگر اسے یہ پسند ہو کہ لوگوں کو اس کی نیکی کا پتہ چلے اور اس پر وہ اس کی عزت کریں تو یہ ریا ہے۔

کونسی ریا سے عمل ضائع ہو جاتا ہے؟

جب انسان کو ریاء کا خیال آئے تو اس کی کئی صورتیں ہیں:
یا تو عبادت سے فارغ ہونے کے بعد خیال آئے گا، یا اس سے پہلے۔ اگر فراغت کے بعد اس کے
ظاہر کیے بغیر ظاہر ہو گیا ہے اور اس پر اُسے خوشی حاصل ہوئی ہے، تو اس سے عمل ضائع نہیں ہوتا کیونکہ اخلاص
کی صفت پر وہ عمل پورا ہو چکا ہے۔ اب اس کے بعد خیال آنے کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ خصوصاً جبکہ
اس نے نہ خود ظاہر کیا ہے اور نہ کسی سے بیان کیا ہے۔ ہاں اگر اس نے عمل پورا ہونے کے بعد اس کو خود
ظاہر کیا ہے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اکثر اوقات ایسے آدمی کے دل میں عمل کرتے وقت بھی کچھ
نہ کچھ ریا کا شائبہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ریاء سے بچا ہوا بھی تھا تو بھی اس کا اجر کم ہو جائے گا کیونکہ پوشیدہ
اور ظاہر عمل کے اجر میں ستر درجے کا فرق ہے۔
اگر عبادت سے فارغ ہونے سے پہلے ہی اسے ریاء کا خیال آگیا۔ مثلاً وہ نماز جو اس نے اخلاص
سے شروع کی تھی۔ اگر وہ صرف خوشی کی حد تک ہو، تو عمل میں کوئی اثر نہ پڑے گا، لیکن اگر ایسی ریا ہو جو کسی
خاص عمل پر آمادہ کرے۔ مثلاً نماز لمبی کر دے تاکہ اس کی منزلت معلوم ہو تو اس سے اجر ضائع ہو جاتا ہے
اگر عبادت کے ساتھ ہی ریاء کا خیال بھی ہو، مثلاً نماز شروع ہی ریاء کے ارادے سے کرے اور اسی
ارادے پر اس کو پورا بھی کرے تو ایسا عمل کسی توجہ کے لائق نہیں۔ اگر بعد میں اس پر ندامت ہو تو اسے چاہیے
کہ اسے نئے سرے سے شروع کرے۔ واللہ اعلم۔

فصل سوم

ریا کے امراض کا علاج

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ ریا اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اور یہ ایک مہلک بیماری ہے جس کا یہ حال ہو اُسے اُس کے دُور کرنے میں کمر ہمت باندھ لینی چاہیے۔

ریا کے علاج میں دو مقام ہیں:

پہلا: اس کی جڑوں اور رستے کو اکھاڑنا جس سے یہ مرض پھوٹتا ہے۔

دوسرا: اُن خطرات کی مدافعت جو اُسے گھیرے ہوئے ہوں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ریا کی جڑ جاہ و منزلت کی محبت ہے۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے تین اصول ہیں؛ اور وہ ہیں تعریف کی لذّت، مذمّت کی تکلیف اور جو لوگوں کے پاس ہے اُس کی طمع۔

اور اس کی تائید صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے۔ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی شجاعت کے لیے لڑتا ہے اور کوئی حمیت کے لیے اور کوئی ریا کے لیے۔ ان میں سے اللہ کی راہ میں کون سی جنگ ہے؟" آپ نے فرمایا: "جو آدمی اس لیے لڑے کہ اللہ کی بات بلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔"

شجاعت کے لیے لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تذکرہ ہو اور اس کی مدح کی جائے۔ حمیت کے لیے لڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگوں کی مذمّت اور اُن کے قہر کو ناپسند کرتا ہے اور ریا کے لیے لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مقام لوگوں کو معلوم ہو۔ اور یہ دلوں میں جاہ و منزلت کی محبت ہے۔

کبھی انسان مدح کا طالب نہیں ہوتا، لیکن مذمت سے ڈرتا ہے۔ جیسا کہ بہادروں میں بزدل آدمی کہ وہ میدان میں کھڑا رہتا ہے۔ بھاگتا نہیں اور اس کا یہ کھڑے رہنا مذمت کے ڈر سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی جہالت کی مذمت کے خوف سے آدمی بغیر علم کے فتویٰ دے دیتا ہے، تو یہ وہ امور ہیں جو ریا کی تحریک کرتے ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ اگر معلوم ہو کہ یہ چیز فی الحال تو لذیذ ہے لیکن انجام کار نقصان دہ ہے تو وہ اس سے پرہیز کرے

اور اس کی طرف بالکل راغب نہ ہو جیسے کہ کوئی آدمی جانتا ہو کہ شہد لذیذ ہے لیکن اسے معلوم ہو جائے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو اس سے منہ پھیر لے گا۔ بس یہی طریقہ اس رغبت کو ختم کرنے کا بھی ہے۔

جب انسان کو ریا کے نقصان، دل کی اصلاح کا ختم ہو جانا، آخرت کی منزلت کا برباد ہونا، عذاب آخرت کا مستحق بن جانا، خدا کی ناراضگی، ذلت کا پیش آنا اور پھر دنیا میں لوگوں کے دلوں کے ملاحظہ کے سبب افکار کا پریشان ہونا معلوم ہو جائے تو اس سے فوراً رک جائے۔ لوگوں کی رضا ایک ایسا مقصد ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ جس چیز سے ایک فریق خوش ہوگا اسی سے دوسرا فریق ناراض ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جو خدا کو ناراض کر کے بندوں کو خوش کرے گا اس سے خدا ناراض ہوگا اور بندوں کو بھی اس پر ناراض کر دے گا۔ پھر اس کی کونسی غرض ہے ان کی مدح میں؟ یقیناً یہ نادانی ہے کہ انسان، مخلوق کو خوش کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرے، کہ نہ تو اُن کی مدح کی وجہ سے اس کا رزق بڑھ سکتا ہے اور نہ عمر۔ اور نہ وہ اس کے فقر و فاقے کے دن اسے نفع دے سکتے ہیں۔

یہی حال اُن کی مذمت کا ہے۔ پھر اس سے ڈرنا کیسا؟ نہ تو اُن کی مذمت اس کا کچھ نقصان کر سکتی ہے۔ نہ اس کی عمر گھٹ سکتی ہے اور نہ اس کا رزق پیچھے ٹل سکتی ہے، کیونکہ بندے سب عاجز ہیں۔ وہ تو اپنے ذاتی نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔

جب یہ باتیں اُس کے دل میں بیٹھ جائیں گی تو ریا سے اس کی رغبت منقطع ہو جائے گی اور اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے گا کیونکہ عقل مند آدمی اُس چیز کی رغبت نہیں کرتا جس کا نقصان زیادہ اور نفع کم ہو۔ لوگوں کے ہاتھ کی چیزوں کی طمع بھی ایک برائی ہے۔ اس کا ازالہ اس سے ہوگا کہ وہ جان لے کہ دینے اور نہ دینے میں دلوں کو مسخر کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے سوا کوئی رازق نہیں۔ جو مخلوق سے طمع رکھے گا وہ ذلیل بھی ہوگا اور بے مراد بھی۔ اور اگر مراد حاصل ہو بھی جائے تو احسان مندی اور ذلت سے نہیں بچے گا۔ پھر جھوٹی امید اور وہم فاسد کے سبب وہ چیز کیسے چھوڑی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

فائدہ مند دوا یہ ہے کہ اپنے نفس کو عبادت چھپانے کی عادت ڈالے۔ اور اُس کے آگے یوں دروازے بند کر دے جیسا کہ برائی کے وقت دروازے بند کرتا ہے۔ ریا میں اعمال چھپانے کے علاوہ اور کوئی دوا اتنی مفید نہیں۔ یہ مجاہدے کے ابتدا میں تو بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے، لیکن جب تکلف سے کچھ مدت اس پر صبر کرے گا، تو اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اللہ اپنی توفیق سے اس کو مدد دے گا۔ بندے کا کام ہے کوشش کرنا اور

اللہ کا کام ہے توفیق دینا۔

دوسرا مقام عبادت کے دوران میں ریا کا خیال دفع کرنے کے متعلق ہے اور اس کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ جو آدمی اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے۔ قناعت سے، لوگوں کی نگاہوں سے، اپنے نفس کو گرانے سے اور لوگوں کی مدح و ذم کو حقیر سمجھنے سے ریا کی جڑیں اکھاڑ دیتا ہے، تو پھر بھی شیطان اس کو عبادت کے دوران میں نہیں چھوڑتا، بلکہ ریا کے خیالات اس کے دل میں پیدا کرتا رہتا ہے۔

جب کسی کو عبادت سے آگاہ ہونے کا خیال آئے تو اُسے اس طرح دفع کرے کہ گویا بہت ہی نامرغوب چیز ہے۔ اپنے نفس کو کہے تیرا اور لوگوں کا کیا تعلق ہے۔ وہ جانیں یا نہ جانیں، لیکن اللہ تیرے حال کو جانتا ہے اور دوسروں کے جاننے کا کیا فائدہ ہے؟

نفس پھر بھی ثنا کی آفت کی طرف رغبت کرے، تو اسے ریا کی آفات اور خدا کی ناراضگی یاد کرائے اور ناراضگی کی کراہت کو اس رغبت کے مقابل لائے۔ لوگوں کی اطلاع کی معرفت اگر خواہش پیدا کرے گی، تو ریا کی آفت کی معرفت سے کراہت پیدا ہوگی۔

فصل چہارم

عبادت میں تساہل اور اس کا سدّباب

معلوم ہونا چاہیے کہ اعمال کو چھپانے میں اخلاص کا فائدہ ملتا ہے یعنی ریا سے نجات ملتی ہے، البتہ ظاہر کرنے میں ایک اچھا پہلو بھی ہے۔ اس سے لوگوں کو بھلائی کی ترغیب ملتی اور پیروی کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض اعمال ایسے ہیں جن کو چھپانا ممکن ہی نہیں۔ جیسے حج اور جہاد۔ بہر حال عمل کو ظاہر کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے دل کی نگرانی کرے۔ یہاں تک کہ اس میں پوشیدہ ریا کی محبت بھی نہ رہے۔ کمزور آدمی کو چاہیے کہ اس نیّت سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دے۔ کمزور آدمی کی مثال اس غرق ہونے والے کی طرح ہے جو تھوڑا تھوڑا تیرنا جانتا ہو۔ اس نے ایک جماعت کو ڈوبتے دیکھا اس کو اُن پر رحم آیا۔ وہ اُن کے پاس گیا اور انھوں نے اس کا سہارا لیا تو وہ بھی ڈوبے اور یہ بھی ڈوبا۔

جو آدمی طاقتور ہو، یعنی اس کا اخلاص مکمل ہو اور اس کی نگاہ میں لوگوں کی مدح و ذم کی کوئی حقیقت نہ ہو تو اس کو اپنا عمل ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ نیکی کی ترغیب دینا بھی نیکی ہے۔

سلف کی ایک جماعت سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کچھ حالات ظاہر کردیتے تھے تاکہ ان کی پیروی کی جائے۔ جیساکہ بعض نے فوت ہونے کے وقت اپنے گھر والوں سے کہا۔ مجھ پر نہ رونا کیونکہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں میں نے کبھی گناہ نہیں کیا۔

ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے سے کہا "اس کمرے میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا کہ میں نے اس میں بارہ ہزار قرآن ختم کیے ہیں۔" ان کے کلام میں سے ایسی اور بہت سی باتیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

گناہوں کو چھپانے کے سلسلے میں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ گناہوں کا چھپانا بھی ریا ہے، لیکن ایسا نہیں، کیونکہ وہ سچا آدمی جو ریاکار نہیں ہے۔ اگر اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، تو اسے چاہیے اپنی لغزش چھپائے۔ اللہ تعالیٰ گناہ ظاہر کرنے کو ناپسند اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "جو آدمی کسی گندگی (گناہ) کا ارتکاب کرے

تو اسے چاہیے کہ اللہ کی پردہ پوشی سے اپنے گناہ کو چھپائے"۔

آدمی نے گناہ کر کے اگرچہ اللہ کی نافرمانی کی ہے، لیکن اس کا دل اس چیز کی محبت سے جسے اللہ پسند کرتا ہے خالی نہیں ہوا۔ اور یہ محبت ایمان کی قوت سے پیدا ہوتی ہے۔ چاہیے کہ دوسروں کے گناہ ظاہر ہونے کو بھی بُرا سمجھے، ایسا کرنا صدق کا اثر ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر لوگ اُس کی مذمت کریں، تو اسے ناپسند کرے کیونکہ اس سے اس کا دل اور اس کی عقل اللہ کی اطاعت سے ہٹ جائے گی۔ طبیعت مذمت سے ضرور تکلیف پاتی ہے۔ اگر مدح بھی اس کو خدا سے غافل کرے، اُس کے دل کو گھیر لے اور ذکر سے پھیر دے تو اُسے بھی بُرا سمجھنا چاہیے۔ اور یہ بھی ایمان کی قوت میں سے ہے۔

ریا کی اقسام اور اُن کا علاج

ریا کے خوف سے طاعات کو چھوڑ دینا ناروا ہے۔ ہاں اگر طاعت پر آمادہ کرنے کا سبب دین کے علاوہ کوئی اور چیز ہو تو اسے چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ وہ نافرمانی ہے اور اس میں اطاعت نہیں ہے، البتہ اگر اس پر آمادہ کرنے والا دین ہے اور یہ کام خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو اس عمل کو نہ چھوڑنا چاہیے، کیونکہ اس پر آمادہ کرنے والا کوئی بُرا جذبہ نہیں دینداری ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عمل کو اس لیے چھوڑ دے کہ لوگ کہیں گے وہ ریاکار ہے، تو اسے نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ یہ شیطان کا فریب ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ نے کہا "جب تم نماز میں ہو اور شیطان تمہارے پاس آ کر کہے تو ریاکار ہے، تو نماز اور زیادہ لمبی کر دو"

بعض سلف سے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ریا کے خوف سے عبادت کو چھوڑ دیا، جیسا کہ ابراہیمؒ نخعی ہی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ آپ قرآن پڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی آپ کے پاس آیا۔ آپ نے قرآن کریم بند کر دیا اور قراءت چھوڑ دی اور کہا مجھے یہ نہ دیکھے کہ میں ہر وقت قرآن پڑھتا ہوں، تو اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اُنھوں نے اس موقع پر اپنے نفس کو مزیّن محسوس کیا تو اس کو کاٹ کر رکھ دیا۔

کبھی آدمی تہجد گزاروں کے ساتھ رات گزارتا ہے۔ وہ رات کا زیادہ حصّہ نماز پڑھتے ہیں اور اسے ایک گھڑی قیام کرنے کی عادت ہے، تو وہ بھی اُن کے ساتھ نماز پڑھتا رہتا ہے۔ یا وہ روزہ رکھتے ہیں، تو یہ

بھی روزہ رکھ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر وہ نہ ہوتے تو اُس کے دل میں عبادت کی یہ خواہش نہ ہوتی۔ یا کبھی خیال کرنے والا خیال کرتا ہے کہ یہ ریا ہے اور یہ مطلق طور پر ایسا نہیں ہے، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر مومن اللہ کی عبادت کی رغبت رکھتا ہے، لیکن کچھ موانعات اسے روک دیتے ہیں اور غفلت اسے پریشان کر دیتی ہے۔ پھر کبھی دوسروں کا مشاہدہ اس غفلت کو زائل کر دیتا ہے اور موانعات دُور ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ جہاں وہ آرام دہ بستر پر سوتا ہے اور بیوی سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن جب کسی اور کے مکان میں رات گزارے تو یہ مشاغل دور ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے اسباب حاصل ہو جاتے ہیں جو اسے نیکی پر آمادہ کرتے ہیں۔ انہی میں سے ایک عبادت گزاروں کا مشاہدہ بھی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کھانے کی زیادہ چیزوں کی وجہ سے روزہ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ برخلاف دوسری جگہ کے، تو ایسے حالات میں شیطان اس کو عبادت سے روکنے کے لیے آتا ہے اور کہتا ہے۔ اگر تو نے اپنی عادت کے خلاف عمل کیا تو تُو ریا کار ہو گا۔ اس کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے، بلکہ اپنے دل کے قصد کو دیکھنا چاہیے۔

انسان کو چاہیے اپنے عمل کا امتحان کرے، لوگوں کو ایسی جگہ میں فرض کر لے کہ خود تو ان کو دیکھتا ہو اور وہ اس کو نہ دیکھتے ہوں۔ پھر اپنے نفس کو دیکھے۔ اگر وہ عبادت کے لیے تیار ہو، تو وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور اگر تیار نہ ہو، تو ان کے ہوتے اس کا تیار ہونا ریا ہے۔ اسی پر دیگر باتوں کو قیاس کر لو۔

تو یہ ریا کی کچھ آفتیں ہیں۔ ان کا خیال رکھو، تفتیش کرو اور اپنی نیت کا دھیان رکھو، کیونکہ ریا چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ مرید کو چاہیے کہ اپنی تمام عبادتوں میں اپنے دل کو اللہ کے علم پر قناعت کرنے کا پابند کرے۔ اور اس پر قناعت وہی کرے گا جو اللہ سے ڈرتا ہو اور اسی سے امید رکھتا ہو۔

اپنے نفس کو اخلاص سے مایوس نہ کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر کہ اخلاص پر تو طاقتور آدمی قادر ہو سکتے ہیں اور میں کمزور ہوں۔ اخلاص کے حاصل کرنے میں مجاہدہ نہ چھوڑ دے۔ اس لیے کہ کمزور کو تو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیمؒ بن ادہم نے کہا: "میں نے معرفت ایک راہب سے سیکھی جس کا نام سمعان تھا۔ میں اس کے عبادت خانے میں داخل ہوا اور اس سے پوچھا تم اس عبادت خانے میں کتنی مدت سے ہو؟ اُس نے کہا ستر سال سے۔ میں نے کہا تمھاری خوراک کیا ہے؟ اُس نے کہا: ہر رات چنے کا ایک دانہ۔ میں نے کہا کونسی چیز تمھارے دل میں تحریک کرتی ہے کہ تمھیں ایک چنا کافی ہے؟ اُس نے کہا ان لوگوں کو دیکھ رہے ہو

جو تمھارے سامنے کھڑے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ تو اس نے کہا یہ سال میں ایک دن میرے پاس آتے ہیں۔ میرے عبادت خانے کو سجاتے ہیں اور میری تعظیم کی وجہ سے اس کے گرد چکر لگاتے ہیں اور میں سارے سال کی مشقت اس ایک گھڑی کی عزّت کے لیے برداشت کرتا ہوں۔ اے دین حنیف کے پیرو کارو! تم بھی ہمیشہ کی عزّت کے لیے ایک گھڑی کی مشقت برداشت کرو۔ تو اس سے میرے دل میں معرفت جاگزیں ہوگئی۔

اس نے کہا میں تجھے کچھ مزید بتلاؤں؟ میں نے کہا: ہاں۔ تو کہا: عبادت خانے سے نیچے اُترو۔ میں اُترا تو اس نے میری طرف ایک تھیلا لٹکا دیا، اس میں چنے کے بیس دانے تھے۔ پھر مجھ سے کہا۔ اب گرجا میں داخل ہو جاؤ۔ اس کی ہدایت پر جب میں گرجا میں داخل ہوا تو عیسائی اکٹھے ہوگئے اور کہنے لگے: اے مسلمان! راہب نے تجھے کیا دیا ہے؟ میں نے کہا اپنی کچھ خوراک مجھ کو دی ہے۔ کہنے لگے، تو اسے کیا کرے گا؟ ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، اس کی قیمت مقرر کرلے۔ میں نے کہا بیس دینار۔ انھوں نے مجھے بیس دینار دے دیے۔ میں رقم لے کر راہب کے پاس واپس گیا، تو اس نے کہا تو نے غلطی کی، تو اگر ان سے بیس ہزار دینار بھی مانگتا تو وہ تجھے دے دیتے۔

یہ عزّت اس آدمی کی ہے جو اللہ کی عبادت نہیں کرتا! اس سے اللہ کی عبادت کرنے والے کی عزّت کا اندازہ کرو۔ اے مسلمانو! اللہ کی عبادت میں لگ جاؤ۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ لوگوں کے دلوں میں عظمت حاصل کرلینا بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ نفس کو خلوت پر آمادہ کرتی ہے، لہٰذا یہ ایک عظیم آفت ہے۔ اس آفت سے محفوظ رہنے کی علامت یہ ہے کہ انسان کے نزدیک آدمی اور چارپائے ایک جیسے ہو جائیں۔ اس کا عمل ایسا ہونا چاہیے کہ جیسے زمین پر اس کے سوا اور کوئی انسان نہیں ہے۔ پھر جب کمزور سے وسوسے پیدا ہوں تو اُن کو دور کردے۔ واللہ اعلم۔

فصل پنجم

تکبّر اور غرور کی مذمّت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ[1] (میں اپنی آیتوں سے عنقریب ان کو پھیر دوں گا جو ناحق زمین میں تکبّر کرتے ہیں۔

فرمایا: اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ[2] (وہ تکبّر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

مسلم کے افراد میں حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کے دل میں ایک ذرّے کے برابر بھی تکبّر ہوگا وہ جنّت میں نہ جائے گا۔"

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جہنّم نے کہا میں متکبّر لوگوں کے لیے منتخب ہوا ہوں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جابر اور متکبّر لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی صورت میں اکٹھے کیے جائیں گے اور اُن کو لوگ پاؤں تلے روندیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔

حضرت سفیانؒ بن عیینہ نے کہا: "جس کا گناہ خواہشِ نفس سے مغلوبیت کا نتیجہ ہو، اس کے لیے توبہ کی امید رکھو۔ آدم علیہ السلام نے بھی خواہشِ نفس کے دباؤ میں آکر نافرمانی کی تو اُن کو بخش دیا گیا، لیکن جب نافرمانی تکبّر کی وجہ سے ہو تو اُس پر لعنت کا خوف ہے۔ ابلیس نے تکبّر کی بنا پر نافرمانی کی تو اس پر لعنت برسی"۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: "جس نے اپنا کپڑا تکبّر سے زمین پر لٹکایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں"۔ تو ابوبکرؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ میرے تہ بند کا ایک کنارہ لٹک ہی جاتا ہے جب تک کہ میں اس کا پوری طرح خیال نہ رکھوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو ان لوگوں سے نہیں ہے جو ایسا تکبّر کی بنا پر کرتے ہیں"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تکبّر ایک باطنی خُلق ہے۔ اُس سے کچھ اعمال صادر ہوتے ہیں جو اُس کا ثمرہ ہیں۔ پھر

---

[1] سورۃ اعراف۔ آیت: ۱۴۶ [2] سورۃ نحل۔ آیت: ۲۳

وہ اعضا پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور تکبّر یہ ہے کہ اپنے آپ کو صفات و کمال میں دوسروں سے فوقیت دے۔ اور اس تعریف سے یہ عُجب (غرور) سے الگ ہوجاتا ہے کیونکہ عُجب دوسرے کے وجود کو لازم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ ایک ہی انسان پیدا ہو تو تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ وہ مغرور ہو، لیکن یہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ متکبّر ہو۔ تاوقتیکہ اس کے ساتھ دوسرے بھی نہ ہوں۔ اور وہ اپنے آپ کو ان کے اوپر سمجھے۔

جب انسان اپنے آپ کو بڑا دیکھے گا تو لازماً دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھے گا۔ متکبّر کی صفت یہ ہے کہ وہ عوام کی طرف جہالت اور حقارت کی وجہ سے ایسے دیکھتا ہے جیسے گدھوں کی طرف دیکھتا ہو۔

تکبّر کی آفت بڑی عظیم ہے اور اس میں عوام بھی ہلاک ہوتے ہیں اور عابد، زاہد اور علماء بھی اس سے کم ہی بچتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ: جس کے دل میں ایک ذرّے کے برابر بھی تکبّر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اور تکبّر جنت کے آگے حجاب ہے کیونکہ وہ بندے اور مومنوں کے اخلاق میں حائل ہوجاتا ہے۔ متکبّر آدمی طاقت نہیں رکھتا کہ مومنوں کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ وہ تواضع پر قادر نہیں ہوتا۔ نہ غصّے، کینے اور غضب کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ نصیحت قبول کرتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کو حقیر سمجھنے اور ان کی غیبت کرنے سے بھی نہیں بچ سکتا۔ غرض جو بھی بُرا خلق ہے وہ اس کے لیے لازم ہے۔

تکبّر کی بدترین قسم وہ ہے جو متکبّر کو علم کے استفادے، قبولِ حق اور اس کی اطاعت سے روک دے۔ کبھی متکبّر کو معرفت حاصل ہوجاتی ہے، کبھی حق کی فرمانبرداری کے لیے اس کا نفس اس کی پیروی نہیں کرتا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا[1] (اور انھوں نے ظلم اور تکبّر سے اس کا انکار کردیا درآں حالیکہ اُن کے نفس اس کا یقین کرچکے تھے)

فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا[2] (وہ بولے کیا ہم اپنے جیسے دو بندوں پر ایمان لے آئیں)

إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا[3] (تم ہمارے جیسے آدمی ہی تو ہو)

اس طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔ اور یہ اللہ اور اس کے رسول پر تکبّر ہے۔

پہلے بیان ہوچکا، تکبّر یہ ہے کہ دوسروں کو ذلیل اور اپنے آپ کو ان سے بڑا جانے۔ اور یہ اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ جیسے کہ آدم علیہ السلام پر ابلیس کے تکبّر نے اُسے اپنے رب کے حکم کی تعمیل سے روک دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبّر کی تشریح یوں فرمائی ہے: "تکبّر حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔"

---

[1] سورۃ نمل۔ آیت: ۱۴ [2] سورۃ مومنون۔ آیت: ۴۷ [3] سورۃ ابراہیم۔ آیت: ۱۱

فصل ششم

تکبّر کے درجے

معلوم ہونا چاہیے کہ علماء اور عبادت گزاروں کے تکبّر کی آفت میں تین درجے ہیں: پہلا یہ کہ ان میں سے کسی انسان کے دل میں تکبّر جاگزیں ہو اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہو، لیکن وہ کوشش کر کے تواضع کرتا ہو۔ اس آدمی کے دل میں تکبّر کا درخت تو لگا ہوا ہے، لیکن اس کی شاخیں کٹی ہوئی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اپنے افعال سے اس کا اظہار کرے، مثلاً مجلس میں بلند مقام پر بیٹھے، ساتھیوں سے آگے بڑھے اور ان کے حق میں کوتاہی کرے۔ ان پر اعتراض کرے۔ تم دیکھو گے کہ ایسا شخص لوگوں کے لیے اپنے رخسارے کو ٹیڑھا کرتا ہے، گویا کہ ان سے منہ پھیرتا ہے۔ وہ اس طرح رہتا ہے گویا کہ لوگوں کو گندہ سمجھتا ہو۔

یہ دونوں اس ادب سے جاہل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ[1] (اور اپنے تابعدار مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رکھو)

تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے تکبّر کا اظہار کرے، جیسے بڑے بڑے دعوے کرے۔ اپنی خوبیاں بیان کرے۔ اپنے نفس کو پاک بتائے۔ فخر کے طور پر اپنے حالات بیان کرے اور اپنے نسب پر اترائے۔ خواہ کوئی علم اور تقویٰ میں اس سے بڑھا ہوا ہو، لیکن وہ نسب کے باعث اُسے حقیر جانے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آدمی دوسرے آدمی سے کہتا ہے میں تجھ سے زیادہ معزز ہوں اور تقویٰ کے بغیر کوئی بھی کسی سے زیادہ معزز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ[2] (اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے)

اسی طرح مال، جمال، طاقت اور متبعین کی کثرت وغیرہ کا تکبّر ہے۔ مال سے تکبّر تو عموماً بادشاہوں اور تاجروں وغیرہ میں ہوتا ہی ہے۔

---

[1] سورۃ شعراء۔ آیت: ۲۱۵ [2] سورۃ حجرات۔ آیت: ۱۳

اور خوبصورتی سے تکبر عموماً عورتوں میں۔ وہ اُن کو دوسروں کی تنقیص اور غیبت اور عیب بیان کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

متبعین اور مددگاروں سے تکبر بادشاہوں کے علاوہ علماء میں بھی ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنے لشکر کی کثرت پر تکبر کرتے ہیں اور علماء اپنے شاگردوں کی کثرت پر۔

مختصر یہ کہ ہر آدمی جس چیز کو کمال سمجھتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں کمال نہ ہو اس سے تکبر پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ فاسق آدمی اپنی بدکرداری اور شراب نوشی پر بھی فخر کرتا ہے کیونکہ وہ اسے کمال سمجھتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تکبر انسان کے خصائل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ رُخسارے کو ٹیڑھا کرنا۔ ترچھی نگاہ سے دیکھنا، سر جھکانا اور چار زانو یا تکیہ لگا کر بیٹھنا۔ اسی طرح اس کا اظہار اقوال سے بھی ہوتا ہے؛ حتیٰ کہ آواز، لہجے، اندازِ گفتگو، یہ چال ڈھال، ناز نخرے، قیام و قعود، حرکات و سکنات اور تمام افعال سے ظاہر ہوتا ہے۔

متکبر کی خصلت یہ بھی ہے کہ وہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اور کھڑا ہونا دو طرح پر ہے: ایک یہ کہ وہ بیٹھا ہو اور ایک آدمی اس کے سر کے پاس کھڑا ہو تو یہ ناجائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جو آدمی پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے رہیں، وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔"

دوسرا یہ کہ کسی انسان کے آنے کے وقت کھڑا ہو جانا، تو سلف ایسا بھی نہیں کیا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہمیں کوئی آدمی محبوب نہیں تھا۔ اور جب صحابہؓ آپؐ کو آتے ہوئے دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ آپؐ اس چیز کو پسند نہیں کرتے۔

علماء نے کہا ہے کہ ماں باپ، عادل بادشاہ اور فاضل آدمی کے لیے کھڑا ہونا مستحب ہے اور اب تو گویا فضلاء میں یہ بات ایک علامت بن گئی ہے۔ پھر اگر آدمی کسی مستحق قیام کے لیے قیام نہ کرے تو خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنی توہین سمجھے۔ اپنی تحقیر جانے اور اس سے کینہ پیدا ہو۔ اور کھڑا ہونے والے کے بارے میں اس کا مستحب ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ جس کے لیے قیام کیا جاتا ہے وہ اسے ناپسند کرے اور اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھے۔

متکبّر کی ایک خصلت یہ ہے کہ وہ اکیلا نہیں چلتا، بلکہ اس کے پیچھے پیچھے کوئی آدمی چلتا ہے۔ اس کی ایک خصلت یہ ہے کہ وہ تکبّر کی وجہ سے کسی کی ملاقات کو نہیں جاتا۔ اور اپنے پہلو میں کسی کے بیٹھنے یا ساتھ چلنے کو برا سمجھتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "مدینے والوں میں سے کوئی لونڈی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کام کے لیے لے جاتی۔"

ابن وہبؒ نے کہا: میں عبدالعزیز بن ابی رَدّاد کے پاس بیٹھا تھا اور میری ران اُن کی ران سے لگ رہی تھی۔ اسی دوران میں مَیں اُن سے ذرا دُور ہو گیا، تو انھوں نے میرا کپڑا پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا: "تم وہ معاملہ مجھ سے کیوں کرتے ہو جو جابر بادشاہوں سے کرتے ہو اور میں اپنے آپ کو تم سب سے زیادہ حقیر سمجھتا ہوں۔"

متکبّر میں ایک خصلت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح اس کی ایک خصلت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا سامان بازار سے اُٹھا کر نہیں لاتا جبکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کوئی چیز خریدی خود اُس کو اٹھا کر گھر لے آئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تجارت کے لیے کپڑے کی گٹھڑی اُٹھا کر بازار لے جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گوشت خریدا اُسے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے گھر لے آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھجوریں خریدیں۔ اُن کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اُٹھا لیا۔ کسی نے کہا "لائیے میں اُٹھا لوں" تو فرمایا "بچوں کے باپ کا زیادہ حق ہے کہ وہ خود اُٹھائے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دن بازار سے لکڑیوں کا گٹھا اُٹھا کر لائے اور آپ ان دنوں مروان کے خلیفہ تھے۔ آپ نے ایک آدمی سے کہا: "اپنے امیر کو راستہ دے دو۔"

جو آدمی چاہے کہ تکبّر ختم ہو اور تواضع اختیار کرے، اسے چاہیے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ملحوظ رکھے اور اس کی طرف ہم پہلے کتاب "آدابِ معیشت" میں اشارہ کر چکے ہیں۔

فصل ہفتم

تکبّر کا علاج اور تواضع کا حصول

معلوم ہونا چاہیے تکبّر ایسی مہلک چیز ہے کہ اس کا فوراً علاج کرنا چاہیے اور اس کے علاج میں دو مقام ہیں، ان میں پہلا مقام اس کی جڑیں اکھاڑنے اور درخت کاٹنے کا طریقہ ہے اور یہ اس طرح ہے کہ انسان اپنے نفس کو پہچانے اور اپنے رب کو پہچانے کیونکہ جب وہ اپنے نفس کو اچھی طرح پہچان لے گا، تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ ہر کمزور سے زیادہ کمزور ہے۔ پہلے نطفہ، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوتھڑا اور پھر وہ چیز جسے قابلِ ذکر کہا جا سکے پہلے وہ بے جان تھا۔ نہ سنتا تھا، نہ دیکھتا تھا، نہ محسوس کرتا تھا اور نہ حرکت کر سکتا تھا۔ گویا زندگی سے پہلے وہ مردہ تھا۔ طاقت سے پہلے کمزور تھا اور دولت مند ہونے سے پہلے تنگدست تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس بے بضاعتی کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ فرمایا ہے: مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ. مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ[1] (اسے کس چیز سے پیدا کیا، نطفے سے اسے پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ رکھا) پھر اللہ نے اس پر احسان رکھا اور فرمایا: ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهُ[2] (پھر اس کا راستہ آسان کیا)

فرمایا: فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا[3] (پھر ہم نے اسے سننے والا دیکھنے والا بنایا)

اللہ نے اسے موت کے بعد زندہ کیا۔ اس کی تصویر اچھی بنائی اور اسے دنیا کی طرف نکالا۔ پھر اسے پیٹ بھر کے کھلایا اور پلایا اور لباس پہنایا۔ اس کی رہنمائی کی۔ اسے قوت بخشی۔

پھر جس کی ابتداء یہ ہو، وہ کس بات پر تکبّر اور فخر کرے؟

اگر انسان کا وجود ہمیشہ اس کے اختیار میں ہوتا، تو پھر بھی اس کی سرکشی کی کوئی وجہ ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس پر متضاد اخلاط اور ہولناک بیماریاں مسلط رہتی ہیں۔ ادھر اس کی بنیاد پوری ہوئی اُدھر وہ کمزور ہوئی اور گری۔ اسے اپنی جان کے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں ہے۔ وہ کوئی چیز یاد کرتا ہے تو اسے بھول جاتا ہے کسی

---

[1] سورۃ عبس۔ آیات: ۱۸-۱۹ [2] سورۃ عبس۔ آیت: ۲۰ [3] سورۃ دہر۔ آیت: ۲

چیز کو مزیدار سمجھ کر کھاتا ہے۔ تو وہ اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے تو وہ اسے ملتی نہیں اور پھر اس سے مطمئن نہیں کہ ناگہانی طور پر اُس کی زندگی چھین لی جائے گی۔

انسان کی موجودہ زندگی دراصل درمیانی زندگی ہے۔ وہ اس کی ابتدا تھی جس کا ذکر کیا گیا۔ رہا انجام، تو وہ موت ہے جو اسے پہلے کی طرح بے جان بنا دے گی۔ پھر اُسے مٹی میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ ایک بدبودار مردہ ہوگا۔ اس کے اعضا گل سڑ جائیں گے۔ ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی۔ کیڑے اس کے اجزا کھائیں گے اور بالآخر وہ مٹی بن جائے گا، جس سے پیالے بنائے جائیں گے۔ مکانوں کی اینٹیں بنیں گی۔ پھر اسی پر خاتمہ نہ ہو جائے گا بلکہ اس کے متفرق اجزاء پھر جمع کیے جائیں گے اور اسے قیامت کے میدان میں حاضر کیا جائے گا۔ وہ دیکھے گا زمین بدلی ہوئی ہے۔ پہاڑ چل رہے ہیں۔ آسمان پھٹا ہوا ہے۔ ستارے بے نور ہو گئے ہیں۔ سورج کی شعاعیں لپیٹ کر الگ رکھ دی گئی ہیں۔ حالات تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جہنم کی بھاپ شور برپا کیے ہوئے ہے اور صحیفے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سے کہا جائے گا: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (اپنی کتاب پڑھ اور تیرا اپنا نفس ہی آج تیرا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔)

وہ کہے گا میری کتاب؟ کون سی کتاب؟ تو کہا جائے گا جس زندگی پر تو بڑا خوش تھا اور جس کی نعمتوں پر تو اکڑا پھرتا تھا۔ اس زندگی میں تجھ پر دو فرشتے مقرر کیے گئے تھے۔ جو تو بولتا تھا یا کرتا تھا وہ لکھتے جاتے تھے، خواہ وہ تھوڑا تھا یا زیادہ۔ تیرا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب کچھ نامۂ اعمال میں درج کیا جاتا تھا۔ تو ان چیزوں کو بھول چکا ہے، لیکن اللہ نے ان کو گن رکھا تھا، تو اب اس کا حساب دینے کے لیے تیار ہو جا! جس کا یہ حال ہو اس کا تکبّر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر اگر جہنّم کی طرف چلا گیا تو انجام کے لحاظ سے اس سے جانور اچھے ہیں کیونکہ وہ پھر مٹی ہو جائیں گے۔

جس کی یہ حالت ہو اور اب اُسے غلطی کے معاف ہو جانے کا بھی یقین نہ ہو تو وہ تکبّر کیسے کر سکتا ہے اور کون ہے جو سزا کے لائق گناہوں سے بچ سکتا ہے؟ اس کی مثال تو اس آدمی جیسی ہے جس نے بادشاہ کا گناہ کیا ہو اور وہ ہزار کوڑے سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا ہو۔ پھر اُسے قید میں ڈالا جائے تاکہ اُسے نکال کر سزا دی جائے اور وہ انتظار کر رہا ہو کہ سزا کے لیے اُسے بلایا جائے گا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ

۱؎ سورۂ اسراء۔ آیت: ۱۴

وہ قید خانے والوں پر تکبّر کرے گا؟ غور کیا جائے تو دنیا بھی تو ایک قید خانہ ہے اور انسان کے گناہ سزا کو لازم کرنے والے ہیں۔

رہی رب العالمین کی پہچان، تو اگر اس کی قدرت کے آثار اور عجائباتِ صنعت کو دیکھے تو اُس کی عظمت کا پتہ چل جائے گا اور معرفت حاصل ہو جائے گی۔ بس یہی وہ علاج ہے جو تکبّر کی جڑیں اکھاڑنے والا ہے۔

تکبّر کا عملی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندوں کے سامنے تواضع اختیار کرے۔ اگر اسے تواتر کے ساتھ اپنائے گا تو تواضع عادت ثانیہ بن جائے گی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے، تواضع اور اخلاقِ جمیلہ کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا مقام: نسب کی بزرگی کے خیال سے بھی انسان کے دل میں تکبّر پیدا ہوتا ہے، تو جسے نسب کی وجہ سے تکبّر ہو اسے جاننا چاہیے کہ یہ تو دوسرے کی خوبی سے عزّت حاصل کرنا ہے۔ ایسی صورت ہو تو اپنے آباؤ اجداد کی اصلیت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ معلوم ہو گا وہ بھی اسی طرح عالم وجود میں آئے تھے جس طرح سب انسان پیدا ہوتے ہیں۔

جس میں خوبصورتی کی وجہ سے تکبّر ہو، اسے عقلمندوں کی طرح اپنے باطن کی طرف دیکھنا چاہیے اور چارپایوں کی طرح ظاہر کو نہ دیکھنا چاہیے۔

جس میں جسمانی طاقت کی وجہ سے تکبّر پیدا ہو، اُسے جاننا چاہیے کہ اگر اس کی ایک رگ میں درد اُٹھے تو وہ ہر عاجز سے زیادہ عاجز ہو جائے گا۔ اور ایک دن کا بخار اُس کی اتنی قوّت تحلیل کر دے گا جو مدّت تک پوری نہ ہو گی۔ اگر اُس کے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ جائے، تو اُسے عاجز کر دے اور اگر ایک کھٹمل اُس کے کان میں داخل ہو جائے تو اُسے بیقرار کر دے گا۔

جو دولت کی وجہ سے تکبّر کرے، تو اُسے چاہیے اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ یہودی سب سے زیادہ مالدار ہیں۔ پس تُف ہے اس بزرگی پر جس میں یہودی بھی اُس سے آگے بڑھ جائے اور جسے چور ایک لحظے میں چھین کر لے جائے اور اس کا مالک ذلیل ہو جائے۔

جو علم کی وجہ سے تکبّر کرے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حجّت جاہل کی نسبت عالم پر زیادہ سخت ہے۔ اُسے چاہیے اس عظیم خطرے کو محسوس کرے جو اس کے سامنے ہے اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ خطرہ اتنا ہی بڑا ہو گا جتنا بڑا مرتبہ ہو گا۔

نیز یہ بھی جاننا چاہیے کہ تکبّر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اور جب وہ تکبّر کرے گا تو اس پر اللہ کا غصہ اور ناراضگی ہو گی۔ اللہ عاجزی اور تواضع کو پسند کرتا ہے۔ بس اسی طرح ہر ایک سبب کا علاج اس کی ضد سے کرے اور تواضع اختیار کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے اخلاق کی طرح اس خُلق کی بھی دو طرفیں اور ایک درمیان ہے:
جو طرف زیادت کی طرف مائل ہے اُس کا نام تکبر ہے۔ جو نقصان کی طرف مائل ہے اُسے خسّت اور ذلّت کہتے ہیں اور درمیان کا نام تواضع ہے اور یہی محمود ہے۔

جو اپنے ساتھیوں پر برتری جتائے وہ متکبّر ہے اور جس نے پستی ظاہر کی وہ متواضع ہے۔ گویا اُس نے اپنے مرتبے سے کچھ چیز گھٹا دی، لیکن اگر کسی عالم کے پاس کوئی موچی یا اسی حیثیت کا کوئی شخص جائے اور عالم اُس کو اپنی جگہ بٹھائے پھر اُس کا جوتا لا کر اُس کے سامنے رکھے اور جب وہ رخصت ہو تو دروازے تک اُس کے ساتھ جائے تو اُس نے ذلّت کو پسند کیا اور یقیناً یہ بات اچھی نہیں۔ اچھی چیز اعتدال ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک حق دار کو اس کا حق ادا کرے۔

معمولی لوگوں میں تواضع یہ ہے کہ اُن کے سوال کے جواب میں اُن پر نرمی کرے اور نرم انداز سے گفتگو کرے۔ اُن کی دعوت قبول کرے۔ ان کی حاجت پوری کرنے میں کوشش کرے۔ اُن کی تحقیر نہ کرے اور انھیں ذلیل نہ سمجھے۔ واللہ اعلم۔

فصل ہشتم

عُجب کے متعلق تصریحات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک آدمی دو چادریں پہن کر بڑے غرور کی چال جا رہا تھا کہ اللہ نے اُس کو زمین میں غرق کر دیا، وہ قیامت تک اس میں دھنستا چلا جائے گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین چیزیں مہلک ہیں۔ بُخل جس کی پیروی کی جائے۔ خواہش جس کی اطاعت کی جائے اور آدمی کا اپنے نفس پر مغرور ہونا۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "دو چیزوں میں ہلاکت ہے۔ عُجب اور قنوط۔ اور ان دونوں کو اس لیے جمع کیا ہے کہ نیک بختی طلب اور کمر ہمت باندھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مایوس آدمی طلب نہیں کرتا۔ اور مغرور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی مراد میں کامیاب ہو چکا ہے اور یوں وہ کوشش نہیں کرتا۔"

مطرف رحمہ اللہ نے کہا: "اگر میں ساری رات سو کر گزاروں اور ندامت کی حالت میں صبح کروں تو یہ حالت مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ساری رات قیام میں گزاروں اور صبح غرور کی حالت میں کروں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ عُجب تکبر پیدا کرتا ہے کیونکہ یہ بھی اس کے اسباب میں سے ہے۔ اور تکبر سے بے شمار آفتیں پیدا ہوتی ہیں اور غرور کی یہ نوعیت تو مخلوق کے ساتھ ہے۔ باقی رہا خالق کا معاملہ، تو عبادات پر غرور نتیجہ ہے عبادتوں کو بڑا سمجھنے کا، گویا کہ وہ اس عبادت سے اللہ پر احسان کرتا ہے۔ اللہ نے جو عبادت کی توفیق دی ہے اسے بھول جاتا ہے اور عبادت کو برباد کر دینے والی آفتوں سے اندھا ہو جاتا ہے۔

اپنے اعمال کی نگرانی وہ کرے گا جسے اعمال کے رد کر دیے جانے کا خوف ہو گا نہ کہ وہ جو ان پر مغرور ہو۔ اور عُجب کسی صفت کمال پر ہوتا ہے۔ خواہ علم پر ہو یا عمل پر۔ پھر اگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھے کہ اس کا اللہ پر حق ہے تو یہ "ناز نخرہ" ہو گا، یعنی عُجب اپنے اعمال کو بڑا سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص خیال کرتا ہے کہ وہ لازمی طور پر اللہ کی رحمتوں کا حق دار بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایسے شخص کو اپنی دعا کے بارے میں گمان ہو گا کہ وہ رد

نہ ہوگی۔ حالانکہ عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر اللہ چاہے تو قبول کرے گا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کی توفیق دے کر تجھ پر احسان کیا ہے۔ پھر کسی عامل کا عمل پر غرور کرنا یا کسی عالم کا علم پر اترانا یا کسی خوبصورت کا خوبصورتی پر ناز کرنا یا کسی دولت مند کا دولت پر گھمنڈ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور آدمی تو صرف محلِ نعمت ہے اور اس کا محلِ نعمت ہونا بھی اللہ کا ایک احسان ہے۔

اگر تم کہو کہ عمل تو تمھاری قوت سے حاصل ہوا ہے، تو یہ تبلاؤ کہ تمھاری قوت کہاں سے آئی ہے؟ کیونکہ عمل کا تصور تو تمھارے وجود سے ہے اور تمھارا وجود اور ارادہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام امور کی کنجی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک کنجی نہ دی جائے گی تم عمل نہ کر سکو گے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں کسی کو بھی اس کے عمل جنت میں داخل نہیں کر سکتے۔" صحابہؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ کو بھی؟" تو فرمایا: "میں بھی اللہ کی رحمت اور فضل ہی سے جنت میں جا سکتا ہوں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ عُجب بھی انھی اسباب سے پیدا ہوتا ہے جن سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور اس کا ذکر اور علاج پہلے گزر چکا ہے۔

ایک عُجب نسب سے ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شریف آدمی یہ خیال کرے کہ وہ اپنے باپ دادا کے شرف سے نجات پا جائے گا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ وہ جانے کہ جب وہ اپنے باپ دادا کا مخالف ہو اور پھر بھی یہ سمجھے کہ وہ ان ہی میں سے ہے تو یہ اس کی جہالت ہے۔ اور اگر ان کی پیروی کرے تو عُجب اُن کے اخلاق میں سے نہیں تھا بلکہ خوف اور نفس کو حقیر سمجھنا اُن کے اخلاق تھے۔ اگر انھیں کوئی بزرگی ملی ہے، تو اچھی صفات اور طاعت سے ملی ہے نہ کہ نسب کی وجہ سے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے فاطمہؓ! میں اللہ کے ہاں تیرے کسی کام نہیں آسکوں گا۔"

اگر تم یہ کہو کہ شریف کو امید ہوتی ہے کہ اس کی قرابت والے اس کی سفارش کریں گے، تو جواب یہ ہے کہ تمام مسلمان شفاعت کی امید رکھتے ہیں، لیکن کبھی کسی آدمی کے لیے آگ میں جلنے کے بعد سفارش قبول ہوگی اور اگر

گناہ زیادہ ہوں گے تو شفاعت نجات نہیں دے گی۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تم میں سے کسی کو ایسے حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن آئے اور اُس کی گردن پر اُونٹ بلبلا رہا ہو تو وہ کہے اے اللہ کے رسول میری مدد کیجیے، تو میں کہوں میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اللہ کا حکم تجھے پہنچا دیا تھا"

جو شخص شفاعت کی امید پر گناہوں میں منہمک رہتا ہے، اس کی مثال اس مریض جیسی ہے جو اپنے حاذق طبیب کے اعتماد پر اپنی خواہش کے مطابق کھاتا پیتا پھرے۔ یہ جہالت ہے کیونکہ طبیب کی کوشش بعض بیماریوں میں فائدہ دیتی ہے نہ کہ سب میں۔

بڑے بڑے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین قیامت سے ڈرتے تھے تو جو اُن کے مرتبے کا بھی نہیں ہے وہ کیسے توکل کر سکتا ہے؟

ایک عُجب غلط رائے پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا۔[1] (کیا جس کے بُرے عمل اسے خوشنما بنا کر دکھائے گئے تو وہ انھیں اچھا سمجھتا ہے۔)

اس کا علاج دوسروں کی نسبت زیادہ مشکل ہے، کیونکہ جو آدمی اپنی رائے کو اچھا سمجھتا ہو وہ ناصح کی نصیحت کی طرف کان ہی نہیں رکھتا۔ اور جب صورت یہ ہو تو جس چیز میں وہ نجات سمجھتا ہے اسے چھوڑ کیسے سکتا ہے؟

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنی رائے کو ہمیشہ ناقص سمجھے اور اس پر مغرور نہ ہو، مگر یہ کہ اس کی یقینی شہادت کتاب یا سنت یا عقلی دلیل سے جو شرائط دلیل کی جامع ہو حاصل ہو جائے۔ اور اس چیز کو صرف اس صورت میں جان سکتا ہے کہ وہ اہل علم کی صحبت اختیار کرے اور کتاب و سنت کے احکام سے آگاہ ہو جائے۔

جو آدمی اپنی پوری زندگی علم میں نہ گزار سکتا ہو اُسے چاہیے کہ مختلف مذاہب میں بحث نہ کرے اور مجمل عقیدے پر ٹھہر جائے، کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے اور اس کے رسول جو کچھ اس کی طرف سے لائے ہیں سب سچ ہے۔ اور بغیر کسی بحث و تنقید کے قرآن کی بیان کردہ ہر بات پر ایمان لائے اور اپنی زندگی تقویٰ اور عبادت گزاری میں بسر کرے۔ اگر وہ مذاہب میں بحث کرنے لگے گا جن سے پوری طرح آگاہ نہیں تو ہلاک ہو جائے گا۔

---

[1] سورۃ فاطر - آیت: ۸

فصل نہم

دھوکا اور اُس کی اقسام

بعض لوگ ایسے ہیں جنھیں دنیا نے دھوکا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں نقد ادھار سے بہتر ہے اور دنیا نقد ہے اور آخرت ادھار۔ یہی فریب کا مقام ہے کیونکہ نقد ادھار سے بہتر صرف اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ نقد اور ادھار برابر ہوں۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آخرت کی مدت کی نسبت انسان کی زندگی کئی لاکھ گنا سے بھی کم ہے۔ اور جس نے یہ کہا تھا کہ نقد ادھار سے بہتر ہے وہ نقد اور ادھار کے برابر ہونے کی صورت میں تھا اور یہ کفار کا دھوکا ہے۔

جو لوگ عقائد صحیح ہونے کے باوجود گناہوں میں مبتلا ہیں وہ اس دھوکے میں کفار کے ساتھ شریک ہیں۔ کیونکہ انھوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند کیا ہے، تاہم اُن کا معاملہ کفار کی نسبتاً آسان ہے۔ اس لیے کہ اصل ایمان ان کو ہمیشہ کے عذاب سے بچالے گا۔

بعض آدمی اس دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے اور ہم اس کی بخشش پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی اپنے باپ دادا کی نیکی سے دھوکا کھاتے ہیں، لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ علماء نے کہا ہے جو کسی چیز کی امید رکھتا ہے وہ اُسے طلب کرتا ہے اور جو کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے بھاگتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو گناہ پر اصرار کے باوجود بخشش کی امید رکھتا ہے۔ وہ دھوکے میں مبتلا ہے۔ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت کے باوجود سخت عذاب دینے والا بھی ہے اور اُسی نے کافروں کے لیے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حالانکہ اُن کے کفر سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ دنیا میں اُس نے اپنے بندوں پر مشقت اور امراض مسلط کر رکھے ہیں، اگرچہ وہ اُن کو دُور کر دینے پر قادر ہے، پھر اُس نے ہمیں اپنے عذاب سے ڈرایا بھی ہے تو پھر ہم کیوں نہ ڈریں!

خوف اور اُمید دو سائق (ہانکنے والے) ہیں جو انسان کو عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور اگر یہ عمل پر آمادہ نہ کریں، تو اس کا مطلب ہوگا ان کا صحیح ادراک حاصل نہیں۔ اسی لیے اکثر لوگوں کو امید بے عملی اور گنہگاری پر آمادہ کرتی ہے۔

قرنِ اوّل کے لوگ عمل کر کے بھی ڈرتے تھے، لیکن اس زمانے کے لوگ کمزور ایمان کے باوجود مطمئن ہیں، تو کیا اُن کی رائے یہ ہے کہ اُن کو رحمتِ خداوندی کی وہ شان معلوم ہوگئی جو پہلے انبیاء اور نیک لوگوں کو معلوم نہیں ہوئی تھی ؟ اگر یہ بات صرف خواہش سے معلوم ہو سکتی، تو یہ لوگ کیوں اتنی محنت کرتے اور کیوں رویا کرتے ؟ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے تو اہل کتاب کی مذمت کی ہے ۔ فرمایا : يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا[1]۔ (وہ اس ادنیٰ دنیا کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا)

غور کیا جائے تو ان لوگوں کی غلط فہمی اہل کتاب جیسی ہی ہے ۔

جو اپنے باپ دادا کی نیکی سے دھوکا کھاتا ہے وہ نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے ۔ اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے باپ کے واقعات پر غور کیوں نہیں کرتا ؟

اسی دھوکے کے قریب قریب ان لوگوں کا دھوکا بھی ہے جن کے پاس نیکیاں اور برائیاں دونوں ہیں، لیکن ان کی برائیاں زیادہ ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی نیکیاں زیادہ ہیں، تو ان میں سے کسی کو دیکھے گا کہ وہ ایک درہم صدقہ کرتا ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ غصب کا مال لے لیتا ہے اور شاید یہ درہم جو صدقہ کیا ہے، یہ بھی اسی چھینے ہوئے مال سے ہو۔ اگر وہ اس صدقے پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ترازو کے ایک پلڑے میں ایک درہم رکھے اور دوسرے میں ہزار درہم اور پھر اسے یہ امید ہو کہ ایک درہم ہزار سے زیادہ وزنی ہو جائے گا ۔

اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اُن کی نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی تعداد کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن برائیوں پر نفس کا محاسبہ نہیں کرتے اور نہ اپنے گناہوں کی تفتیش کرتے ہیں جیسے کہ وہ آدمی جو ایک ہی دفعہ سو مرتبہ استغفار کرے اور تسبیحیں کہے اور پھر باقی سارا دن مسلمانوں کی غیبت کرتا رہے اور ناپسندیدہ باتوں میں مبتلا رہے ۔ وہ تسبیح اور استغفار کے فضائل تو دیکھتا ہے لیکن بدکلامی اور غیبت کی سزا پر غور نہیں کرتا ۔

---

[1] سورۂ اعراف - آیت : ۱۶۹

فصل دوازدہم

گمراہوں کی قسمیں

عموماً چار قسم کے لوگ دھوکے میں مبتلا ہوتے ہیں:

علماء، عابد، متصوفین اور دولتمند۔

علماء میں سے دھوکا کھانے والے کئی قسم کے لوگ ہیں۔ مثلاً اُن میں سے ایک فرقہ تو وہ ہے جنھوں نے علوم شرعی اور عقلی میں پختگی تو پیدا کرلی ہوتی ہے لیکن اپنے اعضاء کو گناہوں سے نہیں بچاتے۔ وہ اپنے علم پر مغرور رہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک ان کا ایک مرتبہ ہے۔ اگر یہ لوگ بصیرت کی نگاہ سے دیکھیں تو اُن کو معلوم ہوجائے کہ علم بھی تو عمل کے لیے مطلوب ہے اور اگر عمل نہ ہو تو علم کی کوئی قدر نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا[1] (جس نے نفس کو پاک کیا وہ خلاصی پاگیا)

یہ تو نہیں فرمایا کہ جس نے علم حاصل کیا اُس نے خلاصی پائی۔ صرف علم اسے کیسے پاک کرسکتا ہے۔ اگر شیطان اس کو اہل علم کے فضائل پڑھ کر سنائے، تو اُسے وہ آیتیں بھی یاد کرنی چاہئیں جو بدکردار عالموں کے متعلق آئی ہیں۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ[2] (تو اس کی مثال کتے کی سی ہے اگر تو اس پر بوجھ لادے تو ہانپے اور اگر چھوڑ دے تو ہانپے)

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا[3] (جیسے گدھا جو اٹھائے بڑی بڑی کتابیں)

ایک فرقہ وہ ہے جن کا علم اور ظاہری عمل تو مضبوط ہے، لیکن انھوں نے اپنے دل کی نگرانی نہیں کی کہ بری صفات کا خاتمہ کریں۔ جیسے تکبر، حسد، ریا اور طلب جاہ و منزلت اور خواہشات کی طلب۔ ان لوگوں نے اپنے ظاہر کو تو مزین کرلیا ہے، لیکن اپنے باطن پر کوئی توجہ نہیں کی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھول گئے کہ: "اللہ تعالیٰ تمھاری صورتیں اور مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دل اور اعمال کو دیکھتا ہے"۔

---

[1] سورۃ الشمس۔ آیت: ۹ [2] سورۃ اعراف۔ آیت: ۱۷۶ [3] سورۃ جمعہ۔ آیت: ۵

انھوں نے اعمال کی نگرانی تو کی لیکن دلوں کی نگرانی نہ کی اور دل ہی اصل ہے کیونکہ نجات وہی پائے گا جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا۔ ان لوگوں کی مثال اُس آدمی کی سی ہے جس نے کھیتی کاشت کی، پھر وہ اگی تو اس کے ساتھ گھاس پھونس وغیرہ بھی اُگ آیا جو کھیتی کو تباہ کر دیتا ہے تو اس سے کہا گیا کہ گھاس کو اُکھاڑ دو۔ اُس نے گھاس کی پتیاں اور شاخیں تو کاٹ دیں لیکن اس کی جڑیں چھوڑ دیں تو اس کی جڑیں اور مضبوط ہو گئیں۔

ایک فرقہ وہ ہے جسے یہ تو معلوم ہے کہ یہ باطنی اخلاق بُرے ہیں لیکن وہ اپنے نفس پر مغرور ہیں سمجھتے ہیں کہ ہم اخلاقِ ذمیمہ سے پاک ہیں اور اللہ کے نزدیک اس سے بہت بلند ہیں کہ اللہ ہمیں ان میں مبتلا کرے۔ ان میں تو عوام مبتلا ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو ہمارے جیسا علم رکھتے ہیں۔ اور جب اُن پر تکبّر یا اقتدار کی طلب کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں یہ تکبّر نہیں ہے۔ یہ تو دین کی عزت کی طلب اور علم کے شرف کا اظہار اور بدعتیوں کی تذلیل ہے۔ اگر ہم معمولی سے کپڑے پہن لیں اور نیچی جگہ میں بیٹھ جائیں تو ہماری وجہ سے دین کے دشمن خوش ہوں گے اور ہماری ذلت پر ہنسیں گے اور ہماری ذلت میں اسلام کی ذلت ہے۔ یہ لوگ اس دھوکے پر نظر نہیں رکھتے کہ یہ بات ابلیس نے اُن کے دل میں ڈالی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ تواضع کیا کرتے تھے اور فقر و مسکنت کو پسند کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ جب آپ شام پہنچے تو راستے میں پانی آگیا۔ آپ اپنے اونٹ سے اترے اور موزے اتارے اور پانی میں داخل ہو گئے۔ آپ نے اونٹ کی مہار بھی پکڑ رکھی تھی حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا: "آج آپ نے شام والوں کے سامنے ایک بہت بڑا کام کیا ہے" آپ نے ان کے سینے میں ہاتھ مارا اور کہا: "اے ابو عبیدہ! کاش یہ بات کہنے والے تم نہ ہوتے۔ تم سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے رسُول کے سبب عزت بخشی، تو جب بھی تم ان کے بغیر عزت طلب کرو گے اللہ تمھیں ذلیل کرے گا"

آپ کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ جب آپ شام پہنچے تو لوگوں نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت آپ اونٹ پر سوار تھے۔ کہا گیا "کاش آپ گھوڑے پر سوار ہو کر امراء و رؤسا سے ملاقات کریں" فرمایا: "میں تمھاری عزت اس جگہ پر نہیں دیکھتا فیصلے تو اس جگہ سے ہوتے ہیں" اور اپنے ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور پھر کہا: "میرے اونٹ کا راستہ چھوڑ دو"

تعجب تو اُس مغرور پر ہے جو قیمتی کپڑوں اور خوبصورت گھوڑوں سے دنیا کی عزت طلب کرتا ہے اور جب

اُس کے دل میں ریا کا خیال آتا ہے تو کہتا ہے۔ اس سے میری غرض علم اور عمل کا اظہار ہے تاکہ لوگ میری پیروی کر کے دین کی ہدایت پائیں۔ اگر اس کا یہی مقصد ہوتا تو جتنا لوگوں کے اپنی پیروی سے خوش ہوتا ہے اتنا ہی اس بات سے بھی خوش ہوتا کہ لوگ کسی دوسرے کی پیروی کریں۔ کیونکہ جس کا ارادہ لوگوں کی اصلاح ہو وہ لوگوں کی اصلاح پر خوش ہوتا ہے خواہ وہ کسی کے ہاتھ سے ہو۔

اسی طرح وہ آدمی ہے جو ان میں سے بادشاہ کے پاس جاتا ہے۔ اس سے محبّت کرتا ہے۔ اس کی ثنا کرتا ہے اور اس کے سامنے انکساری کرتا ہے اور کہتا ہے اس سے میری غرض یہ ہے کہ میں کسی مسلمان کی سفارش یا کسی کی تکلیف دور کر سکوں۔ اللہ جانتا ہے کہ اگر اس کے بعض ساتھی بادشاہ کے نزدیک مقبول ہو جائیں تو اسے یہ بات بڑی شاق گزرے۔

ان میں سے بعض کی غلط فہمی تو اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بادشاہ سے حرام مال لیتے ہیں اور کہتے ہیں اس مال کا کوئی مالک نہیں ہے، یہ مسلمانوں کے رفاہ کے لیے ہے۔ ایسا شخص اس قول کی وجہ سے کہ اس مال کا کوئی مالک نہیں ہے دجّالوں میں سے ایک دجّال ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ حرام حلال ملا ہوا ہوگا۔ اور اس سے وہ مال حلال نہیں ہو جاتا بلکہ اکثر تو اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال کس سے لیا گیا ہے۔

ایک اور فرقہ ہے جس کا علم مضبوط ہے۔ انھوں نے اپنے اعضاء کو پاک کر لیا ہے اور وہ طاعات سے مزیّن ہیں۔ انھوں نے اپنے دلوں کی نگرانی کر کے ان کو ریا، حسد اور کبر وغیرہ سے پاک کر دیا ہے لیکن دل کے کناروں سے کچھ شیطانی فریب مخفی رہ گئے ہیں۔ ان کا نفس فریب کھا رہا ہے، لیکن وہ سمجھتے نہیں اور نہ اس کی پروا کرتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ کوئی ان میں سے رات بھر جاگتا ہے اور سارا دن بھی علوم اور ان کی ترتیب اور الفاظ کی تحسین میں گزار دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس پر آمادہ کرنے والی چیز اللہ تعالیٰ کے دین کے اظہار کی حرص ہے۔ حالانکہ کبھی اس پر آمادہ کرنے والی چیز سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ بھلائی سے اس کا ذکر کریں اور وہ مشہور رہو۔ ایسے لوگ اپنی تصنیفات میں اپنی ثناء ضرور بیان کرتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو لمبے چوڑے دعوے کر کے صریحاً اپنی تعریف کرتے ہیں یا دوسروں پر طعنہ زنی کے ضمن میں ایسا پہلو نکال لیتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ آدمی جو طعنہ کر رہا ہے یہ اس سے افضل اور اس سے زیادہ عالم ہے۔

یہ ایسے مخفی عیوب ہیں جن سے نہایت ہوشیار اور طاقتور لوگ ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ ہم جیسے کمزور لوگوں کو اس میں کوئی امید نہ رکھنی چاہیے۔

سب سے کمتر درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کے عیوب کو پہچانے اور ان کو درست کرنے کی کوشش کرے۔ جیسے اپنی نیکیاں اچھی لگیں اور اپنی برائیاں بُری محسوس ہوں تو اس کے لیے اُمید رکھنی چاہیے، برخلاف اُس شخص کے جو اپنے نفس کو پاک بتائے اور اپنے آپ کو بہتر مخلوق سمجھے۔ تو یہ اُن لوگوں کا حال ہے جنھوں نے اہم علوم حاصل کیے ہیں۔ سوچنا چاہیے اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو غیر اہم علوم پر قناعت کر چکے ہیں۔

بعض ایسے ہیں کہ وہ حکومت، لڑائی جھگڑوں اور دنیاوی معاملات کی تفصیل کے متعلق فتاویٰ کے علم پر بس کر چکے ہیں جن سے لوگوں میں اصلاحِ معیشت ہو سکے، لیکن یہ لوگ اعمالِ ظاہری کو ضائع کر دیتے ہیں اور بعض معاصی کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ مثلاً غیبت جن کو دیکھنا جائز نہیں اُن کو دیکھنا۔ ناجائز کاموں کی طرف چل کر جانا اور اپنے دلوں کو تکبر، حسد، ریا اور دیگر تمام مہلکات سے نہ بچانا۔

یہ لوگ دو طرح سے دھوکے میں مبتلا ہیں۔ ایک تو عمل کی حیثیت سے اور دوسرے علمی حیثیت سے۔ اور ان کی مثال اس مریض جیسی ہے کہ جب وہ کسی دوا کا نسخہ سیکھ لے، تو اس کی تکرار اور تعلیم میں مشغول ہو جائے بلکہ ان کی مثال تو اس آدمی جیسی ہے جسے سرسام (ایک ہذیانی بیماری) ہو۔ وہ ہلاکت تک پہنچ چکا ہو لیکن اپنے مرض کا علاج کرنے کے بجائے استحاضہ کی دوا سیکھنے میں مشغول ہو اور اس کی تکرار کرتا رہے۔

یقیناً یہ انتہائی دھوکہ ہے۔ اور اس دھوکے کا سبب یہ ہے کہ اس نے فقہ کی تعظیم کی روایات سنی ہیں۔ اور اسے یہ معلوم نہیں کہ فقہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے متعلق سمجھ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عذاب کی صفات کی پہچان ہے تاکہ دل میں خوف پیدا ہو اور تقویٰ اختیار کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ[1] (پھر ان کے ہر فرقہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہیں نکلتے کہ دین کو سمجھیں)

وہ علم جس سے انذار (ڈرانا) حاصل ہوتا ہے، وہ اس علم کے علاوہ ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ معاملات کی شرائط سے مالوں کی حفاظت کی جائے اور مالوں سے ابدان کی حفاظت کی جائے اور قتل اور زخموں کی مدافعت ہو۔

مال اللہ کی راہ میں آلہ ہے اور بدن سواری۔ اور اہم علم رستے پر چلنے کی پہچان اور دل کی گھاٹیوں کو

---

[1] سورۃ توبہ - آیت ۱۲۲

طے کرنا ہے، جو کہ بری صفات ہیں۔ اور یہی بندے اور اللہ کے درمیان حجاب ہیں۔

جو آدمی اسی پر رک جائے۔ اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو حج کے رستے پر چلنے کے لیے مشکیزہ اور موزہ کے سینے کا علم حاصل کرے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ بھی ضروری علم ہے، لیکن حج سے تو ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔

بعض وہ ہیں جو اختلافات کے علم پر بس ہو گئے ہیں اور اُن کی اہمیت صرف مجادلہ، الزام، خاموش کرانے اور غلبے کی وجہ سے حق کو رد کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ پہلے لوگوں سے بھی زیادہ بری حالت میں ہیں۔ فقہ میں (مجادلہ) جھگڑے کے تمام وقائع بدعت ہیں۔ سلف ان کو نہیں جانتے تھے۔

باقی رہے احکام کے دلائل تو فقہی مسلک کا علم ان کے علم پر مشتمل ہے اور وہ دلائل کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور جھگڑے (مناظرہ) کے مختلف طریقے مثلاً کسر، قلب، فساد وضع و ترکیب اور تعدیہ، تو یہ خاموش کرانے اور غلبے کے اظہار کے لیے ایجاد کیے گئے ہیں۔

ایک فرقہ اور ہے جو مخالفین کے ردّ اور اپنی خواہشات کے مطابق مجادلہ کرتا ہے۔ اور علم کلام کے جوہر دکھاتا ہے۔

پھر یہ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ تو گمراہ ہے، لیکن دوسرا کسی قدر حق کی طرف ہے، گمراہ تو وہ ہے جو سنتِ رسول کے علاوہ دیگر باتوں کی طرف بلاتا ہے۔ اس سے بہتر وہ ہے جو سنت کا تارک تو نہیں، لیکن علم کے زعم میں مبتلا ہے۔ ان لوگوں کا دھوکا اس حیثیت سے ہے کہ انھوں نے سمجھ رکھا ہے کہ مناظرہ ہی سب سے اہم امر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کوئی آدمی بحث نہ کرے اس کا دین مکمل نہیں ہوتا، یعنی جو آدمی بغیر واضح دلیل کے اللہ اور رسول کی تصدیق کرے اس کا ایمان کامل نہیں۔ اسی فاسد خیال میں انھوں نے اپنی عمریں بحث اور جدال میں صرف کر دی ہیں۔ اُن کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ وہ سلف کی طرف نہیں دیکھتے جن کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین مخلوق ہونے کی شہادت دی ہے، ان کے زمانے میں بھی کئی ایک خواہشات اور بدعات پیدا ہو چکی تھیں، لیکن انھوں نے اپنی عمریں اور اپنا دین جھگڑے اور مجادے کے لیے وقف نہیں کیا۔ وہ اپنے دلوں اور اعضاء کی نگرانی چھوڑ کر اس میں نہیں الجھے، بلکہ گمراہی کی تردید کی ضرورت کے علاوہ اس کے متعلق بات بھی نہیں کی۔ اگر ان کو معلوم ہوا کہ کوئی بدعت پر اصرار کر رہا ہے تو بغیر بحث اور جھگڑے کے اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

حدیث میں ہے کہ جو قوم ہدایت کے بعد گمراہ ہو جائے اس میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔"

ایک اور فرقہ ہے جو وعظ و نصیحت میں مشغول ہے۔ ان میں سے بلند مرتبہ وہ ہیں جو نفس کی اصلاح اور دل کی صفات کے متعلق بات کرتے ہیں، یعنی خوف، امید، صبر و شکر، توکل، زہد و یقین اور اخلاص وغیرہ کے متعلق۔ اور جب وہ ان صفات کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ بس دوسرے ہی ان صفات سے تہی دامن ہیں۔ گویا یہ لوگ دوسروں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن خود اس سے بھاگتے ہیں۔ یہ سب لوگوں سے زیادہ دھوکے میں مبتلا ہیں۔

کچھ ایسے ہیں جو عجیب و غریب باتیں بیان کرنے کے لیے وعظ کے سیدھے راستہ سے ہٹ کر شطح (مستی کی باتیں) اور تلفیق (خود بات بنا لینا) کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو کہ شریعت کے خلاف ہیں۔

بعض ایسے ہیں جو وصال و فراق کے اشعار سے دلیل پکڑتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کی مجالس میں کثرت سے چیخ و پکار اور وجد پیدا ہو۔ اگر محض فاسد اغراض ہوں تو یہ لوگ انسانوں میں شیطان ہیں۔

ایک فرقہ وہ ہے جو اپنا زیادہ وقت حدیث کے سماع اور روایات کو جمع کرنے میں خرچ کرتا ہے لیکن اللہ کی رضا کی بجائے مقصد یہ ہوتا ہے کہ شہروں میں پھریں، شیوخ کو دیکھیں تاکہ کہیں کہ میں فلاں سے روایت کرتا ہوں اور میں فلاں فلاں سے ملا ہوں۔ اور میرے پاس ایسی سندیں ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ یہ بھی راہ راست پر نہیں۔

ایک فرقہ علم نحو، لغت اور شعر کے حصول میں مشغول ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ امت کے علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمریں اسی شغل میں ضائع کر دی ہیں۔ اگر سمجھیں تو ان کو معلوم ہو لغت عرب سیکھنے میں اپنی عمر کو ضائع کرنے والا بھی ایسا ہی ہے جیسا لغت ترک کے سیکھنے میں عمر ضائع کرنے والا۔ ان دونوں میں فرق صرف یہی ہے کہ شریعت عربی زبان میں وارد ہوئی ہے۔ لغت کے غرائب کے علم میں قرآن اور حدیث کے غرائبات کا علم کافی ہے اور علم نحو اتنا ہی کافی ہے جس سے زبان سیدھی ہو جائے۔ اس سے زیادہ کوشش کرنے سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ انسان ان باتوں کے علم سے محروم رہ جاتا ہے جو ضروری ہیں۔ علم صرف و نحو کی گہرائی میں جانے والے کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنی عمر قرآن مجید کے حروف کے مخارج کی تصحیح میں گزار دے اور اسی پر بس ہو کر رہ جائے۔ یہ صریح دھوکہ ہے، کیونکہ حروف سے مقصود معانی ہیں۔ حروف تو ظروف اور وسیلہ ہیں۔ اگر صفراء کی زیادتی کا مریض سکنجبین پینے کے بجائے سکنجبین بنانے کی ترکیب سیکھنے میں عمر برباد کر دے تو

وہ یقیناً دھوکے میں مبتلا ہے۔ خوش قسمت وہ ہے جو اپنی اہم ضرورت کو حاصل کرے دوسری کو چھوڑ دے۔ عمل کی طرف توجہ کرے اور اسی کو مقصود اصلی جانے۔

ایک اور فرقہ ہے جس نے حقوق کو رد کرنے کے لیے حیلے ایجاد کیے ہیں، یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ طریقہ ان کے لیے نافع ہے۔ یہ سراسر دھوکہ ہے کیونکہ انسان اگر اپنی بیوی کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائے تو وہ اللہ کے نزدیک تو بری نہیں ہو جائے گا۔ اگر مرد زکوٰۃ والا مال سال کے آخر میں بیوی کے نام ہبہ کر دے اور بیوی مرد کے نام ہبہ کر دے اور اس طرح وہ زکوٰۃ کو ساقط کر دیں تو یہ محض خود کو دھوکا دینا ہوگا ان کا حق ان کے ذمے باقی رہے گا۔

دوسری قسم عبادت گزار اور بظاہر نیک عمل کرنے والوں کی ہے اور ان کے کئی فرقے ہیں۔ ان میں ایک فرقے نے فرائض تو چھوڑ دیے ہیں لیکن نوافل اور فضائل میں مشغول ہے۔ بعض اوقات وضو کے پانی کے استعمال میں اپنے وسوسوں کو وقیع خیال کرتے ہیں۔ جس پانی پر شریعت طہارت کا حکم لگاتی ہے اس پر وہ خوش نہیں ہوتے، بلکہ اس کے پلید ہونے کے بعید احتمالات پیدا کرتے ہیں، لیکن کھانے کے متعلق وہ احتیاط نہیں کرتے۔ اگر یہ احتیاط پانی سے کھانے کی طرف منتقل ہو جائے تو سلف کی سیرت سے بہت زیادہ مشابہ ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی عورت کے مٹکے سے پانی لے کر وضو کیا، حالانکہ نجاست کا احتمال ظاہر تھا۔ دوسری طرف حرام میں مبتلا ہونے کے خوف سے آپ بعض حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دیتے تھے۔

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو کیا۔

بعض ان میں وہ ہیں جو پانی میں اسراف کرتے ہیں اور وضو میں اتنی دیر کر دیتے ہیں کہ بعض اوقات نماز ضائع ہو جاتی ہے۔

بعض ایسے ہیں جن کو نماز کی تکبیر تحریمہ میں وسوسہ پڑتا ہے، یہاں تک کہ امام کے ساتھ ان کی ایک رکعت ہی جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح بعض ایسے ہیں جن کو سورۃ فاتحہ اور اذکار کے حروف کے مخارج میں وسوسہ پڑتا ہے۔ وہ ضاد اور ظا کے فرق اور تشددوں میں ضرورت سے زیادہ احتیاط کرتے ہیں، بلکہ ان چیزوں کی طرف اتنی توجہ دیتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ قرآن کے معانی اور اس کی نصیحت تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ غلط فہمی کی بدترین قسم ہے کیونکہ لوگوں کو قرآن مجید کی تلاوت میں حروف کے مخارج کی تحقیق کی تکلیف نہیں دی گئی ماسوائے اس کے جو کلام میں عادت کے مطابق جاری ہے۔

ان لوگوں کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو بادشاہ کے پاس پیغام لے کر جائے اور پیغام پہنچاتے وقت حروف کے مخارج کو خوب صورت بنائے اور اُس کی تکرار کی طرف متوجہ رہے اور پیغام کے مقصود اور مجلس کی حرمت کے آداب سے غافل ہو جائے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی سزا پانے اور باہر نکال دینے کے لائق ہے۔

ایک اور فرقہ ہے جو قرآن کی تلاوت میں دھوکا کھاتا ہے۔ وہ اُس کو بڑی تیزی سے پڑھتے ہیں اور بسا اوقات ایک دن میں دو دو مرتبہ ختم کرتے ہیں۔ اُن کی زبان تو الفاظ ادا کرتی ہے، لیکن دل خواہشات کی وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ وہ نہ تو قرآن کے معانی میں غور کرتے ہیں نہ اس کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اُس کے اوامر و نواہی پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بھی دھوکے میں مبتلا ہیں سمجھتے ہیں کہ قرآن کا مقصود صرف تلاوت ہے۔

اُن کی مثال اُس آدمی جیسی ہے جسے اُس کا آقا خط لکھے۔ بعض امور سے منع کرے اور بعض کا حکم دے اور وہ خط کا مفہوم سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کی طرف تو دھیان نہ دے، الفاظ یاد کرنے اور ان کی تکرار میں مصروف رہے اور یہ خیال کرے کہ خط لکھنے کا یہی اصل مقصود ہے۔ نہ وہ کام کرے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور نہ اُن سے باز رہے جن سے روکا گیا تھا۔

بعض ایسے ہیں جو قرآن پڑھنے میں اپنی آواز سے لذت حاصل کرتے ہیں اور اُس کے معانی سے منہ پھیرتے ہیں۔ چاہیے کہ ایسا شخص اپنے دل کو ٹٹولے اور یہ بات سمجھے کہ تلاوت کا مقصد معانی پر غور کرنا اور اعمال کی اصلاح ہے۔

ایک اور فرقہ ہے جو روزے سے دھوکا کھاتا ہے۔ اس کے افراد بہت روزے رکھتے ہیں، لیکن اپنی زبانوں کو غیبت اور فضول باتوں سے نہیں بچاتے اور نہ افطاری کے وقت حرام سے اپنے پیٹوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اور نہ اپنے خیالات کو ریا سے پاک کرتے ہیں۔

بعض آدمی حج سے دھوکا کھاتے ہیں وہ حج کے لیے جاتے ہیں، لیکن مظالم کا ازالہ نہیں کرتے نہ قرض ادا کرتے ہیں نہ ماں باپ سے اجازت لیتے ہیں نہ حلال زادِ راہ ساتھ لیتے ہیں اور بسا اوقات تو یہ صورت دیکھنے میں آتی ہے کہ واپس آکر اُن برائیوں میں اور شدت سے ملوّث ہو جاتے ہیں۔ راستے میں بھی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عبادات اور فرائض سے غافل رہتے ہیں، نیز بدن اور کپڑوں کی طہارت سے عاجز آتے ہیں۔ نیز لڑائی جھگڑے اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اعتراض کرنے والے دھوکے میں پڑے ہوتے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔

بعض ایسے ہیں جو کسی مسجد میں امامت کراتے ہیں اور اگر کوئی اُن سے زیادہ پرہیزگار اور علم والا آگے کھڑا ہو جائے تو اُن کو بہت گراں گزرتا ہے۔

بعض ایسے ہیں جو اذان کہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ یہ کام اللہ کے لیے کرتے ہیں، لیکن اگر اُن کی عدم موجودگی میں کوئی اور آدمی اذان کہہ دے تو اُن کو اس سے تکلیف ہوتی ہے اور کہتے ہیں اُس نے میرے مرتبہ میں مزاحمت کی ہے۔

بعض وہ ہیں جو مکہ یا مدینہ میں مجاور رہیں، لیکن ان کا دل اپنے شہروں میں ہے یا لوگوں کے مال کی طمع کرتے ہیں۔ کبھی اُسے جمع کرتے اور اس پر بخل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے لیے مہلک چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور ان کا کوئی عمل آفات سے خالی نہیں ہوتا۔

ایک فرقہ وہ ہے جو مال سے بے رغبت ہے۔ وہ معمولی لباس اور عام کھانے پر قناعت کرتا ہے اور مکان کے بجائے مسجدوں میں رہتا ہے۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ زاہدوں کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ حالانکہ انھیں جاہ و منزلت کی شدید رغبت ہوتی ہے۔ انھوں نے دو کاموں میں سے ہلکے کو چھوڑ دیا ہے اور بہت بڑی ہلاکت کو قبول کر لیا ہے۔

ایک اور فرقہ ہے جو نفلوں میں رغبت رکھتا ہے اور فرائض کی پروا نہیں کرتا۔ تم دیکھو گے کہ کوئی ان میں سے تہجد اور ضحٰی کی نماز پر خوش ہوتا ہے، لیکن فرائض میں اسے لذت نہیں ملتی اور نہ وہ اوّل وقت میں نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان بھول جاتا ہے جو اپنے رب سے بیان فرماتے ہیں کہ متقرّب لوگ میرا جتنا قرب فرض کی ادائیگی سے حاصل کرتے ہیں اتنا اور کسی چیز سے نہیں کر سکتے۔"

فصل یازدہم

ریاکار صوفی

ایک فرقے نے لباس، بول چال اور شکل وصورت سے دھوکا کھایا ہے۔ یہ لوگ ظاہری طور پر سچے صوفیوں سے مشابہت رکھتے ہیں، لیکن مجاہدے اور ریاضت میں اپنے نفسوں کو نہیں تھکاتے اور حرام، مشتبہ اور بادشاہوں کے اموال پر کتوں کی طرح پل پڑتے ہیں اور اگر اُن کی اغراض میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ایک دوسرے کی عزت کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔

اُن کی مثال اُس بڑھیا کی سی ہے جس نے سنا کہ بہادر جنگجو لوگوں کے نام دفتر میں درج ہو رہے ہیں اور اُن کو مختلف شہروں میں جاگیریں دی جا رہی ہیں تو اس کے دل میں بھی اس کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے زرہ پہنی۔ اپنے سر پر خود رکھا اور بہادروں کے رجز یاد کر لیے اور پھر لشکر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اُس کا نام بہادروں کے دفتر میں لکھا گیا۔ پھر جب وہ ڈاکٹری معائنہ کے لیے پیش ہوئی تو اُسے خود اور زرہ اتارنے کا حکم دیا گیا تاکہ اُس کے بدن کو دیکھا جائے اور اُس کی بہادری کا امتحان لیا جائے اور جب اُس نے یہ سب چیزیں اتاریں تو وہ ایک ضعیف عمر رسیدہ بڑھیا تھی۔

لوگوں نے کہا تو بادشاہ اور اس کے درباریوں سے مذاق کرنے آئی ہے۔ پھر حکم ہوا کہ اس کو گرفتار کر لو اور ہاتھی کے پاؤں تلے کچل دو، تو وہ کچل دی گئی۔

ان ریاکار صوفیوں کا قیامت میں یہی حال ہو گا جبکہ ان کا پردہ کھل جائے گا اور سب سے بڑے حاکم کے سامنے پیش کیے جائیں گے جو کہ دلوں کو دیکھتا ہے نہ کہ لباس اور گدڑی کو۔

ایک اور فرقہ ہے جو علم معرفت، مشاہدۂ حق اور مقامات و احوال طے کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اُن امور کو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ اُن کے نام انھوں نے یاد کر لیے ہیں۔ تم اُن میں سے کسی کو دیکھو گے کہ ان الفاظ کو یاد کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس کا علم پہلے اور پچھلے لوگوں کے علم سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ فقہاء، محدثین اور مختلف علماء کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے چہ جائیکہ عوام۔ یہاں تک کہ عوام میں سے بعض

اُن کے ساتھ رہتے ہیں اور اُن سے اُن کے کھوٹے کلمات سیکھتے اور بار بار اُن کا اعادہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہیں۔ حق کے ساتھ واصل اور مقربین میں سے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک فاجر اور منافق کا درجہ رکھتے ہیں۔

اربابِ دانش کے نزدیک بھی یہ لوگ جاہل اور بے وقوف ہیں۔ نہ وہ علم میں مضبوط ہیں، نہ اُن کے اخلاق مہذب ہیں اور نہ وہ قلب کی پاکیزگی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ سوائے خواہش کی اتباع اور لایعنی باتیں یاد کر لینے کے ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

ان میں سے ایک فرقے نے شریعت کی بساط لپیٹ دی ہے۔ احکام چھوڑ دیے ہیں اور حلال حرام سب برابر کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے بے نیاز ہے پھر ہم کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالیں؟ بعض کہتے ہیں اعضاء کے اعمال کی کوئی قدر نہیں ہے دیکھنا تو دل کو ہے۔ ہمارے دل اللہ کی محبت سے سرشار ہیں اور معرفت تک پہنچ گئے ہیں۔ بےشک ہم دنیا میں مشغول نظر آتے ہیں لیکن ہمارے دل خدا کی بارگاہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم جو خواہشات رکھتے ہیں وہ صرف بدن ہی سے ہیں، دل سے نہیں۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ عوام کے مقابلے میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور وہ بدن کے اعمال سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ گویا اپنے زعم میں اپنے آپ کو انبیاء سے بھی بلند سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ) کیونکہ انبیاء علیہم السلام تو ایک ایک لغزش پر برسوں روتے رہے۔

اہلِ اباحت کے دھوکے کی اقسام بے شمار ہیں۔ وہ سب مغالطے اور وسوسے ہیں جن میں شیطان نے ان کو دھوکا دے رکھا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ علم کی مضبوطی سے پہلے مجاہدے میں مشغول ہو گئے اور کسی دیندار شیخ کی پیروی بھی ان کو نصیب نہ ہوئی۔

ان میں سے ایک فرقہ اور ہے۔ ان پر معرفت کا دروازہ کھلا۔ اُنھوں نے معرفت کی ابتدائی خوشبو سونگھی اور یہ عجیب و غریب خوشبو اُن کو ایسی پسند آئی کہ ان کے دل اسی کے بارے میں سوچنے اور دوسروں کی اس سے محرومی پر غور کرنے میں مصروف ہو گئے۔

یہ سب کچھ دھوکا ہے کیونکہ اللہ کی راہ کے عجائبات کی کوئی انتہا نہیں۔ اگر انسان کا دل ہر عجوبے پر ٹھہر جائے اور اسی کا پابند ہو جائے تو اس کے قدم رک جائیں گے اور اس کی مثال اس آدمی جیسی ہو گی جس نے بادشاہ کی زیارت کا ارادہ کیا، لیکن شاہی باغ میں بے مثال پھول کھلے ہوئے دیکھ کر انہی کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا یہاں تک کہ وہ سارا وقت نکل گیا جس میں بادشاہ کی ملاقات کا امکان تھا۔

فصل دوازدہم

دولتمند لوگ

ان کے بھی کئی فرقے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ مساجد، مدارس، سرائے اور پل وغیرہ تعمیر کرنے کی بڑی خواہش رکھتا ہے جو لوگوں کو نظر آئیں۔ وہ اُن پر اپنے نام لکھتے ہیں تاکہ ان کا ذکر ہمیشہ رہے۔ اگر اُن کو کسی ایسی جگہ ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کو کہا جائے جہاں ان کا نام نہ لکھا جا سکے تو وہ ایک روپیہ بھی خرچ نہ کریں گے۔ اگر اُن کا ارادہ اللہ کو خوش کرنے کا ہوتا تو لوگوں کی رضامندی مقصود نہ ہوتی۔

اُن میں سے بعض آدمی مسجد کی زیبائش میں پیسہ خرچ کرتے ہیں اور انھیں نقوش سے مزین کرتے ہیں جو کہ منع ہے۔ ایسی زینت نمازیوں کو نماز سے غافل کر دیتی ہے۔ نماز کا اصل مقصد خشوع اور حضورِ قلب ہے جو باقی نہیں رہتا۔ گویا یہ لوگوں کے دلوں کو بگاڑتے ہیں۔ پھر اگر وہ مال جو اس کام میں لگا یا حرام ہو تو یہ اور بھی عذاب کا سبب بنتا ہے۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا: "ایک آدمی مسجد کی طرف آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا میرے جیسا گندہ آدمی اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتا، تو اسے اسی وقت صدیق کا مرتبہ دے دیا گیا"۔

مسجدوں کی تعظیم تو یہ ہے کہ انھیں اپنے وجود سے پاکیزہ تر خیال کرے نہ یہ کہ حرام مال سے ان کو ناپاک کرے اور دنیا کی زینت سے اللہ پر احسان رکھے۔ اس آدمی کا دھوکا یہ ہے کہ اس نے برائی کو بھلائی سمجھ رکھا ہے۔

ایک اور فرقہ ہے جو مال کو بخل کی وجہ سے خرچ نہیں کرتا۔ یہ لوگ ایسی بدنی عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں۔ جن میں پیسہ خرچ نہ ہو، ختم قرآن وغیرہ۔ یقیناً یہ دھوکے میں پڑے ہیں کیونکہ بخل ایک مُہلک مرض ہے جو اُن پر غالب ہو چکا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ مال خرچ کر کے اس مرض کا قلع قمع کریں اور ایسی باتوں کو چھوڑ کر جو اُن پر واجب نہیں ہیں فرائض ادا کرنے کی طرف متوجّہ ہوں۔

غور کریں تو اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے کپڑوں میں سانپ داخل ہو جائے لیکن وہ صفراء کی تسکین کے لیے سکنجبین تیار کرنا ضروری خیال کر رہا ہو۔

بعض وہ ہیں جو صرف زکوٰۃ تو ادا کرتے ہیں، لیکن زکوٰۃ میں ردّی مال نکالتے ہیں اور ان فقیروں کو دیتے ہیں جو ان کی خدمت کرتے ہوں یا وہ جو آئندہ اُن کے کام آسکتے ہوں یا جن سے کوئی غرض وابستہ ہو۔

ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی زکوٰۃ تقسیم کرنے کے لیے کسی بڑے آدمی کو دیتے ہیں تاکہ اس کی نگاہ میں عزت بڑھے اور وہ اُن کی حاجتیں پوری کرے۔ یہ سب باتیں نیت کو بگاڑنے والی ہیں اور جو ایسا کرتا ہے سخت دھوکے میں ہے کیونکہ وہ عبادت کا معاوضہ اللہ کے سوا کسی اور سے چاہتا ہے۔

دولتمندوں کا ایک اور فرقہ ہے جو مجالسِ ذکر کی حضوری سے دھوکا کھائے ہوئے ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسی مجالس میں حاضری ان کو عبادات کی ادائیگی سے بے نیاز کر دے گی۔ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ ذکر کی مجالس ایک زائد چیز ہیں۔ یہ نیکی کی ترغیب تو ضرور دیتی ہیں، لیکن فرائض کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ جب تک مقصود کو حاصل نہ کیا جائے اصل فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

بعض اُن میں سے وہ ہے جو کوئی ڈروانی بات سنتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے۔ اے سلامتی دینے والے مجھے سلامت رکھ۔ یا کہتا ہے میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اور سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو گیا۔

اس کی مثال اس مریض کی سی ہے جو طبیبوں کے پاس جائے اور وہ اُن کا مکالمہ سنے یا کوئی بھوکا کسی ایسے آدمی کے پاس جائے جو اس کے سامنے لذیذ کھانوں کا تذکرہ کرے۔ ظاہر ہے ایسا کرنے سے اُسے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ فائدہ تو دوا کھانے اور کھانا تناول کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

بس یہی حال عمل کے بغیر صرف عبادات کے اوصاف سننے کا ہے، بلکہ اس میں ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جس واعظ کا وعظ سُنا وہ تجھ پر حجت ہو جائے گا۔

اگر کہا جائے کہ دھوکے کے جن مداخل کا ذکر کیا گیا اُن سے تو کوئی آدمی بچ نہیں سکتا۔ تو جواب یہ ہے کہ آخرت کا دارومدار صرف ایک بات پر ہے اور وہ ہے دل کو سیدھا رکھنا اور اس سے صرف بدنیت آدمی ہی عاجز آئے گا۔ اگر انسان آخرت کے امور کا اہتمام اس طرح کرے جس طرح دنیا کے امور کا کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہو گا۔ اور سلف صالحین اور نیکی میں اُن کی اتباع کرنے والوں نے ایسا کر کے دکھا دیا ہے۔

دھوکے سے خلاصی پانے کے لیے تین چیزوں سے مدد لی جا سکتی ہے:

عقل : اور یہ وہ اصلی نور ہے جس سے انسان چیزوں کے حقائق معلوم کرتا ہے۔

معرفت : جس سے انسان اپنے نفس اور اپنے رب اور دنیا و آخرت کو پہچانتا ہے۔

اور کتاب المحبت اور شرح عجائب القلب اور التفکر اور کتاب الشکر میں نفس کے اوصاف اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے اشارات موجود ہیں۔

دنیا اور آخرت کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کتاب ذم الدنیا اور کتاب ذکر الموت سے مدد حاصل کرے۔ جب یہ معرفت حاصل ہو جائے گی، تو اللہ کی معرفت سے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو گی اور آخرت کی معرفت سے اس کی رغبت بڑھے گی اور دنیا کی معرفت سے اُس سے بے رغبتی پیدا ہو گی اور اب اس کے سب سے اہم کام وہ ہوں گے جو اللہ کی طرف پہنچائیں اور اُسے آخرت میں نفع دیں۔

جب دل پر یہ ارادہ غالب آجائے گا تو تمام امور میں اس کی نیت صحیح ہو جائے گی اور سارے دھوکے ختم ہو جائیں گے۔ اور جب یہ فائدہ حاصل ہو جائے گا تو تیسری چیز کا محتاج ہو گا اور وہ ہے علم۔ اور علم سے ہماری مراد وہ علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی طرف چلنے کی کیفیت اور اس کی آفات کا علم ہو جائے اور جس سے اللہ کا قرب اور اس کی رہنمائی حاصل ہو۔ یہ سب باتیں ہماری اس کتاب میں موجود ہیں۔

عبادات و عادات کے رُبع سے ضروری و غیر ضروری چیزیں معلوم ہوں گی اور شریعت کے آداب کا پتہ چلے گا۔

اور مہلکات کے رُبع سے ان تمام گھاٹیوں کا علم ہو گا جو اللہ کی راہ میں چلنے سے مانع ہوتی ہیں اور وہ ہیں اخلاق میں بُری صفات۔

اسی طرح منجیات کے رُبع سے ان اچھی صفات کا پتہ چلے گا جن کو بُری صفات کے مٹانے کے بعد ان کی جگہ رکھنا لازمی ہے۔ انسان ان تمام باتوں کا احاطہ کرے گا، تو دھوکے کی تمام اقسام سے بچ سکے گا جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ سب کچھ کر لے تو پھر بھی ڈرنا چاہیے کہ شیطان دھوکہ میں نہ ڈالے۔ شیطان کا قاعدہ ہے کہ وہ حملہ کرنے سے رُکتا نہیں۔ یہاں تک کہ انسان اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہو جائے۔

کہا گیا ہے کہ مخلص لوگ عظیم خطرے پر ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ پر جب موت کا وقت آیا، تو شیطان نے اُن سے کہا: "آپ مجھ سے بچ گئے!" آپ نے کہا: "ابھی نہیں موت کے بعد۔" ثابت ہوا اولیاء کے

دل سے اللہ کا ڈر کبھی نہیں نکلنا چاہیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں دھوکے سے بچائے۔ خاتمہ بالخیر کرے۔ وہ قریب ہے اور دعائیں قبول کرنے والا ہے۔

یہاں مہلکات کا ربع ختم ہوا اور اب منجیات کا ربع شروع ہو رہا ہے۔

کتاب المنجیات

حصہ اوّل

- توبہ اور اُس کے متعلقات
- گناہوں کی اقسام
- ایک اور تقسیم
- آخرت میں درجات کی تقسیم دنیا میں نیکی اور بدی کے مطابق ہوگی
- وہ اسباب جن سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتے ہیں
- توبہ کی شرائط
- توبہ کے لیے مجاہدہ
- توبہ کی مقبولیت کا راز
- صبر اور شکر
- صبر کی اقسام
- صبر کے آداب
- صبر کی دوا اور اُس کے معاون

فصل اوّل

توبہ اور اُس کے متعلّقات

معلوم ہونا چاہیے کہ گناہ محبوب سے حجاب ہیں اور جو چیز محبوب سے دور کرے اس سے پرہیز لازمی ہے اور دور رہنے کا مقصد تین باتوں سے پورا ہوتا ہے۔ علم، ندامت اور پختہ ارادہ، کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو گا کہ گناہ محبوب سے دوری کا سبب ہیں وہ گناہ پر نادم نہ ہو گا اور نہ اُسے دُوری کی راہ طے کرنے کی تکلیف ہو گی اور جب تکلیف نہ ہو گی تو واپس نہ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے کا حکم دیا ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ[1]۔ (اے مومنو! سب اللہ کی طرف توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ)

فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا[2] (اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں خالص توبہ کرو)

فرمایا: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ[3] (اللہ پسند کرتا ہے توبہ کرنے والوں اور پاک لوگوں کو)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے لوگو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو۔ میں ایک دن میں اللہ کی جناب میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔"

صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی توبہ سے اُس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو ایک بہت بڑے جنگل میں تھا۔ اُس کے پاس اس کی سواری تھی جس پر اُس کا کھانا اور پانی تھا۔ وہ آدمی سو گیا پھر جاگا تو اُس کی اونٹنی جا چکی تھی۔ وہ اُسے تلاش کرتا رہا یہاں تک کہ اُس پر پیاس نے غلبہ کیا پھر اُس نے کہا میں اسی جگہ چلا جاتا ہوں جہاں تھا۔

---

[1] سورۂ نور۔ آیت: ۳۱ [2] سورۂ تحریم۔ آیت: ۸ [3] سورۂ بقرہ۔ آیت: ۲۲۲۔

میں وہاں سو جاؤں گا یہاں تک کہ مر جاؤں، تو اس نے مرنے کی نیت سے اپنا سر اپنے بازو پر رکھا اور لیٹ گیا۔ پھر وہ جاگا تو اس کی سواری اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس پر اس کا کھانا اور پانی بھی موجود تھا، تو اللہ مومن بندے کی توبہ پر اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ وہ بندہ اپنی سواری دیکھ کر خوش ہوا"۔

اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ توبہ کے واجب ہونے پر اجماع ہو چکا ہے کیونکہ گناہ تباہ کن اور خدا سے دور کرنے والے ہیں۔ ان سے بھاگنا فوراً واجب ہے۔ چنانچہ توبہ کرنا واجب ہے۔ انسان کسی وقت بھی گناہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر اعضاء سے گناہ نہ کرے تو دل گناہ پر آمادہ رہتا ہے اور اگر یوں بھی نہ ہو تو شیطان کے وساوس سے خالی نہیں ہوتا۔

شیطان جو متفرق خیالات انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے اسے اللہ کے ذکر سے غافل کرتے ہیں۔

اگر ان سے بھی خالی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی صفات اور افعال میں غفلت اور قصور سے خالی نہیں ہوتا۔ غرض یہ سب نقص ہیں اور ان سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ ہاں نقص کے اندازے میں لوگ ضرور مختلف ہیں، لیکن اس کا اصل سب میں موجود ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے دل پر غبار سا آجاتا ہے پھر میں دن رات میں اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں"۔

اللہ تعالیٰ نے اسی لیے آپ کو اس شرف سے نوازا وَيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ[1] (تاکہ اللہ تعالیٰ تیرے پہلے پچھلے گناہ معاف فرمائے) جب حضرت رسول اللہ کا یہ معاملہ ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا؟

جب توبہ کی شرائط جمع ہو جاتی ہیں، تو وہ توبہ صحیح اور مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ[2] (وہ اللہ وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک کہ اس کی نزع کا وقت نہ آجائے۔ اور اس میں بہت سی احادیث ہیں۔

---

[1] سورۃ فتح۔ آیت: ۲ [2] سورۃ شوریٰ، آیت: ۲۵

فصل دوم

گناہوں کی اقسام

معلوم ہونا چاہیے انسان کے اخلاق و اوصاف تو بہت سے ہیں، لیکن گناہوں کی بنیاد چار صفات ہیں ہے:

پہلی صفات ربوبیت کا عکس ہے اور اُس سے تکبّر، فخر، حُبّ مدح و ثناء اور عزّت اور طلب رفعت وغیرہ پیدا ہوتی ہیں اور یہ سب ہلاک کرنے والے گناہ ہیں۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ اکثر لوگ ان سے غافل ہیں۔ وہ ان کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔

دوسری صفات شیطانیہ ہیں اور ان سے حسد، سرکشی، حیلے، مکر، فریب، کھوٹ، نفاق اور فساد وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

تیسری صفات بہیمیّہ ہیں جن سے پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت پورا کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے اور انسان زنا، لواطت اور چوری وغیرہ برائیوں کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔

چوتھی صفات سبعیّہ ہیں اور ان سے غضب اور کینہ اور لوگوں پر ہجوم کرکے قتل اور مار کٹائی اور مال چھین لینا وغیرہ برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ صفات ایک ترتیب سے پیدا ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے صفت بہیمی غالب آتی ہے۔ پھر صفت سبعی اور جب یہ دونوں اکٹھی ہوجاتی ہیں تو عقل کو صفات شیطانیہ میں استعمال کرتی ہیں، یعنی مکر، فریب اور حیلے وغیرہ میں، یہاں تک کہ یہ صفات ربوبیت پر غالب آتی ہیں۔

یہ گناہوں کی بنیادیں اور اُن کے سرچشمے ہیں، انہی سے گناہ پھوٹ کر اعضاء کی طرف آتے ہیں اور بعض گناہ دل کی طرف رُخ کرتے ہیں جیسے کفر اور بدعت اور نفاق اور دل میں برائی کو مخفی رکھنا وغیرہ اور بعض آنکھ میں، کان میں، زبان میں، پیٹ میں، شرمگاہ میں، ہاتھوں اور پاؤں میں اور بعض سارے بدن میں، اُن کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ پھر گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو آدمیوں کے حقوق سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو بندے اور رب کے درمیان ہیں۔

پھر جو حقوق العباد سے متعلق ہیں اُن میں معاملہ زیادہ سخت ہے، لیکن جو بندے اور رب کے درمیان ہیں اُن میں معافی کی بہت زیادہ اُمید ہے۔ سوائے شرک کے۔ اس سے خدا کی پناہ، یہی وہ گناہ ہے جس کی بخشش نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے پاس تین دفتر ہیں۔ ایک دفتر میں تو وہ گناہ ہیں جن کی اللہ پروا نہیں کرتا اور ایک دفتر کے گناہ وہ ہیں جن کو اللہ نہ چھوڑے گا اور ایک دفتر وہ ہے جسے اللہ کبھی معاف نہ کرے گا۔"

وہ دفتر جسے اللہ کبھی نہ بخشے گا وہ شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ[1] (جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی)

وہ دفتر جس کی اللہ پروا نہیں کرتا وہ ہے بندے کا اپنی جان پر ظلم کرنا، یعنی وہ گناہ جن میں بندے اور اللہ کا تعلق ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اُن کو معاف کر دے۔

وہ دفتر جس سے کوئی چیز نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہے بندوں کا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا۔ ان میں قصاص لازمی ہے۔

ایک اور تقسیم

معلوم ہونا چاہیے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ اور اُن میں بہت اختلاف ہے۔ کبائر کی تعداد میں بہت سی احادیث ہیں، لیکن صحاح کی پانچ احادیث متفق علیہ ہیں:

پہلی: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔" انھوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! وہ کون کون سی ہیں؟" فرمایا: "اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، اُس جان کو ناحق مار ڈالنا جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے، سُود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدانِ جنگ سے بھاگ آنا اور پاک دامن مومن بے خبر عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔"

دوسری: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟" تو فرمایا: "یہ کہ تو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔"

---

[1] سورۃ مائدہ۔ آیت: ۷۲

اُس نے کہا پھر کونسا؟ فرمایا: "یہ کہ تو اپنے بچے کو اس ڈر سے مار ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گا۔"
اُس نے کہا پھر کونسا؟ فرمایا: "یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔"

تیسری: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کبیرہ گناہ ہیں، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا"۔

چوتھی: آپؐ نے فرمایا: "کیا میں تمھیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ وہ جھوٹ بولنا یا فرمایا جھوٹی شہادت دینا"۔

پانچویں، حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کبیرے گناہوں کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا: "اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔" آپؐ تکیہ لگائے ہوئے تھے، پھر اُٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: "جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی شہادت دینا"۔ اور اس کو بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ اب خاموش ہو جائیں۔

احادیث سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ گناہ کبیرہ صرف وہ ہیں جن کا ان احادیث میں ذکر آیا ہے۔
بہر حال گناہ کبیرہ کی تعریف میں علماء کے بہت سے مختلف اقوال ہیں اور اس سے شارع کا مقصد گناہ کبیرہ کو مبہم رکھنا ہے تاکہ لوگ گناہوں سے ڈرتے رہیں؛ تاہم ان احادیث سے کبائر کی اجناس معلوم ہوتی ہیں اور سب سے بڑے گناہ کا پتہ بھی چلتا ہے۔

علماء نے کبائر کی تعداد میں بحث کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کبیرہ گناہ چار ہیں۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا سات ہیں۔
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بات پہنچی کہ وہ سات ہیں تو فرمایا وہ سات کی بجائے ستر کے قریب ہیں۔
حضرت ابو صالحؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ کبیرہ گناہ وہ ہیں جن پر دنیا میں حد واجب ہے۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "کبیرہ گناہ وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء کے شروع سے لے کر اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ (اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچو جن سے تم منع کیے گئے ہو) تک ذکر کیا ہے۔"[1]

---

[1] سورۃ نساء - آیت: ۳۱

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا کہ ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آگ کا وعدہ کیا ہے۔
ابو طالب مکی نے کہا: کبیرہ گناہ سترہ ہیں۔ میں نے ان کو احادیث سے جمع کیا ہے۔ چار دل کے گناہ
ہیں۔ شرک کرنا، گناہ پر اصرار کرنا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اور اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہونا۔
اور چار گناہ زبان کے ہیں۔ جھوٹی شہادت دینا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا، جھوٹی قسم کھانا اور جادو
کرنا۔ اور تین پیٹ کے ہیں۔ شراب پینا، یتیم کا مال ظلم سے کھانا اور سود کھانا۔ دو شرمگاہ کے ہیں۔
زنا کرنا اور عمل قوم لوط کا ارتکاب کرنا۔ اور دو ہاتھوں کے ہیں قتل کرنا اور چوری کرنا۔ اور ایک پاؤں
کا ہے۔ میدان جنگ سے بھاگنا۔ اور ایک سارے بدن کا ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔
ممکن ہے کہ اس سے کم و بیش گناہ ہوں، کیونکہ یتیم کو مارنا اور اس کو سزا دینا اس کا مال کھانے سے
بھی بڑا گناہ ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل سوم

آخرت میں درجات کی تقسیم دنیا میں نیکی اور بدی کے مطابق ہوگی

معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں لوگ درجات میں مختلف ہوں گے، جیسا کہ دنیا میں مختلف ہیں۔ وہ ان چار گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے: ہلاک ہونے والے، سزا پانے والے، نجات پانے والے اور کامیاب ہونے والے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی بادشاہ کسی ملک پر غالب آجائے، تو وہاں کے کچھ آدمیوں کو قتل کرتا ہے بعض کو سزا دیتا ہے قتل نہیں کرتا۔ بعض کو چھوڑ دیتا ہے اور یہ نجات پانے والے ہیں، اور بعض کو خلعت عطا کرتا ہے اور یہ کامیاب ہونے والے ہیں۔

جب بادشاہ عادل ہو تو ان کو اس طرح استحقاق کی بنا پر تقسیم کرتا ہے۔ وہ قتل صرف اس کو کرتا ہے جو اس کی حکومت کا انکار کرے اور اس کے اقتدار سے بنیادی طور پر عناد رکھتا ہو۔ سزا اس کو دیتا ہے جو اس کی حکومت کو تسلیم تو کرے، لیکن اس کی خدمت میں کوتاہی کرتا ہو۔ اور جو اس کی حکومت کو تسلیم کرے اور کوتاہی بھی نہ کرے اس کو چھوڑ دیتا ہے اور جو آدمی اپنی عمر بادشاہ کی مدد اور خدمت میں صرف کرتا ہو اسے خلعت عطا کرتا ہے۔

ان اقسام میں سے ہر ایک نعمت اور سزا میں اپنے حالات کے مطابق مختلف ہیں اور اس کی شہادت اس حدیث سے ملتی ہے کہ بعض لوگ پلصراط سے ایسے گزر جائیں گے جیسے بجلی کوند جاتی ہے۔ بعض سات ہزار سال تک آگ میں رہیں گے۔ ایک لحظے اور سات ہزار برس میں بہت بڑا فرق ہے۔

باقی رہا عذاب کی سختی کا اختلاف تو اس کے زیادہ سے زیادہ سخت ہونے کی کوئی انتہا نہیں۔ سب سے کم سزا یہ ہے کہ حساب میں اس سے مناقشہ (گرفت) ہو جیسے کہ بادشاہ اعمال میں بعض کوتاہی کرنے والوں کو سزا دے کہ اس سے حساب سختی کے ساتھ کرے۔ وہ کبھی معاف کر دیتا ہے کبھی کوڑے سے مارتا ہے اور کبھی اور طرح کی کوئی سزا دیتا ہے۔

نیک بختوں کی منازل بھی اسی طرح نعمتوں میں مختلف ہوں گی۔ اور یہ سب امور قرآن و حدیث اور نورِ معرفت سے معلوم ہوتے ہیں۔

اس کی تفصیل کے سلسلے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جس آدمی نے اصل ایمان کو مضبوط کیا۔ کبیرہ گناہوں سے بچا۔ تمام فرائض اچھی طرح ادا کیے۔ اگر کبھی صغیرہ گناہ متفرق طور پر سرزد ہوئے اور ان پر بھی اصرار نہیں کیا، تو اس کے متعلق امید ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے گا۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ کبائر سے پرہیز کرنا صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ایسا آدمی یا تو مقربین میں شامل ہوگا یا اصحاب الیمین میں، اور یہ اُس کے ایمان اور یقین کے مطابق ہوگا۔ اگر وہ کم ہوا اور کمزور رہا تو اس کا مقام نیچے ہوگا اور اگر زیادہ ہوا اور طاقتور رہا تو اُس کا مقام بلند ہوگا۔

مقربین بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت کے مطابق مختلف ہوں گے کیونکہ معرفت میں عارفین کے درجات لاتعداد ہیں، معرفت کے سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ غوطہ خور اس میں اپنی طاقت کے مطابق غوطے لگاتے ہیں۔ اصحاب الیمین کا اعلیٰ درجہ مقربین کے ادنیٰ درجے کے برابر ہے۔ یہ اس آدمی کا حال ہے جو کبائر سے بچے اور فرائض ادا کرے۔

جس نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا اور ارکانِ اسلام کو ترک کیا، لیکن موت سے پہلے پہلے خالص توبہ کر لی تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ملحق ہو جائے گا جنھوں نے سرے سے گناہ کا ارتکاب ہی نہیں کیا، کیونکہ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ دھویا ہوا کپڑا ایسا ہو جاتا ہے گویا کہ وہ میلا ہوا ہی نہ تھا۔

جو آدمی توبہ سے پہلے مر جائے، اس کا معاملہ خطرناک ہے۔ اگر گناہ کے اصرار پر موت ہو جائے تو یہ اس کے ایمان کے متزلزل ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کا ایمان تقلیدی ہو، کہ وہ ادنیٰ شک اور خیال سے تحلیل ہو جاتا ہے، جبکہ یقین کرنے والے عارف کا ایمان ضائع ہو جانے کا خوف نہیں ہوتا۔ اگر توبہ کے بغیر آدمی مر جائے تو اس کا عذاب کبیرہ گناہ کی قباحت اور اصرار کی مدت کے مطابق ہوگا۔ یعنی مقررہ مدت دوزخ میں رہنے کے بعد رہائی پائے گا اور پھر ان میں سے جن لوگوں نے کسی کی تقلید یا اپنی نادانی کی وجہ سے گناہ کیا ہوگا جنت میں داخل کیے جائیں گے اور جو نیکی اور بصیرت میں ان سے بڑھے ہوئے ہوں گے وہ علیین میں

قیام پذیر ہوں گے۔

ہم نے بندوں کے جو مراتب آخرت میں بیان کیے ہیں یہ ظاہر اسباب کی بنا پر ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے حکیم کسی مریض کے متعلق کہہ دے کہ یہ ضرور مر جائے گا اور یہ علاج کی اصلاح کو قبول نہیں کرے گا۔ اور ایک مریض پر حکم لگائے کہ اس کی بیماری ہلکی ہے اور اس کا علاج آسان ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک ظن ہوتا ہے جو کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی صحیح نہیں ہوتا۔ ہلکی بیماری والا مر جاتا ہے اور بڑی بیماری والا بچ جاتا ہے اور کسی کو بھی سبب کا علم نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مخفی اسرار ہیں۔

آدمیوں کی ارواح میں کبھی وہ اسباب اثر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے رکھے ہیں اور کبھی وہ جن کی حقیقت کو جاننا انسان کے بس کا روگ نہیں۔ بس یہی حال آخرت کی ہلاکت اور کامیابی کا ہے کہ ان کے بھی کچھ مخفی اسباب ہیں کہ آدمی کی طاقت نہیں کہ اُن پر مطلع ہو سکے، چنانچہ اسی بنا پر ضروری ہے کہ گنہگار کو معاف کر دیا جائے خواہ اس کے گناہ کتنے ہی زیادہ ہوں۔ اور فرمانبردار پر عتاب ہو اگرچہ اس کی ظاہری عبادت کتنی ہی زیادہ ہو کیونکہ دارومدار تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ دل میں ہے اور دل کے حالات کبھی دل والے سے بھی مخفی رہتے ہیں چہ جائیکہ کوئی اور اسے جان سکے۔

نجات پانے والے (ان سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو عذاب سے بچ جائیں نہ وہ جو سعادت اور کامیابی کے مراتب پر فائز ہوں) وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ تو خدمت کی ہے کہ ان کو خلعت عطا کیا جائے اور نہ انھوں نے کوتاہی کی ہے کہ اُن کو سزا دی جائے۔ ممکن ہے یہ حال دیوانوں، کفار کی اولاد کا اور اُن کا ہو جنھیں دعوت اسلام نہ پہنچی ہو کہ نہ تو اُن کو معرفت نصیب ہوئی اور نہ انھوں نے انکار کیا۔ امید ہے کہ یہ لوگ اعراف میں ہوں گے۔

سچے کامیاب ہونے والے دراصل یہی لوگ: عارف، مقرب اور سابق ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک تیار کی گئی ہے وہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ لوگ جنت کے حریص نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اُس کے دیدار کے شائق ہیں۔

اور اُن کی مثال عاشق کی ہے کہ وہ اس حال میں اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ نہ وہ اپنے وجود کی تکلیف کو محسوس کرتا ہے اور نہ اسے اپنے محبوب کے سوا کوئی غم و فکر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ لوگ آنکھوں کی ایسی ٹھنڈک پانے والے ہیں جس کا تصوّر بھی کسی آدمی کے دل میں نہ گزرا ہو گا۔ نیکیوں کے مطابق درجات کی تقسیم کے متعلق اتنا بیان ہی کافی ہے۔

فصل چہارم

وہ اسباب جن سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتے ہیں

معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ اسباب ہیں جن سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب گناہ پر اصرار اور مداومت بھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا اور نہ استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ رہتا ہے"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کبیرہ گناہ جو ایک دفعہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ گناہ نہ ہو اُس کی معافی کی اُمید اُس صغیرہ گناہ سے بہت زیادہ ہے جس پر بندہ اصرار کرے۔ اس کی مثال پانی کے اُن قطروں کی ہے جو متواتر پتھر پر گرتے رہیں۔ وہ اس میں نشان پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر اتنا ہی پانی ایک بار اس پر گرا دیا جائے تو اس کا کچھ بھی اثر ظاہر نہ ہوگا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پیارا عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی ہو، اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو"۔

ان اسباب میں سے جن سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے یہ بھی ہے کہ انسان گناہ کو معمولی سمجھے۔ جب بندے کے نزدیک کوئی گناہ بڑا ہوتا ہے، تو اللہ کے نزدیک وہ چھوٹا ہوتا ہے اور جب بندہ اس کو چھوٹا سمجھے، تو اللہ کے نزدیک وہ بڑا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا بڑا یا چھوٹا ہونا دل کی نفرت اور کراہت کے سبب سے ہوتا ہے

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا مومن اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ور اسے خطرہ ہو کہ اس پر گر نہ پڑے۔ اور فاجر آدمی اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے مکھی ناک پر بیٹھی اور ہاتھ سے اُسے اُڑا دیا (بخاری۔ مسلم)

مومن کے دل میں گناہ اس لیے بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کے جلال کو جانتا ہے۔ پھر جب وہ اس ذات کی عظمت کا تصور کرتا ہے جس کی نافرمانی ہو رہی ہے تو چھوٹے گناہ کو بھی بڑا سمجھتا ہے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ "تم کچھ ایسے عمل کرتے ہو جو تمھاری نگاہ میں بال سے

بھی کہتے ہیں اور ہم اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تباہ کُن گناہوں میں سے سمجھتے تھے۔

حضرت بلال بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: "گناہ کا چھوٹا ہونا نہ دیکھو، بلکہ جس کی نافرمانی کرتے ہو اس کی عظمت کو دیکھو۔"

اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ صغیرہ گناہ پر خوش ہو اور اس سے اپنی مدح کا خواہاں ہو جیسے کہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ میں نے فلاں آدمی کو کس طرح بے عزت کیا! میں نے اس کی برائیاں بیان کیں، تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ یا کوئی تاجر کہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ میں نے اُس کو کھوٹا مال کس طرح دے دیا اور اسے کیسا دھوکا دیا اور نقصان پہنچایا۔ یہ اور اس جیسی باتوں سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

ایک سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردہ پوشی، بردباری اور مہلت دینے کو ہلکی بات سمجھے اور یہ نہ جانے کہ یہ ناراضگی کا باعث ہے تاکہ مہلت ملنے سے زیادہ گنہگار ہو جائے۔

ایک سبب یہ ہے کہ گناہ تنہائی میں کرے اور پھر اسے مجلس میں دوسروں کے سامنے بیان کرتا پھرے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری سب اُمت کو معاف کر دیا جائے گا سوائے گناہوں کا اعلان کرنے والوں کے۔"

اعلان کرنا یہ ہے کہ آدمی رات کو کوئی کام کرے اور اللہ اس کی پردہ پوشی کر دے اور وہ صبح کو کہتا پھرے میں نے گزشتہ شب فلاں فلاں گناہ کیا ہے۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے اس کی پردہ پوشی کی اور وہ اپنا پردہ خود فاش کر رہا ہے۔

ایک سبب یہ ہے کہ گناہ کرنے والا عالم آدمی ہو جس کی لوگ اقتدا کرتے ہوں۔ جب اس کا گناہ معلوم ہو گا تو وہ کبیرہ ہو جائے گا، جیسے ریشمی لباس پہننا، ظالم بادشاہوں کے پاس جانا۔ ان کو برائی سے نہ روکنا۔ لوگوں کی بے عزتی کرنے میں زبان کھولنا اور ایسے علوم میں مشغول رہنا جس سے جاہ و منزلت حاصل ہو جیسے جھگڑے (مناظرے) کا علم تو یہ وہ گناہ ہیں جن میں عالم کی پیروی ہو گی یہاں تک کہ وہ مر بھی جائے گا تو اس کی برائی دنیا میں پھیلتی رہے گی۔ مبارک ہے وہ بندہ کہ جب آپ مرے تو اس کے ساتھ اس کے گناہ بھی مر جائیں۔

حدیث میں ہے "کہ جس نے کوئی برا طریقہ رائج کیا اُس پر اُس کا اپنا بوجھ بھی ہو گا اور اُن کا بھی جو اُس کے بعد اس پر عمل کریں گے اور عمل کرنے والوں کا بوجھ بھی ہلکا نہ ہو گا۔"

عالم کے ذمے دو کام ہیں: ایک یہ کہ گناہ چھوڑ دے اور دوسرا یہ کہ اگر اس سے گناہ ہو جائے تو

اس کو چھپائے اور جس طرح پیروی کی وجہ سے علماء کے گناہوں کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے، اُسی طرح پیروی کی وجہ سے اُن کی نیکیوں کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے - عالم کو چاہیے کہ اپنے لباس اور خوراک میں اعتدال رکھے، بلکہ کمی کی طرف مائل رہے کیونکہ لوگ اس کی طرف دیکھتے ہیں، لہٰذا جن چیزوں میں اس کی پیروی کی جائے گی ان میں احتیاط لازمی ہے۔ مثلاً جب وہ بادشاہوں کے پاس جائے گا اور اُن سے دنیا کا سامان لے گا، تو لوگ بھی اس کی پیروی کریں گے اور اُن کا گناہ اُس پر ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو بادشاہ کے پاس جا کر سلامت رہے، لیکن دوسرے لوگ سلامت نہ رہ سکیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ لوگوں کو خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ایک عالم آدمی کو لایا گیا، تو بادشاہ کے دربان نے اس سے کہا۔ میں نے تمھارے لیے بکری کا بچّہ ذبح کیا ہے، تم بے دھڑک کھا لینا۔ جب اُس کے سامنے گوشت رکھا گیا تو اس نے نہ کھایا۔ بادشاہ نے اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔ دربان نے اُس سے کہا؛ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ وہ بکری کا بچہ ہے؟ تو اُنھوں نے جواب دیا جو آدمی میری پیروی کریں گے ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ میں نے بکری کا گوشت کھایا تھا یا خنزیر کا؟

فصل پنجم

توبہ کی شرائط

معلوم ہونا چاہیے کہ توبہ نام ہے اس ندامت کا جو عزم اور قصد پیدا کرے۔ اور یہ ندامت اس علم سے پیدا ہوتی ہے کہ گناہ انسان اور اس کے محبوب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اور ندامت دل کی اس تکلیف کا نام ہے جو محبوب کے فراق سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی علامت ہے طویل غم اور رونا۔ مثلاً:

جس آدمی کو اپنے بیٹے یا کسی عزیز کی مصیبت کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ بہت دیر تک روتا ہے۔ غور کرنا چاہیے اپنی جان سے زیادہ کون عزیز ہے؟ اور آگ سے زیادہ سخت سزا اور کون سی ہے؟ اور گناہ سے زیادہ مصیبت آنے کا سبب اور کیا ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سچا خبر دینے والا اور کون ہے؟

اگر کسی آدمی کو طبیب خبر دے کہ اس کا بیٹا بیماری سے شفا یاب نہ ہوگا تو وہ فوراً غم میں مبتلا ہو جائے گا، اگرچہ اس کا بیٹا اس کی اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں ہے اور نہ طبیب اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اور نہ موت آگ سے زیادہ سخت ہے۔ اور نہ بیماری اتنی موت پر دلالت کرتی ہے جتنی کہ گناہ خدا کی ناراضگی اور آگ کے داخل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

توبہ کرنے والے کو چاہیے کہ اپنی فوت شدہ نمازوں یا شرائط کی پابندی کے بغیر ادا شدہ نمازوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرے۔ مثلاً پلید کپڑے سے نماز پڑھی ہو یا اپنی جہالت کی وجہ سے نیت صحیح نہ کی ہو، تو ان سب کی قضا ادا کرے۔ اور اسی طرح اگر اس کے ذمے روزے یا زکوٰۃ یا حج یا کوئی اور فرض ہو تو ان سب کی قضا ادا کرے اور اس کی تحقیق کرے اور اس کا تدارک کرے۔ غرض جملہ گناہوں کے متعلق جو اس سے سرزد ہوئے ہیں تحقیق کرے اور ان میں جن گناہوں کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان ہے اُن سے استغفار اور ندامت ہی اس کی توبہ ہے۔

پھر گناہوں کی مقدار کو دیکھے اور ان کے مناسب ہر گناہ کے بدلے نیکی کرے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ان الحسنات یذھبن السیئات (نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں)[1]

---

[1] سورۃ ہود - آیت: ۱۱۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "برائی کے بعد نیکی کرو، وہ اس برائی کو مٹا دے گی۔"

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر گانا بجانا سنا ہے، تو قرآن اور مجالسِ ذکر کا سماع کرے اگر بغیر طہارت کے قرآن کو ہاتھ لگایا ہے تو اب اس کی عزت کرے اور کثرت سے اس کی تلاوت کرے اور اگر ممکن ہو تو قرآن کریم کو لکھ کر اسے وقف کر دے۔ شراب پینے کا کفارہ یہ ہے کہ پینے والی حلال چیز کا صدقہ کرے۔ غرض اسی طرح ہر گناہ کی ضد سے اس کا کفارہ ادا کرے۔

یہ حکم ان گناہوں کا ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہیں۔ باقی رہے حقوق العباد تو ان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی ہے کیونکہ اس نے بندوں پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے۔ بندوں پر ظلم کرنے والا اللہ کی نافرمانی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔ اس کا تدارک ندامت اور آئندہ ایسا نہ کرنے کے عزم سے ہے۔ اس کے علاوہ ایسی نیکیاں بھی کرے جو ان مظالم کا مداوا کرنے والی ہوں۔ اگر لوگوں کو تکلیف دی ہے تو اب اُن سے اچھا سلوک کرے۔ مال چھیننے کا کفارہ یہ ہے کہ حلال مال سے صدقہ کرے۔ اگر ان کی بے عزتی کی ہے تو دینداروں کی مدح کرے۔ اگر کسی کو قتل کیا ہے تو غلام آزاد کرے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کے متعلق ہے۔ جب کوئی شخص اتنا کرلے گا تو اب بندوں کے حقوق ادا کرنا بھی اس پر لازم ہیں۔ اور بندوں کے حقوق، جان، مال اور عزت کو نقصان پہنچانے سے متعلق ہوں گے۔

پہلی بات یہ کہ جب کسی آدمی کو خطاء سے قتل کرے تو مستحق کو دیت پہنچائے خواہ خود ادا کرے یا اس کی برادری ادا کرے اور اگر عمداً قتل کیا ہے اور شرائط کے مطابق اس پر قصاص واجب ہو چکا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دے۔ وہ چاہیں تو اُسے قتل اور اگر چاہیں تو معاف کر دیں۔ اس جرم کا چھپانا جائز نہیں برخلاف زنا، چوری، شراب پینے یا ایسا کام کرنے کے جس میں حد واجب ہے، کیونکہ ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے توبہ کی یہ شرط نہیں کہ وہ اپنے گناہ ظاہر کریں۔ انھیں چاہیے کہ اپنی پردہ پوشی کریں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اپنے آپ کو کسی حاکم مجاز کے سامنے پیش کرے جو اس پر حد قائم کرے۔ اس کی یہ توبہ صحیح بھی ہوگی اور اللہ کے نزدیک قبول بھی۔ اس کی دلیل ماعز اسلمی اور غامدیہ کے واقعات ہیں۔

یہی حال تہمت کی حد کا ہے کہ اس میں بھی مستحق کو اختیار دینا لازمی ہے۔ چاہے تو سزا دے چاہے تو معاف کر دے۔

ان کے علاوہ دوسرے وہ حقوق ہیں جو مال سے متعلق ہیں مثلاً مال چھیننا اور خیانت کرنا اور معاملات

میں دھوکہ کرنا وغیرہ تو ضروری ہے کہ ان کے مالکوں کو وہ اشیا لوٹا دے جو چرائی یا غصب کی ہوں۔ اسی طرح جن کے حقوق ہیں۔ اُن کو ادا کرے اور اُن سے اپنے آپ کو پاک کرے۔ اور اگر اس کے مظالم اتنے زیادہ ہوں کہ وہ ادا نہ کر سکتا ہو تو جتنا ادا کر سکتا ہو اتنا کرے۔ اور اب اس کے لیے صرف یہی طریقہ ہے کہ نیکیاں زیادہ کرے تاکہ قیامت کے دن اس سے قصاص میں لی جا سکیں اور ان کے حوالے کی جا سکیں جن پر اس نے ظلم کیا تھا۔ اگر اس کی نیکیاں پوری نہ ہوں گی تو اُن کے گناہ اس پر رکھ دیے جائیں گے۔

یہ ان مظالم کا حکم ہے کہ مظلوم بھی موجود ہو اور مال بھی، اور اگر اُس کے پاس ناجائز مال ہو، لیکن اس کے مالک یا اس کے وارثوں کو نہ جانتا ہو تو اس کی طرف سے اسے صدقہ کر دے اور اگر حلال اور حرام مال مل چکا ہو تو اجتہاد سے حرام کا اندازہ کرے۔ اُتنا مال صدقہ کر دے۔

تیسری قسم بے عزتی کرنے اور تکلیف دینے کی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ ان کو تلاش کرے اور اُن سے اپنے گناہ معاف کرائے اور انھیں گناہ کی تفصیل بھی بتائے کیونکہ مبہم معافی مانگنا کافی نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صحیح اندازہ بتا دیا جائے تو مظلوم کا دل نہیں چاہتا کہ اس کو معاف کرے۔ ہاں اگر اس گناہ کا تذکرہ کرنے سے اسے زیادہ تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو پھر بیان نہ کرے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اُس کے ساتھ زیادہ احسان کرے۔ اور پھر مبہم طور پر اس سے معافی مانگے۔ بصورتِ دیگر قیامت کے دن اس کی نیکیاں اس کا معاوضہ ہو جائیں گی۔

جو آدمی اُن میں سے مر چکے ہوں اُن کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ اس کا تدارک زیادہ نیکیاں کرنے سے ہو گا، تاکہ قیامت کے دن اس کے معاوضے میں لی جا سکیں۔ صرف نیکیاں زیادہ ہونے ہی سے اس کی نجات ہو سکے گی۔

فصل ششم

توبہ کے لیے مجاہدہ

صحیح توبہ کی شرط یہ ہے کہ مصمم ارادہ کرے کہ آئندہ ایسا گناہ نہیں کرے گا اور اس پر بڑا پختہ ارادہ کرے۔ اس کی مثال اس مریض جیسی ہے جسے علم ہو کہ اس کی بیماری میں پھل اس کے لیے مضر ہیں تو وہ پختہ ارادہ کرے کہ جب تک اس بیماری میں مبتلا ہے کوئی پھل نہیں کھائے گا، یہ عزم فوراً موکد ہو گا، اگرچہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کسی دوسری حالت میں پھل کھانے کی خواہش اس پر غالب آجائے، لیکن اس وقت تک توبہ درست نہیں جب تک کہ موجودہ وقت میں گناہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ نہ ہو، توبہ کرنے والے کو چاہیے ابتدائی حالت میں عزلت، خاموشی، تھوڑا کھانے اور تھوڑا سونے کی عادت ڈالے۔ حلال کی خوراک کا اہتمام کرے اور پسندیدہ لباس ترک کر دے۔

بعض نے کہا ہے جو شخص خواہش چھوڑنے میں سچا ہو اور سات مرتبہ اپنے نفس سے جہاد کر لے، تو وہ آئندہ گناہ میں مبتلا نہ ہو گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کسی گناہ سے توبہ کرے اور اس پر سات سال تک استقامت رکھے تو وہ دوبارہ اس گناہ کو نہ کرے گا۔

توبہ میں لوگ چار قسم کے ہیں: پہلی قسم کے وہ تائب ہیں جو آخری عمر تک اپنی توبہ پر قائم رہیں اور جن کاموں میں کوتاہی کی ہے اس کا تدارک کریں اور ان کے دل میں اس گناہ کی طرف لوٹنے کا خیال تک نہ آئے سوائے ایسی معمولی لغزشوں کے جن سے انسان عادتاً کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ توبہ میں استقامت ہے اور ایسی توبہ کرنے والا نیکیوں میں آگے بڑھنے والا ہے۔ اسی توبہ کا نام توبۃ النصوح ہے اور یہ نفس مطمئنہ ہے۔

یہ لوگ درجات اور اوصاف کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کی خواہش معرفتِ الٰہی کے غلبے کے نیچے دب چکی ہے اور اُن کی جنگ (مجاہدہ) ختم ہو گئی ہے۔ بعض وہ ہیں جن سے نفس جھگڑتا ہے اور یہ اُسے زیر کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں

دوسری قسم اُن توبہ کرنے والوں کی ہے جو بنیادی اطاعتوں کی ادائیگی اور کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے

رہیں۔ یہ بھی استقامت ہے؛ لیکن وہ پوری طرح گناہوں سے صاف نہیں۔ اُن سے گناہ کا صدور ہوتا ہے لیکن بغیر ارادہ کے، وہ ارادہ کے بغیر بعض حالات سے گزرتے ہوئے گناہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ان میں سے جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے، تو اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ آئندہ اس کے اسباب سے پرہیز کرے گا۔ یہ نفس لوّامہ ہے کیونکہ وہ ایسی بُری حالت پر خود کو ملامت کرتا ہے۔ یہ رتبہ بھی بڑا بلند ہے اگرچہ پہلے سے کمتر، عام توبہ کرنے والوں کی عموماً یہی حالت ہوتی ہے، وجہ یہ کہ برائی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ وہ اس سے کم ہی بچ سکتا ہے، خواہ کوئی شخص کتنی بھی کوشش کرے کہ اس کی نیکیاں برائیوں پر غالب آجائیں اور برائیوں کے پلڑے میں کچھ بھی نہ رہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ برائیوں کا پلڑا بالکل خالی ہوجائے۔ بہرحال ان لوگوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھا وعدہ ہے کہ فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ[1] (وہ جو بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں۔ ماسوائے صغیرہ گناہوں کے تو تیرا رب بڑی وسیع بخشش والا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مرتبے کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ "اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے گنہگار مومن کو پسند کرتا ہے۔"

تیسری قسم یہ ہے کہ توبہ کرے اور ایک مدّت تک توبہ پر استقامت رکھے اور پھر بعض گناہوں میں اس طرح ملوّث ہوجائے کہ نیکیوں پر ہمیشگی کرنے اور طاقت ہوتے ہوئے گناہوں سے پرہیز کرنے کا ارادہ باقی ہو۔ اس کا دل چاہے کہ اگر اللہ اسے طاقت دے تو برائی کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ نیز یہ کہ اس کی برائی کا کفارہ ہو۔ جب گناہ کر چکے تو نادم ہو اور اپنے نفس کو اس گناہ سے توبہ کرنے پر تیار کرے، تو اس نفس کا نام مسئولہ ہے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا (اور کچھ ایسے ہیں جن کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ انھوں نے کچھ نیک عمل کیے ہیں اور کچھ بُرے)

ان کا معاملہ اطاعت پہ ہمیشگی کرنے اور برائیوں سے کراہت کرنے کی وجہ سے پُرامید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ[2] (قریب ہے کہ اللہ اُن کی توبہ قبول فرمائے۔

ان کا انجام تاخیر کی وجہ سے خطرے سے باہر بھی نہیں۔ بسا اوقات توبہ سے پہلے ہی موت واقع ہو

---

[1] سورۃ نجم۔ آیت: ۳۲ [2] سورۃ توبہ۔ آیت: ۱۰۲

جاتی ہے اور اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے۔ ہر سانس پر موت واقع ہو سکتی ہے۔ انسان کو چاہیے اپنے ہر سانس کی حفاظت کرے اور منہیات کے ارتکاب سے پرہیز کرتا رہے۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ توبہ کرے اور ایک مدّت تک استقامت رکھے لیکن پھر گناہ کی طرف لوٹ جائے اور اُسے توبہ کا خیال آئے نہ گناہوں پر افسوس ہو تو یہ اصرار کرنے والوں میں سے ہے اور یہی نفس امّارہ ہے جو برائی کا حکم دینے والا ہے۔

ایسے شخص کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا؛ تاہم اگر اُس کی موت توحید پر ہوئی تو اس کے لیے دوزخ سے نجات کی امید ہے اگرچہ کچھ مدّت کے بعد ہی کیوں نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مخفی سبب کی وجہ سے اسے عام معافی مل جائے، لیکن اس پر بھروسہ کرلینا درست نہیں ہے۔ جو آدمی کہے کہ اللہ تعالیٰ سخی ہے اور اس کے خزانے بڑے وسیع ہیں اور میرے گناہ سے اس کا کچھ نقصان بھی نہیں ہے اور پھر تم اس کو دیکھو کہ روپیہ کی طلب میں سمندروں کا سفر کرتا ہے، تو پھر اگر اسے کہا جائے کہ اگر خدا سخی ہے، تو اپنے گھر میں بیٹھ جا شاید اللہ تجھے نہیں رزق دے دے تو اس کہنے والے کو وہ جاہل سمجھے گا اور کہے گا رزق تو کسب سے ملتا ہے تو اس سے کہا جائے گا اسی طرح نجات بھی تقوے سے ملتی ہے۔

فصل ہفتم

توبہ کی قبولیت کا راز

ہم بیان کر چکے ہیں کہ توبہ کرنے والے کو چاہیے جو برائیاں کی ہیں ان کے بدلے نیکیاں کرے کہ وہ برائیوں کا کفارہ بنیں اور ان کو مٹا دیں۔ کفارہ بننے والی نیکیاں دل اور زبان اور اعضا سے ہوتی ہیں جیسے برائیاں۔

دل کی نیکیاں اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا اور اس کے حضور ذلیل ہونا ہے۔ زبان کی نیکیاں گناہ کا اقرار کرنا اور پھر استغفار کرنا ہے، مثلاً کہے: "اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے تو مجھے معاف کر دے"۔

حدیث میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی کوئی گناہ کرے پھر اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ سے بخشش مانگے تو اللہ اس کو معاف کر دیتا ہے"۔

بدنی نیکیوں کی صورت، عبادات اور طاعات بجا لانا اور صدقات دینا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے جب تک بیماری کا پتہ نہ چلے دوا تجویز نہیں ہو سکتی کیونکہ دوا تو بیماری کے اسباب سے ٹکراؤ کے لیے ہوتی ہے اور بیماری کی ضد ہی سے اس کا علاج کیا جاتا ہے۔

گناہوں پر اصرار کا سبب غفلت اور شہوت ہے اور غفلت کی ضد علم ہے اور شہوت کی ضد صبر؛ چنانچہ لازم ہے کہ شہوت کی تحریک کرنے والے اسباب کو ختم کر دیا جائے۔

گناہوں کی غفلت دور کرنے کے لیے ایک ہی معجون ہے جو علم کی حلاوت اور صبر کی کڑواہٹ سے تیار کی جائے، جیسا کہ سکنجبین میں چینی کی شیرینی اور سرکے کی کھٹائی جمع کی جاتی ہے اور ان دونوں کے مجموعہ سے صفرا کا قلع قمع ہوتا ہے۔

غفلت کی بیماری کے طبیب عالم لوگ ہیں کیونکہ یہ دلوں کی بیماری ہے اور دلوں کی بیماری بدن کی بیماری سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ ایک بڑی برائی تو یہ ہے کہ مریض کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ مریض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کا انجام اس دنیا میں مشاہدے میں نہیں آتا برخلاف بدن کی بیماری کے کہ اس

کا انجام موت ہے جو دیکھی جاتی ہے اور طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ گناہ میں ایک طرح کی لذت اور کشش ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے مرتکب کو انجام معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے باز نہیں آتا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ دل کی بیماری میں تو اللہ کی بخشش پر بھروسہ کرتا ہے، لیکن بدن کے علاج میں خود کوشش کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ توکّل نہیں کرتا۔

تیسری چیز جو سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ ہے طبیب کا نہ ملنا۔ کیونکہ طبیب تو علماء ہیں اور وہ خود اس زمانے میں بیمار ہیں۔ دل کی مہلک ترین بیماری دنیا کی محبت ہے اور یہ بیماری طبیبوں پر بھی غالب آچکی ہے۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کوئی مؤثر علاج نہیں بتا سکتے۔ وہ خود سمجھتے ہیں کہ اگر لوگوں کو دنیا کی حرص سے بچنے کی تاکید کریں، تو وہ کہیں گے تم لوگوں کو حرص سے بچنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، بس اسی وجہ سے یہ بیماری عام ہو چکی ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ لوگوں کے ساتھ واعظ کو کیا روش اختیار کرنی چاہیے؟ تو جواب یہ ہے کہ جو آیات قرآن مجید میں گنہگاروں کو ڈرانے کے لیے آئی ہیں یا جو احادیث و آثار مروی ہیں ان کو بیان کرے اور اس میں توبہ کرنے والوں کی مدح بھی شامل کرے۔ دوسرے انبیاء و سلف صالحین کو معمولی لغزشوں کے سبب جو مصیبتیں پہنچیں ان کو بیان کرے، مثلاً آدم علیہ السلام کا حال کہ لغزش کے بعد جنت سے نکالے گئے یا جو ماجرا یونس و ایوب اور یوسف و داؤد و سلیمان علیہم السلام کے ساتھ گزرا وہ بتائے کیونکہ قرآن مجید نے ان کو صرف عبرت حاصل کرنے کے لیے ہی تو بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں خوش قسمتی یہ ہے کہ جلدی مواخذہ ہو جائے، ایسی صورت میں انسان توبہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، لیکن بدبختوں کو مہلت مل جاتی ہے کہ وہ گناہ زیادہ کرلیں اور اس لیے بھی کہ آخرت کا عذاب بہت سخت ہے تو چاہیے کہ ایسی باتیں اصرار کرنے والوں کو زیادہ سنائی جائیں کہ وہ توبہ کی تحریک کے لیے بہت مفید ہیں۔

تیسرا یہ کہ: ان کو یہ بھی یقین دلائے کہ دنیا میں بھی جلدی سے سزا متوقع ہے کیونکہ بندے کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کے سبب سے پہنچتی ہے۔

بسا اوقات آدمی آخرت کے معاملے میں تو سستی کرتا ہے، لیکن اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا کی سزا سے ڈرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کبھی گناہوں کی شامت دنیا میں بھی پہنچتی ہے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ "بندہ اپنے گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے"۔

فضیل بن عیاضؒ نے کہا میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے گدھے اور اپنے خادم کے اخلاق میں دیکھ لیتا ہوں۔

ابوسلیمانؒ دارانی نے کہا، احتلام بھی سزا ہے۔ اور کسی بندے سے نماز گناہ کے بغیر فوت نہیں ہوتی۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر توبہ کرے اور اس کو چھوڑ دے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرے تو سیاہی زیادہ ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے سارے دل پر پھیل جاتی ہے"۔

یہی وہ زنگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ[1] (ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر اُن کے گناہوں کے سبب سے زنگ ہے)

حسن رحمہ اللہ نے کہا "نیکی دل کا نور ہے اور بدن کی قوت اور برائی دل کا اندھیرا ہے اور بدن کی کمزوری"۔

چوتھی بات یہ کہ گناہوں کی جو سزائیں احادیث میں آئی ہیں اُن کو بیان کرے۔ مثلاً شراب نوشی، زنا، قتل تکبر، حسد اور غیبت وغیرہ کے سلسلے میں جو احادیث ہیں وہ بکثرت لوگوں کو سنائے۔

ضروری ہے کہ طبیب بیماری کو بھی جانتا ہو اور اس کا علاج کرنا بھی۔ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا مجھے کچھ وصیت فرمائیے۔ تو آپؐ نے فرمایا: "غصہ نہ کیا کر"۔

ایک اور نے کہا: مجھے وصیت فرمائیے تو آپؐ نے فرمایا: "جو لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوس ہو جاؤ"۔ آپؐ نے پہلے میں غضب کے آثار دیکھے اور دوسرے میں طمع اور لالچ کے۔ اور دونوں کو ان کے روحانی امراض کے مطابق نصیحت فرمائی۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا غفلت کا علاج ہے۔ رہا شہوت کا علاج تو جو کچھ ہم نے "نفس کی ریاضت" میں بیان کیا ہے اس سے علاج کیا جائے گا؛ تاہم پرہیز بہت ضروری ہے۔ بعض دفعہ مریض کی بیماری صرف اس لیے طبی ہو جاتی ہے کہ وہ مضر چیزوں سے پرہیز نہیں کرتا۔ خواہش کی شدت اسے بدپرہیزی پر آمادہ کرتی ہے یا پھر اپنی تکلیف سے غافل ہوتا ہے۔ ہر حالت میں صبر کی کڑواہٹ لازمی چیز ہے۔ مثلاً کسی نوجوان پر شہوت غالب

---

[1] سورۃ مطففین۔ آیت ۱۴۔

آجائے اور وہ اپنی نگاہ، دل اور اعضاء کو شہوت کے پیچھے دوڑنے سے روک نہ سکے تو چاہیے کہ خوف کی آیات جو قرآن میں آئی ہیں اور احادیث جو رسول اللہ نے بیان فرمائی ہیں ان کو سامنے رکھے۔ جب اس پر خوف غالب ہو جائے گا تو وہ شہوت کی تحریک کرنے والے اسباب خود بخود دور ہو جائیں گے۔

جو چیز خارجی طور پر شہوت کو بھڑکاتی ہے وہ مرغوب چیز کا حاضر ہونا اور اس کو دیکھنا ہے اور اس کا علاج ہے بھوک اور ہمیشہ روزے رکھنا اور یہ سب چیزیں صبر سے پوری ہوں گی اور صبر خوف کی وجہ سے اثر کرے گا۔ خوف علم سے پیدا ہوگا اور علم بصیرت سے۔ تو سب سے پہلے اسے مجالس ذکر کی حاضری کا اہتمام کرنا چاہیے اور نصیحت کی باتیں فارغ دل سے سننی چاہئیں اور اُن پر غور کرنا چاہیے۔ اسی سے خوف پیدا ہوگا اور صبر آسان ہو جائے گا۔ نیز علاج کی طلب کے لیے محرکات آسان ہو جائیں گی اور ان سب باتوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوگی۔

اگر سوال کیا جائے کہ کیا بات ہے کہ انسان برائی کے انجام کو جانتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کرتا ہے؟ تو اس کے کئی جواب ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ نے جس عذاب کی خبر دی ہے وہ سامنے نظر نہیں آتا۔ دوسرے یہ ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو لازماً توبہ کا ارادہ کرتا ہے اور چونکہ انسانی طبائع پر لمبی امید غالب ہے اس لیے وہ توبہ کو پیچھے ڈالتا جاتا ہے۔ توبہ کی امید رکھتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے معافی کی امید رکھتا ہے۔ ان تمام اسباب کا علاج یہ ہے کہ اپنے دل میں غور کرے کہ جو کچھ آنے والا ہے وہ قریب ہے اور وہ موت ہے۔ اس کے ناگہاں آجانے سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔

تسویف (آئندہ کرلوں گا) کا علاج یہ ہے کہ دوزخیوں کے حالات پر غور کرے۔ وہ بھی اسی وجہ سے اس حال کو پہنچے کہ گناہ کرتے تھے اور توبہ کو آئندہ پر ٹالتے تھے۔

ویسے بھی یہ نادانی ہے کہ انسان اپنی اصلیت پر غور نہ کرے۔ جو چیز بالکل اس کے اختیار میں نہیں وہ ہے زندگی۔ شاید وہ باقی نہ رہے اور اگر باقی بھی رہے، تو شاید کل اس کام کو چھوڑنے پر قادر نہ ہو جیسا کہ آج قادر نہیں ہے۔ آخر آج بھی تو شہوت کے غلبے ہی کی وجہ سے عاجز ہے۔ آخر وہ کل کیوں نہ باقی رہے گی؟ بلکہ عادت پختہ ہو جانے کی وجہ سے وہ تو اور پختہ ہو جائے گی۔

آئندہ پر ٹالنے والے بالعموم ہلاک ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی جیسی دو چیزوں میں فرق کر جاتے ہیں۔

آئندہ پر ٹالنے والے کی مثال اس آدمی کی سی ہے جیسے ایک درخت اکھاڑنے کی ضرورت ہو وہ دیکھے کہ درخت بہت مضبوط ہے۔ شدید مشقت سے اکھڑے گا تو وہ کہے میں ایک سال کے بعد اس کو اکھیڑنے کے لیے آؤں گا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ درخت جتنی مدت باقی رہے گا، مضبوط ہوتا جائے گا اور اس کی جتنی عمر لمبی ہوتی جائے گی یہ خود کمزور ہوتا جائے گا۔ جب وہ طاقتور ہونے کے باوجود درخت کی کمزوری کی حالت میں اسے نہیں اکھاڑ سکتا، تو جب خود کمزور ہو جائے گا اور درخت اور طاقتور، تو پھر اس پر کیسے غالب آسکے گا؟

باقی رہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی اُمید تو یہ ممکن تو ضرور ہے لیکن آدمی کو ہوشیار رہنا چاہیے اگر کوئی محض اس امید کا سہارا لے تو اس کی مثال اُس آدمی جیسی ہے جو اپنا سارا مال خرچ کر کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو فقیر بنا دے اور اُمید رکھے کہ اللہ تعالیٰ کسی ویرانے میں خزانے کی اطلاع دے کر اس کو روزی دے دے گا۔ یہ ممکن تو ہے لیکن سنت اللہ یہ نہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی کو احمق ہی کہا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فصل ہشتم

صبر اور شکر

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قریباً نوے مقامات پر صبر کا تذکرہ کیا ہے۔ اکثر نیکیوں اور درجات کو اس کی طرف منسوب فرمایا ہے اور ان کو صبر کا پھل قرار دیا ہے: ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا[1] (اور ہم نے ان میں سے امام بنائے جبکہ انھوں نے صبر کیا۔ وہ ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے)

فرمایا: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا[2] (بنی اسرائیل نے جب صبر کیا تو تیرے رب کے اچھے وعدے اُن سے پورے ہو گئے)

فرمایا: وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[3] (اور ہم صابر لوگوں کو ان کے اچھے اعمال کا بہترین بدلہ دیں گے)

فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ[4] (اور صابر لوگوں کو بغیر حساب کے بے اندازہ اجر دیا جائے گا)

صبر کے علاوہ جو بھی کوئی نیکی ہے اس کے اجر کا ایک اندازہ اور حساب ہے اور چونکہ روزہ بھی صبر کی ایک قسم ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"

اللہ تعالیٰ نے صابر لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ (اللہ) اُن کے ساتھ ہے۔ صبر کے لیے جتنی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیا ہے اور کسی نیکی پر جمع نہیں کیا فرمایا: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ[5]۔ (یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں)

---

[1] سورۃ سجدہ - آیت: ۲۴ [2] سورۃ اعراف - آیت: ۱۳۷ [3] سورۃ نحل - آیت: ۹۶

[4] سورۃ زمر - آیت: ۱۰ [5] سورۃ بقرہ - آیت: ۱۵۷

اور اس میں بہت سی آیات ہیں۔

صحیحین میں ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبر جتنی وسیع اور بہتر بھلائی کسی کو ملتی ہے اتنی کسی عمل پر نہیں ملتی۔

ایک اور حدیث میں ہے "ایمان میں صبر کا وہی مرتبہ ہے جو بدن میں سر کا ہے"

حضرت حسنؒ نے کہا "صبر بھلائی کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے یہ اللہ تعالیٰ اسی آدمی کو عطا کرتا ہے جو اس کے نزدیک بڑا معزز ہو"

بیان کیا جاتا ہے کسی عارف کی جیب میں ایک رقعہ تھا وہ ہر وقت اُس کو نکال کر اس کا مطالعہ کرتا۔ اس میں لکھا تھا: وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا[1] (اپنے رب کے حکم پر صبر کرو تم ہماری نگرانی میں ہو)

معلوم ہونا چاہیے کہ صبر اشرف المخلوق انسان کا خاصہ ہے۔ جانوروں میں اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہاں یہ قوت بڑی ناقص ہے۔ ان پر خواہشات کا غلبہ ہے اور کوئی چیز ان کا مقابلہ کرنے والی نہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی اس کا تصوّر نہیں ہے کیونکہ وہاں صبر کی قوت کامل ہے۔ اُن میں صرف بارگاہِ الٰہی کی حاضری کا شوق ہے اور کوئی خواہش ان پر مسلّط نہیں جو اُن کو اس سے پھیر دے۔

انسان ابتدا میں جانوروں کی طرح ناقص پیدا ہوتا ہے اس میں صرف غذا کی خواہش ہوتی ہے جس کا وہ محتاج ہو۔ پھر اس میں کھیلنے اور زیب وزینت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر نکاح کی اور اس مرحلے تک اس میں صبر کی قوت نہیں ہوتی پھر جب عقل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور طاقت پکڑتی ہے تو سنِ تمیز کے وقت اس میں نورِ ہدایت کی چمک ظاہر ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے۔ جیسا کہ صبح کا نور ظاہر ہوتا ہے، پھر سورج طلوع ہوتا ہے لیکن یہ رہنمائی کمزور ہوتی ہے۔ آخرت کے مصالح کی طرف اس کو رستہ دکھلانے والا کوئی نہیں ہوتا۔

طبیعت جب شریعت کی معرفت سے تعلق پیدا کرتی ہے تو جو چیزیں آخرت کے متعلق ہیں وہ روشن ہو جاتی ہیں اور اس کا اسلحہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورۃ طور، آیت: ۴۸

پھر طبیعت اپنی محبوب چیزوں کا تقاضا کرتی ہے اور عقل اور شریعت کا داعیہ اُسے روکتا ہے اور ان دونوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ میدانِ جنگ انسان کا دل ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر صبر یہ ہے کہ آدمی خواہشات کے مقابل دین میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ اس مقابلے میں ثابت قدم رہے اور شہوت پر غالب آجائے، تو صابرین میں سے ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کا ارادہ کمزور رہا اور شہوت غالب آجائے تو شیطان کے پیرؤوں سے مل جاتا ہے۔

فصل نہم

صبر کی اقسام

صبر دو قسم کا ہے۔ ایک بدنی۔ جیسے مشقت کا برداشت کرنا اور عبادت کے مشکل اعمال کا ادا کرنا وغیرہ۔ دوسرا نفسانی۔ یہ خواہش کے تقاضے اور طبیعت کی مرغوب چیزوں سے رک جانا ہے۔ صبر کی یہ قسم اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے متعلق ہو تو اس کا نام عفت ہے۔ اگر میدانِ جنگ میں صبر ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔ اگر غصّے کو دبانے میں ہو تو اس کا نام حلم ہے۔ اگر کسی پریشان کرنے والی مصیبت سے ہو تو اُس کا نام سینے کی فراخی ہے۔ اگر کسی معاملے کو پوشیدہ رکھنے کے متعلق ہو تو اُس کا نام راز کو چھپانا ہے۔ اگر زائد ضروریات سے رُکنا ہو تو اُس کا نام زہد ہے اور اگر تھوڑی سی ضروریات پر مطمئن ہونا ہو تو اُس کا نام قناعت ہے۔

دراصل مصیبت میں ثابت قدم رہنے کا نام صرف صبر ہے۔ ہم نے جو بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو چکا کہ ایمان کے اکثر اوصاف صبر میں داخل ہیں۔ اگرچہ اپنے متعلقات کے اختلاف کی وجہ سے ان کے نام مختلف ہوں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ بندہ کسی حال میں بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں جو چیز بھی انسان کو ملتی ہے وہ دو قسم کی ہے: ایک تو وہ ہے جو اس کی خواہش کے موافق ہے، جیسے صحت، سلامتی، مال و جاہ، برادری، ملازمین کی کثرت اور دنیا کا تمام ساز و سامان۔ بندہ ان تمام چیزوں میں صبر کا محتاج ہے کہ وہ ان کی طرف جھک نہ جائے اور ان سے لذت حاصل کرنے میں ایسا منہمک نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ ہوں۔

اگر انسان ساز و سامان میں منہمک ہونے سے پہلے اپنے آپ کو روک نہ سکے اور ہمہ تن اُن کی طرف مائل ہو جائے تو اس سے سرکشی اور تکبّر پیدا ہوگا۔ بعض عارفین نے کہا ہے کہ مومن مصیبت پر صبر کر لیتا ہے اور عافیت پر صرف صدیق ہی صبر کر سکتا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: تکلیفوں سے ہماری آزمائش ہوئی، تو ہم نے صبر کیا، لیکن

جب نعمت و آسائش سے آزمائش ہوئی تو ہم صبر نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (تمھیں تمھارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں)

فرمایا: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہے)

فرمایا: إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (تمھاری بیویاں اور تمھاری اولاد تمھارے دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو)

جوانمرد صرف وہ ہے جو عافیت پر صبر کرے اور یہ صبر شکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب تک شکر کے حقوق ادا نہ ہوں صبر پورا نہیں ہوتا۔ اور نعمت میں صبر مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہاں قدرت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کھانا نہ ہونے کی صورت میں بھوکا زیادہ صبر کر سکتا ہے بہ نسبت لذیذ کھانا موجود ہونے کے۔

دوسری قسم خواہشات کے مخالف ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں:

پہلی: طاعات ہیں کہ بندہ ان پر صبر کرنے کا محتاج ہے کیونکہ نفس طبعی طور پر عبودیت (غلامی) سے بھاگتا ہے۔

پھر بعض عبادتیں ایسی ہیں جنھیں وہ سستی کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے۔ جیسے نماز۔ اور بعض وہ ہیں جنھیں بخل کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے جیسے زکوٰۃ اور بعض کو ان دونوں کی وجہ سے جیسے حج اور جہاد۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ارادہ کرنے والا تین حالات میں طاعت پر صبر کا محتاج ہے۔

ایک حالت عبادت سے پہلے کی ہے اور وہ ہے نیت کا صحیح ہونا اور ریا کے شائبے سے بھی بچنا۔

ایک حالت عین عبادت کی ہے اور وہ یہ ہے کہ عبادت کے دوران میں اللہ سے غافل نہ ہو اور آداب و سنن کی ادائیگی میں سستی نہ کرے اور عمل سے فارغ ہونے تک صبر کرے کہ کوئی چیز اس میں خلل نہ ڈالے۔

تیسری حالت عمل سے فارغ ہونے کے بعد کی ہے اور وہ ہے ریا اور سُمعہ کے لیے عمل کو ظاہر کرنے اور بتانے سے متعلق، یعنی ہر اُس چیز سے صبر کرنا جو عمل کو باطل کر دے۔ جس نے صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلانے اور تکلیف دینے سے

---

[۱] سورۃ منافقون- آیت: ۹ [۲] سورۃ انفال: آیت: ۲۸ [۳] سورۃ تغابن- آیت: ۱۴

صبر نہ کیا اس نے صدقے کو باطل کر دیا۔

دوسری قسم گناہوں سے صبر کرنا ہے اور بندہ اس کا بہت ہی محتاج ہے۔

اگر کوئی فعل ایسا ہو جو آسانی سے کیا جا سکتا ہو، جیسے زبان کے گناہ: غیبت کرنا، جھوٹ بولنا اور جھگڑا کرنا وغیرہ تو اس سے صبر کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ کوئی آدمی ریشمی لباس پہنتا ہے تو اُسے بُرا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی غیبت کرتا رہتا ہے تو اُسے بُرا نہیں سمجھا جاتا۔

جو آدمی لڑائی میں اپنی زبان پر اختیار نہ رکھ سکتا ہو اور صبر نہ کر سکے اس کی نجات عزلت (گوشہ نشینی) میں ہے

تیسری قسم وہ ہے جو اختیار کے تحت نہیں ہے، جیسے مصائب اور عزیزوں کی موت اور مال کی تباہی اور بیمار ہونا وغیرہ، تو ان پر صبر کرنا اعلیٰ مقامات میں سے ہے کیونکہ اس کی بنیاد یقین ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی کا اللہ بھلا کرنا چاہے اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے"۔

لوگوں کی ایذا پر صبر کرنا ایسی ہی بات ہے جیسے وہ آدمی جو قول یا فعل یا کسی نقصان جانی یا مالی سے تکلیف دے اور بدلہ لینے کی قوت کے باوجود بدلہ نہ لے۔ یہ صبر ہے۔

لوگوں کی تکلیف پر صبر کرنا نہایت اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ[1] (اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے)

فرمایا: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ[2] (اور ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے)

فرمایا: وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ[3] (اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبر تین قسم کا ہے۔ مصیبت پر صبر۔ اطاعت پر صبر۔ اور گناہ سے صبر۔ جس نے مصیبت پر صبر کیا اور اس کا بہترین صبر سے جواب دیا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے تین سو درجے لکھے جاتے ہیں اور ہر درجے میں اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان میں ہے۔ اور جس نے اطاعت پر صبر کیا اس کے لیے چھ سو درجے لکھے جاتے ہیں اور ہر درجے میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ زمین کے نچلے کنارہ سے لے کر عرش کے اوپر کے کنارہ تک ہے۔ اور جس نے گناہ سے صبر کیا اس کے لیے نو سو درجے لکھے جاتے ہیں اور ایک درجے سے لے کر

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۸۶ [2] سورۃ حجر۔ آیت: ۹۷ [3] سورۃ نحل۔ آیت: ۱۲۶

دوسرے درجے تک اس فاصلہ سے دوگنا فاصلہ ہے جتنا زمین کے کنارے سے لے کر عرش کے اوپر کے کنارے تک ہے"۔

صبر کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان کو جو بھی کوئی مصیبت پہنچتی ہے اسے اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی کو کانٹا بھی چبھے تو اُس سے بھی اُس کے گناہ معاف ہوتے ہیں"۔

ایک اور حدیث میں ہے "مسلمان کو اگر کوئی بیماری، تھکاوٹ، فکر، غم یا تکلیف پہنچتی ہے، حتّٰی کہ اگر کانٹا بھی چبھتا ہے، تو اس سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کرتے ہیں"۔ (بخاری۔ مسلم)

ایک اور حدیث میں ہے: "مومن مرد یا عورت ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ کبھی اپنے جسم کی، کبھی مال کی اور کبھی اولاد کی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہو گا"۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، سب سے زیادہ سختی کس پر آتی ہے؟" تو فرمایا: "انبیاء پر، پھر نیک لوگوں پر۔ پھر درجہ بدرجہ۔"

لوگوں کا امتحان اُن کے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے دین میں مضبوط ہے تو اس پر سختی زیادہ ہوتی ہے اور اگر وہ دین میں کمزور ہو تو اس کی مصیبت ہلکی ہوتی ہے اور مومن بندے پر ہمیشہ سختی آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر چلتا ہے اور اُس کے ذمّے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔" ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب میرے کسی بندے پر کوئی مصیبت اُس کے بدن یا مال یا اولاد میں آتی ہے اور وہ بہترین صبر سے اس کا استقبال کرتا ہے، تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں قیامت کے دن اس کے لیے ترازو قائم کروں یا اس کا نامۂ اعمال کھول کر رکھ دوں"۔

فصل دہم

صبر کے آداب

صبر کے آداب میں سے ہے کہ صدمے کے ابتدا میں صبر کیا جائے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"صبر صدمے کے ابتداء میں ہے۔" یہ حدیث صحیح ہے۔

صبر کے اور آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مصیبت کے وقت: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہے۔ جیسا کہ مسلم میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔

صبر کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اعضا اور زبان کو سکون میں رکھے۔ ہاں رونا جائز ہے۔ بعض حکماء نے کہا کہ بے صبری سے چلی جانے والی چیز واپس نہیں آتی، البتہ دشمن ضرور خوش ہوتا ہے۔

اچھا صبر یہ ہے کہ مصیبت زدہ پر مصیبت کا نشان ظاہر نہ ہو جیسا حضرت اُم سلیمؓ حضرت طلحہؓ کی بیوی نے اپنے بیٹے کی وفات پر کیا اور یہ حدیث بڑی مشہور ہے۔ (صحیح مسلم)

ثابت بنانیؒ نے کہا: عبداللہ بن مطرف فوت ہو گئے تو اُن کے باپ مطرف بڑے اچھے کپڑے پہن کر سر کو تیل لگا کر باہر نکلے۔ لوگ ناراض ہوئے اور کہنے لگے غضب ہے عبداللہ فوت ہو جائے اور تم اس طرح کے کپڑے پہن کر اور تیل لگا کر باہر نکلو، تو کہا کیا میں اس پر اپنی حالت کی کمزوری ظاہر کروں حالانکہ میرے رب نے مجھ سے تین چیزوں کا وعدہ کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک چیز مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پیاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ (وہ لوگ کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم بھی اللہ کی امانت ہیں اور اسی کے پاس جانے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں۔ اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں)[1]

---

[1] سورۃ بقرہ۔ آیات: ۱۵۶۔ ۱۵۷

آیت تلاوت کرنے کے بعد مطرف نے مزید کہا: "دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کے دینے کے بدلے میں مجھے آخرت میں پانی کی ایک صراحی مل جائے تو میں نہ چاہوں کہ وہ مجھ سے دنیا میں لے لی جائے۔"

حضرت صلہؒ بن اشیم اپنے بیٹے کے ساتھ ایک جنگ میں تھے کہنے لگے: "اے بیٹیا، آگے بڑھ کر جنگ کر کہ میں تیری شہادت کا ثواب حاصل کروں۔" چنانچہ اُس نے حملہ کیا اور لڑائی میں شہید ہو گیا۔ پھر یہ خود آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔ عورتیں اُن کی ماں معاذہ عدویہ کے پاس آئیں تو اس نے کہا: "اگر تم مجھے مبارک دینے کے لیے آئی ہو تو خوش آمدید اور اگر کسی اور مقصد کے لیے آئی ہو تو واپس چلی جاؤ۔"

جب کوئی ایسی مصیبت ہو جس کو چھپایا جا سکتا ہو تو اس کو چھپانا اللہ تعالیٰ کے لیے مخفی انعامات میں سے ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو وہ اپنے تیمارداروں سے کیا کہتا ہے۔ پھر اگر وہ تیمارداروں کے سامنے اللہ کی تعریف کرے، تو وہ جا کر بیان کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اُس کو خوب جانتا ہے۔ پھر فرماتا ہے: سنو! اگر میں نے اپنے بندے کو اپنے پاس بُلا لیا تو میں اسے جنت میں داخل کروں گا اور اگر میں نے اسے شفا دی تو میں اُس کا گوشت اور خُون بدل دُوں گا اور اسے اس سے بہتر گوشت اور خون عطا کروں گا اور اس کے گناہ معاف کر دوں گا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور معرفت کا یہ حق ہے کہ تم اپنی تکلیف کی شکایت نہ کرو اور نہ اپنی مصیبت کا تذکرہ کرو۔"

حضرت احنفؒ نے کہا: "چالیس سال سے میری ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی ہے۔ میں نے آج تک کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔"

ایک آدمی نے امام احمدؒ سے پوچھا: "اے ابوعبداللہ! آپ کا کیا حال ہے؟"

آپ نے کہا: "عافیت اور بھلائی سے ہوں۔"

اُس نے کہا: "کل رات آپ کو بخار تھا؟" تو فرمایا: "میں نے جب تم سے کہہ دیا کہ میں عافیت سے ہوں تو بس کافی ہے، تم مجھ سے وہ بات کیوں کہلوانا چاہتے ہو جس کا زبان پر لانا مجھے پسند نہیں۔"

حضرت شقیق بلخیؒ نے کہا: "جس نے اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنی مصیبت کی شکایت کی وہ اللہ کی عبادت

میں کبھی حلاوت نہ پائے گا۔

حکماء نے کہا ہے "مصیبت کا چھپانا نیکی کا خزانہ ہے"۔ سلف مصیبت کے ثواب کو دیکھتے ہوئے اس پر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی حکایات مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بیٹا عبدالملک فوت ہوا، تو حضرت عمرؒ نے ان کو دفن کیا اور قبر پر مٹی ڈالی، پھر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے آپ کو گھیر لیا تو آپ نے فرمایا: اے میرے بیٹے! اللہ تجھ پر رحمت کرے تو اپنے باپ کے لیے بڑا نیک تھا اور جب سے تو پیدا ہوا میں آج تک تجھ سے خوش رہا اور اب خدا کی قسم! میں اس سے بھی زیادہ خوش ہوں، کیونکہ تیرے مرنے کی وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ سے اجر اور ثواب کی اُمید ہے۔"

اگر کہا جائے کہ صبر سے مراد مصیبت کو بُرا نہ سمجھنا ہے، تو اس پر آدمی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور اگر مصیبت کے وجود سے خوشی ہے جیسا کہ تم بیان کرتے ہو تو یہ اور بھی مشکل بات ہے۔

جواب یہ ہے کہ صبر یا تو محبوب کی جدائی سے ہوتا ہے یا کسی ناپسندیدہ چیز کے آنے پر جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ اس کی ممانعت نہیں ہے اور وہ دل کی بے چینی ہے۔ ممانعت صرف اختیاری چیزوں سے ہے۔ جیسے گریبان پھاڑنا اور رخسار پیٹنا اور زبان سے شکوہ کرنا۔ اور وہ جو ہم نے مصائب آنے پر بعض کی خوشی کا تذکرہ کیا ہے، تو وہ خوشی شرعی ہے۔ طبعی نہیں۔ کیونکہ طبیعت تو لازماً مصیبت کو ناپسند کرتی ہے۔

اس کی مثال اس بیمار جیسی ہے جسے علاج کے لیے کوئی پینے کی چیز بتائی جائے وہ اس کی تلاش میں کوشش کرے اور پیسہ خرچ کرے پھر جب وہ خواہش پوری ہو جائے تو اس پر خوش ہو، کیونکہ اسے تندرستی کی اُمید ہے، لیکن اس کی طبیعت اس کو پینے سے کراہت کرتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بادشاہ کسی فقیر سے کہے جب بھی میں تجھے اس پتلی سی لکڑی سے ماروں، تو تجھے ہر مار پر ایک ہزار دینار دوں گا تو وہ فقیر چاہے گا کہ اس سے زیادہ مارے۔ یہ نہیں کہ مار سے اسے تکلیف نہیں ہوتی، لیکن چونکہ وہ اس کے انجام کو جانتا ہے اس لیے خوش ہوتا ہے۔

یہی حال سلف کا تھا جب وہ ثواب کو دیکھتے تھے تو اُن پر وہ مصیبت آسان ہو جاتی تھی۔

ہوں تو بارش کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح برکت اور رحمت کے اوقات میں ہواؤں کے چلنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ قصد اور دل کا انبساط بھی ہو۔ جیسے عرفہ کا دن، جمعہ کا دن اور رمضان کا مہینہ۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تقدیر سے ہمت اور انفاس، اللہ تعالیٰ کی رحمت کو لانے کے لیے اسباب بنائے گئے ہیں۔

کتاب المنجیات

حصّہ دوم

- شکر، اُس کی فضیلت اور نعمتوں کا تذکرہ
- نعمتیں، اُن کی حقیقت اور اقسام
- نعمتوں کے اسباب
- وسائل حیات
- صبر اور شکر کس طرح اکٹھے ہو سکتے ہیں؟
- صبر افضل ہے یا شکر؟
- اُمید کی فضیلت
- خوف، اُس کی حقیقت اور درجات
- خوف وجۂ رحمت بھی ہے۔
- خوف کی اقسام۔
- خوف اور اُمید میں کس کو غالب رہنا چاہیے۔
- خوف پیدا کرنے والی باتیں۔

فصل اوّل

شکر، اُس کی فضیلت اور نعمتوں کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ[1] (ہم جلدی ہی شکر گزاروں کو اس کا بدلہ دیں گے)

فرمایا: مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ[2] (اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ کو تمھیں عذاب دینے سے کیا غرض ہے)

فرمایا: وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ[3] (اور میرے تھوڑے ہی بندے شکر گزار ہیں)

اللہ تعالیٰ نے شکر کے ساتھ زیادہ دینے کا یقینی وعدہ فرمایا اور کہا: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ[4] (اگر تم شکر کرو تو میں ضرور تمھیں زیادہ دوں گا)

شکر کے علاوہ دوسری چیزوں کو اپنی مشیّت پر موقوف رکھا ہے۔ جیسے فرمایا: فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ[5] (تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے بے نیازی عطا کر دے گا، اگر اس نے چاہا)

فرمایا: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ[6] (تو دور کر دیتا ہے وہ تکلیف جس کے لیے تم اُس کو پکارتے ہو اگر چاہے)

فرمایا: يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ[7] (جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے)

فرمایا: وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ[8] (اور جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہے معاف کر دے)

فرمایا: وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ[9] (اور اللہ جس کی چاہے توبہ قبول فرمائے)

جب ابلیس کو شکر کی قدر معلوم ہوئی، تو بنی آدم پر طعن کرتے ہوئے کہا: وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ

---

[1] سورۃ آلِ عمران۔ آیت: ۱۴۵ [2] سورۃ نساء۔ آیت: ۱۴۷ [3] سورۃ سبا۔ آیت: ۱۳

[4] سورۃ ابراہیم۔ آیت: ۷ [5] سورۃ توبہ۔ آیت: ۲۸ [6] سورۃ انعام۔ آیت: ۴۱

[7] سورۃ بقرہ۔ آیت: ۲۱۲ [8] سورۃ النساء۔ آیت: ۴۸ [9] سورۃ التوبہ۔ آیت: ۱۵

شَاکِرِیْنَ (تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا)

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اتنا قیام فرماتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "آپ اتنا قیام کیوں کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں؟" تو فرمایا: "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے، پس تم یہ دعا کیا کرو۔ اے اللہ! مجھے اپنے شکر اور ذکر اور اچھی عبادت کی توفیق عطا فرما۔"

شکر کس طرح کیا جائے

شکر دل، زبان اور اعضاء سے ہوتا ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کا ارادہ کرے اور تمام مخلوق کا بھلا چاہے۔

زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ کی تعریف کرتا رہے۔

اعضاء کا شکر یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی اطاعت میں استعمال کرے اور ان سے گناہ کی مدد کرنے سے پرہیز کرے۔ مثلاً آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کوئی عیب دیکھا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرے۔

کانوں کا شکر یہ ہے کہ لوگوں کے جو عیوب سنے ہیں ان کی پردہ پوشی کرے۔

زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ کی مشیت پر خوش ہونے کا اظہار کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی نعمت کو بیان کرنا شکر ہے اور اس کا ترک کرنا کفر ہے۔"

بیان کیا گیا ہے کہ انصار کے دو آدمی آپس میں ملے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: "کیا حال ہے؟" اس نے کہا: "الحمد للہ" تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسی طرح کہا کرو۔"

بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سلام کیا۔ آپ نے اسے جواب دیا۔ پھر کہا: "کیا حال ہے؟" اس نے کہا: "میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں" تو حضرت عمرؓ نے کہا: "میں یہی چاہتا تھا۔"

سلف ایک دوسرے سے حال پوچھا کرتے تھے اور مقصد ان کا اللہ کا شکر کرنا ہوتا تھا۔ شکر گزار بھی مطیع ہے اور اس کا اظہار کرانے والا بھی مطیع ہے۔

۱؎ سورۃ الاعراف - آیت ۱۷

حضرت ابو عبدالرحمن حبلی نے کہا: جب کوئی آدمی کسی کو سلام کہتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے "کیا حال ہے" اور دوسرا اسے جواب دیتا ہے "میں تیرے سامنے اللہ کی شکر گزاری کرتا ہوں" تو بائیں طرف والا فرشتہ دائیں طرف والے سے کہتا ہے: "تو اس کو کس طرح لکھے گا؟" وہ کہتا ہے: "میں اس کو حمد کرنے والوں میں لکھوں گا۔"

ابو عبداللہ سے جب پوچھا جاتا: "تمہارا کیا حال ہے؟" تو وہ کہتے: "میں تیرے سامنے اور اللہ کی ساری مخلوق کے سامنے اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

شکر کے محرکات

معلوم ہونا چاہیے کہ شکر کا ادا کرنا اور ناشکری کو چھوڑنا اللہ کی پسندیدہ چیزوں کی معرفت کے بغیر پورا نہیں ہوتا کیونکہ شکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی پسندیدہ چیزوں میں استعمال کیا جائے اور ناشکری کا مطلب اس کے خلاف ہے کہ یا تو بالکل استعمال نہ کیا جائے یا ناپسندیدہ جگہوں میں استعمال نہ کیا جائے۔

اللہ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کا ادراک کرنے والی دو چیزیں ہیں:

ایک کان اور دوسری دل کی بصیرت اور وہ ہے عبرت کی نگاہ سے کسی چیز کو دیکھنا اور یہ چیز بہت ہی مشکل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا اور ان کے ذریعے لوگوں پر دین کا راستہ آسان کر دیا۔

اس کی معرفت بندوں کے افعال سے متعلق ہے اور وہ شریعت کے تمام احکام کی معرفت ہے۔ جو آدمی اپنے تمام افعال میں شریعت کے حکم پر مطلع نہیں ہے، اس کے لیے شکر کا حق ادا کرنا ناممکن ہے۔

دوسری چیز عبرت کی نگاہ سے دیکھنا ہے اور وہ ہے اللہ کی تمام مخلوق میں اللہ کی حکمت کا ادراک کرنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جو چیز بھی پیدا کی ہے اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور حکمت کے تحت ایک مقصود ہے اور یہ مقصود ہی محبوب ہے۔ اس حکمت کی دو قسمیں ہیں جلی اور خفی۔

حکمتِ جلی: جیسے یہ علم کہ سورج کے پیدا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ دن اور رات حاصل ہوں اور دن کمائی کے لیے ہے اور رات آرام کے لیے۔ سورج چڑھا ہوا ہو تو نقل و حرکت آسان ہوتی ہے اور چھپ جانے پر سکون و آرام۔ نیز یہ جاننا کہ سورج کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے نہ کہ صرف یہی ایک حکمت ہے۔ اسی طرح بادلوں اور بارش برسنے میں حکمت کا ادراک ہے۔

ستاروں کے پیدا کرنے کی حکمت مخفی ہے۔ اس کو سب لوگ نہیں جانتے۔ ہاں بعض حکمتوں پر لوگ مطلع ہو جاتے ہیں، جیسے ان کا آسمان کی زینت ہونا۔

کائنات کے تمام اجزاء، یہاں تک کہ ایک ذرہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح جاندار چیزوں کے

چونکہ اکثر لوگ صحیفۂ کائنات پر خطِ الٰہی سے لکھی ہوئی سطروں کو پڑھنے سے قاصر ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کا ادراک آنکھوں کی بصارت سے نہیں، بلکہ بصیرت کی نگاہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنے کلام سے خبر دی، جس کو لوگوں نے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ[1] (وہ جو سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اُن کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔)

جس آدمی نے سونے چاندی کے برتن بنا لیے اس نے بھی اللہ کی نعمت کا کفران کیا، کیونکہ یہ تو جمع کرنے والے سے بھی زیادہ بری حالت میں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی آدمی شہر کے حاکم کو کپڑا بننے اور جھاڑو دینے میں یا ان کاموں میں لگا دے جو ادنیٰ لوگ کرتے ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تانبے، پیتل اور مٹی کے برتن، سونے چاندی کے برتنوں کی جگہ بخوبی کام دے سکتے ہیں، لیکن مٹی، تانبہ، پیتل سونے چاندی کی جگہ کام نہیں آ سکتی۔ مٹی اور تانبے کی جگہ سونا چاندی استعمال کرنا سراسر اسراف بیجا ہے۔ ارشاد ہوا:

"جس نے سونے اور چاندی کے برتن میں پیا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے"۔

یہی حال اس کا ہے جو درہم اور دینار سے سودی کاروبار کرے کیونکہ اس نے بھی اُن کے مقصود سے ان کو باہر کر دیا۔

پس مناسب ہے کہ کفرانِ نعمت اور شکرِ نعمت کا اعتبار تمام امور میں اسی مثال سے سمجھ لیا جائے، حرکت، سکون، بولنا اور خاموش رہنا۔ غرض کہ اپنے ہر کام میں شکر اور ناشکری کا خیال رکھے۔ ان میں سے بعض ناشکری کی قسمیں مکروہ ہیں اور بعض شکرگزاری کی۔

اور اس میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو دو دو ہاتھ عنایت کیے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ہے اور زیادہ طاقت کی وجہ سے اس کو بزرگی ملی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس نے تجھے ہاتھ دیے ہیں اس نے تجھے کچھ کاموں کا محتاج بھی کیا ہے۔ پھر بعض کام شریف ہیں جیسے قرآن مجید کا پکڑنا اور بعض ادنیٰ، جیسے کہ نجاست کا صاف کرنا۔ پھر اگر تو بائیں ہاتھ سے قرآن پکڑے اور دائیں سے نجاست صاف

---

[1] سورۃ توبہ، آیت ۳۴

کرے تو تُو نے مقصود کے خلاف کیا۔ شریف سے رذیل کا کام لے کر تو نے گویا ظلم کیا۔

اسی طرح پاؤں ہیں۔ اگر تو نے پہلے بائیں پاؤں پر موزہ پہنا تو دائیں پر ظلم کیا۔ کیونکہ موزہ پاؤں کی حفاظت ہے اور دایاں پاؤں، بائیں پر فضیلت رکھتا ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اُسے اوّلیت کا شرف دیا جائے۔ اسی سے دیگر امور کا قیاس کرنا چاہیے۔

ہم کہتے ہیں کہ جس نے بغیر کسی صحیح ضرورت کے درخت کی ٹہنی کو توڑا تو اس نے درختوں کی پیدائش کی حکمت کے خلاف کیا کیونکہ ان کو فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہاں صحیح غرض سے توڑا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر ایسا ہی دوسرے کی ملکیت میں کرے، تو وہ بھی ظالم ہے اگرچہ وہ محتاج ہو مگر یہ کہ مالک اُسے اجازت دے دے۔

فصل دوم

نعمتیں، اُن کی حقیقت اور اقسام

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مطلوب کو نعمت کہا جاتا ہے، لیکن حقیقی نعمت آخرت کی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں کو مجازی طور پر نعمت کہا جائے گا۔ ہماری طرف نسبت کے لحاظ سے یہ تمام امور چار قسم کے ہیں:۔

پہلا وہ جو دُنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہے، جیسے علم اور حُسنِ خُلق۔ اور یہ حقیقی نعمت ہے۔

دوسرا وہ جو دنیا و آخرت دونوں میں مضر ہے اور یہ حقیقت میں مصیبت ہے۔

تیسرا وہ جو فی الحال نافع ہے، لیکن اس کا انجام مضر ہے، جیسے لذّات کا حاصل کرنا اور خواہشات کی پیروی کرنا۔ یہ عقلمندوں کے نزدیک تو مصیبت ہے، لیکن جاہل اسے نعمت سمجھتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بھوکے آدمی کو زہر ملا ہوا شہد مل جائے، تو اگر وہ جاہل ہے تو اسے نعمت سمجھے گا۔

چوتھا وہ جو فی الحال مضر ہے، لیکن انجام کے لحاظ سے مفید۔ یہ عقلمندوں کے نزدیک نعمت اور جاہلوں کے نزدیک مصیبت ہے۔ اس کی مثال بدمزہ دوا ہے جو بیماری کو شفا دینے والی ہو۔ جاہل کو جب اُس کے پینے پر مجبور کیا جائے گا تو وہ اسے مصیبت سمجھے گا اور عقلمند اسے نعمت جانے گا۔ اسی طرح جب کوئی بچہ سینگی لگوانے کا محتاج ہو تو اس بات سے آگاہ باپ اس کو اس کے لیے بلائے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا انجام شفا ہے اور ناواقف ماں اپنی محبت اور شفقت کی وجہ سے اسے منع کرے گی اور بچہ اپنی جہالت کی وجہ سے ماں کا کہا مانے گا اور باپ کو دشمن سمجھے گا۔ اگر اسے عقل ہو تو ایسا نہ کرے۔ اسی لیے کہا گیا ہے جاہل دوست عقلمند دشمن سے بُرا ہے اور ہر انسان اپنے نفس کا دوست ہے، لیکن نفس جاہل دوست ہے۔ وہ ایسے کام کر جاتا ہے جو دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ نعمتیں دو طرح کی ہیں: ایک وہ جو مقصود بالذّات ہیں اور ایک وہ جو مقصود کے اسباب و ذرائع ہیں۔ مقصود آخرت کی سعادت ہے اور اس کا حاصل یہ چار امور ہیں:

ایسی بقا جس کو فنا نہیں۔ خوشی جس میں غم نہیں۔ علم جس کے ساتھ جہالت نہیں اور غنا جس کے بعد فقیری نہیں۔

دوسری قسم سعادت کے اسباب و وسائل ہیں اور یہ بھی چار ہیں:

فضائلِ نفس جیسے ایمان اور حسنِ خلق۔

فضائلِ بدن، جیسے قوت اور صحت وغیرہ۔

بدن کے محافظ، جیسے مال وجاہ و اولاد وغیرہ۔

وہ اسباب جو فضائل کے مناسب ہیں، جیسے ہدایت۔ ارشاد، سیدھا چلنا اور تائید وغیرہ۔

اگر کہا یہ جائے کہ آخرت کی راہ میں ان خارجی نعمتوں، مال وجاہ وغیرہ کی کیا ضرورت ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ چیزیں جائز دست و بازو اور مقصود کے لیے استعمال ہونے والے آلات ہیں۔ مثلاً مال کہ جب طالبعلم کے پاس بقدر کفایت مال نہ ہوگا تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بغیر ہتھیار کے جنگ کرنے والا اور اس لیے بھی کہ اس کے اکثر اوقات روزی تلاش کرنے میں صرف ہو جائیں گے اور وہ علم اور ذکر و فکر کے حصول سے عاجز رہ جائے گا۔

یہی معاملہ جاہ و منزلت کا ہے۔ اس سے انسان اپنے نفس سے ذلت اور ظلم کو دور کرتا ہے۔ دشمن ہمیشہ تکلیف دیتے اور ظالم حملہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجبورِ محض اور بے نوا ہوگا تو اس کے دشمن اسے زیر کرلیں گے۔ اور اس کے دل کو رنج و غم میں مبتلا کردیں گے۔ ایسے فساد عزت اور جاہ ہی سے دور ہو سکتے ہیں۔

رہی بات صحت اور قوت اور لمبی عمر وغیرہ کی تو یہ بھی نعمتیں ہیں کیونکہ علم اور عمل انہی سے پورا ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو نعمتیں ہیں جن میں اکثر لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ صحت اور فراغت۔

اور جب آپ سے پوچھا گیا کہ بہترین آدمی کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "جس کی عمر لمبی اور عمل اچھے ہوں"۔

مال وجاہ اگرچہ دونوں نعمتیں ہیں اور ہم نے پہلے ان کی آفات بھی بیان کردی ہیں، لیکن یہ دونوں چیزیں مطلقاً بری نہیں ہیں۔

ہدایت، رشد، تسدید (سیدھا رہنا) اور تائید وغیرہ کے بڑی نعمتیں ہونے میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں ہے اور کوئی بھی آدمی ان کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

جب کسی نوجوان کو اللہ کی مدد نہ ملے تو اس کی اپنی ساری کوشش اس پر الٹ پڑے۔

فصل سوم

نعمتوں کے اسباب

معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے بعض نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اور ہم نے بدن کی صحت کو ایک نعمت قرار دیا ہے جو دوسرے مرتبہ میں واقع ہے۔ اگر ہم ان تمام اسباب کو بیان کرنا چاہیں جن سے کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو ہمیں اس کی طاقت نہیں ہے، لیکن کچھ اسباب ظاہر ہیں۔ مثلاً کھانا صحت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ ہم بطور اشارہ کچھ اسباب کا تذکرہ کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ اللہ کے تجھ پر احسانات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تیرے لیے احساس کے آلے پیدا کیے اور طلب غذا میں حرکت کے لیے آلات بنائے۔ تجھے چاہیے، حواس خمسہ کی ترتیب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پر غور کرے۔ مثلاً پہلا حاسہ لمس (چھونا) ہے اور یہ پہلی حس ہے جو جاندار چیزوں میں پیدا کی جاتی ہے۔ اور حس کا کمتر درجہ یہ ہے کہ وہ جسم کے ساتھ لگنے والی چیز کو محسوس کرے۔

دُور کی چیزوں کا احساس دلانے کے لیے اللہ نے تیرے اندر سونگھنے کی حس رکھی کہ دُور کی چیز کا ادراک بُو سے ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس محتاجی کا ازالہ بھی کر دیا کہ بعض اوقات معلوم نہیں ہوتا تو کس چیز کی ہے۔ یہ جاننے کے لیے اللہ نے تجھے دیکھنے کی قوت عطا فرمائی تاکہ تو دُور کی چیزوں کا ادراک کر سکے اور اس کی جہت بھی معلوم کرے اور اس سے بھی آگے یہ دشواری بھی دُور کر دی کہ جو چیز دیوار کے پیچھے ہے اس کا صحیح حال معلوم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دشمن اوٹ میں ہو کر تیرا قصد کرتا ہے، تو اللہ نے تیرے لیے کان بنائے کہ تو دیوار کے پیچھے کی آواز سن سکے اور پھر یہ بھی کافی نہ ہوتا اگر تجھ میں حس ذوق نہ ہوتی کیونکہ اسی سے تو تو اپنے موافق اور اپنی مضر چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔ درخت کی مثال تیرے سامنے ہے کہ اس کی جڑوں میں جو بھی بہنے والی چیز ڈال دی جاتی ہے وہ اسے جذب کر لیتا ہے۔ یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ کونسی چیز اسے سکھا دینے والی اور کونسی شاداب کرنے والی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تجھے ایک اور صفت سے نوازا ہے جو سب سے اعلیٰ ہے اور وہ ہے عقل اسی کے ساتھ تو کھانوں اور ان کے منافع اور انجام کو معلوم کرتا ہے اور اسی سے تو کھانوں کے پکنے اور ان کے اجزاء اور اس کے اسباب کی تیاری کرتا، اور اس کھانے سے نفع اٹھاتا ہے جو تیری صحت کا سبب ہو، یہ عقل کا ادنیٰ فائدہ

ہے اور سب سے بڑی حکمت اس میں اللہ کی معرفت ہے۔

ہم نے حواسِ خمسہ ظاہری کے بارے میں بس چند باتیں ہی لکھی ہیں۔ تفصیل سے بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مثلاً دیکھنا حواس میں سے ایک ہے۔ آنکھ اس کا آلہ ہے اور آنکھ دس مختلف طبقات سے مرکب ہے۔ بعض رطوبتیں ہیں۔ بعض مختلف پردے ہیں اور دس طبقات میں سے ہر ایک کی ایک الگ صفت، صورت، شکل، ہیئت، تدبیر اور ترکیب ہے۔ اگر ایک طبقہ بھی ان میں سے بگڑ جائے تو بصارت زائل ہو جائے گی۔ سننے کی حس اور دوسرے حواس کو بھی اسی پر قیاس کر لو۔ ان کی پوری تفصیل تو کئی جلدوں میں بھی نہیں آسکتی۔

اس کے بعد ارادہ، قدرت اور آلاتِ حرکت کی پیدائش میں طرح طرح کی نعمتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی انسان کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ تو سکتا ہو لیکن اس کے دل میں انھیں نوش جان کرنے کی رغبت پیدا نہ ہو تو اس کا یہ دیکھنا بے کار ہے۔ کتنے ہی مریض ہیں جو کھانے کو دیکھتے ہیں اور وہ ان کے لیے مفید بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ کھا نہیں سکتے کیونکہ کھانے کی خواہش نہیں ہوتی تو یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے اندر کھانے کی خواہش پیدا کی اور اسے تجھ پر مسلط کر دیا، گویا کہ وہ غذا، کھانے کا تقاضا کر کے تجھے مجبور کر دیتی ہے۔ پھر یہ خواہش ضرورت کے مطابق کھانا کھا لینے کے بعد ساکن نہ ہو جاتی، تو تو بہت زیادہ کھاتا اور اپنے نفس کو ہلاک کرتا، تو سیر ہونے کے بعد تجھ میں طمانیت پیدا کر دی کہ تو کھانا چھوڑ دے۔ اور یہی حال جماع کی خواہش کا ہے کہ اس میں بقائے نسل کی حکمت ہے۔

پھر تیرے لیے اعضا پیدا کیے کہ وہ غذا کھانے میں مدد دینے والے آلات ہیں۔ ان میں سے دو ہاتھ ہیں جو بہت سے جوڑوں پر مشتمل ہیں تاکہ مختلف جہات میں حرکت کریں اور لمبے ہوں اور لپیٹ لیے جائیں۔ وہ لکڑی کی طرح گاڑے ہوئے نہیں ہیں۔ کندھا ہے، انگلیاں ہیں جن کو مختلف بنایا۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ اور ان کو دو صفوں میں رکھا۔ اس طرح کہ انگوٹھا دوسری جانب میں ہے جو ساری انگلیوں پر پھرتا ہے۔ اگر یہ اکٹھی اور تہ بر تہ ہوتیں تو پورا مقصد حاصل نہ ہوتا۔ اور پھر ان میں ناخن پیدا کیے اور انگلیوں کے سروں کی ان سے ٹیک لگائی تاکہ طاقت حاصل کریں اور پھر ان سے باریک سے باریک چیزیں پکڑ سکتے ہیں۔

دیگر نعمتوں کا حال بھی یہی ہے۔ فرض کرو ہاتھ سے کھانا پکڑ لیا تو یہ کافی نہیں ہے۔ اللہ نے اپنی حکمت سے منہ اور دو جبڑے بنائے۔ ان میں دانت رکھے اور دانتوں کو کھانے کی ضرورت کے مطابق تقسیم کیا۔ بعض کھانے کو کاٹنے والے ہیں جیسے سامنے کے دانت رباعی اور بعض سخت چیزیں توڑنے کے لیے ہیں جیسے

انیاب (نوکیلے دانت) اور بعض پیسنے والے ہیں جیسے داڑھیں اور نیچے کے جبڑے کو حرکت دورویہ سے متحرک کیا۔ جبکہ اوپر کا جبڑا ایک جگہ پر ثابت رہتا ہے وہ حرکت نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت دیکھو کہ مخلوق کی بنائی ہوئی چکی کا نیچے کا پتھر ساکن رہتا ہے اور اوپر کا متحرک ہوتا ہے، لیکن جو چکّی اللہ نے بنائی ہے اس کا نیچے کا پاٹ اوپر کے پاٹ پر چلتا ہے۔ اگر اوپر کا پاٹ چلتا تو اُن اعضائے شریفہ کو خطرہ تھا جو منہ کے اندر تھے۔

پھر دیکھو اللہ نے زبان دے کر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ وہ منہ کے اطراف میں پھرتی ہے اور ضرورت کے مطابق کھانے کو منہ کے وسط سے دانتوں کی طرف پھیرتی ہے جیسے بیلچہ کہ غلّہ کو چکّی کی طرف دھکیلتا ہے اور اس کے بعد اس میں بولنے کی قوّت بھی ہے۔

فرض کیا کھانے کو کاٹ لیا، پیس لیا، لیکن وہ خشک ہے۔ اُس کو نگل نہیں سکتے جب تک کہ ایک طرح کی رطوبت پھسلا کر حلق میں نہ لے جائے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے زبان کے نیچے ایک چشمہ بنایا ہے جس سے لعاب بہتا ہے اور ضرورت کے مطابق کھانے میں شامل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانا گوندھا جاتا ہے۔

پھر اس گوندھے ہوئے نرم کھانے کو منہ سے معدے تک کون لے جاتا ہے؟ کیونکہ اُس کو ہاتھ سے تو معدے تک پہنچانا ناممکن ہے، تو اللہ تعالیٰ نے کوّے اور نرخرہ کو تیار کیا اور اس کے سر کے کئی حصے بنائے۔ یہ کھانا لینے کے لیے کُھل جاتا ہے، پھر بند ہو جاتا ہے اور نگلتا ہے، یہاں تک کہ کھانا اندر چلا جاتا ہے۔

اوّلاً روٹی اور پھل کے ٹکڑے ہوتے ہیں وہ اس کیفیت میں گوشت، ہڈی یا خون بن

تو اللہ تعالیٰ نے معدے کو ہنڈیا کی طرح بنایا ہے جس میں کھانا پکتا ہے۔ جو پکاتی ہے وہ چار اعضا سے اس کو پہنچتی ہے۔ دائیں جانب سے جگر، بائیں جانب سے تلی۔ آگے کی جانب سے انتڑیوں اور اوجھری کی چربی اور پچھلی جانب سے پیٹھ کا گوشت۔ پھر کھانا پکتا ہے اور سیال یک جان بن جاتا ہے جو رگوں کے جوف میں نفوذ کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ پھر وہ کھانا معدے سے جگر کی طرف چلا جاتا ہے اور اسے پکائے جانے کا عمل ایک بار پھر دہرایا جاتا ہے۔ اب وہ اعضا میں منتشر ہو جاتا ہے اور اس کا ثقل (فضلہ) باقی رہ جاتا ہے جو باہر نکل جاتا ہے۔

اعصاب کے نظام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا آدمی کے اندر بے شمار پٹھے اور رگیں ہیں اور ہر ایک میں

حکمتِ خداوندی ہے۔ اگر کوئی متحرک رگ ٹھہر جائے یا کوئی ٹھہرنے والی پھڑکنے لگے، تو انسان ہلاک ہو جائے۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اپنے اوپر دیکھو تاکہ تمھیں شکر کی قوت حاصل ہو۔ تم اللہ کی نعمتوں میں سے صرف کھانے کی نعمت کو جانتے جو سب سے معمولی ہے اور اس سے بھی تو صرف اتنا ہی کہ بھوک لگتی ہے تو کھانا پایا آتا ہے۔ اتنا تو جانور بھی جانتا ہے کہ وہ بھوکا ہوتا ہے تو کھاتا ہے۔ تھکتا ہے تو سوتا ہے اور شہوت آتی ہے تو جماع کرتا ہے۔

اور جب کوئی اپنے نفس سے وہی کچھ جانے جو ایک گدھا بھی جانتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر کیسے ادا کر سکے گا۔

اور یہ جو ہم نے مختصر سا اشارہ کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سمندر میں سے ایک قطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو گن نہ سکو)[1]

---

[1] سورۃ ابراہیم۔ آیت: ۳۴ و سورۃ نحل۔ آیت: ۱۸

فصل چہارم

وسائلِ حیات

معلوم ہونا چاہیے کہ کھانے مختلف ہیں، بہت ہیں۔ ان کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کے بے شمار عجائبات ہیں اور وہ منقسم ہیں: غذا، دوا اور فواکہات وغیرہ۔

ان میں سے ہم بعض غذاؤں پر گفتگو کرتے ہیں اور توجہ دلاتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس کچھ گندم ہو تو وہ اسے کھالے گا اور وہ ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ بھوکا رہ جائے گا، لہٰذا یہ بات ضروری ٹھہرتی ہے کہ وافر مقدار میں گندم فراہم کی جائے اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش جاری رہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کا معتبر ذریعہ کاشت کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم زمین میں بیج ڈال دو جس میں پانی ہو۔ پانی مٹی میں ملتا ہے تو کیچڑ بنتا ہے۔ پھر یہ پانی اور مٹی کافی نہیں، کیونکہ اگر تم گیلی سخت زمین میں بیج ڈال دو گے تو وہ نشوونما نہ پائے گا۔ کیونکہ ہوا نہیں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ دانہ ایسی نرم زمین میں ڈالا جائے جس کے اندر ہوا داخل ہو سکے۔ پھر ہوا بذاتِ خود حرکت نہیں کرتی بلکہ ایسے اثرات کی محتاج ہے جو اُسے حرکت دیں اور زور سے اس کو زمین پر پھیریں، یہاں تک کہ زمین کے اندر داخل ہو جائے۔ پھر یہ سب چیزیں بھی بے کار ہیں جب تک بیج کی قسم اور خواص کے مطابق موسم کی حرارت میسّر نہ ہو۔

پھر پانی کی طرف غور کرنا چاہیے جس کی زراعت محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسے پیدا کیا ہے؟ چشمے جاری کیے۔ ان سے دریا اور نہریں چلائیں اور چونکہ بعض زمینیں بلند تھیں جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا تھا، تو وہاں بادل بھیج دیے اور ہواؤں کو اُن کی سواری بنایا کہ دنیا کے مختلف اطراف تک کھینچ کر لے جائیں اور پیاسی زمین کو سیراب کریں۔

پھر دیکھو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو کیسے پانی کا محافظ بنایا ہے! ان سے آہستہ آہستہ چشمے پھوٹتے ہیں۔ اگر ایک ہی دفعہ پانی نکل آئے تو شہر غرق اور کھیتیاں تباہ ہو جائیں۔

پھر غور کرو سورج کو زمین سے دُور اُستوار کر کے کس طرح اس کو کام میں لگا دیا ہے۔ وہ کسی وقت زمین کو

گرم کرتا ہے اور کسی وقت نہیں کرتا، کہ ضرورت کے وقت ٹھنڈک حاصل ہو اور ضرورت کے وقت گرمی۔

اللہ ہی نے چاند کو پیدا کیا اور اس میں رطوبت پہنچانے کی خاصیت رکھی جیسے کہ سورج میں گرمی کی خاصیت ہے۔ اس سے علیم وخبیر اللہ کی حکمت کے مطابق پھل پکتے ہیں۔

اسی طرح جو بھی ستارہ آسمان میں پیدا کیا گیا ہے وہ کسی نہ کسی فائدے کے لیے مسخر ہے جیسا کہ سورج اور چاند ہیں اور ہر ایک میں اتنی حکمتیں ہیں کہ کوئی انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا اور چونکہ ہر مقام میں ہر طرح کی اجناس پیدا نہیں ہوتیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاجروں کو مقرر فرمایا اور اُن پر مال جمع کرنے کی حرص کو مسلط کیا۔ اگرچہ اپنی کوششوں میں وہ نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ اُن کی کشتیاں دریاؤں، سمندر میں غرق ہو جاتی ہیں۔ ڈاکو لوٹ کر لے جاتے ہیں یا کسی غیر علاقے میں وہ مر جاتے ہیں اور اُن کا مال وہاں کے حاکم ہتھیا لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی جدوجہد ترک نہیں کرتے، تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے اُن پر کیسے اُمید اور غفلت کو مسلط کر دیا ہے، یہاں تک کہ منافع کی اُمید میں کتنی سختیاں برداشت کرتے ہیں، سمندر کا سفر کرتے ہیں، خطرناک راہوں پر چلتے ہیں، تو وہ کھانے اور ضرورت کی چیزیں مشرق اور مغرب کے کناروں سے کھینچ کر لوگوں کے پاس لاتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مخلوق نعمت کے شکر میں کوتاہی صرف جہالت اور غفلت کی وجہ سے کرتی ہے نعمت کا شکر دراصل اس کی معرفت حاصل ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کم علم لوگ اگر وہ کسی نعمت کو جان بھی لیں تو خیال کرتے ہیں کہ اس کا شکر صرف اتنا ہی ہے کہ کوئی اپنی زبان سے کہہ دے الحمد للہ والشکر للہ (اللہ کا شکر ہے) وہ یہ نہیں سمجھتے کہ شکر کا مطلب یہ ہے کہ اس نعمت کو اس حکمت کی تکمیل میں استعمال کیا جائے جو اس سے مطلوب ہے اور یہی اللہ کی اطاعت ہے۔

نعمت سے غفلت کے کچھ اسباب

ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اس چیز کو نعمت نہیں سمجھتے جو عام لوگوں کو تمام حالات میں میسّر ہو؛ چنانچہ اسی لیے ان نعمتوں پر شکر نہیں کرتے۔ تم دیکھو گے کہ ہوا کے چلنے پر کوئی شکر نہیں کرتا، حالانکہ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر ذرا دیر کے لیے بھی بند ہو جائے تو وہ مر جائیں۔

اگر انھیں حمام یا کنوئیں میں قید کر دیا جائے، تو غم سے ہلکان ہو جائیں۔ پھر اگر کوئی ان مصائب سے نجات پائے تو اس کو ایک بڑی نعمت سمجھے گا اور اس پر اللہ کا شکر کرے گا۔ یقیناً یہ انتہائی جہالت کی بات ہے

کہ ان کا شکر اس پر موقوف ہو کہ اُن سے یہ نعمت چھین لی جائے اور اس کے واپس ملنے پر وہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ نعمت تو ہر حال میں شکر کی مستحق ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ آنکھوں والا آنکھوں کا شکر ادا نہیں کرتا مگر جب اندھا ہو جائے اور اس کی نظر لوٹائی جائے تو اسے نعمت سمجھے اور اس کا شکر ادا کرے۔

یہ تو اُس نامعقول غلام کی سی روش ہے جسے ہمیشہ مار پڑتی ہو اور جب ایک گھڑی مار نہ پڑے تو شکر کرے اور اسے نعمت سمجھے۔ اور اگر اسے بالکل نہ مارا جائے تو اُس میں غرور پیدا ہو جائے اور شکر کرنا چھوڑ دے۔

اب لوگ کچھ ایسے ہو چکے ہیں کہ صرف مال کو نعمت سمجھ کر شکر کرتے ہیں۔ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی باقی نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ کسی آدمی نے ایک اہل بصیرت کے سامنے اپنی تنگدستی کا شکوہ کیا، تو اُس نے کہا: "کیا تجھے پسند ہے کہ تو اندھا ہو جائے اور تجھے دس ہزار درہم مل جائیں"؟ اُس نے کہا نہیں۔ پھر کہا کیا تجھے پسند ہے کہ تو گونگا ہو جائے اور تجھے دس ہزار درہم مل جائیں؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر کہا کیا تجھے پسند ہے کہ تجھے بیس ہزار درہم مل جائیں اور تیرے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں؟ اُس نے کہا نہیں۔ پھر کہا کیا تجھے پسند ہے کہ تجھے دس ہزار درہم مل جائیں اور تو دیوانہ ہو؟ اُس نے کہا نہیں۔ تو اس نے کہا کیا تو شرم نہیں کرتا کہ اپنے مولا کا شکوہ کرتا ہے اور تیرے پاس اُس کا پچاس ہزار درہم کے برابر مال ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ کوئی شخص تنگدستی کے باعث پریشان ہو گیا، تو اس نے خواب دیکھا ایک آدمی نے کہا کیا تو پسند کرتا ہے کہ ہم تجھے ایک ہزار دینار دے دیں اور سورۃ انعام تجھ کو بھلا دیں؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر کہا سورۃ ہود؟ کہا نہیں۔ پھر کہا سورۃ یوسف؟ کہا نہیں۔ تو اس نے کہا تیرے پاس ایک لاکھ دینار کی رقم ہے اور پھر بھی تو شکوہ کرتا ہے؟ بیدار ہوا تو اس کا غم دور ہو چکا تھا۔

ابن سماک، ہارون الرشید کو نصیحت کرنے کے لیے گیا، تو پانی کا ایک پیالہ منگایا اور کہا: اے امیرالمومنین! اگر کسی وجہ سے آپ کو پانی نہ ملے اور آپ کے سارے جاہ وحشم کے بدلے ایک پیالہ پانی دینے کو کہا جائے تو آپ یہ سودا کر لیں گے؟ کہا ہاں۔ تو کہا اللہ برکت دے سیر ہو کر مفت میں پی لیجیے۔ جب ہارون نے پی لیا تو کہا اے امیرالمومنین! اگر کسی بیماری کی وجہ سے یہ پانی آپ کے پیٹ ہی میں رک جائے، یعنی پیشاب بند ہو جائے اور کہا جائے کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے سب دے دیں تو اس بیماری سے نجات مل سکتی ہے، تو کیا آپ یہ معاملہ بھی کر لیں گے؟ ہارون نے کہا۔ ہاں میں یہ بات منظور کر لوں گا۔ ابن سماک نے کہا۔ آپ نے جان لیا کہ ایک پیالہ

پانی کے مقابلہ میں آپ کی سلطنت کی حیثیت کیا ہے۔

کوئی بھی شخص غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سی نعمتیں ایسی دی ہیں جن میں عام لوگ شریک نہیں، ان میں سے ایک عقل ہے۔ تمام انسان اپنی عقل کے متعلق اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں اور ہر شخص اپنے آپ کو سب سے عقلمند آدمی سمجھتا ہے۔ کوئی کم ہی اللہ تعالیٰ سے عقل کا سوال کرتا ہے اور جب یہ عقیدہ ہے تو واجب ہے کہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

ایک ان میں سے خُلق ہے۔ عام روش یہ ہے کہ انسان دوسروں کے عیوب بیان کر کے ان کی مذمت کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان خطاؤں سے بری سمجھتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہو تو چاہیے کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس کے اخلاق اچھے بنائے اور دوسروں کی طرح بد خُلقی میں مبتلا نہ کیا۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر آدمی اپنے نفس کے باطنی امور کو جانتا ہے اور ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر آشکارا ہو جائیں تو انسان ذلیل ہو جائے اور جب یہ حال ہے تو وہ اللہ کا شکر کیوں نہیں ادا کرتا جس نے اس کی برائیوں کو ڈھانپ رکھا ہے اور خوبیوں کو ظاہر کیا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل صورت، اخلاق وصفات، بیوی بچوں، مکان وشہر، ساتھیوں اور قریبیوں۔ جاہ ومنزلت اور تمام محبوب اشیاء میں کچھ ایسی چیزیں عطا کی ہیں کہ اگر وہ اس سے چھین لی جائیں اور دوسروں کو دے دی جائیں تو وہ اس پر رضا مند نہ ہو۔ مثلاً اسے مومن بنایا کافر نہ بنایا۔ زندہ بنایا۔ جماد نہیں بنایا۔ انسان بنایا جانور نہ بنایا۔ مرد بنایا عورت نہ بنایا۔ تندرست بنایا بیمار نہ بنایا۔ صحیح سالم بنایا عیب دار نہ بنایا۔ یہ سب چیزیں ایسی خصوصیات ہیں جن کے لیے شکر واجب ہے۔

اگر انسان اپنے حال کو دوسرے کے حال سے بدلنا پسند نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی اس پر یہ ایسی نعمت ہے جو کسی اور پر نہیں۔ اور اگر وہ اپنے حال کو کسی کے حال سے بدلنا چاہتا ہے اور کسی کے حال سے بدلتا نہیں، تو اس کی نگاہ میں جو اچھے ہیں اُن کی تعداد پر غور کرے۔ لازماً وہ دوسروں کی نسبت کم ہوں گے۔ بالفاظ دیگر جو اس کے حال سے نیچے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگی بہ نسبت اوپر والوں کے۔ تو کیا بات ہے کہ وہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھتا ہے، نیچے والوں کو نہیں دیکھتا۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی تم میں سے کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے مال اور خلق میں افضل ہو تو چاہیے کہ ان کو بھی دیکھے جو اُس سے نیچے

ہوں اولیٰ ہے اُن سے افضل ہے"۔
ترمذی نے یہی حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ "اپنے سے نیچے والے کو دیکھو، اوپر والے کو نہ دیکھو۔ اس سے تم اللہ کی نعمت کو اپنے اوپر حقیر نہ سمجھو گے"۔
جو آدمی اپنے حالات پر غور کرے گا اُسے معلوم ہوگا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات ہیں۔ خصوصاً وہ آدمی جسے ایمان، قرآن وسنت، علم، فراغت اور صحت وامن عطا کیا گیا ہو۔
ایک حدیث میں مروی ہے کہ "جس نے قرآن پڑھ لیا وہ غنی ہے۔"
ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ "قرآن ایسی غنا ہے جس کے بعد فقر نہیں۔ اور اس سے بڑی غنا کوئی نہیں ہے"۔
ایک اور حدیث میں ہے "جس آدمی نے اپنے گھر والوں میں امن سے صبح کی اور اس کا بدن بھی تندرست ہے اور اس کے پاس اس دن کا کھانا بھی ہے، تو گویا ساری دنیا سمٹ کر اس کے پاس آگئی"۔
بعض نے کہا ہے:
"جب تجھے روزی، صحت اور امن کے ساتھ مل رہی ہے اور پھر بھی تو غمگین ہے، تو تیرا غم اللہ کرے کبھی ختم نہ ہو"۔
اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر سے جو دل غافل ہیں ان کا کیا علاج ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ بصیرت والے دل تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کر کے اُن سے آگاہ ہو جاتے ہیں، لیکن جو دل زنگ آلود ہیں وہ نعمت کو اس وقت نعمت سمجھتے ہیں جب اُن پر مصیبت آتی ہے۔ تو ایسے آدمی کا علاج یہ ہے کہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھے اور وہ کام کرے جو بعض متقدمین کرتے تھے۔ وہ شفاخانوں میں جا کر طرح طرح کی بیماریوں کا مشاہدہ کرتے۔ پھر اپنی صحت اور سلامتی پر غور کرتے۔
اسی طرح مجرموں کا مشاہدہ کرتے کہ ان کو قتل کیا جاتا ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں اور اُن کو سزائیں دی جاتی ہیں تو پھر ان سزاؤں سے اپنی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کرتے۔
وہ قبرستان میں جاتے اور جانتے کہ مُردوں کے نزدیک سب سے محبوب چیز یہ ہے کہ وہ پھر دنیا میں لوٹائے

---

[1] اور یہ حدیث مسلم: ۴، ۲۲۷۵ میں بھی ہے اور اس کی عبارت یہ ہے کہ "اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اور اوپر والے کو نہ دیکھو یہ بہت لائق ہے کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ جانو گے"۔ ابو معاویہ نے جو کہ اس حدیث کا ایک راوی ہے یہ الفاظ بھی بیان کیے ہیں "اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو"۔

جائیں تاکہ گنہگار اپنے گناہوں کا تدارک کرے اور نیک آدمی اپنی اطاعت میں اضافہ کرلے کیونکہ قیامت کا دن ہار جیت کا دن ہے۔ پھر جب وہ قبروں کا مشاہدہ کرتے اور جانتے کہ اُن کی سب سے زیادہ پیاری چیز یہ ہے، تو اس مہلت ملنے کی نعمت پر باقی عمر اللہ تعالیٰ کے شکر اور اطاعت میں گزار دیتے اور عمر کو ان کاموں میں صرف کرتے جن کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ہے آخرت کا توشہ تیار کرنا۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے اُن کو اپنے دل کا علاج اس بات سے کرنا چاہیے کہ وہ جان لیں کہ جب نعمت کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو وہ نعمت چلی جاتی ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ کہا کرتے تھے "نعمت پر ہمیشہ شکر ادا کیا کرو، کیونکہ کم ہی کوئی نعمت ہے جو کسی قوم سے چھیننے کے بعد اُن کو دوبارہ مل گئی ہو۔

فصل پنجم

صبر اور شکر کس طرح اکٹھے ہو سکتے ہیں؟

شاید تم کہو۔ کہ پہلے تم نے ذکر کیا ہے ہر موجود میں اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے، کہ مصیبت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، تو پھر صبر کا کیا مطلب ہے؟ اور اگر مصیبت موجود ہے تو شکر کا کیا مطلب ہے؟ صبر اور شکر کیسے اکٹھے ہو سکتے ہیں؟ صبر تو تکلیف کی وجہ سے ہوتا ہے اور شکر خوشی کی وجہ سے۔ اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ مصیبت موجود ہے جیسا کہ نعمت موجود ہے اور ہر مصیبت پر صبر کا حکم نہیں ہے۔ مثلاً کفر کہ یہ بھی مصیبت ہے اور اس پر صبر کا حکم نہیں۔ یہی حال گناہوں کا ہے۔

رہی یہ بات کہ کافر اپنے کفر کو مصیبت نہیں سمجھتا، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار ہو اور غشی کے سبب اسے تکلیف کا احساس نہ ہو۔ جو گنہگار اپنے گناہ کو جانتا ہے اس پر فرض ہے کہ گناہ چھوڑ دے۔ ہر وہ مصیبت جس کا چھوڑنا انسان کے اختیار میں ہو اس پر صبر کا حکم نہیں ہے۔ مثلاً پیاس کے ہوتے اگر کوئی شخص پانی پینا چھوڑ دے، حتیٰ کہ اس کی تکلیف بڑھ جائے تو اسے صبر کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

صبر کا حکم صرف اس تکلیف پر ہے جس کا ازالہ انسان کے اختیار میں نہ ہو اور اس صورت میں صبر مصیبت نہ رہے گا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک لحاظ سے نعمت معلوم ہو؛ چنانچہ اسی لیے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس پر صبر اور شکر دونوں اکٹھے ہو جائیں۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ بظاہر نعمت نظر آنے والی کوئی چیز باعث آزار ہو۔ مثلاً دولت کسی انسان کی ہلاکت کا سبب بن جائے۔ مال کی وجہ سے اس کے قتل کا قصد کیا جائے۔ یہی حال صحت کا ہے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی نعمت ایسی نہیں ہے جو کسی نہ کسی صورت میں مصیبت نہ لگتی ہو۔

کبھی بندے پر بعض امور میں مصیبت ہوتی ہے اور اس میں نعمت بھی ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان اپنی موت سے بے خبر ہے اور یہ اس پر نعمت ہے کیونکہ اگر اس کو جان لیتا تو زندگی مکدر ہو جاتی، اور غم لمبا ہو جاتا۔ اسی طرح ان چیزوں سے ناواقفی بھی نعمت ہے جو بعض آدمی اس کے لیے پوشیدہ رکھتے ہیں کیونکہ اگر وہ اس پر مطلع ہوتا، تو

اس کا دکھ بڑھ جاتا۔ اسی طرح لوگوں کی بری صفات سے بے خبر ہونا بھی نعمت ہے کہ اگر ان سے آگاہی حاصل ہو، تو ایسے لوگوں سے دل میں نفرت پیدا ہو کر مستقل تکدّر کی صورت پیدا ہو جائے۔

قیامت۔ لیلۃ القدر اور جمعہ کے دن کی مبارک ساعت کا مبہم ہونا بھی ایسا ہی ہے اور یہ سب نعمتیں ہیں کیونکہ جہالت، طلب اور اجتہاد کے جذبے کو طاقت ور بناتی ہے۔

غور کا مقام ہے جب جہالت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے پہلو ہیں تو پھر علم میں کتنی نعمتیں ہوں گی ؟

سچ یہ ہے کہ ہر موجود میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، یہاں تک کہ درد پانے والے کے حق میں درد بھی نعمت ہے۔ کبھی ایک کا دکھ دوسروں کے حق میں نعمت ہوتا ہے، جیسے قیامت کے دن کافروں کو سزا ملنا کہ وہ جنتی لوگوں کے حق میں نعمت ہے کیونکہ اگر کسی قوم کو بھی عذاب نہ ہوتا تو نعمت والے اپنی نعمت کی قدر نہ جان سکتے۔ جب دوزخی تکلیف پائیں گے تو جنتی لوگوں کی خوشی اور بڑھ جائے گی۔ دراصل تقابل ہی سے خوبیاں اور خامیاں اُجاگر ہوتی ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہلِ دنیا سورج کی روشنی دیکھ کر خاص طور سے خوشی کا اظہار نہیں کرتے حالانکہ اُن کو اس کی ضرورت بھی بڑی ہے اس لیے کہ وہ عام و خاص سبھی کے لیے ہے۔ آسمان کی زینت دیکھ کر خاص طور سے مسرت ظاہر نہیں کی جاتی، حالانکہ وہ ہر زینت سے زیادہ خوشنما ہے۔ وجہ یہ کہ وہ بھی عام ہے۔

ان مثالوں سے ہماری یہ بات درست ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق میں کوئی نہ کوئی حکمت اور نعمت ہے۔ یا وہ سب بندوں پر ہے۔ یا بعض پر، تو مصیبت کے پیدا کرنے میں بھی نعمت ہے یا مصیبت والے پر یا دوسروں پر، تو بندے پر صبر اور شکر کا وظیفہ ہر حال میں لازم ہے اس لیے کہ وہ نہ تو مطلق عذاب ہے اور نہ نعمت مطلق۔ کیونکہ انسان کبھی ایک چیز سے ایک لحاظ سے خوش ہوتا ہے تو دوسرے لحاظ سے مغموم۔ تو غم کی حیثیت سے صبر ہوگا اور خوشی کی حیثیت سے شکر۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کی مصیبتوں میں یہ پانچ چیزیں ہوتی ہیں۔ عقلمند کو ان پر خوش ہونا چاہیے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے:

پہلی یہ کہ ہر مصیبت اور مرض کے متعلق سوچنا چاہیے کہ یہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتا تھا، تو اُسے شکر کرنا چاہیے کہ اس سے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔

دوسری یہ کہ مصیبت دین کی نہیں جو دنیا اور عقبیٰ دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے جس مصیبت میں بھی مبتلا کیا اس میں مجھ پر

اللہ تعالیٰ کی چار نعمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ مصیبت دین میں نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اس سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور میں رضا بالقضا سے محروم نہیں ہوا اور پھر مجھے اس پر ثواب کی بھی امید ہے۔

ایک آدمی نے سہل بن عبداللہ سے کہا: "چور میرے گھر میں داخل ہوا اور میرا سامان لے گیا"۔ تو انھوں نے کہا: "اللہ کا شکر ادا کرو، اگر شیطان تمھارے دل میں داخل ہو جاتا اور ایمان بگاڑ دیتا پھر تم کیا کرتے؟ جس آدمی کو سو کوڑے مارنے کا حق ہو اگر وہ صرف دس کوڑے مارے تو وہ شکریہ کا مستحق ہے۔"

تیسری یہ کہ ہر سزا کے متعلق تصور ہو سکتا تھا کہ وہ آخرت پر ڈال دی جاتی۔ دنیا کے مصائب تو ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں تخفیف ہے، لیکن آخرت کی مصیبت ہمیشہ کی ہے۔ اگر ہمیشہ نہ بھی رہے تو بھی اس کی تخفیف کی کوئی صورت نہیں جس کو دنیا میں سزا دے دی گئی دوسری مرتبہ اسے آخرت میں سزا نہ ملے گی۔ جیسا کہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

صحیح مسلم میں ہے کہ مسلمان کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے لیے کفارہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی زخم، بلکہ کانٹا بھی جو اس کو چبھ جائے۔

چوتھی یہ کہ یہ مصیبت اس کے لیے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی اور لازماً اس کو پہنچنے والی تھی تو دنیا میں پہنچ چکی تو یہ بھی نعمت ہے۔

پانچویں یہ کہ اس کا ثواب اس کی تکلیف سے بہت زیادہ ہے کیونکہ دنیا کے مصائب آخرت کے راستے ہیں جیسے بچے کو کھیلنے کے اسباب سے منع کرنا اس کے لیے نعمت ہے کیونکہ اگر اسے ہر وقت کھیلنے دیا جائے تو یہ اسے علم اور ادب کے حصول سے روک دے گا اور پھر وہ ساری زندگی خسارہ اٹھائے گا۔

یہی حال مال، اہل و عیال اور اعضاء کا ہے کہ یہ چیزیں انسان کی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔

بے دین لوگ آخرت کا عذاب دیکھ کر تمنا کریں گے کہ کاش وہ دیوانے یا بچے ہوتے اور اللہ کے دین میں اپنی عقلوں سے تصرف نہ کرتے۔

جو چیز بھی ان میں سے بندے میں پائی جاتی ہے اس کے متعلق تصور ہو سکتا ہے کہ اس کی بھلائی اسی میں ہو، لہٰذا اُسے اللہ پر حسن ظن رکھنا چاہیے اور جو مصیبت پہنچے اسے اپنے حق میں بہتر خیال کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت بڑی وسیع ہے اور وہ بندوں کی مصلحت کو بندوں سے زیادہ جانتا ہے۔ کل روزِ حساب میں جب وہ اس کا ثواب دیکھیں گے تو شکر ادا کریں گے جس طرح کہ بچہ جوان ہونے کے بعد اپنے ماں باپ

اور استاد کا شکر ادا کرتا ہے کہ انھوں نے ادب سکھانے کے لیے اسے سزا دی تھی ۔ مصائب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہی تادیب ہے ۔

حدیث میں ہے "کہ اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے ۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ مہلک گناہوں کی بنیاد دنیا کی محبت ہے اور مراد کے مطابق بغیر کسی مصیبت و ابتلاء کے پے در پے نعمتوں کا ملنا دل میں دنیا کی محبت پیدا کرتا ہے ۔

اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ جب مصائب زیادہ ہو جائیں تو دل دُنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے ۔ دنیا انسان کے لیے قید خانہ بن جاتی ہے اور اس سے نجات پانا اس کی انتہائی خواہش ہوتی ہے ۔

اور جب صورتِ حال یہ ہے ، تو دنیا میں تکلیف کا ہونا ضروری ہے اور یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے کوئی تجھے بغیر مزدوری کے سینگی لگائے ۔ یا کوئی ایسی کڑوی دوا پلائے جس سے شفا کی امید ہو ۔ اگرچہ مریض درد اور تکلیف محسوس کرے گا ، لیکن صاحبِ فہم ہونے کی صورت میں اسے یہ طمانیت بھی حاصل ہوگی کہ یہ معمولی تکلیف بڑے عذاب سے نجات دینے کا باعث ہوگی اور وہ مصیبت پر بھی شکر کرے گا ۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات پر ایک بدو نے ان کے بیٹے کے پاس ان الفاظ میں تعزیت کی :

"صبر کر ہم بھی تیری وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ رعیت کا صبر تو سردار کے صبر ہی سے ہوتا ہے ۔ عباسؓ کے بعد تیرا صبر تیرے لیے عباسؓ سے بہتر ہے اور عباسؓ کے لیے اللہ تجھ سے بہتر ہے ۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا " اس کی تعزیت سے اچھی تعزیت مجھ سے کسی نے نہیں کی ۔"

اگر کوئی یہ کہے کہ صبر کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں وہ دلالت کرتی ہیں کہ دنیا میں مصیبت ، نعمت سے بہتر ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ درست نہیں ، کیونکہ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مسلمان کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لائے ۔ وہ مرغی کے چوزے کی طرح ہو چکا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " کیا تو نے کوئی دعا مانگی تھی یا بیماری کا سوال کیا تھا ؟" اس نے کہا ہاں ۔ میں کہا کرتا تھا " اے اللہ جو تو مجھے آخرت میں سزا دینے والا ہے وہ مجھے دنیا میں دے دے ۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "سبحان اللہ ! تو اس کی طاقت نہیں رکھتا ۔ تو نے اس طرح کیوں نہ کہا اے اللہ ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی کون سی دعا افضل ہے؟" تو فرمایا: "اللہ سے دنیا و آخرت میں معافی اور تندرستی کا سوال کرو۔" پھر وہ دوسرے دن آیا اور کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، کون سی دعا افضل ہے؟" تو فرمایا: "اللہ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور تندرستی مانگو۔" پھر وہ تیسرے دن آیا تو پھر کہا: "اللہ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور تندرستی مانگو۔ اگر تمھیں دنیا اور آخرت میں معافی اور تندرستی مل جائے تو تم کامیاب ہو۔"

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مصیبت کی مشقت اور بدبختی کے مسلط ہونے اور بری تقدیر اور دشمنوں کی خوشی سے اللہ کی پناہ مانگو۔"

مطرف نے کہا: "اگر مجھے معافی ملے اور میں شکر کروں، تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہے کہ میں مصیبت میں پڑوں اور صبر کروں۔"

فصل ششم

صبر افضل ہے یا شکر!

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ صبر افضل ہے شکر سے یا شکر بہتر ہے صبر سے۔ اور اس میں لمبی بحث ہے جو مصنف رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صبر اور شکر کے کچھ درجات ہیں۔ مثلاً:

صبر کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اللہ کا شکوہ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد رضا ہے جو صبر سے اعلیٰ مقام ہے اور اس کے بعد مصیبت پر شکر ہے اور یہ مقام رضا سے اعلیٰ ہے۔

اسی طرح شکر کے بھی بہت سے درجات ہیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کی پے در پے نعمتوں پر حیا کرنا بھی شکر ہے۔ یہ بات کہ انسان اللہ کا شکر ادا ہی نہیں کر سکتا، اس کا جاننا بھی شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عظیم حلم اور پردہ پوشی کو جان لینا بھی شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر کسی استحقاق کے نعمت ملنے کا اقرار کرنا بھی شکر ہے۔ یہ جان لینا کہ شکر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے یہ بھی شکر ہے۔ نعمتوں میں تواضع اور مسکنت اختیار کرنا بھی شکر ہے اور درمیانی واسطوں کا شکریہ ادا کرنا بھی شکر ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اُس نے خدا کا شکر بھی ادا نہ کیا"

منعم کے سامنے حسن ادب اور اعتراض نہ کرنا بھی شکر ہے اور نعمت کو اچھی طرح قبول کرنا اور تھوڑی نعمت کو زیادہ سمجھنا بھی شکر ہے۔

جو اعمال و اقوال شکر اور صبر کے تحت آتے ہیں وہ بے شمار ہیں اور ان کے مختلف درجات ہیں۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے میں مختصر بات کافی نہیں ہو سکتی؛ تاہم جب صبر کی نسبت اس شکر کی طرف ہو جو مال کو اطاعت میں خرچ کرتے وقت کیا جائے تو شکر افضل ہے کیونکہ اس میں صبر بھی ہے۔ اللہ کی نعمت پر خوشی بھی ہے اور فقیروں پر خرچ کرنے کی تکلیف برداشت کرنا اور اپنی مباح ضرورتوں میں خرچ نہ کرنا بھی ہے۔ اور جب مال کا شکر اس طرح ہو کہ اسے نافرمانی میں خرچ نہ کرے، بلکہ جائز کاموں میں خرچ کرے، تو اس صورت میں صبر شکر سے افضل ہے اور صابر فقیر اُس بخیل سے بہتر ہے جو اپنا مال اپنے جائز کاموں ہی میں خرچ کرے۔

کیونکہ فقیر نے اپنے نفس سے مجاہدہ اور اللہ کی آزمائش پر صبر کیا ہے۔

صبر کی جو بھی فضیلت شکر پر بیان ہوئی ہے اس سے یہی مخصوص مرتبہ مراد ہے کیونکہ لوگوں کے ذہن میں مال کی نعمت اور اس سے دولتمند ہونے کا مفہوم آتا ہے۔ شکر کا مفہوم لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، تو اس صورت میں وہ صبر جو عام لوگوں کے ذہن میں ہے اس شکر سے افضل ہے جسے عموماً لوگ شکر کہتے ہیں۔

جب تم ہماری بات پر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ہر بات کے لیے بعض حالات میں ترجیح ہے۔

بہت سے فقیر صابر، غنی شاکر سے بہتر ہیں جیسا کہ بیان ہوا اور بہت سے غنی شاکر، فقیر صابر سے افضل ہیں اور یہ وہ اغنیاء ہیں جو اپنے آپ کو فقیروں کی طرح سمجھتے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے لیے کوئی مال نہیں رکھتے۔ باقی سب خیرات کر دیتے ہیں۔

ضروری ہے کہ انسان جب خرچ کرے تو اپنی جاہ و منزلت نہ چاہے۔ نہ احسان رکھے۔ ایسا غنی، فقیر صابر سے بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اُمید اور خوف

معلوم ہونا چاہیے کہ اُمید اور خوف دو بازو ہیں جن سے مقرّب لوگ ہر اچھے مقام کی طرف اُڑتے ہیں۔ یا یہ دو سواریاں ہیں جن سے آخرت کی راہ کی ہر مشکل گھاٹی کو طے کیا جاتا ہے؛ چنانچہ اسی لیے ان کی حقیقت، فضیلت، اسباب اور متعلقات کا بیان ضروری ہے۔ ہم ان باتوں کو دو حصوں میں ذکر کرتے ہیں۔ پہلا حصّہ امید کے متعلق ہے اور دوسرا خوف کے متعلّق۔

معلوم ہونا چاہیے کہ امید سالکین کے مقامات اور طالبین کے حالات میں سے ہے اور جب کوئی صفت راسخ اور مضبوط ہو جائے تو اسے مقام کہتے ہیں۔ اگر عارضی اور جلد زائل ہونے والی ہو تو اسے حال کہا جائے گا۔ جیسے ایک زردی قائم رہنے والی ہے، جیسے سونے کی زردی۔ اور ایک زردی زائل ہونے والی ہے جیسے خوفزدہ کے چہرے کی زردی۔ اسی طرح دل کی صفات ان اقسام میں منقسم ہوتی ہیں۔ غیر ثابت کو حال کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دل سے پھر جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے ہر وہ چیز جو ملے خواہ وہ مرغوب ہو یا ناپسند۔ تو وہ زمانۂ حال کے متعلق ہو گی یا زمانۂ

ماضی کے متعلق۔ ان میں پہلی قسم کے نام ہیں: وجد۔ ذوق اور ادراک۔

دوسری کا نام ذکر ہے اور اگر آئندہ کے متعلق دل میں کوئی خیال آجائے اور وہ دل پر غلبہ حاصل کرلے تو اس کا نام انتظار اور توقع ہوگا اور اگر انتظار محبوب چیز کا ہے تو اس کا نام ہے امید اور اگر بری چیز کا ہے تو وہ خوف ہے۔

امید نام ہے محبوب چیز کے انتظار سے خوش ہونے کا، لیکن اس توقع کے لیے ضروری ہے کہ اسباب حاصل ہوں، لیکن اگر اس کے سبب یا عدم سبب کا علم نہ ہو، تو وہ تمنّا ہے۔ کیونکہ وہ بغیر کسی سبب کے انتظار رہے اور امید اور خوف کا نام اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں تردّد ہو۔ جو قطعی اور یقینی ہو اُس کو امید یا خوف نہیں کہا جائے گا۔ مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے سورج کے طلوع ہونے کی امید ہے اور مجھے اس کے غروب ہونے کا خوف ہے۔ کیونکہ اس کا طلوع اور غروب یقینی چیز ہے۔ ہاں یہ کہا جائے گا مجھے بارش ہونے کی امید ہے اور بارش نہ ہونے کا خوف ہے۔

اہلِ دل جانتے ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دل زمین ہے اور ایمان اس میں بیج اور طاعات زمین کو پاک صاف کرنے، نہر کھودنے اور اس کی طرف پانی لے جانے کے مراحل ہیں۔

وہ دل جو دنیا میں غرق ہے اس شور زمین کی طرح ہے جس میں بیج نہیں اُگتا۔

اس عمل میں قیامت کا دن کٹائی کا دن ہے اور ہر شخص وہی کاٹے گا جو بوئے گا اور یہ کھیتی ایمان کے بیج سے پیدا ہوگی۔

دل کی گندگی اور بداخلاقی کے ہوتے ایمان کم ہی نفع دیتا ہے۔ جیسا کہ شور زمین میں بیج نہیں اُگتا۔

انسان کی مغفرت کو امید کی کھیتی پر قیاس کرنا چاہیے۔ جس آدمی نے اچھی زمین انتخاب کی اور اس میں اچھا بیج ڈالا۔ پھر ضرورت کے مطابق اس کو پانی دیتا رہا۔ زمین کو کانٹوں اور گھاس سے پاک کرنے سے غافل نہ ہوا اور پھر اللہ کی طرف رجوع ہو کر دعا میں مصروف رہا کہ اُس کے کھیت آفات سے محفوظ رہیں، تو وہ ضرور اچھی فصل اٹھائے گا۔ اور اس کے انتظار کو اُمّید کہا جائے گا۔

اگر کسی نے بیج شور، سخت اور بلند زمین میں ڈالا جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کی نگرانی کی اور اس تساہل کے باوجود اچھی فصل کاٹنے کی توقع کرتا رہا، تو اس کے اس عمل کو حماقت کہا جائے گا امید نہیں۔

اسی طرح اگر بیج پاکیزہ زمین میں ڈالا، لیکن پانی نہ دیا۔ بارش کا انتظار کرتا رہا، تو اس کا نام تمنّا ہے

نہ کہ امید۔

گویا امید کا مفہوم اس محبوب چیز کے انتظار پر صادق آتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے طالب نے کوشش کی تمام منزلیں طے کرلی ہوں۔ صرف وہ چیز باقی رہ گئی ہو جو اس کے اختیار میں نہ تھی اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل کہ وہ موانع اور مفسدات کو دور کرے۔

بندہ جب ایمان کا بیج ڈال دے۔ اسے طاعات کا پانی دے۔ دل کو ارذل اخلاق کے کانٹوں سے پاک صاف کرکے اللہ کے فضل کا انتظار کرے کہ اسے موت تک ثابت قدم رکھے اور خاتمہ بالخیر ہو تو اس کا یہ انتظار امید محمود ہے جو اسے ہمیشہ طاعات پر آمادہ کرے گی اور موت تک ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی ترغیب دے گی۔

اگر ایمان کے بیج کو کاٹ دیا اور طاعات کا پانی نہ دیا یا دل کو ردی اخلاق سے بھرا ہوا چھوڑ دیا۔ دنیا کی لذات کی طلب میں منہمک رہا، تو بخشش کا انتظار حماقت اور دھوکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا[1] (ان کے بعد نالائق جانشین آئے جو کتاب کے وارث ہوئے۔ وہ اس دنیا کا سامان لیتے اور کہتے ہمیں معاف کردیا جائے گا)

ایک اور آیت میں اس بات کے قائل کی مذمت بیان کی: وَلَئِنْ رُدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا[2] (اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا، تو اس سے بہتر جگہ پاؤں گا)

شدادؓ بن اوسؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہوشیار وہ آدمی ہے جو اپنے نفس کو دبا کر رکھے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہش کے پیچھے لگا دے اور اللہ سے امید رکھے۔"

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "جس کی تو اطاعت نہیں کرتا اس کی رحمت کی امید رکھنا رسوائی و حماقت ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ[3] (یقیناً وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا یہی لوگ اللہ

---

[1] سورۃ اعراف - آیت: ۱۶۸ [2] سورۃ کہف - آیت: ۳۶

[3] سورۃ البقرۃ - آیت: ۲۱۸

کی رحمت کے امیدوار ہیں)

مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ ہیں جو امید رکھنے کے مستحق ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ بس یہی امید رکھتے ہیں کیونکہ دوسرے بھی امید رکھتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ امید بڑی اچھی چیز ہے کیونکہ وہی عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ نا امیدی بُری چیز ہے کیونکہ وہ عمل سے روک دیتی ہے۔ جو آدمی جانتا ہو کہ زمین شور ہے۔ پانی گہرا اور بیج نہیں اُگے گا تو وہ زمین کا خیال رکھنا چھوڑ دے گا اور اس کی نگرانی میں اپنے آپ کو نہ تھکائے گا۔

خوف امید کے برخلاف نہیں، بلکہ اس کا ساتھی ہے اور امید مجاہدے کا طریق بتاتی اور طاعات پر ہمیشگی پیدا کرتی ہے۔ خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ بدلتے رہیں۔ اور اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ اللہ کے پاس جانے کی خوشی ہمیشہ رہے۔ اس کی ہم کلامی کو نعمت سمجھے اور اس کی خوشامد میں نرمی اختیار کرے۔

یہ ہر اس بندے کے حالات ہیں جو کسی بھی بادشاہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اور جب انسان سے ملاقات کے لیے ایسا عجز اختیار کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسے افعال کیوں نہ ظاہر ہوں گے، اور اگر ظاہر نہ ہوں، تو یہ مقام امید سے نامحرومی کی دلیل ہے۔ جو آدمی ان علامتوں کے بغیر بھلائی کی امید رکھتا ہے وہ دھوکے میں مبتلا ہے۔

فصل ہفتم

اُمید کی فضیلت

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس سے معاملہ کرتا ہوں"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ "جو گمان بھی رکھے کوئی گمان رکھنے والا"۔

مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کسی آدمی کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ اس کا اللہ کے متعلق اچھا گمان ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ مجھ سے محبّت رکھو اور جو مجھ سے محبت رکھتے ہیں ان سے محبّت رکھو اور میری مخلوق کی نگاہ میں مجھے محبوب بناؤ۔ عرض کیا اے میرے رب! تیری مخلوق کی نگاہ میں تجھے کیسے محبوب بناؤں؟ تو فرمایا: میرا اچھا تذکرہ کرو اور میرے احسانات اور نعمتوں کا تذکرہ کرو۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "قیامت کے دن ایک بندہ کو دوزخ کا حکم ہوگا۔ وہ کہے گا میرا گمان اس طرح نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ کہے گا تیرا گمان کیا تھا؟ وہ کہے گا۔ میرا گمان تو یہ تھا کہ تو مجھے بخش دے گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کو چھوڑ دو"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اُمید کی دوا کے یہ دو آدمی بطور خاص محتاج ہیں:

ایک وہ جس پر ناامیدی غالب آچکی ہو کہ وہ عبادت چھوڑ دے۔

دوسرا وہ جس پر خوف غالب آچکا ہو یہاں تک کہ اپنے نفس اور اہل کو نقصان پہنچائے۔

وہ مغرور گنہگار جو عبادت سے منہ موڑنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھتا ہو اس کے حق میں صرف خوف کی دوائیں استعمال کرنی چاہئیں کیونکہ امید کی دوائیں اس کے حق میں زہر ثابت ہوں گی جس طرح کہ ٹھنڈک والے کے لیے شہد شفا، لیکن گرمی والے کے لیے مضر ہے؛ چنانچہ ضروری ہے کہ وعظ کہنے والا لطیف انداز اختیار کرے اور بیماری کے مقام کو نگاہ میں رکھ کر بالکل درست دوا تجویز کرے۔ ویسے اس زمانہ میں لوگوں

کو امید کی دوائیں نہ دینی چاہئیں، بلکہ خوف دلانے میں مبالغہ کرے گا البتہ جب بیماروں کی اصلاح مقصود ہو تو امید کے اسباب کی فضیلت بیان کرے تاکہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "عالم وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور نہ اُن کو اللہ کی پکڑ کے انداز سے بے خوف ہونے دے۔"

جب تم کو یہ معلوم ہو گیا تو اب امید کے اسباب معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں بعض تو غور و فکر سے متعلق ہیں اور کچھ روایات سے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے کتاب الشکر میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اس پر غور کرے۔ جب اسے دنیا میں بندوں پر اللہ کی رحمتوں کا علم ہو جائے اور اس کے عجائبات حکمت جان لے جو اس نے انسان کی فطرت میں رکھے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں نے بندوں کی دنیاوی مصلحتوں میں دقائق کی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کو پسند نہیں کیا کہ مراتب کی زیادتی (بلندی) اُن سے فوت ہو جائے، تو وہ اللہ کے بندوں کی ہمیشہ کی بربادی پر کیسے خوش ہوگا؟ جس نے دُنیا میں مہربانی فرمائی ہے وہ آخرت میں بھی ضرور مہربانی کرے گا۔ دونوں جہان کی تدبیر کرنے والا وہی تو ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا[1] (کہہ دیں اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو ۔ بے شک اللہ سب گناہ بخش دے گا)

فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ[2] (اور فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں اور زمین والوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں سے آگ کا وعدہ کیا ہے اور اپنے دوستوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ فرمایا: لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۔ ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ[3] (ان کے اوپر بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور نیچے بھی۔ اس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے)

فرمایا: وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ[4] (اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے)

---

[1] سورۃ زمر۔ آیت: ۵۳ [2] سورۃ شوریٰ۔ آیت: ۵ [3] سورۃ زمر۔ آیت: ۱۶
[4] سورۃ آلِ عمران۔ آیت: ۱۳۱۔

فرمایا: فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى [۵] (میں نے تم کو شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرایا ہے جس میں کوئی بڑا بدنصیب ہی داخل ہوگا جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا)

فرمایا: وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ [۶] (اور تیرا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کو بخشنے والا ہے)

احادیث میں سے وہ بھی ہے جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا: "شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا مجھے تیری عزت اور جلال کی قسم میں آدم کی اولاد کو آخری دم تک گمراہ کرتا رہوں گا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے میری عزت اور جلال کی قسم جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے میں بھی ان کو بخشتا رہوں گا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تمھیں لے جائے اور کوئی اور قوم لائے جو گناہ کریں، پھر بخشش مانگیں تو اللہ بخشے۔" (مسلم)

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اعمال درست کرو اور لوگوں کو اللہ کے قریب کرو اور خوشخبری دو کیونکہ کوئی بھی جنّت میں اپنے عمل سے داخل نہ ہوگا۔" صحابہ نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، کیا آپ بھی؟" تو فرمایا: "میں بھی داخل نہیں ہو سکتا، مگر جب کہ اللہ کی رحمت مجھے ڈھانپ لے۔"

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے، اے آدم! اٹھ اور جہنّم میں بھیجے جانے والوں کو اٹھا، تو وہ کہیں گے: اے رب! میں حاضر ہوں، اور اسی میں سعادت ہے، اور بھلائی سب تیرے ہاتھ میں ہے۔ اے میرے اللہ! آگ کا حصہ کتنا ہے؟ تو حکم ہوگا۔ ہزار میں سے نو سو ننانوے، تو اس وقت بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی۔ اور تو لوگوں کو مدہوش دیکھے گا اور وہ حقیقت میں مدہوش نہیں ہوں گے، لیکن اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا، تو یہ بات لوگوں پر بڑی شاق گزری۔ یہاں تک کہ ان کے چہرے متغیر ہو گئے اور کہنے لگے۔ اے اللہ کے رسول

---

۵ سورۃ اللیل۔ آیات: ۱۴ تا ۱۶ ۶ سورۃ رعد۔ آیت: ۶

اور وہ ایک ہم میں سے کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا "یاجوج ماجوج میں سے نوسو ننانوے اور تم میں سے ایک۔ تو لوگوں نے کہا اللہ اکبر، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم جنت والوں کا چوتھا حصہ ہوگے۔ خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ تم جنتیوں کا تیسرا حصہ ہوگے۔ اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ تم جنتیوں میں سے آدھے ہوگے" تو لوگوں نے تکبیر کہی پھر فرمایا: "اُس دن تم لوگوں میں اس طرح ہوگے جیسے سیاہ بیل میں سفید بال یا سفید بیل میں سیاہ بال۔"

تو دیکھو کیسے انداز سے ڈرایا، پھر جب وہ بے چین ہوئے تو کس طرح مہربانی کا تذکرہ فرمایا۔ جب دل خواہشات میں مطمئن ہوں تو انھیں بے چین کرنا چاہیے اور جب بے چینی بڑھ جائے تو تسلی دی جائے تاکہ معاملہ معتدل رہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اللہ قیامت کے دن اتنی بخشش فرمائے گا کہ کسی کے دل میں اس کا تصوّر بھی نہیں آسکتا۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک مجوسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کھانا مانگا۔ آپ نے نہ دیا اور کہا۔ "اگر تم مسلمان ہوجاؤ تو میں تمھیں کھانا کھلاؤں گا۔ اس پر اللہ نے ان کی طرف وحی کی۔ اے ابراہیم! میں اس کو کفر کے باوجود نوّے سال سے کھلا رہا ہوں۔ تو ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے۔ اُسے واپس لائے اور سب حال بتایا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نوازش پر تعجب کیا اور مسلمان ہوگیا۔

یہ وہ اسباب ہیں جو خائف اور مایوس لوگوں کے دلوں میں اُمید کی روح پھونک دیتے ہیں۔ ہاں مغرور اور بے وقوف لوگ ایسی باتیں نہیں سنتے، بلکہ وہ ایسی باتیں سنتے ہیں جن کو ہم اسباب خوف میں بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ اکثر لوگ ایسی ہی باتوں سے درست ہوتے ہیں جیسے، وہ غلام جو لاٹھی سے سیدھا رہ سکتا ہے۔

فصل ہشتم

خوف، اُس کی حقیقت اور درجات

معلوم ہونا چاہیے کہ خوف عبارت ہے دل کے اس درد اور جلن سے جو کسی تکلیف دہ چیز کے واقع ہونے کے سبب سے ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی آدمی بادشاہ کا گناہ کرے۔ پھر گرفتار ہو جائے اور اسے قتل ہونے کے ڈر کے ساتھ معافی کی توقع بھی ہو، ایسی صورت میں اس کے قلب کی کیفیت سزا پانے اور معاف کر دیے جانے کے اسباب کے مطابق ہوگی، یعنی اگر سزا کے اسباب کمزور ہوں گے، تو خوف بھی کم ہوگا۔

کبھی خوف گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کی عظمت و جلال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں کو ہلاک کر دے تو پھر بھی اسے کوئی پروا نہ ہوگی اور نہ اسے کوئی روک سکتا ہے، تو آدمی جتنا اپنے عیوب، اور اللہ تعالیٰ کے جلال، اور اس کی بے نیازی سے واقف ہوگا اتنا ہی اس کا خوف زیادہ ہوگا۔

سب سے زیادہ خوف اس آدمی کو ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اپنے نفس کو اور اپنے رب کو جانتا ہو۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ[1] (اللہ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں)

جب معرفت مکمل ہوتی ہے تو خوف اثر کرتا ہے اور اس کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ پھر اعضا پر ظاہر ہوتا ہے اور صفات متاثر ہوتی ہیں۔ مثلاً جسم کی کمزوری، چہرے کی زردی، رونے اور غشی بلکہ کبھی موت تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور کبھی دماغ کی طرف چڑھتی ہے تو عقل کو بگاڑ دیتی ہے۔

---

[1] سورۂ فاطر آیت: ۲۸

حقیقی معنوں میں خوف کا اعضاء پر اثر کرنا یہ ہے کہ وہ گناہوں سے رک جائیں اور تقصیرات کو پورا کرنے اور مستقبل کی تیاری کے لیے طاعات کو لازم پکڑیں۔

بعض نے کہا: "جو ڈرا، اس نے رات کو سفر کیا۔"

دوسرے نے کہا: "خائف وہ نہیں جو روئے بلکہ خائف وہ ہے جو گناہوں کو چھوڑ دے۔"

خوف کے نتائج یہ ہیں کہ وہ شہوات کو توڑتا ہے۔ لذات کو مکدر کرتا ہے اور جب یوں ہو تو محبوب گناہ بھی اس کی نگاہ میں مکروہ ہو جاتے ہیں جیسے کہ اس آدمی کو شہد برا معلوم ہوگا جسے علم ہو اس میں زہر ملا ہوا ہے پس اسی طرح خوف سے شہوات جل جاتی ہیں۔ اعضا شائستہ ہو جاتے ہیں۔ دل ذلیل اور مسکین ہو جاتا ہے اور تکبر، کینہ اور حسد ختم ہو جاتے ہیں۔

خوف اور اپنی عاقبت کے خطرات دل پر مسلط ہو جائیں تو وہ کسی اور چیز کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتا۔ اس کا شغل مراقبہ، مجاہدہ اور اپنا محاسبہ کرنا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کا حال اس آدمی جیسا ہو جاتا ہے جو ایک ظالم درندے کے پنجے میں آگیا ہو۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ غافل ہو جائے گا اور یہ بچ جائے گا یا وہ اس پر غلبہ حاصل کر کے اس کو ہلاک کر دے گا۔ اس کا شغل صرف اپنا حال ہے جس میں مبتلا ہے تو جتنا خوف طاقتور ہوگا اتنا ہی محاسبہ و مراقبہ طاقتور ہوگا اور جتنی اللہ تعالیٰ کے جلال اور صفات کی معرفت ہوگی اور جتنا اپنے نفس کے عیوب اور آئندہ کے احوال و خطرات کو جانے گا، اتنا ہی اس کا خوف ہوگا۔

خوف کا سب سے کمتر درجہ جس کا اثر اعمال میں ظاہر ہو یہ ہے کہ نواہی سے بچے، جس کے حرام ہونے کا شبہ ہو اس کو چھوڑنے کا نام ورع ہے اور اگر اس کے ساتھ تنہائی اور عیش سے روگردانی بھی ہو تو اس کا نام صدق ہے۔

خوف وجہ رحمت بھی ہے

معلوم ہونا چاہیے کہ خوف اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو علم اور عمل کے دوام کی طرف ہانکتا ہے؛ تاکہ اس کے ساتھ قرب کا مرتبہ حاصل کر سکیں۔

علماء کے نزدیک خوف کے تین درجے ہیں: افراط۔ اعتدال اور تفریط۔ اور ان میں سے اچھا اعتدال ہے۔ اور وہ ایسا ہے جیسے جانور کے لیے کوڑا۔ کیونکہ جانور کے لیے بہتر یہی ہے کہ کوڑے سے الگ نہ ہو البتہ مارنے میں مبالغہ بھی اچھا نہیں۔

انسان کے لیے وہ اس طرح ہے کہ کوئی آیت یا کوئی ہولناک بات سنی، تو دل میں ڈرا اور وہ رونے لگا، جب وہ سبب غائب ہو گیا، تو دل میں پھر غفلت آ گئی۔ یہ کمتر خوف ہے اور اس کا نفع قلیل ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ کمزور سی لاٹھی کسی طاقتور جانور کو ماری جائے اور اسے معمولی سی تکلیف ہو۔ اسے پوری طرح اندازہ نہ ہو کہ کیوں تادیب کی گئی ہے۔ قریب قریب یہی حالت عام لوگوں پر غالب ہے۔ سوائے عارفین اور علماء کے، یعنی وہ علماء اور عارفین جو اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کو جانتے ہیں ایسی معمولی تنبیہ سے بھی ہوشیار ہو جاتے ہیں۔

پہلی قسم، یعنی خوف کی زیادتی یہ ہے کہ مایوسی اور ناامیدی پیدا ہو جائے۔ اور یہ بھی بری ہے کیونکہ یہ عمل سے روک دیتی ہے اور کبھی انسان کو دیوانگی اور موت تک پہنچا دیتی ہے۔ دراصل ہر وہ چیز جو کسی کام کے لیے مطلوب ہو اس کا محمود درجہ صرف وہ ہے جس سے مقصود حاصل ہو سکے اور جو اس سے کم ہو یا حد سے گزر جائے تو وہ برا ہی ہے۔

خوف کا فائدہ احتیاط، ورع، پرہیزگاری، مجاہدہ و فکر و ذکر اور عبادت کی طرف راغب کرنا ہے۔ اس کا مقصد وہ تمام اسباب ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچائیں اور یہ ساری چیزیں زندگی کے سبب سے ہیں جس میں بدن کی صحت اور عقل کی سلامتی بھی ہو۔ جب ان چیزوں میں خلل پڑے گا، تو اصل فائدہ زائل ہو جائے گا۔

اگر کہا جائے کہ جو آدمی خوف سے مر جائے اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس نے اس حالت میں موت سے ایک ایسا مرتبہ پایا ہے کہ اگر اس کے سوا مرتا تو وہ مرتبہ اسے حاصل نہ ہوتا؛ تاہم اگر وہ زندہ رہتا اور معارف و اعلیٰ معاملات کے درجات تک ترقی کرتا تو یہ اس سے بہتر ہوتا کیونکہ بہترین سعادت اللہ کی اطاعت میں لمبی عمر پانا ہے۔ ہر وہ چیز جو عمر، عقل اور صحت کو ختم کر دے نقصان اور خسارہ ہے۔

خوف کی اقسام

معلوم ہونا چاہیے کہ خائف لوگوں کے مختلف مقامات ہیں، مثلاً،

بعض وہ ہیں جن کے دل پر توبہ سے پہلے ہی موت کے آنے کا خوف غالب ہوتا ہے۔

بعض وہ ہیں جن پر نعمتوں کے استدراج کا خوف غالب ہوتا ہے یا ان کو استقامت سے ہٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔

بعض وہ ہیں جن کو برے خاتمے کا خوف ہوتا ہے۔ اور ان میں سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ سابقہ زندگی کا خوف ہو کیونکہ خاتمہ، سابقہ کی شاخ ہے۔ اور اللہ جسے چاہے بغیر وسیلے کے بلند کرے اور جسے چاہے بغیر وسیلے

کے نیچے پھینک دے" وہ جو بھی کرے، اسے کون پوچھ سکتا ہے!!

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ لوگ جنتی ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں اور یہ دوزخی ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

خوف کھانے والوں میں سے وہ بھی ہیں جو سکراتِ موت اور اس کی سختی سے ڈرتے ہیں۔ یا منکر نکیر کے سوال سے یا عذابِ قبر سے ڈرتے ہیں۔

بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کی ہیبت۔ اور حساب کی گرفت اور پلصراط پر گزرنے اور دوزخ اور اس کی ہولناکیوں یا جنت کی محرومی یا اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہو جانے سے ڈرتے ہیں اور خوف کی یہ تمام حالتیں بذاتِ خود ناپسندیدہ ہیں، خوف کے لائق ہیں۔

اعلیٰ ترین مرتبہ اللہ تعالیٰ سے حجاب کے خوف کا ہے۔ اور یہ عارفین کا خوف ہے اور جس کا اس سے پہلے ذکر ہوا، وہ زاہدوں اور عابدوں کا خوف ہے۔

فصل نہم

خوف اور اُمید میں کس کو غالب رہنا چاہیے

ہر چیز کی فضیلت، طلب سعادت پر مدد کرنے کے لحاظ سے ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کا قُرب، تو ہر وہ چیز جو اس پر مدد کرے وہ فضیلت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ[1] (اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنت ہیں)

فرمایا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ[2] (اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے)

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب اللہ کے ڈر سے بندے کی کھال پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے (آندھی میں) درخت کے خشک پتّے"۔

ایک اور حدیث میں ہے "اللہ اس پر کبھی ناراض نہ ہوگا جس میں خوف ہے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے میری عزت وجلال کی قسم میں بندے پر دو خوف جمع نہ کروں گا اور نہ دو امن جمع کروں گا۔ اگر دنیا میں وہ مجھ سے بے خوف رہا تو میں قیامت میں اس کو ڈراؤں گا اور اگر دنیا میں مجھ سے ڈرا تو میں قیامت میں اس کو امن دوں گا"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دو آنکھوں کو کبھی آگ نہیں لگے گی۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی اور ایک وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں رات کو پہرا دیا"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ کہنے والے کی یہ بات کہ خوف افضل ہے یا امید؟ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ روٹی افضل ہے یا پانی؟

---

[1] سورۃ الرحمٰن۔ آیت: ۴۶

[2] سورۃ بیّنہ۔ آیت: ۸

اس کا جواب یہ ہے کہ کہا جائے بھوک کے لیے روٹی افضل ہے اور پیاسے کے لیے پانی۔ اور اگر دونوں جمع ہوں تو جس کی زیادہ ضرورت ہو اس کو دیکھا جائے گا۔ اگر دونوں برابر ہوں تو وہ دونوں برابر ہوں گے۔

خوف اور امید دراصل دو دوائیں ہیں جن سے دلوں کا علاج کیا جاتا ہے، تو ان کی فضیلت بیماری کے مطابق ہے۔ اگر اللہ کی پکڑ سے بے پروائی غالب ہو، تو خوف افضل ہے۔ اسی طرح اگر بندے پر نافرمانی غالب ہو تو بھی خوف افضل ہے، لیکن اگر مایوسی اور ناامیدی غالب ہو تو امید افضل ہے۔ ویسے یہ بھی جائز ہے کہ مطلقاً کہا جائے خوف افضل ہے۔ جیسے کہا جائے روٹی سکنجبین سے افضل ہے کیونکہ روٹی سے بھوک کا علاج کیا جاتا ہے اور سکنجبین سے صفراوی بیماریوں کا اور بھوک کی بیماری غالب اور اکثر ہے، تو روٹی کی ضرورت بھی زیادہ ہوگی؛ چنانچہ اسی لحاظ سے افضل ہے۔

مخلوق کا گناہ اور دھوکے میں مبتلا ہونا عام ہے اور اسی اعتبار سے خوف کا افضل ہونا مانا جائے گا۔

اگر ہم خوف اور امید کے مقام کو دیکھیں تو امید افضل ہے کیونکہ امید اللہ کی رحمت کے سمندر سے تعلق رکھتی ہے اور خوف اللہ کے غضب سے۔ متقی کے حق میں بہتر یہ ہے کہ اس کے دل میں خوف اور امید برابر ہوں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو وہ برابر ہوں گے۔

بعض سلف نے کہا: اگر آواز دی جائے کہ ایک آدمی کے سوا باقی سب جنت میں چلے جائیں گے، تو مجھے ڈر ہے کہ وہ آدمی میں ہی نہ ہوں! اور اگر آواز دی جائے کہ ایک آدمی کے سوا سب دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، تو مجھے امید ہے کہ شاید وہ آدمی میں ہی ہوں۔ یہ کیفیت مومن متقی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اگر کہا جائے کہ مومن کے دل میں خوف اور امید برابر کیسے ہو سکتے ہیں، حالانکہ وہ تقویٰ کے مقام پر ہے؛ اس کے دل میں تو امید کو غالب ہونا چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ مومن کو اپنے عمل کی صحت کا یقین نہیں ہوتا۔ اس کی مثال اس آدمی کی سی ہوتی ہے جو بیج ڈالے لیکن اس کی جنس اُسے معلوم نہ ہو اور نہ زمین کے مزاج کا پتہ ہو، تو بیج ایمان ہے اور اس کی صحت کی شرطیں بڑی باریک ہیں اور زمین دل ہے اور اس کا ناپاک اور پاک ہونا پوشیدہ امور ہیں۔ اخلاق کی صفتیں بہت مخفی ہیں۔ یقینی طور پر ان کا ادراک نہیں ہوتا اور اسی لیے مومن کے قلب پر خوف کا غلبہ رہتا ہے۔ اس کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ رہے ہیں کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا ہوں؟ اُن کو خوف تھا کہ اُن کے عیب اُن سے پوشیدہ نہ رہ گئے ہوں۔ بہرحال اچھا خوف وہی ہے جو عمل پر آمادہ کرے اور دنیا کی طرف مائل ہونے سے

دل میں بے چینی پیدا کر دے۔

ہاں موت آنے کے وقت انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ امید غالب ہو، کیونکہ خوف تو کوڑا ہے جو عمل پر آمادہ کرنے والا ہے اور اب عمل کا وقت نہیں ہے۔ اب تو خوف سے سوائے دل کی رگ کاٹنے کے اور کوئی فائدہ نہ ہوگا، البتہ اس حال میں امید اس کے دل کو طاقت دے گی اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو محبوب بنائے گی کسی کو لائق نہیں کہ اللہ کی محبت کے سوا اور حالت میں دنیا کو چھوڑ کر جائے۔ سب کو اللہ پر حسن ظن رکھنا چاہیے حضرت سلیمان تیمیؒ نے اپنی موت کے وقت حاضرین سے کہا: مجھے رخصت کی حدیثیں سناؤ، تاکہ میں اللہ سے حسنِ ظن کی حالت میں ملاقات کروں۔

فصل دہم

خوف پیدا کرنے والی باتیں

خوف دو طریقے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ نادان بچہ کسی مکان میں ہو اور کوئی درندہ یا سانپ آجائے، تو وہ اس سے بالکل نہیں ڈرتا، بلکہ بعض دفعہ تو کھیلنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑنا چاہتا ہے، لیکن اگر بچے کا باپ بھی اس کے ساتھ ہو اور وہ ڈر کر بھاگے، تو بچہ بھی ساتھ ہی ڈر جائے گا اور اپنے باپ کی موافقت میں واویلا کرے گا، تو بچے کا یہ خوف نقصان پہنچانے والی چیز کی معرفت حاصل ہو جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ باپ کی تقلید میں ہے۔

جاننا چاہیے کہ اللہ کا خوف بھی دو طرح کا ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف ہے اور یہ عام لوگوں کا خوف ہے۔ جب کوئی شخص اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے، تو اچھے برے کاموں کی مناسبت سے اس کے دل میں جنت اور دوزخ کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس پر خوف یا رجائیت غالب آتی ہے۔

دوسرا اللہ تعالیٰ کی جلالت و کبریائی کا خوف ہے۔ اور یہ علماء و عارفین کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ[1] (اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی صفات ہیبت اور خوف کا تقاضا کرتی ہیں اور علماء و عارفین بُعد اور حجاب سے ڈرتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری نے کہا: "آگ کا خوف فراق کے خوف کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ۔"

عام لوگوں کا یہ حال نہیں ہوتا۔ وہ تو طُرق کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ البتہ آگ کا خوف انھیں مضطرب کرتا ہے اور وہ بھی تقلیدی طور پر۔ وہ تو بچے کے سانپ سے خوف کے مشابہ ہے جو باپ کی تقلید میں ہوتا ہے، اسی لیے کمزور ہوتا ہے اور اکثر تقلیدی عقاید کمزور رہتے ہیں۔

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۳۰

پھر جب بندہ اللہ کی معرفت کی طرف ترقی کرے گا، تو لازماً اس سے ڈرے گا۔ اور یہ آدمی ایسے علاج کا محتاج نہیں جو اس کے دل میں خوف پیدا کرے، بلکہ یہ خوف اس کے علم اور عقیدے کی وجہ سے ہو گا۔

جو آدمی اعمالِ حسنہ میں کوتاہی کرتا ہے اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اخبار و آثار کو سنے اور خوف والوں کے حالات و اقوال کا مطالعہ کرے۔

اگر وہ اُن کی عقلوں اور ان کے منصب کو امید رکھنے والوں اور دھوکہ کھانے والوں کے مناصب کے مقابل رکھے گا، تو اُسے کوئی شک و شبہ نہ رہے گا کہ ڈرنے والوں کی اقتدا بہتر ہے کیونکہ وہ انبیاء اور علماء اور اولیاء ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک انصاری بچے کے جنازہ کے لیے بلایا گیا۔ تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، یہ بڑا خوش نصیب ہے جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے جس نے نہ گناہ کیا نہ گناہ کی عمر پائی۔" تو آپ نے فرمایا: "اے عائشہ کیا اس کے سوا بھی کوئی بات ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہنے والے پیدا کیے اور ابھی وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے کہ ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ ہو چکا اور کچھ دوزخ کے لیے پیدا کیے اور ابھی وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے کہ ان کے دوزخی ہونے کا فیصلہ ہو چکا۔"

اس ذیل میں سب سے عجیب یہ آیت ہے جس کا ظاہر تو امید ہے، حالانکہ وہ بڑی سخت ڈروانے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ[1] (اور میں اس آدمی کے لیے بڑا بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے، پھر ہدایت پر رہے)، تو یہاں مغفرت کو چار شرطوں سے مشروط کیا ہے جن کی صحت بڑی مشکل ہے۔

ڈرانے والی آیات میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ[2] (زمانے کی شہادت ہے کہ انسان ہمیشہ خسارہ میں رہا ہے)

اس کے بعد چار شرطیں ذکر کی ہیں جن سے انسان خسارے سے بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ[3] (اور اگر ہم چاہیں تو ہر جان کو اس کی ہدایت دے دیں لیکن ہماری یہ بات حق ہو چکی کہ میں جہنم کو سب جنوں اور انسانوں سے

---

[1] سورۃ طٰہٰ۔ آیت: ۸۲ [2] سورۃ عصر۔ آیات: ۱، ۲ [3] سورۃ سجدہ۔ آیت: ۱۳

بھر دوں گا)

یہ تو معلوم ہے کہ اگر معاملہ نیا ہوتا تو چارہ سازی کی بہت زیادہ امید ہوتی، لیکن جو چیز پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ اس کا تدارک ممکن نہیں، اسے تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اگر عارفین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی اور امید سے ان کے دلوں کو راحت نہ ملتی تو وہ خوف کی آگ سے جل جاتے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "جو آدمی موت کے وقت ایمان چھن جانے سے بے خوف ہو، اس کا ایمان چھین ہی لیا جاتا ہے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ کی وفات کا وقت آیا تو رونے لگے۔ ایک آدمی نے کہا: "اے ابو عبداللہ! میرا خیال ہے آپ کے گناہ بہت زیادہ ہیں۔" تو آپ نے زمین سے کچھ مٹی اٹھائی اور کہنے لگے۔ "خدا کی قسم! مجھے اپنے گناہوں کی اتنی بھی پروا نہیں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ موت سے پہلے میرا ایمان نہ چھین لیا جائے۔"

حضرت سہل رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: "مرید کو گناہ میں مبتلا ہونے کا ڈر ہوتا ہے اور عارف ڈرتا ہے کہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نبی نے اللہ کی بارگاہ میں بھوکا اور ننگا ہونے کی شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی:

"اے میرے بندے کیا تو اس پر راضی نہیں کہ میں نے تیرے دل کو کفر سے محفوظ رکھا ہے کہ تو مجھ سے دنیا کا سوال کرتا ہے؟" تو اس نے مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈالی اور کہا: "کیوں نہیں۔ میں راضی ہوں۔ مجھے کفر سے محفوظ رکھ۔"

جبکہ عارفین کا باوجود راسخ قدم ہونے کے یہ حال ہے کہ وہ خاتمے کی خرابی سے ڈرتے ہیں تو پھر کمزور لوگ کیسے نہ ڈریں!!

موت سے پہلے ایمان چھن جانے کے کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً بدعت، نفاق اور تکبر وغیرہ بری صفات۔ یہی وجہ ہے کہ سلف نفاق سے بہت ڈرا کرتے تھے۔

بعض نے کہا: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں نفاق سے پاک ہوں تو یہ مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہو۔ اور اس سے ان کی مراد عقیدے کا نفاق نہیں تھا، بلکہ اعمال کا نفاق مراد لیتے تھے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ "منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔"

خاتمہ کی خرابی دو طرح کی ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اس کے دل میں شک غالب آ جائے یا سکراتِ موت اور اس کی ہولناکیوں میں اللہ کا انکار کر دے تو اس سے دائمی عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت اس سے کم ہے اور وہ یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی پر ناراض ہو، یا اس پر اعتراض کرے، یا وصیت میں ظلم کر جائے، یا کسی گناہ پر اصرار کرتے ہوئے اس کی موت ہو جائے۔

بیان کیا گیا ہے کہ موت کی حالت میں شیطان کا حملہ سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ وہ اپنے مددگاروں سے کہتا ہے اس کو پکڑ لو، اگر یہ آج تمھارے قابو میں نہ آیا تو پھر تم اسے کبھی نہ پکڑ سکو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے "اے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت میرے حواس خراب کر دے۔"

خطابیؒ نے کہا: "یہ اس طرح ہوتا ہے کہ شیطان اس وقت انسان پر غالب آ جاتا ہے۔ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور توبہ کرنے سے روک دیتا ہے یا اسے مظالم سے عہدہ برآ نہیں ہونے دیتا یا اسے اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتا ہے یا موت کو اس کی نگاہ میں ناپسندیدہ بناتا ہے، تو وہ اللہ کی تقدیر پر راضی نہیں رہتا۔

وہ اسباب جن کی وجہ سے خاتمہ بالخیر نہیں ہوتا بہت سے ہیں تفصیلی طور پر ان کو بیان کرنا ناممکن ہے لیکن ان سب کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

اگر خاتمہ شک اور انکار پر ہو، تو اس کا سبب بدعت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات، یا افعال کے متعلق خلاف عقیدہ رکھے۔ خواہ تقلید کی وجہ سے ہو یا اپنی رائے فاسد سے، تو جب موت کے وقت پردہ اٹھتا ہے، تو اسے اپنے اس عقیدے کا باطل ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے علاوہ جتنے بھی اسلامی عقیدے ہیں وہ سب اسی طرح ہیں ان کی کوئی اصل نہیں۔

جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق سلف کے طریق پر بغیر کسی بحث و تمحیص کے مجمل عقیدہ رکھے وہ ان شاء اللہ ان خطرات سے محفوظ رہے گا۔

گناہوں پر خاتمہ ہونے کا اصل سبب ایمان کی کمزوری ہوتا ہے۔ اسی سے گناہوں میں انہماک پیدا ہوتا ہے۔ گناہ نورِ ایمانی کو بجھا دیتے ہیں اور جب ایمان کمزور ہو جاتا ہے، تو اللہ کی محبت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ پھر جب موت کے آثار شروع ہوتے ہیں تو یہ کمزوری اور زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا سے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے تو وہ سبب جو خاتمہ کو اس مقام تک پہنچاتا ہے وہ دنیا کی محبت اور اس کی طرف میلان ہے۔ دوسری طرف ایمان کی کمزوری

اللہ کی محبت کو کمزور کرتی ہے، لیکن جس کے دل میں اللہ کی محبت دنیا کی محبت پر غالب ہو وہ ان خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور دنیا سے اس طرح رخصت ہوتا ہے جیسے نیکوکار غلام اپنے مالک کے حضور پیش ہوتا ہے۔ اس کے دل میں مالک کے پاس آنے کی جو خوشی اور سرور ہوتا ہے وہ مخفی نہیں۔ پھر عزت افزائی اس کے علاوہ ہے۔

دوسری طرف جس کی روح اس حال میں نکلے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا انکار دل میں آرہا ہو یا وہ اللہ کی نافرمانی پر مصر ہو، تو وہ اللہ کے پاس اس طرح آتا ہے جیسے کوئی زبردستی اس کو لائے تو پھر جس سزا کا وہ مستحق ہوگا وہ بھی مخفی نہیں ہے۔

جو آدمی سلامتی کی راہ چاہے اسے چاہیے کہ ہلاکت کے اسباب سے دور رہے۔ خائفین کے دلوں کو یہی چیز بے قرار رکھتی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ دل پھرتے رہتے ہیں اور احوال بدلتے رہتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "بعض دفعہ آدمی دوزخیوں کے سے کام کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے۔ اور کبھی آدمی جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے"۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب بندے کی روح کو آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے، تو فرشتے کہتے ہیں "سبحان اللہ! یہ بندہ شیطان سے بچ کر آگیا، تعجب ہے کہ کیسے بچا!"

جب تم نے برے خاتمے کے معنی سمجھ لیے، تو اُس کے اسباب سے بچو، اور اصلاح کی تیاری کرو، اس تیاری کو آئندہ پر ڈالنے سے پرہیز کرنا ضروری ہے کہ عمر بہت تھوڑی ہے اور ہر سانس خاتمے کی طرح ہے کیونکہ ممکن ہے کہ تمھاری روح اسی حال میں قبض ہو جائے۔

انسان اسی پر مرتا ہے جس پر زندہ رہتا ہے اور جس پر مرے گا اسی پر اُٹھے گا۔

معلوم ہونا چاہیے اصلاح کی کوشش صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم بقدر کفایت پر قناعت کرو اور زائد چیزوں کی طلب چھوڑ دو۔ ہم ڈرنے والوں کی کچھ باتیں تم کو سناتے ہیں۔ امید ہے ان سے دل کی سختی دور ہو جائے گی۔

یہ تو تم مانتے ہو کہ انبیاء اور اولیاء تم سے زیادہ عقلمند تھے، تو ان کے خوف کی شدت میں غور کرو، شاید تم اپنے نفس کو تیار کر سکو۔

ملائکہ علیہم السلام کا خوف

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ[1] (وہ اپنے اوپر سے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور جو انھیں حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں)

ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں کہ جن کے کندھے اللہ کے ڈر سے کانپتے رہتے ہیں" اور پھر پوری حدیث بیان کی۔

ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ عرش اٹھانے والے فرشتوں کی آنکھوں سے نہروں کی طرح آنسو بہتے ہیں، اور جب وہ سر اوپر اٹھاتے ہیں تو کہتے ہیں: "تو پاک ہے جیسے تجھ سے ڈرنے کا حق ہے ایسا ڈرا نہیں جاتا" تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "جو میرے نام سے جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں وہ یہ بات نہیں جانتے"۔

جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے معراج کی رات جبریل علیہ السلام کو دیکھا وہ اللہ کے ڈر کی وجہ سے پرانی مشک کی طرح تھے"۔

ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ جبریل علیہ السلام، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو رو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: "کیوں روتے ہو؟" تو کہا: "جب سے اللہ نے جہنم کو پیدا کیا ہے اس ڈر سے میری آنکھیں خشک نہیں ہوئیں کہ میں اللہ کی نافرمانی کروں اور وہ مجھے اس میں ڈال دے"۔

یزید رقاشی نے کہا: "عرش کے گرد اللہ کے کچھ فرشتے ہیں جن کے آنسو قیامت تک نہروں کی طرح چلیں گے وہ اس طرح اللہ کے ڈر سے لرزتے ہیں کہ جیسے ہوا اُن کو اُڑا کر لے جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں"۔ اے میرے فرشتو، تم کیوں خوف کرتے ہو جبکہ تم میرے پاس ہو؟ تو وہ کہتے ہیں "اے رب! جتنا ہم تیری عزت اور عظمت کو جانتے ہیں اگر زمین والے جان لیں تو کھانا پینا چھوڑ دیں اور بستروں پر نہ لیٹیں، جنگلوں کی طرف نکل جائیں اور بیلوں کی طرح ڈکراتے رہیں"۔

محمد بن منکدر نے کہا: "جب جہنم پیدا ہوا، تو فرشتوں کے دل لرزنے لگے۔ پھر جب آدم پیدا ہوئے تو ان کے دلوں کو سکون ہوا۔

---

[1] سورۃ نحل۔ آیت: ۵۰

بیان کیا گیا ہے کہ جب ابلیس کی کارستانی ظاہر ہوئی تو جبرئیل اور میکائیل رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی کہ یہ رونا کیسا ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا: "اے رب! ہم تیری پکڑ سے بے خوف نہیں ہیں"۔ فرمایا: "اسی حالت پر رہو"۔

انبیاء علیہم السلام کا خوف

وہبؒ نے کہا: "آدم علیہ السلام جنت سے نکلنے کے بعد تین سو سال تک روئے اور غلطی ہو جانے کے بعد کبھی آسمان کی طرف اپنا سر نہ اٹھایا۔

وہیبؒ بن ورد نے کہا: "جب اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام پر بیٹے کے متعلق عتاب فرمایا اور کہا: اِنِّیٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ[1] (میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو) تو آپ تین سو سال تک روتے رہے۔ یہاں تک کہ رونے کی وجہ سے آنکھوں کے نیچے کھالیاں سی بن گئیں۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "ابراہیم علیہ السلام جب نماز میں کھڑے ہوتے تو اللہ کے خوف کی وجہ سے اُن کے سینے سے ہنڈیا کے اُبلنے کی سی آواز آتی۔"

مجاہدؒ نے کہا: "جب داؤد علیہ السلام سے خطا ہوئی، تو آپ چالیس روز تک سجدے میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے سبزی اُگ آئی جس نے سر کو چھپا لیا۔ پھر پکارا: "اے رب! پیشانی زخمی ہو گئی اور آنکھیں خشک ہو گئیں اور داؤد (علیہ السلام) کو اپنی غلطی کے بارے میں کوئی جواب نہیں ملا"۔ تو اُن کو آواز آئی کیا تو بھوکا ہے کہ تجھے کھانا دیا جائے؟ یا بیمار ہے کہ شفا دی جائے؟ یا مظلوم ہے کہ تیری مدد کی جائے؟ تو آپ کے مُنہ سے ایسی آہیں نکلیں کہ ساری سبزی میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس وقت اللہ نے اُن کو معاف کر دیا۔

کہا گیا ہے کہ داؤد علیہ السلام کو بیمار سمجھ کر لوگ بیمار پُرسی کے لیے آتے حالانکہ اُن کو صرف اللہ کا ڈر ہوتا تھا کوئی بیماری نہ ہوتی تھی۔

عیسیٰ علیہ السلام جب موت کو یاد کرتے تو آپ کے جسم سے خون پھوٹ آتا۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اتنا روئے کہ اُن کی ڈاڑھیں ننگی ہو گئیں تو اُن کی والدہ نے نمدے کی

---

[1] سورۃ ہود۔ آیت : ۴۶

دو نہیں ان کے رخساروں پر باندھ دیں۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں دیکھا کہ میں آپ کے کوے کو دیکھ لوں۔ آپ صرف تبسم فرماتے اور جب بادل یا آندھی دیکھتے تو آپ کے چہرے سے خوف ظاہر ہوتا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! لوگ جب بادل دیکھتے ہیں تو بارش کی امید کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جب آپ بادلوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے سے خوف ظاہر ہوتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: "اے عائشہ! میں اس سے مطمئن نہیں کہ اس میں عذاب ہو۔ ایک قوم کو آندھی سے عذاب ہوا اور ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہنے لگی: یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔" اسے صحیحین نے روایت کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو رونے کی وجہ سے آپ کے سینے میں ہنڈیا کے ابلنے جیسی آواز آتی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو پکڑ کر کہتے: یہ ہے جس نے مجھے ہلاکتوں میں ڈالا اور کہتے: کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹا جاتا پھر جلایا جاتا۔

اسی طرح طلحہ اور ابوالدرداء اور ابوذر رضی اللہ عنہم نے بھی کہا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قرآن کی آیتیں سنتے اور بیمار ہو جاتے۔ لوگ کئی دن تک ان کی بیمارپرسی کو آتے۔ آپ نے ایک دن زمین سے تنکا اٹھایا اور کہا: اے کاش میں یہ تنکا ہوتا۔ اے کاش میں کوئی چیز قابل تذکرہ نہ ہوتا۔ اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔" رونے کی وجہ سے آپ کے چہرے پر دو سیاہ لکیریں پڑ گئی تھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ جب مرجاؤں تو دوبارہ نہ اٹھایا جاؤں۔"

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کہا: کاش میں ایک مینڈھا ہوتا میرے گھر والے مجھے ذبح کر دیتے اور میرا گوشت کھا لیتے اور شوربا پی لیتے۔"

حضرت عمران بن حصین نے کہا: "اے کاش میں راکھ ہوتا جسے ہوائیں اڑا کر لے جائیں۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کاش میرے پاس کوئی آدمی ہو جو میرے مال کی نگرانی کرے اور میں

اپنا دروازہ بند کر لوں اور کوئی میرے پاس نہ آئے یہاں تک کہ میں اللہ سے جا ملوں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے رخساروں پر آنسو جاری ہونے کی لکیریں اس طرح تھیں جیسے پرانا تسمہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "اے کاش! میں بھولی بسری ہوئی چیز ہوتی۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "خدا کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھا ہے آج ان کی طرح کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ وہ پریشان، بال غبار آلودہ صبح کرتے، ان کی حالت ایسی ہوتی جیسے لٹا ہوا قافلہ، ان کی آنکھوں کے درمیان ایسے نشانات پڑے ہوتے جیسے بکریوں کے گھٹنوں پر، وہ رات اللہ کے سامنے سجدے اور قیام میں گزارتے۔ اللہ کی کتاب پڑھتے کبھی کھڑے ہوتے کبھی سجدہ کرتے۔ پھر صبح ہوتی اور اللہ کا تذکرہ ہوتا تو اس طرح کانپتے جیسے آندھی میں درخت۔ اور اُن کی آنکھیں بہتیں یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے۔ اور خدا کی قسم! اب تو گویا قوم غافل ہو کر سو گئی ہے۔"

تابعین اور بعد کے لوگوں کا خوف

حضرت ہرم بن حیان نے کہا: "خدا کی قسم! میں پسند کرتا ہوں کہ کاش میں کوئی درخت ہوتا جسے کوئی اونٹنی کھا جاتی، پھر مینگنی کی شکل میں مجھے پھینک دیتی اور میں قیامت کے دن حساب سے بچ جاتا۔ میں اس بڑی مصیبت سے ڈرتا ہوں۔"

حضرت حسین بن علی جب وضو کرتے تو رنگ زرد ہو جاتا۔ لوگ پوچھتے کیا بات ہے؟ تو کہتے: "کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں کس کے سامنے جا رہا ہوں؟"

حضرت محمد بن واسع رات کا اکثر حصہ روتے ہوئے گزارتے۔ خاموش نہ ہوتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب موت کا تذکرہ ہوتا تو پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے اور روتے، یہاں تک کہ ان کے آنسو ان کی ڈاڑھی پر بہتے۔ آپ ایک رات روئے تو گھر والے بھی رونے لگے۔ جب آنسو تھمے تو آپ کی بیوی فاطمہؒ نے کہا: اے امیر المومنین! میرے ماں باپ قربان۔ آپ کیوں روئے؟" تو کہا: "مجھے خیال آگیا کہ لوگ اللہ کے دربار سے پھر کر جنت کو جا رہے ہیں اور کچھ دوزخ کو۔" پھر آپ چیخے اور بے ہوش ہو گئے۔

جب خلیفہ منصور نے بیت المقدس کا ارادہ کیا، تو آپ ایک راہب کے پاس ٹھہرے جس کے پاس حضرت عمر بن عبدالعزیز ٹھہرا کرتے تھے۔ اس سے کہا: "مجھے عمر بن عبدالعزیز کی کوئی عجیب بات بتاؤ جو تم نے دیکھی ہو۔"

راہب نے کہا" ایک رات وہ میرے اس کمرے کی چھت پر رہے۔ چھت پر سنگ مرمر کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔ پرنالے سے پانی کے قطرے گرنے لگے۔ میں نے جا کر دیکھا تو آپ سجدے میں تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔"

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت فتح موصلی خون کے آنسو روتے۔

حضرت ابراہیم بن عیسیٰ یشکری نے کہا" میں بحرین میں ایک آدمی کے پاس گیا جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ میں نے اس سے آخرت کا تذکرہ کیا۔ اس نے بھی موت کا تذکرہ کیا اور پھر وہ چیخنے لگا، یہاں تک کہ اس کی جان نکل گئی۔"

حضرت مسمعؒ نے کہا: میں عبدالواحد بن زید کے پاس گیا۔ وہ وعظ کہہ رہے تھے۔ اُس دن اُن کی مجلس میں چار آدمی فوت ہو گئے۔

یزید بن مرثدؒ بہت روتے اور کہتے" خدا کی قسم! اگر مجھ سے اللہ تعالیٰ یہ کہے کہ میں تمھیں اس حمام میں قید کر دوں گا تو میرا حق تھا کہ میں ہمیشہ روتا رہتا۔ پھر میں کیسے نہ روؤں کہ اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو وہ مجھے آگ میں قید کرے گا۔"

حضرت سریؒ سقطی نے کہا" میں ہر روز آئینہ میں اپنا چہرہ اس خوف سے دیکھتا ہوں کہ میرا چہرہ سیاہ نہ ہو گیا ہو۔"

تو یہ تھا ملائکہ، انبیاء، عبادت گزاروں اور اولیاء کا خوف! ہمیں تو اُن سے بھی زیادہ ڈرنا چاہیے کیونکہ ہمارے درجات کم اور گناہ زیادہ ہیں۔

ڈر گناہوں کی کثرت سے نہیں بلکہ دل کی صفائی اور کمالِ معرفت سے آتا ہے۔ ہم اگر بے خوف ہیں تو جہالت کے غلبے اور دل کی قساوت کی وجہ سے۔ صاف دل کو تھوڑا سا خوف بھی حرکت میں لاتا ہے اور سخت دل پر کوئی وعظ اثر نہیں کرتا۔

ایک بزرگ نے فرمایا" میں نے ایک راہب سے کہا: مجھے کچھ نصیحت کرو تو اُس نے کہا: اگر تم سے ہو سکے تو اس آدمی کی طرح ہو جاؤ جسے درندوں اور سانپ بچھوؤں نے گھیر لیا ہو۔ اور وہ ڈر رہا ہو کہ اگر ذرا بھی غفلت کی تو درندے اس کو پھاڑ دیں گے۔ یا بھول گیا تو سانپ بچھو اسے ڈس لیں گے۔"

میں نے کہا" کچھ اور فرمائیے۔" تو کہا" پیاسے کو وہی کافی ہے جو آسانی سے مل جائے۔"

اس راہب نے ایسے شخص کی مثال دی ہے جسے درندوں اور حشرات الارض نے گھیر لیا ہو۔ یہ مثال مومن کے حق میں بالکل صحیح ہے۔ جو آدمی نورِ بصیرت سے اپنے اندر دیکھے گا اسے درندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھرا ہوا پائے گا۔ جیسے غضب، کینہ، حسد، تکبر، عُجب اور ریا وغیرہ۔ اگر یہ غفلت کرے گا تو یہ سب اس کو نوچیں گے اور پھاڑ کھائیں گے۔ ہاں دنیا میں ان کے مشاہدے سے حجاب ہے۔ جب پردہ اُٹھ جائے گا اور اسے قبر میں رکھا جائے گا تو یہ سانپ اور بچھو واضح طور پر دیکھے گا جو اس کو ڈسیں گے۔

جو آدمی موت سے پہلے ان پر غالب آنا یا ان کو مارنا چاہے وہ ایسا ضرور کرے، ورنہ اپنے نفس کو ان سے ڈسوانے کے لیے تیار کرلے، اور یہ جان لے کہ وہ صرف ظاہری جسم ہی کو نہ ڈسیں گے، بلکہ دل کو بھی ڈسیں گے۔

کتاب الفقر

- زہد و فقر
- فقر کی غنیٰ پر فضیلت
- فقیر کے آداب
- عطیّہ قبول کرنے کے آداب
- مجبور فقیر کے آداب
- زہد کی حقیقت، فضیلت اور اس کے درجات
- زہد کے درجات اور اقسام
- ضروریاتِ زندگی میں زُہد کی تفصیل
- زُہد کی علامتیں

فصل اوّل

زہد و فقر

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر گناہ کی جڑ دنیا کی محبت ہے اور اس سے بغض ہر نیکی کی بنیاد۔ اس کتاب کے پہلے ابواب میں دنیا کی مذمت بیان ہو چکی ہے۔ اب ہم اس سے بغض اور بے رغبتی کا تذکرہ کریں گے کہ وہ نجات دینے والی چیزوں کی جڑ ہے۔

دنیا سے مقاطعہ یا تو اس طرح ہو گا کہ دنیا بندے کو نہ ملے۔ اسی کا نام فقر ہے۔ یا بندہ اس کو چھوڑ دے۔ اس کا نام زہد ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم فقر اور زہد، نیز ان کے درجات کے بارے میں بیان کریں گے۔

فقر کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے وہ فقیر ہے، کیونکہ وہ اپنی ہر حاجت کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔ اسے جو کچھ ملتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتا ہے۔

فقر میں یہ پانچ صورتیں متصوّر ہو سکتی ہیں:

۱۔ اگر مال ملے تو اُسے بُرا سمجھے اور اس کی بُرائی سے بچنے کے لیے لینے سے گریز کرے۔ ایسے آدمی کا نام زاہد ہے۔ اور اس کے اس فعل کا نام زہد۔

۲۔ مال کی رغبت نہ ہو کہ اس کے حاصل ہونے سے خوش ہو اور نہ اس کو ناپسند کرے کہ اُس سے اُسے تکلیف ہو۔ ایسے آدمی کو راضی کہا جاتا ہے۔

۳۔ مال کا ہونا بہ نسبت نہ ہونے کے اسے پسند ہو، لیکن رغبت اتنی نہ ہو کہ اس کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہو، بلکہ اس کے پاس حلال طریقے سے خود بخود آ جائے تو اس سے خوش ہو اور لے لے۔ اور اگر اُسے اُس کی تلاش میں محنت کرنی پڑے، تو اس کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے آدمی کو قانع کہتے ہیں۔

۴۔ دل میں مال کی طلب ہو۔ اُس کے لیے محنت کرنے کا عزم بھی رکھتا ہو، لیکن اپنی عاجزی کی وجہ سے چھوڑ دے۔ ایسے آدمی کو حریص کہتے ہیں۔

۵۔ اپنے مقصد کے لیے مال حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو جیسے بھوکا اور ننگا جس کے پاس کھانا یا لباس

نہ ہو۔ ایسے آدمی کو مضطر (مجبور) کہتے ہیں، خواہ تلاش میں اس کی رغبت کمزور ہو یا طاقتور۔
ان میں سب سے اعلیٰ پہلی حالت ہے اور وہ ہے زہد۔ اس کے علاوہ ایک اور مقام بھی ہے جو اس سے بھی اعلیٰ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک مال کا وجود و عدم برابر ہو جائے۔ اگر ملے تو خوش نہ ہو۔ اور نہ ملے تو دُکھ نہ ہو۔

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کے پاس دراہم کی دو تھیلیاں آئیں۔ آپ نے اُن کو اسی دن تقسیم کر دیا۔ لونڈی نے کہا: "کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ایک درہم گوشت کے لیے رکھ لیتیں، جس سے ہم روزہ افطار کر لیتے"۔

آپ نے فرمایا: "اگر تم یاد کرا دیتیں تو میں رکھ لیتی"۔

جس آدمی کی ایسی حالت ہو کہ اگر اس کے پاس ساری دنیا کی دولت بھی آجائے تو اُس کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ مال کو اللہ کے خزانے میں سمجھتا ہے نہ کہ اپنے ہاتھ میں۔ ایسی حالت والے کو مستغنی کہا جاتا ہے۔ وہ مال کے وجود اور عدم سب سے بے نیاز ہے۔

احمد بن ابو الحواریؒ نے ابو سلیمانؒ دارانی سے کہا کہ مالکؒ بن دینار نے مغیرہؓ سے کہا: "گھر کے اندر جا اور جو زکوٰۃ مجھے دی گئی ہے وہ اٹھا کر لے جا۔ شیطان میرے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس کو چور لے جائے گا"۔

ابو سلیمانؒ نے کہا: "یہ زہد کی کمزوری ہے۔ جب ایک شخص دنیا سے بے رغبت ہو چکا ہے، تو اُسے کیا خواہ اسے کوئی لے جائے"۔

مال سے بھاگنا اور اس سے بے رغبت ہونا کمزوروں کے حق میں کمال ہے، لیکن انبیاء اور اولیاء کے حق میں تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

کبھی قوی بھی مال سے نفرت کا اظہار کرتا ہے تاکہ مال چھوڑنے میں کمزور اس کی پیروی کریں۔ واللہ اعلم۔

فصل دوم

فقر کی غنیٰ پر فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فقیروں کی مدح کے طور پر فرمایا، لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (ان فقیروں کے لیے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے)

فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ (ان فقیروں کے لیے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے)

احادیث بھی بہت ہیں۔ ان میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہے کہ "میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں عام داخل ہونے والے فقیر لوگ تھے اور دولتمند روکے گئے تھے" اور پھر پوری حدیث بیان کی اور وہ صحیحین میں ہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "اے اللہ! آلِ محمد کا رزق بقدر کفایت دے"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ "محمد کے گھر والوں نے جب سے وہ مدینہ میں آئے تین رات متواتر گندم کی روٹی سیر ہو کر نہ کھائی۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی"۔

مسلم کے افراد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ سارا سارا دن ان کو ردّی قسم کی کھجور بھی پیٹ بھرنے کے لیے نہ ملتی تھیں۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: "فقراء مومنین اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے"۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "دولتمندوں کی مجلس سے بچو"۔ اور فرمایا: "ایک بندے کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے معذرت کریں گے، جیسے کہ بندہ بندے سے دنیا میں معذرت کرتا ہے۔ پھر فرمائیں گے اپنی عزت اور جلال کی قسم میں نے تجھ سے دنیا کو اس لیے نہ روکا تھا کہ تو میرے نزدیک

۱؎ سورۃ بقرہ۔ آیت: ۲۷۳ ۲؎ سورۃ حشر۔ آیت: ۸

بے قدر تھا، بلکہ اس لیے روکا تھا کہ میں نے تیرے لیے بڑی بزرگی تیار کر رکھی تھی۔ اے میرے بندے، ان صفوں کی طرف نکل، جس نے تجھے میری رضا کے لیے کھلایا یا پہنایا تھا اس کا ہاتھ پکڑ، میں نے انھیں تیرے لیے بخشا۔"

حضرت موسٰی علیہ السلام سے کہا گیا جب تم فقیر کو آتا دیکھو تو کہو "نیک لوگوں کی نشانی خوش آمدید" اور جب تم دولتمند کو آتا دیکھو تو کہو "کسی گناہ کی سزا ہے جو دنیا ہی میں دے دی گئی ہے۔"

حضرت ابوالدرداءؓ نے کہا "دو درہم والے کا حساب ایک درہم والے کی نسبت زیادہ سخت ہوگا۔"

سفیان ثوریؒ کی مجلس میں فقراء آگے بیٹھتے اور اغنیاء پیچھے بیٹھا کرتے۔

ایک آدمی ابراہیمؒ بن ادہم کے پاس دس ہزار درہم لایا۔ آپ نے قبول نہ کیے اور کہا "کیا تو چاہتا ہے کہ میرا نام فقیروں کے دفتر سے مٹا دیا جائے؟ میں ایسا نہیں کروں گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "مبارک ہے وہ بندہ جسے اسلام کی ہدایت ہوئی اور زندگی کفایت سے گزری۔ جو اسے اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اس پر قناعت کی۔"

باقی رہا یہ سوال کہ غنی اور فقیر میں سے افضل کون ہے؟ تو ظاہری منقولات فقیر کی افضلیت پر دلالت کرتی ہیں، لیکن اس کی تفصیل ضروری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ شک اور اختلاف اس فقیر کے متعلق ہو سکتا ہے جو صابر ہو حریص نہ ہو اور اس غنی کے متعلق جو شاکر ہو اور اپنا مال نیک کاموں میں خرچ کرتا ہو۔ یا فقیر حریص یا غنی حریص کے متعلق۔ کیونکہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فقیر قانع، غنی بخیل اور حریص سے بہتر ہے۔ اور غنی نیکی میں مال خرچ کرنے والا فقیر حریص سے بہتر ہے۔ اور اگر دولت مند مباح چیزوں میں مال سے فائدہ اٹھائے تو فقیر قانع اس سے بہتر ہے۔

اس میں اصل بات یہ ہے کہ جو چیز مقصود بالذات نہ ہو بلکہ کسی اور چیز کے لیے درکار ہو، اس کو اس کے مقصود سے منسوب کرنا چاہیے۔ اسی سے اس کی فضیلت ظاہر ہوگی۔ دنیا بذات خود بری نہیں ہے، بلکہ بری اس لیے ہے کہ وہ وصول الی اللہ میں مانع ہے۔ اسی طرح فقر بھی بذات خود مقصود نہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ اس سے وہ تعلقات اور مشاغل ختم ہو نے ہیں جو اللہ تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔

کتنے ہی ایسے غنی ہیں جن کی دولت اُن کو خدا سے نہیں روکتی، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہما۔ اور کتنے ہی فقیر ہیں کہ اُن کا فقر ان کو مقصود سے روک دیتا ہے۔

اور انھیں اللہ کی محبت و اُنس سے پھیر دیتا ہے۔ اُس کو مشغول کرنے والی دنیا کی محبت ہے جس کے ساتھ اللہ کی محبت جمع نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز سے محبت کرنے والا اس میں مشغول رہتا ہے، خواہ اس کے فراق میں ہو یا وصال میں۔

دنیا غافلوں کی معشوقہ ہے۔ جو اس سے محروم ہیں وہ اس کی طلب میں مشغول ہیں۔ اور جو اس پر قادر ہیں وہ اس کی حفاظت اور اس سے فائدہ اٹھانے میں۔ اور اگر تم لوگوں کا خیال کرو، تو فقیر خطرات سے محفوظ ہے کیونکہ عیش و آرام کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور یہ بھی ایک بچاؤ ہے کہ اسے نہ ملے اور چونکہ اکثر آدمیوں کی یہی طبیعت تھی لہٰذا شریعت میں دولتمندی کی مذمت اور فقر کی فضیلت آئی ہے۔ ہم یہ فضیلت بیان کر چکے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "دو مومن جنت کے دروازے پر ملیں گے۔ ایک غنی ایک فقیر۔ جو دنیا میں اکٹھے تھے۔ فقیر کو جنت میں داخل کر لیا جائے گا اور غنی کو جب تک اللہ چاہے گا روک لیا جائے گا۔ پھر اسے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ فقیر اس سے ملے گا اور کہے گا: "اے بھائی! آپ کیوں رُک گئے تھے، خدا کی قسم آپ رُک گئے تو مجھے آپ کے متعلق ڈر پیدا ہوا۔ وہ کہے گا۔ اے بھائی، تمھارے بعد مجھے بہت بری طرح روک دیا گیا اور میں اتنا پسینہ بہا کر تمھارے پاس آسکا ہوں کہ اگر ہزار اونٹ کھٹے پودے کھا کر اس کو پینے لگتے تو سب سیر ہو جاتے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ محبوب کا فراق بڑا سخت ہوتا ہے۔ جب تو دُنیا کو پسند کرے گا، تو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرے گا۔ جو آدمی محبوب سے الگ ہو تو اس کی جدائی میں اسے اسی قدر تکلیف ہو گی جتنی اس سے محبت ہو گی پس چاہیے کہ اس سے محبّت کرو جو تم سے جدا نہ ہو۔ اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ دنیا سے محبّت نہ رکھو یہ تم سے جدا ہو جائے گی۔

فقیر کے آداب

اگر اللہ نے فقر میں مبتلا کیا ہے تو اسے بُرا نہ سمجھنا چاہیے اور اس سے بلند مقام یہ ہے کہ اس پر راضی اور خوش ہو۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے اور اسی پر اعتماد ہو۔

اگر حال اُلٹ جائے۔ خلقت سے شکوہ کرے اور اللہ کا شکر ادا نہ کرے تو فقر اس کے حق میں عذاب ہے، اسے شکوے کا اظہار نہ کرنا چاہیے، بلکہ تعفف اور تحمّل کا اظہار کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ[1] (جاہل، انھیں سوال نہ کرنے

---

[1] سورۃ بقرہ۔ آیت: ۲۷۳

کی وجہ سے غنی تصور کرتا ہے)

فقیر کو چاہیے کہ غنی کی تواضع اس کے غنی ہونے کی وجہ سے نہ کرے اور نہ اس کے پاس رغبت سے اٹھے بیٹھے۔

اسے یہ بھی چاہیے کہ اپنے فقر کی وجہ سے عبادت میں کوتاہی نہ کرے اور ضرورت سے زائد مال کو خرچ کرنے میں بخل نہ کرے۔ یہ خرچ فقیر کی پُر مشقت کوشش ہے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ، کونسا صدقہ افضل ہے؟ تو فرمایا: "غریب آدمی کی مشقت سے نکالی ہوئی چیز جو کسی فقیر کو پوشیدہ طور پر دی جائے۔"

فصل سوم

عطیہ قبول کرنے کے آداب

جب بغیر سوال کیے ملے تو اس میں تین چیزوں پر غور کرے نفس مال۔ دینے والے کی غرض اور لینے کی غرض۔
نفس مال کے متعلق تو یہ ہے کہ وہ تمام شبہات سے پاک ہو۔ اگر اس میں کوئی شبہ ہو، تو لینے سے پرہیز کرے۔
پہلے حلال حرام کے بیان میں شبہ کے درجات بیان کیے ہیں۔ کس سے بچنا واجب ہے اور کس سے مستحب۔
دینے والے کی غرض کے متعلق یہ ہے کہ یا تو وہ محبت کے لیے دے گا اور وہ ہدیہ ہے۔ اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے یہ کہ دینے والے کی غرض ثواب حاصل کرنا ہو، وہ زکوٰۃ اور صدقہ ہے، تو اس پر لازم ہے کہ اپنے نفس کی صفات کو دیکھے کہ کیا وہ اس کا مستحق ہے؟ اگر اس پر حال مشتبہ ہو، تو وہ بھی مشتبہ ہے اور اگر صدقہ ہے اور دینے والا اس کے دین کی وجہ سے دے رہا ہے تو پھر اپنے باطن کو دیکھے کہ کہیں وہ باطن میں نافرمان تو نہیں ہے کہ اگر دینے والے کو پتہ چل جائے تو وہ اس سے متنفر ہو جائے۔ جیسے کہ وہ عالم سمجھ کر دے اور وہ عالم نہ ہو۔
تیسرے یہ کہ اگر دینے والے کی غرض شہرت، ریا یا سُمعہ ہو تو اُسے چاہیے کہ رد کر دے اور اسے قبول نہ کرے۔ کیونکہ اگر اسے قبول کرے گا تو اس کے فاسد ارادے میں اس کا مددگار ہو گا۔
رہی لینے کی اپنی غرض تو غور کرے کہ وہ اس مال کا محتاج ہے یا اس سے بے نیاز، اگر اس سے بے نیاز ہے تو نہ لے۔ اور اگر محتاج ہے اور مال بھی شبہات سے پاک ہے جو ہم نے بیان کیے ہیں تو افضل یہ ہے کہ اسے قبول کر لے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو مال تیرے پاس بغیر کسی لالچ کے آجائے وہ لے لے۔ اور جو نہ آئے اس کے پیچھے نہ لگ"۔ (صحیحین)
ایک اور حدیث میں ہے "کہ جس کے پاس اپنے بھائی سے کوئی بھلائی بغیر سوال اور لالچ کے آجائے اسے قبول کر لے۔ واپس نہ کرے۔ یہ اس کو اللہ نے رزق دیا ہے"۔

مجبور فقیر کے آداب

معلوم ہونا چاہیے کہ سوال کرنے کی ممانعت اور رخصت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ رخصت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سوال کرنے والے کا حق ہے، اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔"

احادیث میں ہے کہ "سوال کرنے والے کو ضرور کچھ نہ کچھ دے دو اگرچہ جلا ہوا پایہ ہی کیوں نہ ہو۔"

اگر سوال کرنا حرام ہوتا (حد سے گزرنا ہوتا) تو حد سے گزرنے والے کی مدد اس کے حدود سے تجاوز کرنے پر جائز نہ ہوتی۔

سوال کرنے سے ممانعت کی احادیث بھی موجود ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی تم میں سے ہمیشہ مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو ملے گا اور اس کے چہرے پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔" (صحیحین)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال سے بچنے کا ذکر فرمایا تو کہا: "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔" (اوپر کا ہاتھ دینے والا ہے اور نیچے کا لینے والا)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی بغیر مجبوری کے مانگے وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کا چہرہ زخم زخم ہوگا۔" آخر تک یہ حدیث حسن ہے اور اس معنی میں اور بہت سی احادیث ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ سوال کرنا اصل میں حرام ہے کیونکہ اس میں تین چیزیں ضرور ہوتی ہیں:

پہلی: اللہ کا شکوہ۔ دوسری اپنے نفس کی ذلت اور کسی مومن کو اپنے نفس کو ذلیل نہ کرنا چاہیے۔ اور تیسری عام طور پر جس سے مانگتا ہے اس کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔

ضرورت کی حالت میں یا کسی اہم حاجت کے لیے جو ضرورت کے قریب ہو سوال کرنا جائز ہے اور مجبور کو جیسے بھوکے کا سوال کرنا جیسے اپنی موت یا بیماری کا خوف ہو اور ننگے کا سوال کرنا جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کچھ نہ ہو۔ یا سردی سے بچنے کے لیے کپڑے نہ ہوں اور یہی حال اس کا ہے جو چل سکتا ہے لیکن مشقت سے۔ اسے جائز ہے کہ سواری کے کرایہ کا سوال کرے، لیکن سوال نہ کرنا بہتر ہے۔ جس کے پاس روٹی ہو اور سالن نہ ہو اسے کراہت کے ساتھ مانگ لینا جائز ہے۔ اور یہی حال زین کے لیے سوال کرنے کا ہے۔ جس کے پاس سواری ہو لیکن زین نہ ہو وہ سوال کر سکتا ہے۔

سوال کرتے وقت محتاج کی طرح نہ مانگے، خود کو اللہ تعالیٰ کا محتاج خیال کرے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے شکوے کا پہلو پیدا نہ ہو گا۔

چاہیے کہ اپنے باپ یا قریبی دوست سے سوال کرے یا کسی سخی سے اپنی حاجت بیان کرے جس نے اچھے کاموں کے لیے مال رکھا ہو۔ ایسا کرنے سے یہ ذلت سے بچ جائے گا۔

اگر کسی ایسے آدمی سے لے جس کے متعلق جانتا ہے کہ اس نے محض شرم کی وجہ سے دیا ہے تو اس کا لینا جائز نہیں بلکہ لوٹانا واجب ہے۔

فقیر کو چاہیے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ نہ مانگے۔ اس چیز کا خیال رکھے کہ سوال کرنا محض دفع الوقتی کے لیے ہے۔ زیب و زینت کے لیے نہ مانگے۔ اگر اُسے علم ہو کہ ہر روز اسے کوئی نہ کوئی ایسا آدمی مل جائے گا جس سے سوال کرے تو ایک دن رات کی روزی کا بندوبست ہو جائے گا تو زیادہ مانگنا جائز نہیں۔ ہاں اگر یہ خوف ہو کہ دینے والا نہ ملے گا یا خوف ہو کہ سوال کرنے سے عاجز آ جائے گا، تو ایک دن کی ضرورت سے زیادہ کا سوال کرنا بھی جائز ہے۔ بہر حال ایک سال کے خرچ سے زیادہ مانگنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

بشیر حافی فرمایا کرتے تھے: فقیر تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ فقیر ہے جو مانگتا بھی نہیں اور اگر اسے دیا جائے تو لیتا بھی نہیں یہ فرشتوں میں سے ہے۔ اور ایک وہ فقیر ہے جو مانگتا نہیں اور اگر اسے دیا جائے تو لے لیتا ہے، تو یہ جنتی لوگوں سے ہے اور ایک فقیر وہ ہے کہ صرف ضرورت کے وقت مانگتا ہے تو اُس کے سوال کرنے کا کفارہ اس کا سوال کرنے میں سچ بولنا ہے۔"

شیخ جمال الدین رحمہ اللہ نے فرمایا: "میں کہتا ہوں فیصلے کی بات یہ ہے کہ اگر فقیر بغیر مانگے اپنا وقت گزار سکے، تو اُسے سوال کرنا جائز نہیں۔ اور اگر اس کا وقت تنگی سے گزرتا ہو تو دیکھا جائے گا تکلیف قابلِ برداشت ہے یا ناقابلِ برداشت۔ اگر تکلیف ناقابلِ برداشت ہو تو سوال کرنا جائز ہو گا۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: "جو بھوکا ہو اور سوال نہ کرے اور مر جائے تو وہ دوزخ میں گیا۔"

فصل چہارم

زہد کی حقیقت، فضیلت اور اُس کے درجات

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں زہد سالکین کے مقامات میں سے ایک بلند مقام ہے۔ اور زہد نام ہے ایک چیز سے منہ پھیرنا تاکہ اس سے بہتر کو حاصل کر سکے۔ شرط یہ ہے کہ جس سے منہ پھیرتا ہے وہ چیز بھی کسی نہ کسی طرح سے اسے مرغوب ہو۔ جو آدمی ایسی چیز سے منہ پھیرے جو نہ تو فی نفسہٖ مرغوب ہو اور نہ مطلوب، تو اُسے زاہد نہیں کہا جائے گا۔ جیسے کوئی آدمی کھانا چھوڑ دے تو اسے زاہد نہیں کہا جائے گا۔

حقیقی معنوں میں زاہد اُسے کہتے ہیں جو دُنیا چھوڑ دے۔ اور جو اللہ کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دے۔ زاہد کامل وہی ہے۔

جو دنیا سے منہ موڑے لیکن جنت اور اس کی نعمتوں کی بھی رغبت رکھے تو وہ بھی زاہد ہے لیکن یہ پہلے سے کم مرتبہ۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مال کا چھوڑ دینا، یا اُسے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے خرچ کرنا زہد نہیں ہے۔ زہد یہ ہے کہ دنیا کو آخرت کے مقابل حقیر سمجھ کر چھوڑ دے۔

جس کو معلوم ہو کہ دنیا برف کی طرح ہے جو پگھلتی ہے اور آخرت موتی کی طرح ہے جو باقی رہتا ہے تو اُس کی خواہش ہوگی دنیا کو بیچ کر آخرت خرید لے۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ[1] (آپ کہہ دیں دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے)

فرمایا: مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ[2] (جو تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا)

---

[1] سورۃ نساء۔ آیت: ۷۷ [2] سورۃ نحل۔ آیت: ۹۶

زہد کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ۔ (اور جو ہم نے ان کو آزمائش کے لیے دنیا کی زندگی کی زیبائش دی ہے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی کا مقصود دنیا ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے کام پراگندہ کر دیتے ہیں۔ اس کی جائیداد منتشر ہو جاتی ہے اور اس کی پیشانی پر محتاجی لکھ دی جاتی ہے۔ پھر دنیا اسے اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن جس آدمی کا مقصود آخرت ہو جائے اللہ اس کو یکسو کر دیتا ہے۔ اُس کا سامان محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔"

حضرت حسنؒ نے کہا: "قیامت کے دن اہل زہد کے علاوہ سب ننگے اٹھیں گے۔ کچھ لوگوں نے دنیا کی عزت کی تو اُس نے اُن کو سُولی پر چڑھایا۔ سو تم اس کو ذلیل کرو۔ جب تم اس کو ذلیل کرو گے تو اس وقت وہ بہت اچھی ہوگی۔

حضرت فضیلؒ نے کہا: "تمام برائی ایک گھر میں رکھ دی گئی ہے اور اُس کی چابی دنیا کی محبت ہے۔ اور سب بھلائیاں ایک گھر میں رکھ دی گئی ہیں اور اس کی چابی دُنیا سے بے رغبتی ہے۔"

بعض سلف کہتے تھے: "دنیا سے بے رغبتی دل اور بدن کو آرام دیتی ہے اور اس کی رغبت غم اور فکر بڑھاتی ہے۔"

زہد کے درجات اور اقسام

بعض لوگ دنیا سے بے رغبت ہونا چاہتے ہیں حالانکہ وہ اس کے عاشق نشین ہوتے ہیں۔ لیکن پھر وہ اپنے نفس سے مجاہدہ کرتے ہیں۔ ان کو متزہد کہا جاتا ہے اور یہ زہد کی ابتداء ہے۔
دوسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بخوشی دنیا سے بے رغبت ہو۔ اپنے نفس کو اس میں تکلیف نہ دے لیکن اس کی نگاہ میں زہد کی قدر و قیمت زیادہ ہو۔ ایسا شخص جلد ہی مراد پا لیتا ہے۔ اُسے یہ احساس مسرت بخشتا ہے کہ اُس نے ایک پیاری چیز ضرور چھوڑ دی ہے لیکن اُس سے زیادہ اچھی چیز حاصل کر لی ہے۔ جیسے کوئی دو

لہ سورۃ طٰہٰ۔ آیت: ۱۳۱

درہم لینے کے لیے ایک درہم کو چھوڑ دے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی خوشی سے زہد اختیار کرے اور اپنے زہد سے بھی بے رغبت ہو۔ وہ یہ سمجھے میں نے کوئی چیز نہیں چھوڑی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی ٹھیکرے کو چھوڑ دے اور ہیرا پکڑ لے۔ ظاہر ہے وہ ہیرے کو ٹھیکرے کا معاوضہ نہیں سمجھے گا۔ اور یہ کمال درجے کا زہد ہے۔

معلوم ہونا چاہیے دنیا چھوڑنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ سے ملنے جائے اور دروازے پر بیٹھا ہوا کتا اسے روک دے تو وہ روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے ڈال کر اندر چلا جائے اور بادشاہ کا قرب حاصل کرے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ شخص بادشاہ کے پاس اپنے اس ایک لقمے کا احسان جتائے گا جو اس نے کتے کو ڈالا تھا؟ یقیناً نہیں۔ تو شیطان اللہ تعالیٰ کے دروازے پر کتا ہے۔ وہ لوگوں کو داخل ہونے سے روکتا ہے، حالانکہ دروازہ کھلا ہے اور پردہ اٹھا ہوا ہے۔ دنیا لقمے کی طرح ہے، تو جس نے بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے دنیا کو چھوڑ دیا وہ پھر اس کا خیال بھی نہ کرے گا کیونکہ اس کے بدلے میں اسے جو کچھ دیا گیا ہے بہت بیش قیمت ہے۔ اگر کسی کو ایک ہزار سال عمر دی جائے تو دنیا کی تمام نعمتوں کی مثال آخرت کی تمام نعمتوں کے مقابلے میں ایک لقمہ ہے۔

مرغوبات کی نسبت سے زہد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب، حساب اور آئندہ کی ہولناکیوں سے نجات کے لیے زہد اختیار کر لیا جائے۔ یہ ڈرنے والوں کا زہد ہے۔

۲۔ ثواب اور موعودہ نعمتیں حاصل کرنے کے لیے زہد اختیار کیا جائے۔ یہ امید رکھنے والوں کا زہد ہے کہ انھوں نے نعمتوں کو نعمتوں کے لیے چھوڑا۔

۳۔ سب سے اعلیٰ زُھد یہ ہے کہ نہ تو دکھوں سے نجات کے لیے ہو اور نہ لذتوں کے حصول کے لیے، بلکہ صرف اللہ کی ملاقات کے لیے ہو۔ اور یہ محسنین اور عارفین کا زہد ہے۔

فصل پنجم

ضروریاتِ زندگی میں زُہد کی تفصیل

اہم ضرورتیں سات ہیں : کھانا، لباس، مکان، سامانِ خانہ، نکاح، مال اور جاہ و منزلت۔

پہلی ضرورت، یعنی کھانا۔ اس کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں زاہد کی رغبت صرف اتنی ہے جس سے بھوک زائل ہو جائے اور بدن کے موافق ہو۔ لذت اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتی۔

حدیث میں ہے کہ اللہ کے بندے عیش و عشرت میں نہیں رہتے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عروہ سے فرمایا : "ہم پر ایک ایک دو دو، تین تین چاند گزر جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آگ نہ جلائی جاتی۔" تو عروہ نے کہا : "اے خالہ جان! آپ کس چیز پر زندگی گزارتے تھے؟" تو آپ نے کہا : "دو سیاہ چیزوں پانی اور کھجور پر۔"

اس مضمون میں بہت سی مشہور احادیث ہیں۔

زاہد عام طور پر بالکل سادہ اور معمولی کھانا کھاتے تھے لیکن یہ بات بھی نہ تھی کہ اچھے کھانے کو انھوں نے اپنے لیے حرام کر لیا ہو۔ بیان کیا جاتا ہے حضرت سفیانؒ ثوری کے دسترخوان پر بھنا ہوا گوشت اور فالودہ ہوتا تھا۔

دراصل زہد یہ ہے کہ ایسی چیز کا قصد کرے جس سے بدن درست رہے اور عیش و عشرت میں نہ پڑے۔ اور اس میں بھی یہ بات ملحوظ رکھی جا سکتی ہے کہ کس شخص کی جسمانی حالت کیسی ہے اور اُسے کس نوعیت کی غذا استعمال کرنی چاہیے، کیونکہ سب کی جسمانی حالت ایک سی نہیں ہوتی، البتہ یہ بات ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ دنیا پرستی کا پہلو پیدا نہ ہو۔

بعض آدمی اپنی روزی کے لیے حلال کی چیزیں ذخیرہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نامرغوب بات نہیں۔ اس سے وہ زہد سے خارج نہیں ہو جاتے۔ درست بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے حالات کے مطابق احتیاط کی زندگی بسر کرنے کی آزادی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے حضرت داؤدؒ طائی کو بیس دینار وراثت میں ملے۔ آپ نے

ان کو بیس سال میں خرچ کیا۔

دوسری ضرورت لباس ہے، تو زاہد اس میں اتنے پر اکتفا کرتا ہے کہ گرمی سردی سے محفوظ رہے اور ستر پوشی کا مقصد پورا ہو جائے لیکن اس میں بھی کچھ حرج نہیں کہ زینت بھی حاصل ہو جائے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے بھی بعض اوقات انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ اسے خدا رسیدہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ ویسے فطری طور پر ایسی حالت ہو تو کوئی حرج نہیں۔

حضرت ابو بردہؓ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک پیوند لگی چادر اور موٹے کپڑے کا تہبند نکالا اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان دو کپڑوں میں ہوئی (صحیحین)

حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں خطبہ دیا اور آپ کی چادر میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

تیسری ضرورت مکان ہے۔ اس میں زاہد کے تین درجے ہیں: سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے لیے کوئی خاص جگہ نہ بنائے بلکہ مسجد کے گوشوں پر قناعت کرے۔ جیسے اصحاب صُفّہ تھے۔

درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اپنی خاص جگہ بنائے، لیکن کھجور کی شاخوں سے یا بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی جھونپڑی ہو یا گھاس پھونس کی۔

اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اینٹوں کا حجرہ بنائے لیکن اگر اسے کھلا اور بلند بنائے تو زہد کی حد سے نکل جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپ نے اینٹ پر اینٹ نہ رکھی (یعنی صرف معمولی جھونپڑیاں بنائیں)

حضرت حسنؒ نے کہا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جاتا تو میرا ہاتھ چھت کو لگ جاتا۔"

حدیث میں ہے کہ "آدمی کو تمام اخراجات کا اجر ملتا ہے سوائے مٹی میں لگائے ہوئے پیسے کے۔"

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا: "جب مکان بقدر کفایت ہو تو نہ اس کا اجر ہے اور نہ بوجھ۔"

مختصر یہ کہ جو چیز بھی ضرورت کے لیے بنائی جائے اس میں زہد کی حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

چوتھی چیز گھر کا سامان ہے۔ زاہد کو چاہیے کہ مٹی کے برتن رکھے اور اپنے کاموں میں ایک ہی برتن کو استعمال کرے۔ پیالے میں کھائے اور اسی میں پیے۔ جو آدمی بہت سے آلات بنائے یا نفیس چیزیں استعمال کرے وہ زہد سے خارج ہوا۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو دیکھنا چاہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی

حدیث ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔ آپ چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور چٹائی کے نشان آپ کے پہلو پر تھے۔ پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خزانہ (سٹور) دیکھا میں صرف ایک صاع (ٹوپہ) کے قریب جو پڑے ہوئے تھے۔

بخاری کی روایت میں ہے: "خدا کی قسم! میں نے وہاں کوئی چیز نہ دیکھی جس پر نگاہ اٹک جاتی" یہ حدیث مشہور ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور ایک مینڈھے کی کھال کے سوا ہمارے پاس کوئی بستر نہ تھا۔ ہم رات کو اس پر سو رہتے اور دن کو اس پر اونٹنی کا چارہ رکھ کر کھلاتے اور فاطمہ کے سوا میرے پاس کوئی خادم نہ تھا۔ آپ آٹا گوندھتیں تو مشقت کی وجہ سے آپ کی پیشانی کے بال تغاری کے کنارے سے آلگتے۔" (یعنی دباؤ زیادہ دینے کی وجہ سے زیادہ جھکنا پڑتا)

ایک آدمی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اُن کے گھر میں نظر دوڑانے لگا۔ پھر کہا: "اے ابوذر! آپ کے گھر میں مجھے کوئی سامان نظر نہیں آتا؟" آپ نے کہا: "ہمارا ایک گھر ہے ہم اپنا تمام قیمتی سامان اس میں رکھتے ہیں۔" اس نے کہا: "جبتک آپ یہاں ہیں آپ کو یہاں بھی سامان کی ضرورت ہے۔" آپ نے فرمایا: "مکان کا مالک ہمیں یہاں نہیں رہنے دے گا۔"

پانچویں ضرورت نکاح ہے اور اصل نکاح میں اور اس کی کثرت میں زہد کا کوئی نقصان نہیں۔

حضرت سہلؒ بن عبداللہ نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں سے محبت تھی۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ زاہد ترین صحابہ میں سے تھے۔ آپ کے پاس چار بیویاں اور دس سے زیادہ لونڈیاں تھیں۔

ابوسلیمان دارانی کہتے تھے "جو بھی تجھے اللہ سے غافل کر دے خواہ بال بچّہ ہو یا مال و دولت وہ بُرا ہے۔"

اس سلسلے میں فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ جس پر شہوت غالب ہو، اور اپنے نفس سے مطمئن نہ ہو تو نکاح اس کا مددگار ہے۔

جسے خوف نہ ہو اس کے لیے نکاح افضل ہے یا عبادت میں مشغول رہنا؟ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض وہ ہیں جو بقائے نسل کے لیے نکاح کرتے ہیں اور حلال کمائی سے خرچ بھی پورا کر سکتے ہیں تو نکاح اُن کے دین میں کوئی نقص نہیں پیدا کرتا اور نہ ان کا دل پریشان ہوتا ہے، بلکہ نکاح یکسو کر دیتا ہے۔ ان کی نظر کو روکتا ہے اور فکر کو واپس لاتا ہے اور یہ انتہائی فضیلت ہے اور اسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ وغیرہ

بزرگوں کا عمل تھا۔

جو لوگ نکاح کی لذت کو ترک کرنے میں زہد سمجھتے ہیں، اُن کی بات پر غور نہ کرنا چاہیے۔

بعض سلف خوبصورت عورت کے مقابل معمولی عورت کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسی عورتیں دین کی طرف بالعموم زیادہ مائل ہوتی ہیں، ان کا خرچ کم ہوتا ہے اور ان کا اہتمام آسانی سے ہو جاتا ہے، برخلاف خوبصورت عورت کے کہ وہ دل کو پریشان اور مشغول کرتی ہے اور زیادہ خرچ کا مطالبہ کرتی ہے۔

حضرت مالکؒ بن دینار نے کہا: "آدمی قصد کرتا ہے تو بڑی خوبصورت عورت سے نکاح کرتا ہے اور پھر کہتا ہے میں تو ریشمی بستر چاہتا ہوں، اور وہ اس کے دین کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔"

چھٹی ضرورت مال ہے اور یہ بھی زندگی میں ضروری ہے، تو اس میں زاہد اتنے پر اکتفا کرتا ہے جس سے وقت گزر سکے۔ بعض نیک لوگ تجارت کا شغل کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مانگنے سے بچیں۔

حضرت حماد بن سلمہؒ اپنی دوکان کھولتے اور جب دو حبّہ (دو جَو کے برابر چاندی کا ایک سکّہ) کما لیتے، تو دوکان بند کر دیتے۔

حضرت سعیدؓ بن مسیّب تیل کی تجارت کرتے تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے چار سو دینار چھوڑے، اور کہا: میں نے اس لیے چھوڑے ہیں کہ ان کی وجہ سے میں اپنی عزت اور دین بچاؤں۔"

ساتویں ضرورت جاہ و مرتبہ ہے۔ اور انسان کے لیے عزت بھی بڑی ضروری ہے، حتّٰی کہ ایک خادم کے دل میں بھی یہ خواہش موجزن ہوتی ہے، لیکن زاہد کا زہد میں مشغول ہونا دلوں میں اس کے لیے منزلت پیدا کرتا ہے، تو اُسے چاہیے کہ اس کے سوا کوئی اور خواہش قوی ہونے کی برائی سے بچے۔

مختصر یہ کہ دنیا میں باعزت طور پر رہنے کے لیے اسباب ضروری ہیں، لیکن ان اسباب ہی کو مقصد بنا لینا درست نہیں۔ سلف پر حلال مال پیش کیا جاتا، تو وہ کہتے ہم نہیں لیتے ہمیں خطرہ ہے کہ یہ مال ہمارا دین نہ بگاڑ دے۔"

زہد کی علامتیں

تم خیال کرتے ہو کہ مال کو چھوڑنے والا زاہد ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، کیونکہ مال کا ترک کرنا اور سخت زندگی کا اظہار اُس آدمی کے لیے بڑا آسان ہے جو زہد کی وجہ سے اپنی مدح کو پسند کرتا ہے۔ کتنے ہی راہب ہیں جو کٹیا میں رہتے ہیں، تھوڑا کھاتے ہیں اور اپنی ذات کی مدح کا تصوّر انھیں تقویت دیتا ہے اور یوں ان کی سخت کوشی ریا بن جاتی ہے

جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

زاہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال اور جاہ دونوں سے بے رغبتی کرے۔ یہاں تک کہ نفس کی لذتوں کا خیال ہی باقی نہ رہے۔ ویسے زہد کی ابتداء میں معرفت مشکل ہے۔

حضرت ابن مبارکؒ نے کہا: "بہترین زہد یہ ہے کہ زہد کو چھپایا جائے اور اس میں تین علامتوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔

پہلی یہ کہ موجود چیز پر خوش نہ ہو اور جو نہ ہو اس پر غمگین نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ[1] (تاکہ تم نہ ملنے پر غم نہ کھاؤ اور موجود پر خوش نہ ہو)

دوسری یہ کہ اس کے نزدیک مذمت کرنے والا اور مدح کرنے والا دونوں برابر ہوں اور یہ جاہ و منزلت کی طلب کے سلسلے میں زہد کی علامت ہے۔

تیسری یہ کہ اس کی محبت خاص اللہ سے ہو اس کے دل پر طاعت کی حلاوت غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور دنیا کی محبت کسی دل میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی برتن میں پانی اور ہوا جمع نہیں ہو سکتے۔ جب پانی داخل ہو گا تو ہوا خارج ہو جائے گی۔

بعض سے پوچھا گیا زہد نے ان کو کہاں تک پہنچایا؟ تو کہا اللہ کی محبت تک۔ حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا: "دنیا عروس کی طرح ہے جو اسے چاہتا ہے اسے کنگھی کرتا ہے، لیکن زاہد اس کا منہ کالا کرتا ہے۔ اس کے بال نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے۔ عارف اس کو چھوڑ کر اللہ میں مشغول ہے۔

یہ ہے جو ہم زہد اور اس کے احکام کے متعلق بیان کرنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ زہد توکل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لیے اب ہم انشاء اللہ اس کا بیان شروع کریں گے۔

---

[1] سورۃ حدید۔ آیت: ۲۳

کتاب التوحید و التوکل

- توحید اور توکل کی فضیلت
- توکل کے حالات اور اس کے اعمال
- متوکلین کے اعمال

فصل اوّل

توحید اور توکّل کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ[1] (اور مومنوں کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے)۔

فرمایا: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ[2] (اور جو اللہ پر توکل کرے اللہ اسے کافی ہے)

حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری اُمت سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے"۔ پھر آپ نے فرمایا "یہ وہ ہیں جو نہ داغ لگواتے ہیں نہ گنڈا تعویذ کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بس اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ صحیحین نے اسے روایت کیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ نے فرمایا: "اگر تم اللہ پر پوری طرح توکل کرو تو وہ تم کو اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے۔ وہ صبح بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پوٹے بھر کر آتے ہیں"۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے: "اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنے پسندیدہ اعمال اور اپنے سچے توکّل اور حُسنِ ظن کی مجھے توفیق دے"۔

واضح رہے کہ توکّل کی بنیاد توحید پر ہے اور توحید کے کئی طبقات ہیں۔ مثلاً،

پہلا یہ کہ دل اس کی تصدیق کرے جو اس کلمہ کا مضمون ہے "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس یقین کرنے کی یہ شرط ہے کہ بغیر کسی دلیل کے یہ بات مانے۔

دوسرا یہ کہ مختلف اشیا کو دیکھے اور سمجھے کہ ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہ اپنی ذات اور صفات میں واحد ہے۔ یہ مقربین کا مقام ہے۔

تیسرا یہ کہ آدمی پر جب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق و مالک نہیں ہے تو پھر وہ کسی دوسرے

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۲۲ [2] سورۃ طلاق۔ آیت: ۳

کی طرف نہیں دیکھتا۔ بلکہ اُسی سے ڈرتا ہے۔ اُسی سے اُمید رکھتا ہے، اُسی پر اعتماد اور اسی پر توکل کرتا ہے۔ وہ اس عقیدے پر پوری طرح جم جاتا ہے کہ اللہ واحد ہے۔ اللہ پاک ہے اور سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ کھیتی کے پیدا ہونے میں بارش پر اعتماد نہیں کرتا، نہ بارش کے نازل ہونے میں بادل پر انحصار کرتا ہے اور نہ کشتی کے چلنے میں ہوا پر کہ ان چیزوں پر اعتماد کرنا جہالت ہے۔

جس پر یہ حقائق منکشف ہو جاتے ہیں وہ جانتا ہے کہ ہوا خود بخود حرکت نہیں کر سکتی۔ ضروری ہے کہ اس کا کوئی محرک ہے اور وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

مشرک کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو قتل کرنے کے لیے پکڑا جائے اور پھر بادشاہ خاص مہربانی سے اس کی معافی کا فرمان جاری کر دے، تو وہ سیاہی، کاغذ اور قلم کا شکریہ ادا کرنے لگے جس سے فرمان لکھا گیا ہے اور کہے اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو میں نجات نہ پاتا۔ کس قدر افسوس ہے کہ وہ اپنی نجات قلم سے سمجھتا ہے۔ قلم کو حرکت دینے والے کو نہیں جانتا۔ اور یہ انتہائی جہالت ہے۔ جس کو معلوم ہو جائے کہ قلم بذاتِ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا وہ لکھنے والے کا شکرگزار ہوگا نہ کہ قلم کا۔ تمام مخلوق خالق کی ملکیت میں اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ قلم کاتب کے ہاتھ میں، تو پاک ہے وہ جو اسباب کا مسبب ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

توکّل کے حالات اور اس کے اعمال

معلوم ہونا چاہیے کہ توکّل، وکالت سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے فلاں آدمی نے فلاں آدمی کو اپنے کام کا وکیل بنایا، یعنی اپنا کام اُس کے سپرد کیا اور اس میں اُس پر اعتماد کیا۔

توکّل دراصل مُوکّل پر اعتماد کا نام ہے اور کوئی انسان اس وقت تک کسی پر اعتماد نہیں کرتا جب تک کہ اس میں چند باتوں کا یقین نہ رکھتا ہو۔ مثلاً شفقت، قوت اور ہدایت وغیرہ، اور جب یہ معلوم ہو گیا تو اُسی پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کو قیاس کر لیں۔

جب دل میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی خالق نہیں ہے اور اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پختہ ہو جائے گا کہ اللہ پورے علم اور قدرت اور رحمت والا ہے اور اس کی قدرت سے زیادہ کسی کی قدرت نہیں ہے اور نہ اُس کے علم سے بڑھ کر کسی کا علم ہے اور نہ اس کی رحمت سے زیادہ کسی کی رحمت ہے، تو لازماً دل اُسی اکیلے پر توکل کرے گا کسی دوسری ہستی کی طرف کسی طرح بھی توجہ نہ کرے گا۔

اگر نفس کی یہ حالت نہ ہو، تو اُس کے دو سبب ہو سکتے ہیں : (۱) یا تو ان صفات پر پختہ یقین نہیں ہے۔

(۲) اور یا بزدلی کے غالب ہونے کی وجہ سے دل کمزور ہے اور اس کی بے یقینی اوہام کے غلبے کی وجہ سے ہے۔

دل کی یہ حالت بھی وہم کی وجہ سے ہوتی ہے، حالانکہ یقین میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کی مثال کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص شہد لینا چاہے اور دیکھے کہ اس میں گندگی پڑی ہوئی ہے تو شہد خریدنے کی خواہش ماند ہو جائے گی۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ اگر کسی عقلمند آدمی کو کہا جائے کہ میت کے ساتھ ایک مکان، بستر یا قبر میں لیٹ کر رات گزارے تو وہ اس سے اجتناب کرے گا، اگرچہ اسے یقین ہے کہ اس وقت میت جماد (بے جان) ہے۔ اور سب جانتے ہیں تمام جمادات سے طبیعت متنفر نہیں ہوتی۔ یہ دل کی کمزوری ہے اور یہ اس قسم کی کیفیت ہے کہ کم ہی انسان اس سے خالی ہوں گے۔

کبھی انسان پر وہم غالب ہو جاتا ہے اور ہر چیز سے خوف کھاتا ہے یہاں تک کہ دروازے بند کر لینے کے باوجود اکیلا مکان میں رات نہیں گزار سکتا، لیکن اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ توکّل دل کی قوت اور یقین کی طاقت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا اور جب توکّل کے یہ معنی تمھاری سمجھ میں آ گئے تو معلوم ہونا چاہیے کہ قوت اور ضُعف میں اس حالت کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ وہ ہے جو ہم نے ذکر کیا، یعنی اس کا حال اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور اس کی کفالت اور عنایت پر ایسا ہو جیسا کہ وکیل پر اعتماد ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ زیادہ طاقتور ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا حال ایسا ہو جیسا بچّے کا اپنی ماں کے ساتھ، کہ بچّہ ماں کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ نہ اس کے سوا کسی کے پاس شکایت لے جاتا ہے اور نہ کسی پر ویسا اعتماد کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی معاملہ پیش آئے یا کوئی خیال آئے، تو سب سے پہلے اس کی زبان پر "اماں" کا لفظ آتا ہے؛ چنانچہ جو اللہ کا ایسا ہی شیدائی ہو اور اس پر ویسا ہی اعتماد رکھتا ہو جیسا بچہ ماں پر رکھتا ہے، تو وہ اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کر دے گا اور یہ سچا متوکّل ہو گا۔

اس درجے اور پہلے درجے میں فرق یہ ہے کہ یہ متوکّل اپنے توکّل میں ایسا فانی ہے کہ توکّل کے مفہوم پر بھی غور نہیں کرتا، اور اسی لیے اپنے متوکّل علیہ کے سوا کسی طرف توجہ نہیں کرتا، نہ اس کے دل میں کسی غیر کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ پہلا وہ درجہ ہے جو تکلّف اور کسب سے توکّل کرتا ہے اور اس حالت میں پوری طرح ڈوبا ہوا نہیں ہے۔ بس سرسری توجہ اس کی طرف ہے۔ اور یہ ایسا حال ہے کہ متوکّل علیہ ہر وقت اس کی توجّہ کا مرکز نہیں رہتا۔

تیسرا درجہ ان دونوں سے اعلیٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہو جائے جیسے غسال کے ہاتھوں میں میت۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو میت نہیں جانتا اور یہی فرق ہے بچے کی حالت میں اپنی ماں کے ساتھ کہ وہ اپنی ماں کے پاس شکایت لے جاتا ہے اور روتا ہے اور اس کا دامن تھامتا ہے۔

اور یہ وہ احوال ہیں جو مخلوق میں عام طور سے پائے جاتے ہیں۔ ہاں ان پر ہمیشگی مشکل ہے۔ خصوصاً تیسرے مقام پر قائم رہنا تو بہت ہی مشکل ہے۔

فصل دوم

متوکّلین کے اعمال

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ توکّل کا مطلب ہر قسم کی کوششوں اور تدابیر کو ترک کر دینا اور چیتھڑے کی طرح زمین پر گر پڑنا ہے یا خود کو ایسا بنا لینا ہے گویا ذبح شدہ جانور کا گوشت قصاب کے سامنے پڑا ہے۔ یقیناً یہ جاہلوں کا خیال ہے اور ایسا عقیدہ شریعت میں حرام ہے۔

شریعت نے توکّل کرنے والوں کو مقربین میں شامل کیا ہے اور بتایا ہے کہ توکّل کی تاثیر مقاصد کے لیے انسان کی حرکت اور کوشش سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً انسان کوئی نفع حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے جیسے کسی موجود چیز کی حفاظت کے لیے، یا کسی آنے والی تکلیف سے بچنے کے لیے، جیسے حملہ آور کو روکنا۔ یا کسی ایسی تکلیف کو دور کرنا جس میں مبتلا ہو۔ جیسے بیماری کا علاج کرنا وغیرہ۔

انسان کی سعی و جہد ان چار قسموں سے باہر نہیں ہوتی:

۱۔ نفع کا حاصل کرنا اور جن اسباب سے نفع حاصل کیا جاتا ہے ان کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ اسباب یقینی ہوں، جیسے وہ اسباب جن سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت سے مسببات ہمیشہ کے لیے وابستہ ہیں اور ان میں کبھی جدائی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص بھوکا ہو اور سامنے رکھے ہوئے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے اور کہے میں متوکل ہوں۔ یہ توکّل کی غلط توجیہ ہے۔ مطلق حرکت نہ کرنے اور کوشش سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کا کہیں بھی حکم نہیں ہے۔ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا۔ لقمہ منہ میں رکھنا، اسے چبانا اور نگلنا سب کوشش کے ذیل میں آتا ہے اور ایسی کوششوں کو کوئی بھی ترک نہیں کر سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کھانا کھانے کے سیر کر دے۔ یا کھانے میں حرکت پیدا کر دے کہ وہ خود بخود منہ میں آ جائے یا کسی فرشتے کو مقرر کر دے کہ وہ اس کو چبائے اور معدے میں پہنچا دے۔ اگر کوئی ایسا خیال کرتا ہے، تو سنت اللہ سے بے خبر ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ بغیر بیج کے کھیتی اُگا دے گا تو یہ سب دیوانگی ہے۔ عمل چھوڑنا توکّل نہیں ہے، بلکہ توکّل ایک علم اور ایک حال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

علم تو یہ ہے کہ تو جانے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے اور ہاتھ اور اسباب اور حرکت کی قوت کو پیدا کیا ہے اور اسی نے تجھے کھلایا اور پلایا ہے، اور حال یہ ہے کہ تیرا دل اور تیرا اعتماد اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہو، نہ کہ ہاتھ اور کھانے پر، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تیرا ہاتھ خشک ہو جائے اور تیری حرکت باطل ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی کو تجھ پر غالب کر دے اور وہ تجھ سے کھانا چھین لے، تو کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا توکل کے منافی نہیں ہے۔

دوسرا درجہ ایسے اسباب کا ہے جو یقینی نہیں ہیں، لیکن عموماً مسببات ان کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جو شہروں سے دور آباد ہو جائے اور سفر کی نیت سے ایسے جنگلوں کی طرف نکلے جدھر کوئی انسان شاذ و نادر ہی جاتا ہو اور اپنے ساتھ زادِ راہ بھی نہ لے جائے، تو یہ آدمی اللہ تعالیٰ کا امتحان لینے والا ہے۔ اور اس کا یہ کام ناجائز ہے۔ اسے تمام معاملات پر غور کرنے اور زادِ راہ لینے کا حکم ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب سفر کیا تو زادِ راہ بھی لیا اور منزل تک رہنمائی کرنے کے لیے کسی واقف کار کو بھی ساتھ لیا۔

تیسرا درجہ ایسے اسباب کا ہے جو کسی مقصد کے حصول میں معاون بنتے ہیں۔ انھیں اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ ہاں اگر وہ زائد از ضرورت چیزیں اکٹھی کرے تو اسے حریص کہا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کسب کا چھوڑنا توکل نہیں ہے۔ یہ ان کم کوش لوگوں کا کام ہے جو راحت پسند ہوتے ہیں اور بہانہ توکل کا کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "متوکل وہ ہے جو زمین میں بیج ڈالے اور پھر اللہ پر توکل کرے"

۲۔ دنیا کی حرص توکل کے خلاف ہے۔ اگر ایک آدمی جائز کام کر کے روزی حاصل کرے اور اپنے حالات کا اندازہ کر کے بال بچوں کے لیے محفوظ رکھے اور ان کی آسائش کے لیے سوچے، تو یہ توکل کے خلاف نہیں۔

صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کی کھجوروں کو بیچ دیا کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لیے سال بھر کا خرچ رکھ لیا کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا تھا تو جواب یہ ہے کہ انھیں ایسے مہمانوں کی میزبانی کرنی ہوتی تھی جو خالی ہاتھ ہوتے تھے، اصحاب صفہ کا یہی حال تھا؛ چنانچہ ایسی صورت میں یہی بہتر تھا کہ جو کچھ حاضر ہو سب خرچ کر دیا جائے، یعنی حالات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ذخیرہ نہ کریں۔ گویا یہ معاملات کو حسن و خوبی سے نبھانے کی تاکید تھی۔ حلال چیزوں کے ذخیرہ کرنے پر پابندی نہ تھی۔

۳۔ ایسے اسباب کا فراہم کرنا جن سے تکلیف دور رہے اور ضرر کو دور کرنے والے اسباب کو چھوڑ دینا توکل کے خلاف نہیں۔ مثلاً درندوں کی زمین۔ سیلاب کی جگہ یا گرنے والی دیوار کے نیچے سونا منع ہے۔ اسی طرح زرہ کا

پہننا۔ دروازہ بند کرنا اور اونٹ کو رسّی سے باندھنا توکّل کے خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ[1] (اور چاہیے کہ اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھیں)

ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: "اے اللہ کے رسول! میں اونٹ کا گھٹنا باندھ کر توکّل کروں یا اونٹ کو کھلا چھوڑ کر توکّل کروں؟" آپ نے فرمایا: "اس کو باندھ کر توکّل کرو۔"

ہاں یہ بات ضروری ہے کہ ان ساری چیزوں میں بھروسہ مسبب پر رکھے نہ کہ اسباب پر اور اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہے۔

اگر کسی کا سامان چوری ہو جائے اور اُسے یہ خیال آئے کہ اگر احتیاط کرتا تو چوری نہ ہوتا، یا اس پر اللہ کا شکوہ کرے، تو وہ توکّل سے بہت دُور چلا گیا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تقدیر، طبیب کی طرح ہے۔ اگر طبیب مریض کو کوئی چیز کھانے کو دیتا ہے تو مریض خوش ہوتا اور کہتا ہے اگر وہ اس کو میرے لیے مفید نہ سمجھتا تو مجھے نہ دیتا اور اگر منع کرتا ہے تو پھر بھی خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے اگر یہ غذا میرے لیے مضر نہ ہوتی تو مجھے منع نہ کرتا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جس کا اللہ تعالیٰ کی مہربانی میں اتنا بھی اعتقاد نہ ہو جتنا مریض کو حاذق اور مشفق طبیب پر ہوتا ہے تو وہ توکّل کے عام مفہوم سے بھی آشنا نہیں۔ توکّل یہ ہے کہ اگر اس کا سامان چوری ہو جائے، تو تقدیر پر خوش رہے اور لینے والے کو معاف کر دے۔

بعض آدمیوں نے بعض علماء کے پاس ڈاکے کی شکایت کی کہ اُن کا مال لے لیا گیا ہے تو کہا جتنا تجھے اپنے مال کا غم ہے اگر اتنا ہی غم اس بات پر نہ ہو کہ مسلمانوں میں ایسا آدمی کیسے پیدا ہو گیا جو ڈاکو ہے، تو حیف ہے۔

۴۔ تکلیف کو دور کرنے کی کوشش، جیسے بیمار کا علاج کروانا وغیرہ بھی توکّل کے خلاف نہیں، البتہ اس سلسلے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

معلوم ہونا چاہیے مرض کو دور کرنے والے اسباب تین قسم کے ہیں:

ایک وہ جو یقینی ہیں، جیسے پیاس کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے پانی اور بھوک کی تکلیف دور کرنے کے لیے روٹی، تو اس قسم کی چیزوں کا چھوڑ دینا ہرگز توکّل نہیں۔

---

[1] سورۃ نساء۔ آیت: ۱۰۲

دوسری وہ جن کے متعلق محض گمان ہے، جیسے فصد کرانا سینگی لگوانا اور مسہل لینا وغیرہ۔ یہ بھی توکل کے منافی نہیں ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی علاج کرایا اور علاج کرانے کا حکم بھی دیا۔

علاوہ ازیں اکابر مسلمانوں نے بھی علاج کرایا ہے اور کچھ لوگوں نے علاج نہیں بھی کرایا، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ سے کہا گیا "کیا ہم آپ کے لیے کسی طبیب کو بلائیں؟" تو کہا: "مجھے طبیب نے دیکھا ہے۔" پوچھا گیا "پھر طبیب نے کیا کہا؟" کہا وہ کہتا ہے "میں جو چاہوں کرتا ہوں۔"

مصنف رحمۃ اللہ نے کہا "ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ علاج کرانا افضل ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حال کو ہم اس پر محمول کرتے ہیں کہ آپ نے پہلے علاج کرایا پھر دوا سے فائدہ اٹھانے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ یا ان کو علامات سے اپنی وفات کا وقت قریب ہونا معلوم ہو چکا تھا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ دواؤں کے اثرات اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔"

تیسری یہ کہ سبب معروفات میں سے نہ ہو جیسے داغ لگوانا، تو یہ توکل سے خارج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کی صفت بیان کی ہے کہ "وہ داغ نہیں لگواتے۔"

بعض علماء نے آپ کے اس فرمان کو کہ "وہ داغ نہیں لگواتے" اس پر محمول کیا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں لوگ عام طور پر ایسا کیا کرتے تھے۔ وہ تندرستی کے زمانے میں بھی داغ لگواتے اور جھاڑ پھونک کرتے، تاکہ بیمار نہ ہوں؛ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا انسداد فرمایا۔ اور یہ تاکید فرمائی کہ بیمار ہونے کے بعد دوا دارو کی طرف توجہ دی جائے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت اسعدؓ بن زرارہ (صحابی) نے داغ لگوایا تھا۔

یاد رہے بیماری کا شکوہ کرنا توکل کے خلاف ہے۔ سلف بیمار کی ہائے ہائے کو بھی بُرا سمجھتے تھے کیونکہ یہ شکایت کا ایک انداز ہے۔ فضیلؒ کہا کرتے تھے "میں بیماری چاہتا ہوں بغیر بیمار پرسی کرنے والوں کے۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایک آدمی نے کہا "آپ کا کیا حال ہے؟" آپ نے کہا "اچھا ہے۔" اس نے کہا: "کل رات آپ کو بخار رہا تھا؟" کہا جب میں نے کہہ دیا کہ اچھا ہے تو تم میرے منہ سے ناپسندیدہ بات کیوں نکلوانا چاہتے ہو۔"

ہاں اگر بیمار طبیب سے اپنی حالت بیان کرے تو یہ ناپسندیدہ بات نہیں بعض سلف ایسا کیا کرتے تھے۔ کہتے میں اپنے متعلق اللہ کی قدرت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ اپنے شاگرد کو اپنی تکلیف بتانا بھی بُرا نہ سمجھتے تھے تاکہ وہ بیماری میں اُستاد کی مدد کرے۔

بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تم میں سے دو آدمیوں کو۔"

کتاب الرضاء

- محبت، شوق، اُنس اور رضا
- اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان
- اللہ کی محبت کو تقویت دینے والے اسباب
- شوق کا مطلب
- بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کا مطلب
- اللہ کی تقدیر پر راضی ہونے کا مطلب
- اللہ کی تقدیر اور انسان کی خواہش
- اللہ اور بندے کا تعلق

فصل اوّل

محبّت، شوق، اُنس اور رضا

معلوم ہونا چاہیے اللہ کی محبت ہی مقامات میں سے انتہائی بلند مقام ہے اور جو مقام محبّت کے بعد ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے جیسے شوق، اُنس اور رضا، اور جو مقام محبت سے پہلے ہے وہ اسی کی تمہید۔ جیسے توبہ و صبر اور زُہد وغیرہ۔

اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ اور اس کے رسُول کی محبت فرض ہے اور محبت کے شواہد میں سے اللہ کا یہ فرمان بھی ہے: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (اللہ ان سے محبّت رکھتا ہے اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں)[1]

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (اور ایماندار اللہ کی محبت میں بہت سخت ہیں)[2]۔

اور یہ اللہ تعالیٰ سے محبّت کے اثبات کی دلیل ہے اور اس میں محبت کے فرق کا اثبات بھی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: "تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟" اُس نے کہا: "اے اللہ کے رسُول، میں نے اس کے لیے زیادہ نماز اور روزے کی تیاری نہیں کی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبّت رکھتا ہوں"۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کی محبّت ہوگی اور تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تیری محبت ہوگی"۔ تو مسلمانوں کو اسلام کے بعد اتنی بڑی خوشی کبھی نہ ہوئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس روح قبض کرنے کے لیے ملک الموت آیا تو آپ نے اس سے کہا: "کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست کو مار ڈالے؟" تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی: "کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست کی ملاقات کو ناپسند کرے؟" تو آپ نے فرمایا: "اے ملک الموت میری روح کو قبض کر لے"۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: "جس نے اپنے رب کو پہچانا، اس نے اُس سے محبّت کی اور جس نے اللہ کے واسطے کے

---

[1] سورۃ مائدہ۔ آیت: ۵۴ [2] سورۃ البقرہ۔ آیت: ۱۶۵

بغیر کسی اور سے محبت کی تو اس کی وجہ اللہ کی معرفت سے جہالت اور نادانی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو اللہ ہی کی محبت کی وجہ سے ہے اور یہی حال علماء اور اتقیاء سے محبت کا بھی ہے، کیونکہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ محبوب کرے وہ بھی محبوب ہوتا ہے۔ اور محبوب کا رسول بھی محبوب ہے۔ اور یہ سب کچھ اصل کی محبت کی طرف لوٹتا ہے اور اہل بصیرت کے نزدیک حقیقت میں اللہ کے سوا اور کوئی محبوب نہیں ہے اور نہ اس کے سوا کوئی محبت کا مستحق ہے۔"

اس قول کی وضاحت چند اسباب سے ہوتی ہے۔ مثلاً:

پہلا سبب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس، اپنی بقا، کمال اور وجود کے دوام سے محبت کرتا ہے اور جو اس کے خلاف ہے یعنی ہلاکت، عدم اور نقصان اُس کو ناپسند کرتا ہے اور یہ ہر جاندار کی فطرت ہے اس بات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی اس فطری جذبے سے خالی ہوگا۔ اور یوں یہ اللہ تعالیٰ سے انتہائی محبت کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جب انسان اپنے رب کو پہچان لیتا ہے اور یقینی طور پر جان لیتا ہے کہ اس کا وجود اور دوام اور کمال صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی اس کی اختراع کرنے والا ہے اور وہی اس کی ذات کا موجد ہے۔ اگر وہ اپنے فضل سے اس کو ایجاد نہ کرتا تو یہ عدم محض ہوتا۔ اور اگر وہ اپنے فضل سے اس کو مکمل نہ کرتا تو یہ ناقص ہی رہتا۔ حضرت حسن بصریؒ نے کہا: "جس نے اپنے رب کو پہچانا اس نے اس سے محبت کی اور جس نے دنیا کو پہچانا اس نے اس سے نفرت کی۔"

محبت اور تعلق کا معاملہ جب یوں ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے نفس سے محبت رکھے اور اپنے رب سے محبت نہ کرے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان فطرتاً اُس سے محبت کرتا ہے جو اس پر احسان کرے۔ اُس کی مدد کے لیے آئے اور اس کے دشمنوں کا قلع قمع کرے۔ اور جب انسان اچھی طرح اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی محسن صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اُس کے احسانات بے حد و بے حساب ہیں۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾[1] "اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو شمار نہ کر سکو۔"

ہم نے کتاب الشکر میں اس کی طرف کچھ اشارہ کیا تھا کہ لوگوں کی طرف احسان کی نسبت صرف مجازی ہوتی ہے اور حقیقت میں محسن صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم فرض کرتے ہیں ایک آدمی نے اپنے تمام خزانے اور اپنی ہر چیز تمہیں دے دی اور اس میں

---

[1] سورۃ ابراہیم آیت: ۳۴ و سورۃ نحل- آیت: ۱۸

اختیار دیا کہ جس طرح چاہو خرچ کرو۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ احسان اس کی طرف سے ہے، حالانکہ اُس کا احسان اس کے مال سے اور مال پر قدرت سے اور مال خرچ کرنے کے داعیہ سے پورا ہوا، تو وہ کون ہے جس نے اس کو پیدا کیا۔ اس کے مال کو پیدا کیا، اس کے ارادے کو پیدا کیا؛ اور وہ کون ہے جس نے تمھیں اُس کی نگاہ میں محبوب بنایا اور اس کی توجہ تمھاری طرف مبذول کی اور اُس کے دل میں ڈالا کہ اس کی دنیا اور دین کی اصلاح تم پر احسان کرنے میں ہے؛

اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو وہ تمھیں کچھ نہ دیتا۔ گویا کہ وہ خدا کا حکم تسلیم کرنے میں مجبور ہے۔ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ تو اصل میں محسن تو وہ ہے جس نے اُسے مجبور کیا اور اسے تمھارے لیے مسخر کر دیا۔ اس کی حیثیت تو کسی امیر کے خازن کی سی ہے کہ اس نے حکم دیا کہ فلاں آدمی کو میری طرف سے ایک خلعت عطا کرو۔ تو امیر کی عطا کردہ خلعت کے سپرد کرنے میں خزانچی کو محسن نہیں کہا جائے گا کیونکہ وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہے اور اگر امیر اسے اختیار دے دیتا تو وہ اس کو بالکل نہ دیتا۔ اسی طرح ہر ایک محسن کا حال ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یہ نہ ڈالے کہ وہ اپنا مال خرچ کرے، تو وہ اپنے مال میں سے ایک دانہ بھی خرچ نہ کرے۔ عارف کو چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے کیونکہ اس کے سوا کسی اور سے احسان کا صادر ہونا ممکن ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ محسن بذاتِ خود طبائع کو محبوب ہوتا ہے، جب یہ معلوم ہو گا کہ کوئی بادشاہ عالم، عابد، لوگوں پر نرمی اور شفقت کرنے والا ہے، تو تم اس سے محبت رکھو گے اور محبت صرف اس کے احسان کی وجہ سے ہے؛ چنانچہ یہی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کا تقاضا کرتی ہے بلکہ یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کے سوا کسی اور سے محبت نہ کی جائے۔ اگر کسی سے ہو تو صرف اس کے تعلق کی وجہ سے ہو۔

اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔ جیسا کہ خود فرمایا: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرتے لگو تو شمار نہ کر سکو۔[1]

ہم کہتے ہیں کہ جو آدمی علم یا تقویٰ سے متصف ہو اس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ انہی صفات کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام سے بھی محبت ہوتی ہے اور جب ان صفات کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابل رکھ کر دیکھو گے تو اُن کی صفات تم کو بہت کمزور نظر آئیں گی۔

باقی رہا علم۔ تو اللہ تعالیٰ کو پہلوں اور پچھلوں کا ایسا علم ہے جس نے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے؛

---

[1] سورۃ ابراہیم۔ آیت: ۳۴، سورۃ نحل۔ آیت: ۱۸

یہاں تک کہ اس سے ایک ذرّہ برابر چیز بھی آسمانوں اور زمینوں میں پوشیدہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سب مخلوق کو مخاطب کر کے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا[1] (اور تمھیں تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے)۔

اگر تمام زمینوں اور آسمانوں کے رہنے والے اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ ایک چیونٹی یا ایک مچھر کی پیدائش کی تفصیلات جان سکیں تو اس کے سوویں حصے پر بھی مطلع نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اُس کے علم میں سے کچھ معلوم کر سکتے ہیں مگر وہی جو وہ خود چاہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی کمال درجے کی ہے۔ جب تم تمام مخلوق کی قدرت کو اللہ کی قدرت کے مقابل رکھو گے، تو معلوم ہو گا کہ جو شخص سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ جس کا ملک سب سے وسیع ہے۔ جس کی پکڑ سب سے سخت ہے۔ جس کی سیاست اپنے اوپر اور دوسروں پر بھی بڑی جامع ہے۔ اس کی قدرت کی انتہا بھی یہ ہو گی کہ وہ اپنی بعض صفات پر قادر ہو گا اور بعض امور میں مجبور۔ وہ اپنے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ وہ اپنی زندگی اور موت کے بعد دوبارہ اختیار رکھتا ہے، بلکہ وہ تو اپنی آنکھ کو اندھا ہونے سے۔ اپنی زبان کو گونگا ہونے سے۔ اپنے کانوں کو بہرہ ہونے سے اور اپنے بدن کو بیمار ہونے سے بھی نہیں بچا سکتا۔ دوسروں کے ذرات پر اسے جو قدرت بھی ہے وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ اللہ ہی اُس کا اور اُس کی قدرت کا اور اس کے ممکنہ اسباب کا مالک ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کسی بہت بڑے بادشاہ پر ایک مچھر کو مسلّط کر دے تو وہ اُسے ہلاک کر ڈالے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے بادشاہ ذوالقرنین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ[2] (ہم نے اس کو زمین میں جگہ دی) گویا اس کی ساری حکومت اور بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے تھی۔

تمام مخلوق کی پیشانیاں اللہ تعالیٰ کے قبضے اور قدرت میں ہیں۔ اگر ان کو ہلاک کر دے تو اس کے ملک اور بادشاہی سے ایک ذرہ بھی کم نہیں ہوتا اور اگر اس جیسی ہزاروں مخلوقات اور پیدا کر دے تو ان کے پیدا کرنے میں اسے کچھ بھی دشواری نہ ہو گی۔ حقیقت میں صرف وہی قادر ہے۔ اُسی کے لیے کمال، عظمت، دبدبہ، کبریائی اور قہر اور غلبہ ہے۔

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت: ۸۵ [2] سورۂ کہف آیت: ۸۴

اگر تصور کیا جائے کہ تم ایک قادر سے محبت رکھو جس کی قدرت اور عظمت اور علم کمال درجے کا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ کمال درجے کی تقدیس اور تنزیہ اسی کے متعلق تصوّر کی جا سکتی ہے۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ایسا ہے جس کی ضد نہیں۔ وہ ایسا بے نیاز ہے کہ کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہیں۔ وہ ایسا غنی ہے جسے کوئی حاجت نہیں۔ وہ ایسا قادر ہے جو چاہے کر لیتا ہے اور جو چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں اور وہ ایسا عالم ہے جس سے زمین و آسمان کا ایک ذرّہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

عارفین کی معرفت کا کمال یہ ہے کہ وہ معرفت سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ کمال درجے کی محبت کا مستحق ہے اور اس حق میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

فصل دوم

اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان

معلوم ہونا چاہیے کہ لذتیں ادراک کے تابع ہیں اور انسان کے اندر کچھ قوتیں اور طبعی چیزیں ہیں اور ہر طبعی قوت کی لذت ہے اور یہ طبعی چیزیں بے مقصد نہیں ہیں، بلکہ کسی نہ کسی غرض کے لیے ہیں۔

کھانے کی خواہش اس لیے رکھی گئی ہے کہ انسان غذا حاصل کرے جس سے زندگی کی بقا ہے۔

دیکھنے اور سننے کی لذت آنکھوں اور کانوں میں رکھی گئی ہے۔ اسی طرح دل میں ایک فطری قوت ہے اس کا نام "نورِ الٰہی" ہے اور اسے عقل اور باطنی بصیرت بھی کہا جاتا ہے۔ اور اسے نورِ ایمان ویقین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ تمام امور کے طبعی حقائق معلوم ہو سکیں۔ اس کی طبیعت کا تقاضا علم اور معرفت ہے اور یہی اس کی لذت ہے۔

علم اور معرفت سے، اگرچہ کسی معمولی چیز کے متعلق ہی کیوں نہ ہو خوشی حاصل ہوتی ہے اور جس کو جہالت کی طرف منسوب کیا جائے اگرچہ وہ کسی معمولی چیز ہی سے جہالت ہو، اس سے دل مغموم ہوتا ہے اور یہ سب کچھ علم کی لذت اور اس کے طبعی کمال کو سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

علم بہترین صفت اور انتہائی کمال ہے۔ اسی لیے انسان طبعی طور پر علم اور ذکاوت کی تعریف پر خوش ہوتا ہے۔ پھر کاشتکاری اور کپڑے سینے کے علم کی لذت اتنی نہیں جتنی ملکی سیاست اور لوگوں کے امور کی تدبیر کے علم میں ہے۔

اسی طرح شعروادب کے علوم کی لذت وہ نہیں جو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کے علوم میں ہے۔

علم کی لذت علم کی بزرگی کے مطابق ہوتی ہے اور علم کا شرف معلوم کے شرف کے مطابق ہوتا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ لذیذ وہ علم ہے جو سب سے اشرف ہے۔ اور علم کا شرف معلوم کے شرف سے ہے تو معلومات میں جو سب سے زیادہ بزرگ اور اکمل اور اشرف اور اعظم ہو گا، تو اس کے متعلق علم بھی لازماً سب سے زیادہ لذیذ اور اشرف ہو گا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودات میں کوئی چیز بھی تمام اشیاء کے خالق۔ ان کو مکمل اور مزین کرنے والے۔ پہلی اور

دوسری بار پیدا کرنے والے اور اُن کی تدبیر اور ترتیب کرنے والے سے زیادہ بزرگ، اعلیٰ اور اشرف اور اکمل اور اعظم ہو!

کیا یہ تصوّر میں آسکتا ہے کہ کوئی بادشاہ کمال، جمال اور دبدبے اور جلال میں خدا تعالیٰ سے زیادہ ہو؟ (نعوذ باللہ) معلوم ہونا چاہیے کہ معرفت کی لذّت ان تمام لذّتوں سے زیادہ ہے جن کو حواس خمسہ کے ذریعے سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کامل لوگوں کے نزدیک باطنی لذت ظاہری لذت پر غالب ہوتی ہے۔ اگر کسی آدمی کو اختیار دیا جائے کہ یا تو مرغی کا بھنا ہوا گوشت اور بادام کا حلوا کھالو یا ریاست اور دشمنوں پہ غلبے اور سرداری کا مقام پسند کرلو، تو اگر آدمی کم ہمت، مردہ دل اور بہیمی خواہش سے مغلوب ہوگا تو وہ گوشت اور حلوے کو پسند کرے گا لیکن اگر عالی ہمت اور عقلمند ہوگا تو ریاست کو ترجیح دے گا۔ خواہ اس کے حصول میں اس کو کئی دن تک بھوکا رہنا اور صبر کرنا پڑے۔ اور ریاست کو پسند کرنا اس کی دلیل ہے کہ اُس کے نزدیک یہ پاکیزہ کھانوں سے زیادہ لذیذ ہے؛ چنانچہ جس طرح ریاست کی لذّت اس آدمی کے نزدیک لذیذ کھانوں کی لذّت سے بڑھ کر ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت اور امورِ الٰہیہ کے اسرار کو سمجھنا اہلِ دانش کے نزدیک دُنیا کی دیگر تمام لذّتوں پر غالب ہے۔ اس کو وہی آدمی سمجھ سکتا ہے جس نے دونوں لذّتیں چکھی ہوں، وہ عام لذّتوں سے علیحدہ رہ کر فکر اور ذکر کو ترجیح دے گا، یہاں تک کہ ریاست کو چھوڑ دے گا، کیونکہ وہ اس ریاست اور اس کے اندر کی چیزوں کے فنا ہونے کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں کدورت شامل ہے اور ان کی موت بھی یقینی ہے۔

اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات و افعال کا مطالعہ بہت ہی عظیم ہوگا، کیونکہ وہ کدورتوں سے خالی ہے۔ عارف ہمیشہ معرفت کی جنت میں رہتا ہے جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ اس کے باغوں میں کھاتا پیتا ہے، اُس کے پھل چُنتا ہے۔ اُس کے حوضوں سے پانی پیتا ہے اور اسے تسلی ہے کہ یہ منقطع نہیں ہوں گے۔ معرفت کی جنت ابدی و سرمدی ہے۔ اُسے موت قطع نہیں کرتی کیونکہ اُس کا محل روح ہے۔ اور موت صرف روح کی حالت تبدیل کرتی ہے، اُسے معدوم نہیں کرسکتی۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عارفوں کے مختلف درجے ہیں۔ ان کے درجات کا اختلاف شمار و قطار سے باہر ہے اور یہ امور صرف ذوق سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ بیان کا نفع اس میں بہت تھوڑا ہے۔

بہرحال اتنی بات سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سب سے زیادہ لذیذ چیز ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہے۔

ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے کہا: "اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جن کو آگ کا ڈر اور جنت کی امید اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں کر سکتی، تو ایسے لوگوں کو دنیا کیسے غافل کر سکتی ہے؟"

حضرت معروفؒ سے پوچھا گیا: "آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت پر کس چیز نے آمادہ کیا۔ کیا موت کی یاد نے؟"

کہنے لگے: "موت کیا چیز ہوتی ہے؟"

کہا گیا: "قبر کے ذکر نے؟"

کہا: "قبر کیا چیز ہوتی ہے؟"

کہا: "آگ کے خوف اور جنت کی امید نے؟" انھوں نے کہا: یہ کیا چیزیں ہیں؟

"ایک بادشاہ ہے جس کے اختیار میں یہ سب کچھ ہے۔ اگر تم اس سے محبت رکھو گے تو یہ سب چیزیں گویا تمھارے لیے وقف ہوں گی۔"

حضرت احمدؒ بن فتح نے کہا: "میں نے بشرؒ بن حارث کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا: معروفؒ کرخی کا کیا بنا؟" تو انھوں نے اپنا سر ہلایا پھر کہا: "بہت دور چلے گئے۔ ہمارے اور ان کے درمیان پردے حائل ہو گئے، کیونکہ معروف نے اللہ کی عبادت نہ جنت کے شوق میں کی اور نہ آگ سے ڈر کر۔ اُس نے اللہ کی عبادت اللہ کے شوق میں کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اس کے درمیان سے پردے اٹھا دیے۔"

جب کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے، تو اس کا دل اسی میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ نہ جنت کی طرف توجہ کرتا ہے اور نہ اس کی آگ سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ ایسی نعمتوں میں پہنچ چکا ہوتا ہے جن سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ بعض نے کہا:

"اس کی جُدائی اُس کی آگ سے زیادہ گرم ہے اور اس کا وصل اس کی جنت سے زیادہ اچھا ہے۔"

اور اُس لذت سے مراد اللہ کی معرفت میں دل کی لذت ہے جو کھانے پینے اور نکاح کی لذت سے بہت افضل ہے کیونکہ جنت حواس کے فائدے اٹھانے کی جگہ ہے اور دل کی لذت صرف اللہ تعالیٰ کی ملاقات میں ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت دنیا میں اس کی معرفت سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ نفس جب تک بدنی عوارضات اور شہوات سے محجوب ہے اور اس پر بشری صفات غالب ہیں وہ مشاہدے تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ دنیا کی یہ زندگی بذات خود ایک حجاب ہے۔ اور اس کے حجاب ہونے کے سبب میں بڑی لمبی تفصیل ہے۔

جب موت سے حجاب اُٹھ جائے گا، تو نفس باقی رہ جائے گا، اس حال میں کہ اس میں کچھ دنیا کی آلودگی ہوگی۔ پھر جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں میل کچیل سے پاک و صاف ہو جائیں گے تو جنتی جن کو دنیا میں اللہ کی معرفت حاصل ہوگی اُس کے مطابق اللہ تعالیٰ اُن پر تجلّی فرمائیں گے۔

جس نے دنیا میں اللہ کو نہ پہچانا وہ اُسے آخرت میں نہ دیکھے گا۔ جس کو دنیا میں معرفت نصیب ہوئی وہی اس کو دیکھ کر لذّت حاصل کرے گا۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ[1] (اور آخرت کا گھر ہی اصل میں زندگی ہے)۔

حدیث میں آیا ہے کہ "بہترین وہ آدمی ہے جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھے ہوں"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفت کی تکمیل اور توسیع لمبی عمر میں ہمیشہ کے ذکر اور فکر، مجاہدے پر دوام، دنیا کے تعلقات سے منقطع ہونے اور جستجو میں یکسو ہونے سے ہوتی ہے۔ یقین ہے ہمارے اس بیان سے محبت اور معرفت کی لذّت اور رؤیت کے معنی آپ کو معلوم ہو چکے اور یہ بھی کہ اہلِ کمال کے نزدیک معرفت کی لذّت تمام لذّتوں سے بہت زیادہ ہے۔

---

[1] سورۃ عنکبوت۔ آیت: ۶۴

فصل سوم

اللہ کی محبّت کو تقویت دینے والے اسباب

معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں سب سے زیادہ خوش نصیب اور اچھی حالت والا وہ شخص ہوگا جو اللہ کی محبّت میں قوی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ نعمت محبّت کے اندازے کے مطابق ہوگی، محبت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی لذّت بھی زیادہ ہوگی۔

اصل محبّت سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں ہوتا، البتّہ محبّت کی قوت اور اس کے غلبے سے اکثر لوگ محروم ہیں اور یہ غلبہ دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے:

ایک یہ کہ دنیا کے تعلقات کو ختم کیا جائے اور غیر اللہ کی محبّت دل سے نکالی جائے، کیونکہ اللہ کی محبّت کے کمزور ہونے کا ایک سبب دنیا کی محبت کا غلبہ ہی ہے۔ جتنا دل دنیا سے مانوس ہوگا اتنا ہی اُس کا اُنس اللہ سے کم ہوگا۔ مشہور مقولہ ہے کہ دنیا اور آخرت آپس میں دو سوکنیں ہیں۔ دنیا کو دل سے نکالنے کا واحد طریقہ زہد کے راستے پر چلنا ہے جو عبارت ہے صبر اختیار کرنے، خوف اور امید کے خلاف جہاد کرنے اور اللہ کی کامل فرمانبرداری سے۔

دوسرا سبب محبّت کی قوّت کے لیے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جب معرفت حاصل ہو گی تو اللہ کے ساتھ محبّت بھی آئے گی۔ اور دُنیا کے مشاغل سے انہماک کم ہوگا۔ للّٰہیت، فکر صافی، دائمی ذکر، طلب میں جدوجہد اور اللہ کے افعال سے اس پر استدلال کرنا ہی یہ پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا سب سے چھوٹا فعل بہ نسبت ملائکہ اور آسمانوں کے زمین اور اس کی موجودات ہیں۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ:

سورج چھوٹا سا نظر آنے کے باوجود زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے تو اس کی نسبت سے اندازہ کرو کہ زمین کتنی چھوٹی ہے۔ اور پھر اُس آسمان کی نسبت جس میں سورج مرکوز ہے، یعنی چوتھے آسمان کی نسبت سے جب سورج کو دیکھو کہ وہ کتنا چھوٹا ہے اور چوتھا آسمان اپنے سے اوپر والے آسمانوں کی نسبت چھوٹا ہے۔ پھر ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے جنگل میں سات انگوٹھیاں پڑی ہوں اور کرسی عرش کے مقابل یہی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر آدمی کو دیکھو جو مٹی سے پیدا ہوا ہے اور زمین کا ایک جزو ہے۔ اور دوسرے حیوانات کو دیکھو۔ اور پھر دیکھو کہ زمین کی نسبت یہ کتنے چھوٹے ہیں۔ حیوانات میں سے بالکل چھوٹا مچھر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو کس طرح ہاتھی کی شکل پر پیدا کیا ہے جو ایک بڑا جانور ہے۔ اس کو دو پَر دیے۔ اُس کے کان اور آنکھیں بنائیں۔ اس کے پیٹ میں غذا کے اعضاء اور آلات پیدا کیے اور اس کے تمام حالات کی تدبیر کی، یعنی اس کے قوائے جاذبہ اور دافعہ اور ہاضمہ بنائے اور پھر دیکھو کہ وہ کیسے اڑتا ہے اور اس کی ایک سخت سونڈ بنائی جس سے خون چوستا ہے۔

اسی طرح شہد کی مکھی کو دیکھو کہ وہ کس طرح پھولوں کی کلیوں سے رس لیتی ہے۔ گندگی سے بچتی ہے اور اپنے سردار کی اطاعت کرتی ہے، یہاں تک کہ جو مکھی گندگی پر بیٹھ کر آئے سردار مکھی اس کو قتل کر دیتی ہے اور دیکھو کہ وہ چھ گوشہ چھتہ کیسے تیار کرتی ہے! نہ چار گوشہ بناتی ہے نہ گول نہ پانچ گوشہ، بلکہ چھ گوشہ، کیونکہ مسدّس (چھ گوشہ) شکل میں ایک خاصیت ہے۔

سب سے زیادہ وسیع شکل گول ہے یا جو اس کے قریب ہو۔ مربع (چار گوشہ) شکل میں گوشے ضائع جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنا چھتہ گول بناتی تو گھر سے باہر کی جانب جگہ ضائع ہوتی۔ گول شکلوں کو ملایا جائے تو وہ پوری طرح آپس میں نہیں ملتیں۔ اور گوشوں والی کوئی شکل ایسی نہیں ہے جو جگہ گھیرنے میں گول سے زیادہ ہو۔ وہ شکلیں جو آپس میں اس طرح ملیں کہ کوئی جگہ خالی نہ رہے چھ گوشہ کے سوا اور کوئی نہیں۔

پھر دیکھو کہ اس کے چھوٹا اور کمزور ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے الہام فرمایا۔ غرض یہ کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کے متعلق اس مختصر بیان سے اللہ کی صنعت کے بارے میں بصیرت حاصل کی جا سکتی ہے اور یہ ایسا پہلو ہے کہ اس پر جتنا غور کیا جائے اتنی ہی معرفت حاصل ہوتی ہے اور خالق حقیقی سے محبّت بڑھتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ لوگوں میں محبّت کے مختلف ہونے کا سبب کیا ہے؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ اصل محبت میں بالکل مشترک ہیں، لیکن وہ معرفت کی استعداد کی وجہ سے مختلف ہو گئے ہیں۔ بہت سے ہیں اللہ کے متعلق جن کی معرفت صرف اسماء اور صفات تک محدود ہے جن کا علم انھیں حاصل ہو سکا۔ دانا و بینا آدمی اللہ تعالیٰ کی صنعت کی تفصیل کا مطالعہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ چیزیں دیکھتا ہے جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے اور یوں اس کے دل میں اللہ کی عظمت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی محبت بھی بڑھتی ہے اور پھر یہ معرفت جو اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائبات ہیں اس کو ایسے سمندر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کو سمجھنے سے مخلوق قاصر ہے۔ کیونکہ مخلوق اپنے خالق کی عظمت کا اندازہ

نہیں کرسکتی۔ البتہ صنعت سے صانع کے وجود اور اس کے علم و قدرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت وعلم اور اس کی تمام صفات کی ہر وہ چیز شہادت دیتی ہے جو ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ پتھر، اینٹ، درخت، سبزی، جانور، زمین، آسمان، ستارے، خشکی، تری سب شہادت دے رہے ہیں، بلکہ سب سے پہلی شہادت ہمارے اپنے نفس اور جسم اور حالات کا تبدیل ہونا۔ دلوں کا پھرنا۔ طور طریقے اور حرکات وسکنات ہیں۔

جو بھی اس کائنات میں موجود ہے وہ شاہد ناطق ہے۔ اپنے خالق اور مدبر اور تصرف کرنے والے اور حرکت دینے والے پر اور یہ چیزیں دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علم اور قدرت اور حیات اور لطف اور حکمت وعظمت وجلال پر کیونکہ ہر ایک ذرّہ بزبانِ حال آواز دیتا ہے کہ اس کا وجود اس کا اپنا نہیں ہے، وہ اپنے موجد کا محتاج ہے، لیکن ہماری عقلیں اللہ تعالیٰ کے ادراک کی نسبت ایسی ہیں جیسے چمگادڑ دن کے وقت کہ وہ اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے رات کو دیکھتی ہے، دن کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے دن میں نہ دیکھنے کی وجہ یہ نہیں کہ دن مخفی ہے، اس کے شدتِ ظہور اور اس کی تیز روشنی میں کچھ کلام نہیں۔ چمگادڑ کی کمزور آنکھوں کی وجہ سے اسے نظر نہیں آتا۔

اسی طرح ہماری عقلیں اللہ تعالیٰ کے صحیح ادراک سے قاصر ہیں۔ تو پاک ہے وہ جو اپنے نور کی تیزی میں مخفی ہے۔ انسانوں کی بصیرت اور بصارت سے بھی وہ اسی لیے پوشیدہ ہے کہ ان میں اس کی ذات کے صحیح صحیح ادراک کی قوت نہیں۔ انسان کی قوتوں کا تو یہ حال ہے کہ ابتدائی عمر میں اس کی تمام قوتیں، یہاں تک کہ عقل بھی کمزور ہوتی ہے۔ پھر ان میں تھوڑی بیداری اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور انسان افکار میں پختہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد جو اشیاء پاتا ہے اُن سے مانوس ہوتا ہے اور جیسے جیسے اس کا یہ مشاہدہ اور مطالعہ آگے بڑھتا ہے پرانی چیزیں دل سے اترتی جاتی اور نئی اشیاء سے محبت بڑھتی جاتی ہے۔

اسی طرح جب انسان ناگہانی طور پر کوئی عجیب وغریب جانور، کوئی سبزی یا اللہ تعالیٰ کا کوئی عجیب کام دیکھتا ہے، تو تعجب سے اس کی زبان کھلتی ہے اور کہتا ہے: سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ سب چیزیں قطعی شہادت دیتی ہیں کہ کوئی ان کا پیدا کرنے والا ہے، لیکن انسان ان کی شہادت کو محسوس نہیں کرتا۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ کوئی اندھا اسی اندھے پن کی حالت میں بالغ ہو پھر اس کی آنکھ سے پردہ ہٹ جائے اور وہ آسمان، زمین درختوں، سبزی اور حیوانات کو یکبارگی دیکھے تو ان عجائبات کے مشاہدے اور ان کے خالق کے شاہد ہونے کے تعجب سے خطرہ ہے کہ اس کی عقل نہ جاتی رہے۔ انسان کے ذہنی طور پر بتدریج بالغ ہونے کی حکمت یہی ہے کہ وہ فطرت کی نیرنگیاں اچانک دیکھ کر مبہوت نہ رہ جائے۔ اللہ نے نورِ معرفت سے روشنی حاصل کرنے اور اس کے وسیع سمندروں میں تیرنے کے رستے اسی لیے محدود رکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل چہارم

شوق کا مطلب

محبت اور اس کے دلائل کے ثبوت پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ شوق اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے کیونکہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے، وہ اس کا مشتاق ہوتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ شوق اس چیز کا ہوتا ہے جس کا کچھ ادراک ہوا اور کچھ نہ ہو۔ کیونکہ جس چیز کا ادراک بالکل نہ ہو اس کا شوق نہیں ہوتا اور کمال ادراک دیکھنے سے ہوتا ہے اور یہ آخرت میں ہوگا۔

دراصل امورِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر بندے پر بعض امور منکشف ہوتے ہیں اور باقی بے انداز مخفی رہتے ہیں، البتہ عارف ان کے وجود کو جانتا ہے اور یہ شعور بھی رکھتا ہے کہ ان کے اصل فوائد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ نیز وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو معلومات اس سے غائب ہیں وہ معلوم چیزوں سے بہت زیادہ ہیں۔ تو جب تک اصل معرفت حاصل نہ ہو جائے بندہ ہمیشہ مشتاق رہتا ہے اور دنیا میں پیدا ہونے والا یہ شوق آخرت میں خدا تعالیٰ کی رویت اور ملاقات سے پورا ہوگا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ دنیا میں اہلِ شوق کے دلوں کو سکون مل سکے۔

حضرت ابراہیمؒ بن ادہم مشتاقین میں سے تھے۔ انھوں نے ایک دن کہا "اے رب، اگر تو نے اپنے کسی محب کو کوئی ایسی چیز دی ہے جس سے اس کے دل کو سکون مل جائے تو مجھے بھی دے دے۔ مجھے بیقراری نے بڑی تکلیف دی ہے" فرماتے ہیں پھر میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اس نے فرمایا: اے ابراہیمؒ! کیا تجھے مجھ سے شرم نہیں آتی؟ تو مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں تجھے وہ چیز دوں جو میری ملاقات سے پہلے تیرے دل کو سکون دے دے۔ کیا کبھی دوست کی ملاقات سے پہلے کسی عاشق کے دل کو قرار ملا ہے؟ میں نے کہا "اے رب! تیری محبت میں میں بہک گیا۔ میں نے نہ جانا کہ کیا کہہ رہا ہوں"

تو یہ شوق آخرت میں جا کر پورا ہوگا۔ اور وہ جو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔ نہ وہ بندے پر واضح ہو سکتا ہے۔ نہ بندہ اس کو جانتا ہے۔ وہ اسی کی لذت میں مشغول ہے جو اس پر ظاہر ہوا۔ اور نعمت اور لذت دونوں ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ وہ غیر معلوم چیزوں کے شوق کے احساس سے بے خبر

ہوجاتا ہے۔ بس انوارِ بصیرت کی اتنی مقدار رہی شوق اور اس کے معانی کے حقائق کو کھولنے کے لیے کافی ہے۔

احادیث کے شواہد میں سے وہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دعا سکھائی اور اسے حکم دیا کہ اس کی روزانہ اپنے گھر والوں سمیت ضرور پابندی کرے اور اس دعا میں یہ بھی ہے: "اے اللہ! میں تجھ سے تیری تقدیر پر رضا اور موت کے بعد عیش اور تیرے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت اور تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں۔"

توریت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "میری ملاقات کے لیے نیک لوگوں کا شوق بہت زیادہ ہے اور مجھے اُن کی ملاقات کا اُن سے بھی زیادہ شوق ہے۔"

اپنے ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے ایک القا فرمایا: "میرے کچھ بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میں اُن سے محبت رکھتا ہوں۔ مجھے اُن کا شوق ہے۔ اُن کو میرا شوق ہے۔ وہ میرا ذکر کرتے ہیں، میں ان کو یاد کرتا ہوں۔ اگر تم ان کی راہ پر چلو تو میں تم سے محبت کروں گا اور اگر تم نے اُن سے منہ موڑا تو میں تم سے ناراض ہوجاؤں گا۔" اُس نے کہا: "اے رب! اُن کی علامت کیا ہے؟" فرمایا: "دن کو (نمازوں کے لیے) سایہ کی نگرانی کرتے ہیں جیسا کہ مہربان چرواہا اپنی بکریوں کی نگرانی کرتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کا خیال رکھتے ہیں جیسا کہ غروب آفتاب کے وقت پرندے اپنے گھونسلوں کا خیال کرتے ہیں اور جب رات چھا جاتی ہے اور اندھیرا گہرا ہوجاتا ہے۔ بستر بچھ جاتے ہیں اور ہر دوست اپنے دوست کے ساتھ تنہائی میں چلا جاتا ہے، تو وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنے چہرے بچھا دیتے ہیں اور میرے کلام کے ذریعے مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اور میرے انعامات کے تذکرہ سے میری خوشامد کرتے ہیں۔ پھر کچھ چیخنے والے، کچھ رونے والے، کچھ آہیں بھرنے والے، کچھ شکوے کرنے والے، کوئی کھڑا، کوئی بیٹھا، کوئی رکوع میں، کوئی سجدے میں میری حمد بیان کرتا ہے۔

میری وجہ سے اُن کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ میری نظروں میں ہے اور وہ میری محبت کی وجہ سے جو شکوے کرتے ہیں وہ میرے کانوں میں ہیں۔"

فصل پنجم

بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کا مطلب

بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے بے شمار شواہد ہیں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ[1] (اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا[2] (اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں)۔

ساتھ یہ بھی فصاحت فرمائی کہ وہ جس سے محبت رکھتا ہے اُسے عذاب نہیں دیتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُس آدمی کا رد فرمایا جس نے اُس کا دعویٰ کیا تھا: قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ[3] (کہو پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی کیوں سزا دیتا ہے)

محبت کے لیے بخشش کی شرط رکھی: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ[4] (کہو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔

صحیح حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بندہ ہمیشہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں" آخر تک۔ اور یہ مشہور حدیث ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت کی علامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے" اور سب سے قوی علامت اس کے لیے اچھی تدبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ بچپن ہی سے اس کی تربیت بڑے احسن طریقہ سے کرتا ہے۔ اس کے دل میں ایمان بوتا ہے۔ اس کی عقل کو روشن کرتا ہے۔

---

[1] سورۃ بقرہ۔ آیت: ۲۲۲ [2] سورۃ صف۔ آیت: ۴ [3] سورۃ مائدہ۔ آیت: ۱۸
[4] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۳۱

جس کے باعث وہ ہر اُس چیز کی پیروی کرتا ہے جو اُسے اللہ کے قریب کرے اور ہر اُس چیز سے نفرت کرتا ہے جو اُسے اللہ سے دُور کردے۔ پھر اُس کے کام اُس کے لیے آسان کردیتا ہے اسے خلقت کے سامنے ذلیل نہیں کرتا۔ اُس کے ظاہر و باطن کو درست کرتا ہے اور اُس کے ذہن میں صرف اپنا خیال رکھ دیتا ہے اور جب یہ محبّت زیادہ ہو جاتی ہے تو اُسے ہر چیز سے ہٹا کر اپنے لیے مشغول کردیتا ہے۔

رہی بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت، تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر آدمی محبّت کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیونکہ دعویٰ کرنا بڑا آسان ہے اور اس کو ثابت کرنا بڑا مشکل ہے تو انسان کو شیطان سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ اور یہ نفس کا دھوکا ہے کہ آدمی اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے جبتک کہ علامات سے اس کا امتحان نہ لے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ جنت میں اللہ کی ملاقات کو پسند کرے۔ یہ تو نا ممکن ہے کہ دل کسی سے محبت کرے اور اس کی ملاقات اور مشاہدے کو پسند نہ کرے اور موت کی کراہت اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ مومن موت سے کراہت کرتا ہے اور اللہ کی ملاقات موت کے بعد ہے۔

سلف میں سے بعض موت کو پسند کرتے اور بعض ناپسند کرتے تھے۔ یا تو اپنی محبّت کی کمزوری کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ اس میں دنیا کی محبّت کی آمیزش تھی یا پھر اس لیے کہ وہ اپنے گناہوں کو دیکھتے تو توبہ کے لیے زندگی میں برکت چاہتے۔

ان میں بعض وہ تھے جو اپنے آپ کو محبّت کے ابتدائی مقام میں دیکھتے تو اللہ کی ملاقات کی تیاری کرنے سے پہلے موت آنے کو ناپسند کرتے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے محبوب کے آنے کی خبر پہنچے اور وہ چاہے کہ اس کا آنا کچھ دیر بعد ہو تاکہ وہ اپنے گھر کو تیار کرسکے، تو اس لحاظ سے موت کو مکروہ سمجھنا کمالِ محبت کے منافی نہیں ہے۔

ایک علامت یہ ہے کہ اپنی پسند کے مقابل ظاہری اور باطنی طور پر اللہ کی پسند کو ترجیح دے، خواہش کی پیروی نہ کرے سُستی کو سختی سے دفع کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہمیشہ لگا رہے اور نوافل سے اس کا قرب حاصل کرے۔

جو بندہ اللہ سے محبّت رکھتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ ویسے کبھی نافرمانی اصل محبّت کے منافی نہیں ہوتی، بلکہ کمالِ محبت کے منافی ہوتی ہے۔ کتنے ہی ایسے انسان ہیں جن کو صحت سے محبت ہے، لیکن پھر بھی مضر چیزیں کھا لیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ معرفت کمزور اور خواہش غالب ہوتی ہے اور ایسا شخص محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس پر نعمانؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جاتا۔ آپ اسے حد لگا دیتے (یعنی شراب پینے کی) یہاں تک کہ ایک دن جب اُسے لایا گیا اور آپ نے اس کو حد لگائی تو ایک آدمی نے اس پر لعنت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس پر لعنت نہ کرو، یہ اللہ اور اُس کے رسُول سے محبّت

رکھتا ہے"۔ مطلب یہ کہ گناہ نے اُس کو محبت سے خارج نہ کیا تھا، بلکہ کمالِ محبت سے خارج کیا تھا۔

علامات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ کے ذکر پر فریفتہ ہو۔ اس سے اس کی زبان نہ رُکے اور نہ اس کا دل اس سے خالی ہو۔ جو آدمی کسی چیز سے محبّت رکھے تو لازماً اس کا اور اس کے متعلقات کا تذکرہ بہت زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کی محبّت کی علامت اس کا ذکر اور قرآن کی محبت ہو کہ اُس کا کلام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ہے جو اللہ کے محبوب رسول ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ[1] (کہو اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبّت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا)

بعض سلف نے کہا: "مجھے اللہ سے ہمکلامی میں لذّت ملتی تھی اور میں ہمیشہ قرآن کریم کی تلاوت کرتا تھا۔ پھر میری تلاوت میں رکاوٹ ہوئی اور ہم کلامی کی لذت بھی جاتی رہی، پھر میں نے خواب میں دیکھا ایک آدمی کہہ رہا تھا۔

اگر تو میری محبّت کا دعویٰ کرتا ہے تو تُو نے میری کتاب کیوں چھوڑ دی؟ کیا تُو نے اس میں میرے لطف و عتاب پر غور نہیں کیا؟

ایک علامت یہ ہے کہ خلوت اور اللہ کی ہم کلامی اور قرآن کریم کی تلاوت سے اُنس ہو۔ ہمیشہ تہجد پڑھے اور موانعات کے انقطاع سے وقت کی صفائی اور رات کے سکون کو غنیمت سمجھے اور محبّت کا کمترین درجہ یہ ہے کہ دوست کے ساتھ خلوت میں لذّت پائے اور اُس کی ہمکلامی کو نعمت سمجھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عبادت گزار نے ایک مدّت تک ایک جنگل میں اللہ کی عبادت کی۔ اُس نے ایک پرندہ دیکھا جس نے ایک درخت پر گھونسلا بنایا تھا وہ اُس میں آکر چہچہاتا، تو اُس نے کہا کاش کہ میں اپنا مصلّیٰ اس درخت کے پاس لے جاتا اور اس پرندے کی آواز سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ پھر اُس نے ایسا ہی کیا تو اللہ نے اُن کے نبی کی طرف وحی فرمائی کہ فلاں عابد سے کہو تو نے مخلوق سے اُنس حاصل کیا میں تجھے اس درجے سے گرا دوں گا جس کو تو اپنے عمل سے کبھی بھی نہیں پا سکے گا۔

محبّت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ محبوب کی ہم کلامی سے اُنس ہو اور خلوت کو کمال درجے کی نعمت سمجھے اور ہر اس چیز سے اُس کو کمال درجہ کی وحشت ہو جو اُس کی خلوت میں مخل ہو۔

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۳۱

جب محبت اور اُنس غالب ہو جاتا ہے تو خلوت اور ہم کلامی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے جس سے تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ دل محبت اور اُنس میں غرق ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ انسان دنیا کے کام سمجھتا ہی نہیں جب تک کہ دو بارہ سہ بارہ کہہ کر اُسے تاکید نہ کی جائے جیسے کہ آشفتہ حال عاشق ہوتا ہے۔

ایک علامت یہ ہے کہ جو وقت اللہ کی یاد سے غفلت میں گزرا اس پر افسوس ہو اور اطاعت کو نعمت سمجھے۔ اسے بوجھ نہ جانے اور اُس کی مشقت اُس کو معلوم نہ ہو۔

حضرت ثابت بنانی رحمہ اللہ نے کہا: "میں نے بیس سال نماز تکلف سے پڑھی اور بیس سال نعمت سمجھ کر۔"

حضرت جنیدؒ نے کہا: "محبت کی علامت ہمیشہ کی خوشی اور ایسی خواہش میں جانفشانی ہے جو اُس کے بدن کو خواہ نقصان پہنچائے لیکن دل کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اور ان سب چیزوں کی مثالیں مشاہدات میں موجود ہیں۔ محب اپنے محبوب کی مراد میں کوشش کرنے کو بوجھ نہیں سمجھتا اور اُس کی خدمت میں دل کی لذت پاتا ہے۔ اگرچہ اس کے جسم پر بوجھ ہو اور محبت لازماً غلبہ چاہتی ہے، تو جس کا محبوب جس قدر زیادہ پیارا ہوگا وہ اس کی خدمت میں سستی کو اسی قدر چھوڑ دے گا۔

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ کے تمام بندوں پر شفیق اور مہربان ہو اور اُس کے دشمنوں کے لیے سخت۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ[1] (وہ کافروں کے لیے سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں)

اگر اللہ کے معاملے میں کسی کی ملامت کا خوف نہ ہو اور اللہ کے لیے ناراضگی سے اس کو کوئی چیز روک نہ سکے، تو یہ محبت کی علامات ہیں اور جس میں یہ سب جمع ہو جائیں اُس کی محبت کامل ہے اور وہی آخرت میں حوضِ کوثر سے سیراب ہوگا۔

جس کی محبت میں غیر اللہ کی محبت کی ملاوٹ نہ ہوگی اُسے آخرت میں محبت کے اندازے کے مطابق نعمتیں ملیں گی اور اُس کے مشروب میں اس کے ایمان کے مطابق مقربین کے مشروب کی آمیزش ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ[2] (نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے)

یہاں تک کہ فرمایا: يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ خِتَامُهُ مِسْكٌ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ۔[3] (وہ مُہر شدہ خالص شراب پلائے جائیں گے اور اُس کا اختتام کستوری کا ہوگا اور اس میں ریس کرنے والوں کو ریس کرنی چاہیے اور اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی۔ اس چشمہ سے مقرب بندے پئیں گے)

---

[1] سورۃ فتح۔ آیت: ۲۹ [2] سورۃ انفطار۔ آیت: ۱۳ و سورۃ مطففین۔ آیت: ۲۲ [3] سورۃ مطففین۔ آیت: ۲۵ تا ۲۸

توجس کی محبت خالص ہوگی اُس کو شراب بھی خالص ملے گی اور جس کی محبت میں ملاوٹ ہوگی اس کی شراب میں بھی ملاوٹ ہوگی: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (جو ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ کے برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا)

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ کی محبت میں ہیبت اور تعظیم کی وجہ سے خوف ہو۔ اور خوف محبت کے منافی نہیں۔ خاص طور پر محبت کرنے والوں کے لیے خوف کے وہ مقامات ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں ہیں اور بعض مقام بعض سے سخت ہیں۔ پہلا خوف اللہ کے منہ پھیر لینے کا ہے اور اس سے سخت خوف حجاب کا ہے اور اس سے سخت خوف اللہ سے دُور ہو جانے کا ہے۔

ایک علامت محبّت کا چھپانا۔ دعوے سے اجتناب اور وجد اور محبت کے اظہار میں احتیاط ہے۔ اور اس کی وجہ محبوب کی تعظیم، بزرگی، ہیبت اور اپنے راز پر غیرت ہے۔ کیونکہ محبّت محبوب کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ کبھی محبت دہشت اور مدہوشی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے بے ارادہ محبّت ظاہر ہو جاتی ہے تو ایسا آدمی معذور ہے جیسا کہ بعض نے کہا:

اور جس کا دل دوسرے کے پاس ہو اس کا حال کیا ہوگا اور جس کا راز اُس کی پلکوں میں ہو وہ کیسے چھپائے۔

سورۃ زلزال، آیت ۷، ۸

فصل ششم

اللہ کی تقدیر پر راضی ہونے کا مطلب

معلوم ہونا چاہیے کہ جس پر اُنس کا حال غالب ہو اس کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ تنہائی اور خلوت میں رہے۔ اللہ سے اُنس کے بعد لازم ہے کہ دوسروں سے وحشت ہو اور ایسے شخص کے دل پر سب سے بھاری چیز وہ ہوتی ہے جو خلوت میں مخل ہو۔

عبدالواحد بن زید نے کہا: "میں نے ایک راہب سے پوچھا: آپ کو خلوت پسند ہے؟ تو اُس نے کہا: اگر تم کو خلوت کی لذّت نصیب ہو جائے تو تمھیں اپنے وجود سے بھی وحشت ہو جائے۔ میں نے کہا۔ اللہ سے اُنس کی لذّت کب نصیب ہوتی ہے؟ اس نے جواب دیا، جب محبت خالص ہو جائے۔ میں نے کہا۔ محبت خالص کب ہوتی ہے؟ کہا: جب فکر مجتمع ہو جائے اور صرف اللہ کی اطاعت کی فکر رہ جائے۔"

اگر پوچھا جائے کہ اُنس کی علامت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُس کی خاص علامت لوگوں کو ملنے سے تنگ دل ہونا اور بے چینی محسوس کرنا ہے۔ اور اگر با مر مجبوری ملے بھی تو اُس کی حالت ایسی ہوتی ہے گویا ان کے درمیان موجود نہیں۔ اس کا جسم لوگوں میں ہوتا ہے، لیکن دل محبوب کے پاس۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اُنس جب دائمی، غالب اور مستحکم ہو جائے، تو بعض اوقات اس میں ایک طرح کی خوشی اور ناز و نخرہ پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات بظاہر یہ صورت بُری معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں جراٴت اور اللہ کی ہیبت میں کمی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ مقامِ اُنس کے مقیم سے ایسی چیز برداشت کر لی جاتی ہے، لیکن جو لوگ اس مقام کو نہیں سمجھتے وہ ایسے آدمی پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابو حفص سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دن جا رہے تھے تو آپ کو ایک پریشان حال آدمی ملا۔ آپ نے اُس سے پوچھا "تجھے کیا ہوا؟" اُس نے کہا: "میرا گدھا گُم ہو گیا ہے اور میرے پاس اس کے علاوہ کوئی متاع نہیں۔" تو ابو حفص وہیں کھڑے ہو گئے اور کہا: "اے اللہ! مجھے تیری عزت کی قسم جب تک اس کا گدھا نہ ملے گا میں آگے ایک قدم نہ اٹھاؤں گا۔" تو اسی وقت گدھا آ گیا۔

برخ عابد سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پیاس سے پریشان ہو کر باہر نکلے اور کہا: "اے رب! تو بخیل تو نہیں

ہے۔ کیا تیرے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے؟ ہمیں ابھی پانی دے۔"

اور یہ کوئی بعید بات نہیں ہے کہ ایک آدمی سے کوئی بات برداشت کر لی جائے اور دوسرے سے وہی بات برداشت نہ کی جائے۔ باقی رہا اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا، تو یہ مقربین کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے۔ محبت کا نتیجہ ہے، اور اس کی حقیقت بڑی گہری ہے۔ اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جسے اللہ سمجھائے۔

رضا کی فضیلت میں وہ بھی ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے اپنی تقسیم پر راضی کر دیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: "اے داؤد، مجھے سب سے زیادہ خوش کرنے والا اور تیرے بوجھ کو اُتارنے والا کوئی عمل ایسا نہیں جیسا کہ میری تقدیر پر خوش ہوتا ہے۔"

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو غمگین دیکھا تو فرمایا: "اے عدی! کیا بات ہے میں تجھے غمزدہ اور پریشان دیکھ رہا ہوں؟" تو اُنھوں نے کہا: "میں کیوں پریشان نہ ہوں میرے دو بیٹے قتل ہو گئے ہیں اور میری آنکھ پھوٹ گئی ہے۔" تو آپ نے فرمایا: "اے عدی! جو اللہ کی تقدیر پر راضی ہوا وہ اس پر جاری ہو گی اور اسے اجر ملے گا اور جو اللہ کی تقدیر پر راضی نہ ہوا اس پر بھی تقدیر جاری ہو گی اور اس کے عمل ضائع ہو جائیں گے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے اپنے انصاف اور علم سے راحت اور خوشی، یقین اور رضا میں رکھی ہے اور غم اور فکر، شک اور تقدیر پر ناراضگی میں۔"

حضرت علقمہ رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ[1] (اور جو اللہ پر ایمان لائے گا اللہ اس کے دل کو ہدایت دے گا) کی تفسیر میں فرمایا: "یہ مصیبت ہے جو آدمی کو پہنچتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔ وہ اسے تسلیم کرتا ہے اور اس پر راضی ہوتا ہے۔"

ابو معاویہ اسود نے اللہ تعالیٰ کے قول: فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً[2] (ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے) کے متعلق فرمایا: "یہ رضا اور قناعت ہے۔"

حدیث میں ہے کہ انبیاء میں سے ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی دس سال کی غربت اور بھوک کی شکایت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی: "کتنی مدت تک شکوہ کرتے رہو گے؟ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے

---

[1] سورۃ تغابن۔ آیت: ۱۱ [2] سورۃ نحل۔ آیت: ۹۷

میں نے لوحِ محفوظ میں تمہاری قسمت اسی طرح لکھی تھی اور تمہارے متعلق میرا یہی فیصلہ ہے اور میں نے دنیا پیدا کرنے سے پہلے تمہارے لیے یہی لکھا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے دنیا کی پیدائش کو از سرِ نو لوٹاؤں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو میں نے تمہارے لیے مقدر کیا ہے اُسے تبدیل کر دوں اور تمہاری پسند میری پسند سے فائق ہو اور تمہاری چاہت میری چاہت سے فائق ہو جائے۔ مجھے میری عزت و جلال کی قسم! اگر تمہارے دل میں آئندہ اس قسم کا کوئی خیال آیا تو میں تمہارا نام انبیاء کے دفتر سے مٹا دوں گا۔"

داؤد علیہ السلام کی زبور میں ہے: "کیا تم جانتے ہو کہ سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پلصراط سے کون گزرے گا؟ وہ جو میرے فیصلے پر راضی ہیں اور ان کی زبانیں میرے ذکر سے تر ہیں۔"

داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: "اے رب! تیرے نزدیک سب سے بڑے لوگ کون ہیں؟" کہا: "وہ بندہ جو کسی کام کے متعلق مجھ سے استخارہ کرے، پھر میں اس کو اپنی پسند بتاؤں اور وہ اس پر رضامند نہ ہو۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا: "تقدیر کے واقعات کے علاوہ میرے لیے کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔"

پوچھا گیا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟" تو کہا: "جو اللہ تعالیٰ میرے لیے فیصلہ کرے۔"

حضرت حسنؒ نے کہا: "جو اللہ کی تقدیر پر راضی ہوا اس کو فراخی ملے گی اور اللہ اسے اس میں برکت دے گا۔ اور جو راضی نہ ہوگا، نہ اسے فراخی ملے گی نہ برکت۔"

عبدالواحد بن زید نے کہا: "رضا اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا دروازہ ہے، یہ دنیا کی جنت ہے، یہ عبادت گزاروں کی راحت ہے۔"

بعض بزرگوں نے کہا: "آخرت میں سب سے بلند درجات اُن کے ہوں گے جو ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ جسے رضا عطا فرمائی گئی وہ سب سے افضل درجات پر پہنچا۔"

ایک اعرابی کے بہت سے اونٹ مر گئے تو اُس نے کہا:

"خدا کی قسم! میں خدا کی غلامی میں ہوں، اور اس کا بندہ ہوں۔ اگر کینہ پرور دشمن کے خوش ہونے کا خیال نہ ہوتا، تو میں یہ ہرگز پسند نہ کرتا کہ میرے اونٹ باڑے میں موجود رہیں اور اللہ کی تقدیر نافذ نہ ہو۔"

فصل ہفتم

اللہ کی تقدیر اور انسان کی خواہش

جو چیز خواہش کے خلاف ہو اس میں بھی رضا کا تصوّر کیا جا سکتا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو محسوس کرتا ہے لیکن اس پر راضی ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو اُس کی زیادتی کی رغبت کرتا ہے کیونکہ اس کو اس کا ثواب ملتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی حجام سے فصد کراتا ہے، سینگیاں لگواتا ہے اور اُسے ان کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے لیکن صحت کے لیے وہ اس پر راضی ہوتا ہے۔ اس کی رغبت کرتا ہے، بلکہ سینگی لگانے والے کا احسان بھی سمجھتا ہے اور اُسے اُجرت بھی دیتا ہے۔

یہی حال اس مسافر کا ہے جو منافع کی طلب میں سفر کرتا ہے۔ وہ سفر کی مشقت اٹھاتا ہے لیکن سفر کے نتیجے کے خیال سے اسے پسند کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔ یہی حال ہر اس آدمی کا ہے جسے اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ جتنا اس سے گیا ہے اس سے بدرجہا زیادہ مل جائے گا اور وہ اس پر رضامند ہو جاتا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے محبت غالب آ جائے کیونکہ محبوب کی مراد میں محبّ کو لذت ملتی ہے۔ اور محبت کی زیادتی کی وجہ سے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ عجیب بات نہیں ہے، کیونکہ خوف یا غضب کی حالت میں جنگ کرنے والے آدمی کو زخم لگتا ہے تو وہ اسے محسوس نہیں کرتا اور نہ اس حال میں اسے زخم کا علم ہوتا ہے کیونکہ اُس کا دل مستغرق ہوتا ہے۔ اور جب دل کسی کام میں غرق ہو تو دوسری کسی چیز کا خیال نہیں آتا۔ یہ بات مشاہدات میں موجود ہے۔

حضرت جنید رحمہ اللہ نے کہا: "میں نے سری سقطیؒ سے پوچھا: کیا محبّ کو مصیبت کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے؟" کہا: "نہیں۔"

بہت سے اہلِ بلاء کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے: "اگر ہمیں ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو پھر بھی اللہ کی محبت ہمارے دل میں بڑھتی ہی جائے گی۔"

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ محبت کی زیادتی تکلیف کا احساس ختم کر دیتی ہے اور محب کو مخلوق کی محبت میں بھی مدد دیتی

ہے جیسا کہ بعض نے بیان کیا ہے کہ ہمارے ہمسایہ میں ایک آدمی تھا۔ اُسے اپنی لونڈی سے محبت تھی۔ وہ بیمار ہو گئی۔ وہ اُس کے لیے حلوہ بنانے لگا۔ وہ ہانڈی میں چمچہ چلا رہا تھا کہ لونڈی نے "ہائے" کہا۔ وہ گھبرا گیا۔ چمچہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اور وہ اپنا ہاتھ ہی ہانڈی میں چلاتا رہا یہاں تک کہ اُس کی انگلیاں جل کر گر پڑیں اور اُسے معلوم نہ ہوا۔ اس کی تائید اُن عورتوں کے واقعے سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تھا، تو اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے اور انھیں تکلیف کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ تو جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خواہش کے خلاف بھی رضا کا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ اور جب یہ مخلوق کی محبت ممکن ہے تو اللہ تعالیٰ اور آخرت کی لذت کے متعلق بطریق اولیٰ ممکن ہوگا۔ اور اس کا امکان تین وجہ سے ہے:

پہلی وجہ یہ کہ مومن جانتا ہے کہ اس کے حق میں اللہ کی تدبیر اس کی اپنی تدبیر سے بہتر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کسی مسلمان کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں اُسی میں اُس کی بھلائی ہوتی ہے۔"

حضرت مکحولؒ نے کہا: "میں نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے سنا آپ نے فرمایا: "آدمی اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جب اس کو بہتری کی رہنمائی کرتا ہے، اور وہ ناپسند کرتا ہے، تو انجام کار تھوڑی مدت کے بعد ہی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہی اس کے لیے بہتر تھا۔"

حضرت مسروقؒ نے کہا: "جنگل میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس کتا، گدھا اور مرغ تھے۔ مرغ نماز کے لیے جگاتا۔ گدھے پر وہ پانی اور اپنا خیمہ وغیرہ بار کرتا اور کتا رکھوالی کرتا۔ ایک دن لومڑی آئی اور مرغ کو اٹھا کر لے گئی۔ اُس آدمی نے کہا: "شاید اسی میں بہتری ہو۔" پھر بھیڑیا آیا اور اُس نے گدھے کو مار ڈالا۔ اُس آدمی نے کہا شاید اس میں بھی میری بھلائی ہو۔ پھر کتا بھی مر گیا، تو اُس آدمی نے اب بھی یہی کہا: "شاید اسی میں بھلائی ہو۔"

اس سے کچھ دن بعد اُس نے دیکھا کہ جو لوگ اِرد گرد رہتے تھے اُن پر حملہ ہوا اور سب گرفتار ہو گئے۔ اس بے سروسامان شخص کو حملہ آوروں نے کچھ نہ کہا، دوسرے اس وجہ سے گرفتار ہو گئے کہ ان کے پاس آوازیں دینے والی چیزیں تھیں، جن سے ڈاکوؤں کو پتہ چل گیا۔ اگر اُس کا مرغ اور کتا زندہ ہوتے تو دونوں ضرور بولتے اور ڈاکو اُس کے ٹھکانے کا بھی سراغ پا لیتے۔

حضرت سعیدؒ بن مسیّب نے کہا: "لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا۔ اے بیٹے! تم پر جو کچھ بھی گزر جائے خواہ تم اُس کو پسند کرو یا ناپسند، بہر حال اپنے دل میں یہی سمجھا کرو کہ اسی میں تمھاری بھلائی تھی۔" بیٹے نے کہا کہ جب تک اس بات کی صحت معلوم نہ ہو جائے میں آپ کی یہ بات کیسے مان لوں۔ تو لقمان نے کہا۔ چلو اس زمانے کے پیغمبر کے

پاس چلتے ہیں۔ وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے۔ بیٹے نے کہا۔ ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ تو وہ دونوں اپنے اپنے گدھوں پر سوار ہوئے اور راستے کا خرچ، روٹی، پانی لے لیا۔ پھر کتنے ہی دن اور راتیں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک صحرا اُن کے سامنے آگیا اور وہ اُس میں داخل ہو گئے اور جتنی دیر اللہ نے چاہا چلتے رہے۔ یہاں تک کہ سورج سر پر آگیا۔ گرمی سخت ہو گئی اور روٹی اور پانی بھی ختم ہو گیا۔

گدھے تھکاوٹ کی وجہ سے نڈھال ہو گئے، تو وہ اُتر کر پیدل چلنے لگے۔ اسی طرح چلے جا رہے تھے کہ لقمان نے اپنے سامنے نظر دوڑائی تو انھیں کچھ سیاہی اور دھواں نظر آیا۔ اُنھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ سیاہی تو درخت ہیں اور دھواں آبادی کا نشان؛ چنانچہ اُنھوں نے اُسی طرف رُخ کر لیا۔

وہ اسی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں پڑی ہوئی ہڈی لقمان کے بیٹے کے پاؤں میں چبھ گئی اور ایسی چبھی کہ تلوے سے اوپر نکل آئی۔ بیٹا غش کھا کر گر پڑا۔ لقمان نے لپک کر اُسے اُٹھایا۔ دانتوں سے پکڑ کر ہڈی نکالی اور اپنی پگڑی پھاڑ کر زخم پر باندھ دی۔

بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر لقمان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور ایک قطرہ لڑکے کے منہ پر گرا تو اُسے ہوش آگیا۔ اُس نے باپ کو روتے دیکھا تو کہا: "اے میرے باپ! جب آپ اس حادثے کو میرے لیے بہتر سمجھتے ہیں تو روتے کیوں ہیں؟"

لقمان نے کہا: "اے بیٹے! میں باپ ہوں اور یہ رونا باپ کی محبت کی وجہ سے ہے اور یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ حادثہ تمھارے لیے کس طرح بہتر ہے؟ تو شاید اس مصیبت سے بڑی مصیبت اللہ نے تجھ سے دُور کر دی ہو اور میں جس مصیبت میں مبتلا ہوا ہوں شاید اس سے بڑی مصیبت سے اللہ نے مجھ کو بھی بچایا ہو۔"

یہ کہتے ہوئے لقمان نے سامنے کی طرف نظر ڈالی تو اب دھواں اور سیاہی نظر نہ آئے۔ اُنھوں نے دل میں سوچا میں نے پہلے جو کچھ دیکھا تھا شاید میرا واہمہ تھا، لیکن پھر خیال آیا اس قدر واضح انداز میں نظر آنے والی چیز واہمہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ سامنے سے ایک سوار نمودار ہوا جس نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور بہت تیزی سے اپنے گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ لقمان اسے بغور دیکھ رہے تھے کہ وہ اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور دُور سے آواز آئی:

"کیا تم لقمان ہو؟"

انھوں نے کہا: "ہاں۔" تو کہا: "تمھارا بے وقوف بیٹا کیا کہتا تھا؟"

لقمان نے کہا: "اے اللہ کے بندے تو کون ہے، میں تیری بات سنتا ہوں لیکن تیرا چہرہ نہیں دیکھتا؟"
اس نے کہا: "میں جبریل ہوں مجھے کوئی ملک مقرب یا نبی مرسل ہی دیکھ سکتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم مجھے دیکھ لیتے۔ تمہارے بے وقوف بیٹے نے تم سے کیا کہا تھا؟"

لقمان نے کہا: "کیا آپ کو معلوم نہیں؟"

جبریل نے کہا: "مجھے تمہارے معاملے کا کچھ علم نہیں۔ تم دونوں کے نگہبان فرشتے میرے پاس آئے اور تم دونوں کے بارے میں بتایا۔ اس سے پہلے مجھے اللہ تعالیٰ نے اس شہر، اس کے باشندوں اور مضافات کو تباہ کرنے کا حکم دیا تھا، تو میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ تم دونوں کو جس طرح چاہے اس بستی سے روکے تو اللہ نے تم کو اس طرح روکا جو تمہارے بیٹے کے ساتھ ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو تم دونوں بھی شہر والوں کے ساتھ تباہ ہو جاتے۔"

جبریل نے لڑکے کے قدم پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کھانے والے برتن پر ہاتھ پھیرا تو وہ کھانے سے بھر گیا اور پانی والے برتن پر ہاتھ پھیرا تو وہ پانی سے بھر گیا۔ اس کے بعد دونوں کو بہت عجلت کے ساتھ گھر پہنچا دیا۔"

دوسری وجہ یہ کہ تکلیف پر راضی ہونا اس امید کی وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کے بدلے بہت اجر ملے گا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ تندرستی کی امید میں آدمی فصد کھلوانے، سینگی لگوانے اور کڑوی کسیلی دوائیں استعمال کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔

تیسری وجہ رضا کی یہ ہے کہ وہ محبوب کی مراد سمجھ کر اس پر راضی ہوتا ہے! در حقیقت جس میں محبوب کی رضا ہو وہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ لذیذ چیز ہوتی ہے، اگرچہ اس میں اس کی جان بھی چلی جائے۔ جیسا کہ بعض نے کہا ہے:
جو زخم تمہارا کوئی مرض دور کر دے اس کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ محبت کا غلبہ ایسا ہوتا ہے کہ تکلیف کا احساس نہیں رہتا اور جو اس کیفیت کو نہ پائے اسے اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کو اس کا ادراک اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے اسباب مہیا نہیں ہیں۔ اور وہ ہے محبت کی افراط۔ اور جس نے محبت کا مزہ نہ چکھا اسے اس کے عجائبات بھی معلوم نہ ہوں گے۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ بہرہ، نغمے اور الحان کی لذت کا انکار کرے گا اور جس کے پاس دل نہ ہو وہ یقیناً ان لذتوں کا انکار کرے گا جو صرف دل سے تعلق رکھتی ہیں۔

فصل ہشتم

اللہ اور بندے کا تعلّق

معلوم ہونا چاہیے کہ دُعا کرنا رضا کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح گناہوں، اُن کے اسباب اور گنہگاروں کو ناپسند کرنا اور اُن کے ازالہ کی کوشش کرنا بھی رضا کے خلاف نہیں ہے۔

دراصل دُعا سے ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے بندوں کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے: یَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (وہ ہمیں ڈر اور رغبت سے پکارتے ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء اور صالحین کا دعا کرنا معلوم اور مشہور ہے۔

گناہوں سے اجتناب اور اُن پر خوش نہ ہونے میں بھی ہم اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ نے گناہوں پر خوش ہونے والوں کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح وہ کفار اور فجار سے بغض رکھتا اور اُن پر خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کے شواہد قرآن و حدیث میں بے شمار ہیں۔

اگر کہا جائے کہ اللہ کی تقدیر پر راضی ہونے کے متعلق احادیث وارد ہوئی ہیں اور اگر گناہ اللہ کی تقدیر کے خلاف ہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اور اگر یہ اللہ کی تقدیر ہیں تو ان کو ناپسند کرنا تقدیر کو ناپسند کرنا ہے۔ پھر یہ دونوں حالتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ شبہ ایسے لوگوں کو پڑ سکتا ہے جو اسرارِ علم سے واقف نہیں ہیں؛ چنانچہ اسی جہالت کی بنا پر ایک قوم کو شبہ ہوا کہ بُری باتوں سے خاموش رہنا بھی رضا کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ اُنھوں نے اس کا نام "حُسنِ خُلق" رکھا ہے۔ حالانکہ یہ خالص جہالت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رضا اور کراہت جب ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی حیثیت سے وارد ہوں، تو یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہاں اگر تم ایک چیز کو ایک حیثیت سے پسند کرو اور دوسری حیثیت سے ناپسند تو یہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہوں گی۔ مثلاً تمھارا ایک ایسا دشمن مرجاتا ہے جو

---

[1] سورۃ انبیاء، آیت: ۸۹

تمھارے دشمن کا بھی دشمن تھا اور تمھارے دشمن کو ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا تھا، تو تم اس کی موت کو اس حیثیت سے تو برا سمجھو گے کہ اس کے مرنے سے تمھارے دشمن کے ہلاک ہونے کا امکان جاتا رہا، لیکن اس حیثیت سے خوش ہو گے کہ وہ تمھارا بھی دشمن تھا۔

اسی طرح گناہ کی بھی دو نسبتیں ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ وہ اُس کا اختیار اور ارادہ تھا، تو تم اس وجہ سے تو خوش ہو کہ یہ مالک الملک کی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، لیکن ایک وجہ بندے کی طرف ہے کہ وہ اس کی کمائی اور صفت ہے اور اللہ کے نزدیک مبغوض اور بُرا ہونے کی علامت ہے اور چونکہ یہ دوری اور ناراضگی کے اسباب میں سے ہے، لہٰذا بُرا اور مذموم ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

ہم مخلوق میں سے ایک ایسا محبوب فرض کرتے ہیں جس نے اپنے محبت کرنے والوں سے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کروں اور میں اس کے لیے ایک معیار قائم کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں فلاں آدمی کو اتنا مارتا ہوں کہ وہ مجھے گالی دینے پر مجبور ہو جائے، پھر جب وہ مجھے گالی دے گا، تو میں اُس کو اپنا دشمن سمجھوں گا۔ پھر جو بھی اس سے محبت رکھے گا وہ میرا دشمن ہو گا اور جو اس سے بغض رکھے گا میں اُسے اپنا دوست اور محب سمجھوں گا۔"

پھر اُس نے ایسا ہی کیا اور گالی سے اس کی مراد پوری ہوئی جو کہ بغض کا سبب ہے اور بغض حاصل ہوا جو کہ عداوت کا سبب ہے، تو جو بھی اس کی محبت میں سچا ہے اس کا حق ہے کہ کہے کہ اس آدمی کو مارنے اور تکلیف دینے کی تیری تدبیر کو تو میں گوارا کرتا ہوں کیونکہ وہ تیری رائے اور تدبیر اور فعل ہے، لیکن اُس شخص کا تجھ کو گالی دینا اس حیثیت سے کہ وہ گالی اُس شخص نے دی یہ اُس کی زیادتی اور تجھ پر حملہ ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک اس کا فرض تھا کہ وہ صبر کرتا اور گالی نہ دیتا۔

یہی حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے پر شہوات اور گناہوں کے جذبات مسلط کرنے پر رضا اور نافرمانی کی صورت میں اس سے ناراض ہونے کا ہے۔

ہر اس آدمی پر واجب ہے جو اللہ سے محبت رکھنے والا ہے کہ جسے اللہ بُرا سمجھے، اسے وہ بھی بُرا سمجھے، اور جس سے اللہ دشمنی رکھے اور اُسے اپنی بارگاہ سے دُور کر دے اگرچہ اس نے اپنے غلبے اور قدرت سے اسے مجبور کر دیا ہے کہ اللہ سے دشمنی اور مخالفت رکھے پھر بھی وہ راندۂ درگاہ اور درجاتِ قرب سے دُور ہے؛ چنانچہ اس سے وہ بھی دشمنی رکھے اور تمام محب اس کو بُرا سمجھیں اور اپنے محبوب کی موافقت کریں کہ جس پر وہ ناراض ہے اس پر وہ بھی ناراض ہوں۔

اس مثال سے وہ تمام باتیں واضح ہو جاتی ہیں جو اللہ کے لیے بغض اور اللہ کے لیے محبت کے بارے میں

احادیث میں آئی ہیں کہ کفار پر سختی اور ناراضگی بھی ہے اور اللہ کی تقدیر پر رضا بھی ہے کہ وہ اللہ کا فیصلہ ہے اور یہ تقدیر کا وہ راز ہے جسے افشا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی اور بدی دونوں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے میں داخل ہیں، لیکن برائی منکر ہونے کے ساتھ مکروہ ہے اور نیکی مراد ہونے کے ساتھ پسندیدہ۔ اس سلسلے میں بہتر یہی ہے کہ خاموش رہے اور شریعت کے آداب کو ملحوظ رکھے۔ جس طرح لوگ عبادت کرتے ہیں اسی پر ٹھہرا رہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر خوش بھی رہے اور گناہوں کو ناپسند بھی کرے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے ایک چیز جو محبت سے تعلق رکھتی ہے حسن ظن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کی طرف وحی فرمائی: "اگر مجھ سے منہ موڑنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ میں انھیں کس طرح مہلت دیتا ہوں، اُن پر کیسا مہربان ہوں، اور مجھے کتنا شوق ہے کہ وہ گناہ چھوڑ دیں، تو میرے شوق میں ان کی موت واقع ہو جائے اور میری محبت سے اُن کا جوڑ جوڑ الگ ہو جائے، تو اے داؤدؑ! جب منہ موڑنے والوں کے متعلق میرا یہ ارادہ ہے، تو جو میری طرف ہی توجہ رکھتے ہیں اُن کے متعلق میرا ارادہ کیسا کچھ ہو گا؟ اے داؤدؑ! بندہ سب سے زیادہ میرا محتاج اس وقت ہوتا ہے جب وہ مجھ سے بے نیاز ہو جائے۔ اور سب سے زیادہ بزرگ میرے نزدیک اس وقت ہوتا ہے جب وہ میری طرف رجوع کرے۔"

ایک عبادت گزار عورت کہتی تھی: "خدا کی قسم! میں زندگی سے اُکتا گئی ہوں۔ اگر موت قیمتاً ملتی، تو میں اللہ تعالیٰ کے شوق میں اسے خرید لیتی۔"

اس سے کہا گیا: "کیا تجھے اپنے اعمال پر اتنا اعتماد ہے؟" تو کہنے لگی: "نہیں، لیکن مجھے اس سے محبت اور حسن ظن ہے۔ بھلا بتاؤ اگر میں اس سے محبت رکھوں تو کیا وہ مجھے سزا دے گا؟"

کتاب الاخلاص

- نیّت، اخلاص اور صدق
- نیّت اور اُس کی حقیقت
- اخلاص اور اُس کی فضیلت
- اخلاص کی حقیقت
- ملاوٹ والے عمل کا حکم اور اس پر ثواب کا استحقاق
- صدق اور اس کی حقیقت و فضیلت

فصل اوّل

نیّت اخلاص اور صدق

ارباب بصیرت کو انوار القرآن سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ سعادت تک پہنچنے کے لیے علم اور عبادت نہایت ضروری ہیں۔ دنیا میں سب لوگ ہلاک ہو رہے ہیں مگر علم والے۔ اور سب علم والے ہلاک ہوں گے سوائے عاملین کے۔ اور سب عمل والے ہلاک ہوں گے سوائے مخلصین کے۔ اور مخلص بھی عظیم خطرے میں ہیں۔

بغیر نیّت کے عمل محض مشقت ہے اور نیت بغیر اخلاص کے ریا۔ اور اخلاص بغیر تحقیق کے غبار۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا[1] (اور ہم اُن کے اعمال کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے پریشان غبار بنا دیا)

میں نہیں سمجھتا کہ جو نیت کی حقیقت کو نہیں جانتا اس کی نیت کیسے درست ہو سکتی ہے؟ اور اگر وہ اخلاص کی حقیقت نہیں جانتا تو اس کی نیت میں اخلاص کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اور اگر اُسے صدق کے معنی کا علم نہیں، تو مخلص اپنے نفس سے صدق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے؟

ہر بندے کا جو اللہ کی اطاعت کا ارادہ کرے پہلا کام یہ ہے کہ وہ نیت کو جانے تاکہ اسے معرفت حاصل ہو اور پھر صدق اور اخلاص کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد اپنے عمل کو اس کے مطابق درست کرے۔ کیونکہ بندے کے لیے یہی نجات کا وسیلہ ہیں۔ اور اب ہم ان چیزوں کو تین حصّوں میں بیان کرتے ہیں:

نیّت اور اس کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ[2] (اور ان لوگوں کو نہ ہٹا جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور وہ اس کی رضا مندی چاہتے ہیں)

---

[1] سورۃ فرقان۔ آیت: ۲۳

[2] سورۃ انعام۔ آیت: ۵۱

ارادہ سے مراد نیت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ: اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی، تو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی، تو اس کا اجر اللہ و رسول کے ذمے ہے اور جس کی ہجرت تحصیل دنیا یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہوئی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے ہجرت کی۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: "ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ بتائیے ایک آدمی بہادری دکھانے کو لڑتا ہے اور ایک آدمی قومی دھڑے کے لیے اور ایک آدمی دکھلاوے کے لیے۔ ان میں سے اللہ کی راہ میں کون سی لڑائی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑے وہ اللہ کی راہ میں ہے۔" یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنے پیچھے مدینے میں کچھ ایسے آدمی چھوڑ آئے ہو کہ تم جو بھی کوئی وادی طے کرتے ہو یا جو بھی راہ چلتے ہو وہ تمھارے ساتھ اجر میں برابر کے شریک ہیں۔ اُن کو بیماری نے روک رکھا ہے۔" (مسلم)

امام بخاریؒ نے اسے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا اس کے لیے بھی ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔"

ابو کبشہ انصاریؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس امت کی مثال چار آدمیوں کی طرح ہے۔ ایک وہ ہے جسے اللہ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ علم کے مطابق عمل کرتا ہے اور مال کو حق میں خرچ کرتا ہے۔ ایک وہ جسے اللہ نے علم دیا ہے مال نہیں دیا۔ اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اُس کی طرح اُسے خرچ کرتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دونوں اجر میں برابر ہیں۔"

ایک وہ ہے جسے اللہ نے مال دیا ہے اور علم نہیں دیا۔ وہ اس میں پریشان ہے اور مال کو ناجائز طور پر خرچ کرتا ہے۔

ایک وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہے نہ علم۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں کی طرح خرچ کرتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔"

ابو عمرانؒ جونی نے کہا: "فرشتے اعمال لے کر چڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اس صحیفے کو پھینک

فرشتے عرض کہتے ہیں اے ہمارے رب! اس نے اچھی بات کہی اور ہم نے اس کو لکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس نے میرے لیے نہیں کی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرشتے سے کہتے ہیں: فلاں آدمی کے لیے اتنی اتنی نیکی لکھو۔ وہ کہتے ہیں۔ اے رب! اس نے تو ایسا عمل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس نے اس کی نیت کی تھی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: سب سے افضل عمل یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے فرائض کو ادا کرے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرے اور اللہ تعالیٰ کے ثواب کی سچی نیت کرے۔

بعض کہا کرتے تھے: مجھے کوئی ایسا عمل بتاؤ جس سے میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرنے والا ہو جاؤں، تو اُسے کہا گیا۔ نیکی کی نیت کر، تو ہمیشہ عامل رہے گا۔ اگرچہ عمل نہ کرے۔ تو نیت قبول ہوتی ہے اگرچہ عمل نہ ہو۔ کیونکہ جس نے رات کو نماز پڑھنے کی نیت کی پھر وہ سو گیا، تو اُسے نیت کا ثواب ضرور مل جائے گا۔

حدیث میں ہے "جس آدمی نے رات کا کوئی وقت نماز پڑھنے کے لیے مقرر کر رکھا ہو۔ پھر وہ سو جائے، تو اس کی نماز کا اجر اس کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اور اس کا سو جانا اس پر خدا کا صدقہ ہو جاتا ہے"۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے[1]۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اعمال کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم گناہ ہیں۔ یہ نیک نیت سے نیکی نہیں بن سکتے۔ جیسے کوئی آدمی حرام مال سے مسجد بنائے، تو نیت اس میں مؤثر نہیں ہوگی۔ اگرچہ بھلائی کی نیت کرے۔ کیونکہ برائی آخر برائی ہے۔ نیکی صرف وہ ہے جسے شریعت نیکی سمجھتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ برائی نیکی بن جائے! یہ ناممکن ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جو آدمی حرام مال سے مسجد یا مدرسہ تعمیر کر کے بادشاہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ایسا ہے جیسے علمائے سوء بیوقوفوں اور شریر لوگوں کو علم سکھاتے ہیں جو فسق و فجور میں مشغول ہیں، کیونکہ یہ لوگ جب علم حاصل کر لیں گے، تو اللہ تعالیٰ کے راستے کے ڈاکو بنیں گے۔ یہ دُنیا پر کتوں کی طرح جھپٹیں گے۔ خواہشات کی پیروی کریں گے اور ان کا وبال اُن کے اُستاد پر ہوگا کیونکہ اُس کو اُن کی بدنیتی اور علم حاصل کرنے کے مقصد کا اندازہ تھا۔

اسی طرح قصہ گو لوگوں کا قصوں کی تعلیم حاصل کرنا ہے کہ ان میں سے اکثر کا مقصد دنیا کا حاصل کرنا اور مال اکٹھا کرنا ہوتا ہے تو ان کو تعلیم دینا فساد پر مدد کرنا ہے، اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اطاعت بھی اگر بُرے ارادے سے کی

---

[1] حافظ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں کہا ہے کہ بیہقی نے کہا اس کی سند ضعیف ہے اور ابن دحیہ نے کہا یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

جائے تو وہ بھی گناہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح گناہ خواہ کسی بھی نیت سے کیا جائے نیکی نہیں بن سکتا۔ اگر اس کے ساتھ ارادہ بھی گندہ ہو، تو اس کا بوجھ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور ایسا شخص وبالِ عظیم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

دوسری قسم عبادات کی ہے۔ اور افضلیت میں اضافہ نیت پر منحصر ہے۔ بعض لوگ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرتے ہیں۔ اگر کوئی نیت نہ ہو تو پورے ثواب سے محروم رہے گا۔ اس کے مقابلے میں عمل کی افضلیت کا انحصار نیک نیتوں کی کثرت سے ہوتا ہے، کیونکہ ایک ہی اطاعت میں بہت سی نیکیوں کی نیت ممکن ہے۔ ایسی صورت میں ہر نیت پر ثواب ملے گا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک مستقل نیکی ہے۔ اور پھر ہر نیکی دس گنا تک بڑھ جاتی ہے۔

اس کی مثال مسجد میں بیٹھنا ہے کہ وہ ایک نیکی ہے اور اس کے ساتھ ہی بہت سی نیتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھے۔ اعتکاف کی نیت بھی ہو سکتی ہے۔ اعضاء کو گناہ سے روکنے کی نیت بھی ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ نیت بھی کہ اللہ کی راہ سے روکنے والی چیزوں سے علیحدہ ہو جائے۔ خالص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو، وغیرہ، تو یہ زیادہ نیتیں کرنے کا طریقہ ہے اسی پر تمام عبادتوں کو قیاس کرنا چاہیے۔ کوئی طاعت بھی ایسی نہیں جس میں زیادہ نیتیں نہ ہو سکتی ہوں۔

تیسری قسم مباح چیزوں کی ہے۔ اور ہر مباح میں ایک سے زیادہ نیتیں ہو سکتی ہیں اور ان سے بڑے بلند درجات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

جو آدمی ان چیزوں سے غافل ہے اور ان کو جانوروں کی طرح استعمال کرتا ہے وہ بڑے نقصان میں ہے اور بندے کو اپنے خیالات اور اقدامات اور نگاہوں کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے کہ قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک کے متعلق سوال ہو گا کہ فلاں کام کیوں اور کس ارادہ سے کیا تھا؟

مباح چیزوں سے خدا کا قرب حاصل کرنے کی مثال خوشبو لگانا ہے۔ خوشبو لگانے میں سنت کا اتباع، مسجد کے احترام اور بدبو کو دفع کرنے کی نیت کرے کہ بدبو سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: "جس کی بو اچھی ہو اس کی عقل زیادہ ہوتی ہے۔"

اسی طرح سر میں تیل لگانے سے ذہانت اور عقل کی تیزی پیدا ہوتی ہے اور دینی مہمات کا ادراک آسان ہو جاتا ہے۔

بعض سلف نے کہا: میں پسند کرتا ہوں کہ ہر چیز میں میری نیت ہو، یہاں تک کہ کھانے پینے، سونے اور بیت الخلاء میں جانے میں بھی نیت ہو۔ ان میں سے ہر چیز کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرنا ممکن ہے کیونکہ یہ سب چیزیں وہ ہیں جو

بدن کے بقا اور دین کے بقا اور دین کے مہمات کے لیے دل کی فراغت کا سبب ہیں۔

جو آدمی کھانے میں عبادت کے لیے قوت حاصل کرنے کی نیت کرے اور نکاح میں اپنے دین کو بچانے۔ اپنے گھروالوں کا دل خوش کرنے اور نیک اولاد کے حاصل ہونے کی نیت کرے تو ان سب پر اسے ثواب ملے گا۔

اپنے کلمات و حرکات کو حقیر نہ سمجھو۔ حساب ہونے سے پہلے پہلے اپنے نفس سے خود حساب کرلو اور جو کام بھی کرنا ہو اس سے پہلے اپنی نیت صحیح کرو۔ جو چھوڑو اس میں اپنی نیت کو دیکھو۔

معلوم ہونا چاہیے کہ نیت نفس کی آمادگی اور اس کی مصلحت کی طرف اُس کے میلان کا نام ہے۔ خواہ موجودہ وقت میں ہو یا آئندہ میں۔

بعض جاہل کہتے ہیں کہ نیت کو اچھا رکھنا چاہیے تو وہ کھانا کھاتے وقت منہ سے کہتے ہیں "میں نے اللہ کے لیے کھانے کی نیت کی" یا قرآن کریم کی تلاوت کے وقت کہتا ہے "میں نے اللہ کے لیے پڑھنے کی نیت کی" اور وہ اسی کو نیت سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نیت صرف دل کے آمادہ ہونے کا نام ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے نیت اختیار کے تحت نہیں۔

بعض اوقات نیت بڑی آسان ہو جاتی ہے لیکن کبھی بہت مشکل۔ اور عموماً اس آدمی کے لیے نیت آسان ہوتی ہے جس کا دل دنیا کے بجائے دین کی طرف مائل ہو۔ بہرحال نیت کے لحاظ سے لوگ چند قسم کے ہیں:

بعض وہ ہیں جو خوف کی وجہ سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

بعض وہ ہیں جو اُمید کی وجہ سے نیت کرتے ہیں اور ایک مقام ان دونوں سے بلند تر بھی ہے اور وہ ہے اللہ کی عبادت و اطاعت اس کے جلال اور مستحق عبادت ہونے کی وجہ سے۔ اور یہ نیت عام دنیا داروں کو میسر نہیں ہوتی۔ اس کو سمجھنے والے بھی بہت تھوڑے ہیں چہ جائیکہ اس پر عمل کرنے والے۔ اس مقام والا اللہ کی محبت میں اللہ کے جلال پر غور کرنے اور اس کا ذکر کرنے کے علاوہ اور کچھ شغل نہیں رکھتا۔

احمدؒ بن خضرویہ نے بیان کیا کہ اُنھوں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سب لوگ مجھ سے مانگتے ہیں اور ابو یزید مجھ کو مانگتا ہے۔"

ہماری غرض نیتوں کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔ جس کے دل پر ایک چیز غالب ہو بسا اوقات اسے اس کے علاوہ نیت میسّر نہیں ہوتی۔ اور جس کو مباح میں نیت میسّر ہو اور فضیلت میں میسّر نہ ہوتی ہو تو اس کے لیے مباح بہتر ہے۔ فضیلت اُسی کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کھانے پینے اور سونے میں یہ نیت ہو کہ اس سے عبادت کے لیے قوت حاصل کرے گا اور اپنے بدن کو آرام دے گا لیکن فی الحال اس میں نماز اور روزے کا خیال نہ ہو، تو کھانا اور سونا افضل ہے، بلکہ اگر کثرت کی وجہ سے عبادت سے اکتا جائے اور معلوم کرے کہ اگر کچھ دیر آرام کرلے گا تو اس کی خوشی پھر لوٹ آئے گی، تو اس وقت اُس کے لیے آرام کرنا عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "دلوں کو آرام دو اور حکمت کے ساتھ اُن سے کام لو۔ وہ بھی جسموں کی طرح تھک جاتے ہیں۔"

بعض نے کہا "دلوں کو آرام دو اس طرح وہ ذکر کو یاد رکھیں گے! اور یہ باریک نکات ہیں جو علماء کی مجالس سے حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ طب کا ماہر کبھی گرمی والے کا علاج گوشت سے کرتا ہے، حالانکہ وہ بھی گرم ہوتا ہے اور حاذق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گوشت سے مریض کی قوت لوٹ آئے، تاکہ علاج کو برداشت کر سکے۔

اسی طرح جنگ کا ماہر کبھی حیلہ کرتا ہے اور مقابل کے آگے بھاگ اٹھتا ہے، تاکہ اسے کسی تنگ جگہ میں کھینچ لائے۔ اللہ تعالیٰ کے رستے پر چلنا شیطان کے ساتھ جنگ اور دل کا علاج ہے۔ دیدہ ور آدمی اس رستے میں باریک چالوں کے لیے ٹھہر جاتا ہے، جنھیں کمزور آدمی صحیح نہیں سمجھتا۔

جس چیز کا علم نہ ہو اسے غلط نہ سمجھنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اس کے اسرار منکشف ہوں۔

فصل دوم

اخلاص اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ[1] (اور انھیں حکم دیا گیا کہ صرف خالص اللہ کی عبادت کریں)

فرمایا: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[2] (خبردار، اللہ کے لیے خالص دین ہے)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اپنا دین خالص رکھو، تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا، تو فرشتے مہر شدہ نامۂ اعمال لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس کو پھینک دو اور اس کو قبول کر لو۔ فرشتے کہیں گے۔ تیری عزت کی قسم! ہم نے تو وہی لکھا جو اس نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ یہ دوسروں کے لیے تھا اور میں آج صرف وہی عمل قبول کروں گا جو صرف میرے لیے تھا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتے بندے کے عمل لے کر جاتے ہیں اور عمل بہت زیادہ بتاتے ہیں اور اسے بڑا اچھا کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف وحی کرتے ہیں کہ تم میرے بندے کے اعمال کی نگرانی کرنے والے ہو۔ اور میں اس کے دل کو دیکھتا ہوں۔ اس بندے نے خالص عمل نہیں کیے۔ اس کو سجّین میں رکھو۔ اور ایک بندے کے عمل لے کر جاتے ہیں اور بڑے تھوڑے عمل بتاتے ہیں، تو ان کی طرف وحی فرماتا ہے کہ تم میرے بندے کے اعمال کے نگران تھے اور میں اس کے دل کو دیکھتا ہوں، ان کو بڑھا دو اسے علّیّین میں رکھو۔"

حضرت حسنؒ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: "ایک درخت کی اللہ کے سوا پوجا ہوا کرتی تھی۔ ایک آدمی اس کے پاس

---

[1] سورۃ بیّنہ۔ آیت: ۴ [2] سورۃ زمر۔ آیت: ۳

آیا اور کہنے لگا میں اس درخت کو ضرور کاٹوں گا، چنانچہ اللہ کے لیے غصے میں آکر اسے کاٹنے کے لیے گیا۔ شیطان اسے انسان کی صورت میں ملا اور کہا۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: میں اس درخت کو کاٹنا چاہتا ہوں جس کی اللہ کے سوا پوجا ہو رہی ہے۔ شیطان نے کہا جب تم اس کی پوجا نہیں کرتے تو جو پوجا کرتے ہیں ان سے تمھارا کیا نقصان ہے؟ اس نے کہا: میں اسے ضرور کاٹوں گا، تو شیطان نے کہا میں تجھے اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں۔ تو اس درخت کو نہ کاٹ۔ صبح کے وقت تجھے تیرے تکیے کے نیچے سے ہر روز دو دینار مل جایا کریں گے۔ اُس نے کہا اس کا ذمّہ دار کون ہے؟ اس نے کہا میں۔ وہ آدمی واپس آگیا اور جب صبح ہوئی تو اسے تکیے کے نیچے دو دینار مل گئے۔ پھر دوسری صبح کو کچھ بھی نہ ملا پھر وہ غصے میں آکر درخت کو کاٹنے کے لیے نکلا۔ شیطان پھر اسی صورت میں اُسے ملا اور پوچھا کیا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا میں اس درخت کو کاٹنا چاہتا ہوں جس کی اللہ کے سوا پوجا ہو رہی ہے۔ اس نے کہا، تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو نہیں کاٹ سکتا۔ وہ کاٹنے کے لیے چلا، تو شیطان نے اُسے زمین پر پٹخ دیا اور اس کا گلا گھونٹنے لگا یہاں تک کہ وہ مرنے کے قریب ہوا۔ پھر شیطان نے اس سے کہا۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟ اور اسے بتایا کہ میں شیطان ہوں اور یہ بھی بتایا کہ پہلے دن تم اللہ کے لیے غضبناک ہو کر آئے تھے اور میں تم پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ میں نے تمھیں دو دینار کا لالچ دیا، تو تم نے درخت کو چھوڑ دیا اور اب جو تم آئے ہو تو دو دیناروں کے لیے غضب ناک ہو کر آئے ہو، لہٰذا میں نے تم پر قابو پا لیا۔"

حضرت معروف کرخیؒ اپنے نفس کو مارتے اور کہتے: "اے نفس، عمل خالص کر تب خلاصی ہوگی!"

حضرت ابو سلیمانؒ نے کہا: مبارک ہے وہ بندہ جس کا ایک ہی قدم اللہ کی رضا کے لیے اٹھا ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہنے رکھتا تھا اور غمی خوشی میں عورتوں کے مجمع میں چلا جاتا تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ وہ عورتوں کے مجمع میں تھا کہ موتی چوری ہو گیا۔ انھوں نے کہا دروازے بند کر دو ہم تلاشی لیں گے اور پھر ایک ایک کی تلاشی لینی شروع کی۔ یہاں تک کہ ایک یہ آدمی اور ایک عورت باقی رہ گئے، تو اس نے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور کہا اگر آج میں اس ذلت سے بچ گیا تو آئندہ ایسا کبھی نہ کروں گا۔ تو اسی عورت سے وہ موتی مل گیا اور تلاشی لینے والی نے آواز دی۔ "موتی مل گیا ہے اس شریف عورت کو چھوڑ دو۔"

فصل سوم

اخلاص کی حقیقت

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر چیز میں دوسری چیز کی ملاوٹ کا تصور ہو سکتا ہے۔ پھر جب کوئی چیز ملاوٹ سے پاک اور خالص ہو تو اس کا نام اخلاص ہے اور اخلاص کی ضد اشراک ہے۔ جو مخلص نہیں وہ مشرک ہے۔ ہاں شرک کے کئی درجے ہیں اور توحید میں اخلاص کی ضد شرک فی الالٰہیت ہے۔ ایک شرک جلی ہے اور ایک خفی۔ اور اسی طرح اخلاص ہے۔

ہم نے ریاء کے درجات اس کے باب میں پہلے بیان کر دیے ہیں اور اب ہم اس میں گفتگو کریں گے جو قرب حاصل کرنے کے ارادے سے عمل کیا جائے، لیکن اس میں کوئی اور سبب بھی شامل ہو جائے۔ خواہ ریا یا نفس کی لذت وغیرہ ہی ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی تقرب کے ارادے کے ساتھ ہی اس لیے روزہ رکھے کہ روزہ رکھنے کی عزت بھی حاصل کرے۔ یا کسی غلام کو آزاد کرے تاکہ اس کی بد خلقی اور مشقت سے بچے۔ یا اس لیے حج کرے کہ سفر کی وجہ سے اس کی صحت اچھی ہو جائے یا پیش آنے والے شر سے بچ جائے۔ یا اس لیے جنگ کرے کہ جنگ کرنے کا طریقہ اور اس کے اسباب اُسے معلوم ہو جائیں۔ یا رات کو نماز پڑھے تاکہ نیند دور ہو اور اپنے گھر اور سامان کی حفاظت کر سکے۔ یا علم سیکھے کہ اس سے مال حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ یا پڑھاتے میں مشغول ہو تاکہ کلام کی لذت سے خوشی حاصل کرے۔

پھر جب اس کا سبب تقرّب الی اللہ ہو اور اس کے ساتھ ان خیالات میں سے کوئی دوسرے خیالات بھی شامل ہو جائیں اور ان کی وجہ سے یہ عمل اس پر آسان ہو جائے تو یہ عمل اخلاص کی حد سے خارج ہو گیا۔

انسان کا شاید ہی کوئی فعل یا کوئی عبادت ان امور سے خالی ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جس شخص کا ساری زندگی میں ایک لمحہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو جائے وہ نجات پا جائے گا اور ایسا اخلاص کے نادر ہونے اور ان ملاوٹوں سے دل کے بمشکل پاک ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ خالص صرف وہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے سوا اور کوئی ارادہ نہ ہو۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا "نفس پر سب سے زیادہ سخت چیز کیا ہے؟" کہا: "اخلاص، اس لیے کہ اس میں نفس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ملاوٹیں جو اخلاص کو مکدر کر دیتی ہیں مختلف ہیں۔ بعض جلی ہیں اور بعض خفی۔ ہم ریا کے درجات اس کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ بعض ریا تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جب تک عامل عمل کی حالت میں انسان اور جانور کے مشاہدہ میں فرق کر سکتا ہے، اخلاص کی صفائی سے خارج ہے اور شیطان سے صرف وہی بچ سکتا ہے جس کی نظر نہایت باریک ہو اور اللہ کی رحمت و توفیق اس کے شامل حال ہو۔

کہا گیا ہے کہ عالم کی دو رکعتیں جاہل کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں۔ اس سے وہ عالم مراد ہے جو آفاتِ عمل سے واقف ہو اور ان سے محفوظ رہ سکے۔ جاہل آدمی ظاہر عبادت کو دیکھتا ہے اس کی حقیقت پر غور نہیں کرتا۔ یقیناً سونے کا ایک قیراط جسے نقاد پسند کرے اس پورے دینار سے افضل ہے جسے کوئی غبی اور اناڑی آدمی پسند کرے۔

ملاوٹ والے عمل کا حکم اور اس پر ثواب کا استحقاق

وہ عمل جس کی بنیاد صرف ریا پر ہو آدمی پر وبال ہے جیسا کہ خالص عمل جو صرف اللہ کی رضامندی کے لیے کیا جائے ثواب کا سبب ہے۔

ان دونوں قسموں میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ معاملہ صرف اس عمل کا ہے جس میں ریا اور نفس کی لذت کی ملاوٹ ہو۔ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس سے ثواب ہوگا یا عذاب یا کچھ بھی نہ ہوگا؟

صحیح علم تو اللہ پاک ہی کو ہے، لیکن جو چیز ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم عمل پر آمادہ کرنے والے امور کی قوت کو دیکھیں گے۔ اگر نفسانی خواہش اور دینی جذبہ دونوں برابر ہوں، تو دونوں ساقط ہو جائیں گے اور اس عمل کا نہ اسے ثواب ہوگا نہ عذاب۔ اور اگر ریا غالب ہے تو وہ نقصان دہ ہے اور عذاب کا موجب ہے، لیکن اس کی سزا اس آدمی کی سزا سے کم ہوگی جس کا عمل صرف ریا کے لیے ہے۔ اور اگر دینی جذبہ ریا سے زیادہ طاقتور ہے، تو جتنی اس کی قوت ریا سے زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا[۱] بے شک اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا اور اگر نیکی ایک بھی

---

[۱] سورۃ نساء۔ آیت: ۴۰

ہوگی تو اسے بڑھائے گا)

ہمارے اس بیان کی تائید امت کے اس اجماع سے ہوتی ہے کہ جو آدمی حج کے لیے جائے اور تجارت بھی کرے، تو اس کا حج صحیح ہے اور اسے اس کا ثواب بھی ہوگا، حالانکہ اس میں نفس کا حصہ بھی شامل ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ اصلی محرّک حج کا ارادہ تھا؛ لہٰذا اس سفر سے ثواب ہوگا اور اسی طرح غازی ہے کہ وہ جنگ اور غنیمت دونوں کا ارادہ کرے اور غنیمت کا ارادہ بالتّبع ہو تو اُسے ثواب حاصل ہوگا لیکن اس آدمی کے برابر نہ ہوگا جس کو غنیمت کا خیال تک نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل چہارم

صدق اور اس کی حقیقت و فضیلت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچائی اختیار کرو، سچائی نیکی کی راہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کا رستہ دکھاتی ہے۔ آدمی ہمیشہ سچ بولتا اور اس کی جستجو کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت بشر حافی نے کہا: جس نے اللہ سے سچائی کا معاملہ کیا، اسے لوگوں سے وحشت ہوئی۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ صدق کا لفظ کئی ایک معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

ایک تو بات میں سچائی ہے۔ ہر آدمی کا فرض ہے کہ اپنے الفاظ پر غور کرے اور صرف سچ بولے اور زبان سے سچ بولنا ہی صدق کی سب سے مشہور اور ظاہر قسم ہے۔ انسان کو کلام میں توریہ سے پرہیز کرنا چاہیے کہ وہ جھوٹ کے مشابہ ہے، مگر یہ کہ اس کی ضرورت ہو اور بعض احوال میں مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو توریہ کرتے تاکہ دشمن تک خبر نہ پہنچے اور وہ جنگ کی تیاری نہ کر سکے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جو دو آدمیوں کے درمیان صلح کرائے اور اچھی بات کہے یا ایسی بات کہے جس سے بھلائی پیدا ہوتی ہو وہ آدمی جھوٹا نہیں ہے۔"

چاہیے کہ ان الفاظ میں بھی سچائی کا لحاظ رکھے جن سے وہ اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے جیسے کہ کہے "میں نے اپنا چہرہ اس اللہ کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا" یہ کہتے ہوئے اگر اس کا دل دنیا میں مشغول ہو اور خدا سے پھرا ہوا ہو تو وہ جھوٹا ہے۔

دوسرا صدق ارادے اور نیت کا ہے اور اس کا تعلق اخلاص سے ہے تو جو آدمی اپنے عمل میں نفس کو خوش کرنے کی ملاوٹ کرتا ہے اس کی سچائی کی نیت باطل ہو گئی؛ چنانچہ ایسا عمل کرنے والا جھوٹا ہے۔ جیسا کہ تین آدمیوں؛ عالم، قاری اور مجاہد والی حدیث میں ہے کہ جب قاری کہے گا میں نے قرآن اس لیے پڑھا، تو اللہ تعالیٰ اس کو نیت اور ارادے کا جھوٹا کہیں گے نہ کہ نفس قراءت کا جھوٹا اور یہی حال اس کے دونوں ساتھیوں کا ہے۔

تیسرا صدق۔ پختہ عزم اور اس کو پورا کرنے کا ہے: مثلاً:

۱۔ جیسے کہے کہ اگر خدا تعالیٰ مجھے مال دے، تو میں سارا مال صدقہ کردوں گا! یہ عزیمت کبھی پختہ ہوتی ہے اور کبھی اس میں تردد ہوتا ہے۔

۲۔ جیسے عزم سچا ہو اور اپنے وعدے کو پورا کر دکھائے۔ کیونکہ جب حقائق ثابت ہو کر سامنے آجائیں اور عزیمت صاف اور واضح ہو جائے اور اس کی خواہش مغلوب ہو جائے تو اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ[1] (اور مومنوں میں سے کچھ آدمی ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا)۔

ایک اور آیت میں فرمایا: وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ[2] (اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر ہمیں اپنے فضل سے عطا فرمائے گا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے)۔

اللہ تعالیٰ کے اس قول تک: وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے)

چوتھا صدق اعمال میں ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک سا ہو۔ یہاں تک کہ اس کے ظاہری اعمال خشوع وغیرہ جس چیز پر دلالت کریں اس کا باطن اس کے خلاف نہ ہو۔

مطرفؒ نے کہا: "جب بندے کا ظاہر اور باطن یکساں ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچا بندہ ہے۔"

پانچواں صدق مقامات دین میں ہے اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے جیسے خوف، امید، زہد، رضا، حُبّ اور توکل میں سچا ہونا۔ ان امور کے کچھ ابتدائی مراحل بھی ہیں جن کے ظاہر ہونے پر یہ نام بولا جاتا ہے اور پھر ان کی ایک انتہا اور حقیقت ہے تو بالیقین صادق وہ ہے جو ان کی حقیقت تک پہنچ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا[3] (لیکن نیکی اس آدمی کی ہے جو اللہ اور قیامت پر ایمان لائے ...... یہاں تک کہ فرمایا یہی لوگ سچے ہیں)۔

اور فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا[4] ...... (مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کبھی شک نہ کیا)

فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (یہی لوگ سچے ہیں۔)

---

[1] سورۃ احزاب۔ آیت: ۲۳ [2] سورۃ توبہ۔ آیت: ۷۵ [3] سورۃ البقرہ۔ آیت: ۱۷۷ [4] سورۃ الحجرات: آیت: ۱۵

کہتے ہیں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ اللہ سے ضرور ڈرتا ہے۔ اس حالت کو خوف کی حالت کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص حقیقت کے درجے تک نہیں پہنچا ہوتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی بادشاہ سے ڈرتا ہے، تو اس کا رنگ کس طرح زرد ہو جاتا ہے اور کس طرح کانپتا ہے کہ کوئی خلافِ تہذیب حرکت نہ ہو جائے۔ اسی طرح وہ جہنم کی آگ سے بھی ڈرتا ہے، لیکن معصیت کا ارتکاب کرتے وقت اس پر ایسی کوئی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ اسی لیے عامرؒ بن قیس نے کہا تھا: مجھے جنت پر تعجب ہے کہ اس کا طالب کیسے سو جاتا ہے اور دوزخ پر تعجب ہے کہ اس سے بھاگنے والا کیسے سو جاتا ہے؟

ان مقامات کی کوئی انتہا نہیں کہ پوری طرح ان کو آدمی پا سکے، لیکن ہر ایک کو اس کے حسب حال حصہ ملتا ہے۔ تھوڑا یا بہت۔ جب انسان قول و فعل میں یکساں ہو تو اُس کا نام صادق ہوتا ہے۔ اللہ کسی بندے میں صدق کا ظہور دیکھتا ہے تو اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص سمجھنی چاہیے کہ تمام معاملات میں صادق ہونا نوادرات سے ہے، یہ توفیق کسی کسی کو ملتی ہے۔ یہ تو ہوتا ہے کہ آدمی کسی معاملے میں صادق ہوتا ہے، کسی میں نہیں ہوتا لیکن سب باتوں میں صادق کوئی کوئی ہوتا ہے۔

صدق کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنی مصیبت اور عبادت دونوں کو چھپائے اور اس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو بُرا سمجھے۔

کتاب المحاسبہ

- محاسبہ و مراقبہ
- مشارطہ
- مراقبہ
- عمل کے بعد محاسبہ
- نفس کی گوشمالی
- غور و فکر

فصل اوّل

محاسبہ و مراقبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ..... الی قولہ - وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ[1] (جس دن ہر آدمی اپنی کمائی ہوئی نیکی کو حاضر پائے گا..... یہاں تک کہ فرمایا" اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے)

فرمایا: وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ .... الی قولہ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ[2] (اور ہم انصاف کے ترازو رکھیں گے" ...... یہاں تک کہ فرمایا۔ اور ہم کافی ہیں حساب لینے والے")

فرمایا: وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ .... الی قولہ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا[3] (اور کتاب سامنے رکھی جائے گی تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ اس کے مندرجات سے ڈرتے ہوں گے .... یہاں تک کہ فرمایا۔ اور تیرا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا)

فرمایا: يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ...... الی آخرھا[4] (اس دن آدمی مختلف حالتوں میں نکلیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھیں) آخر سورت تک۔

یہ آیات اور ان کے مشابہ آیات آخرت کے حساب کے خطرناک ہونے کا اظہار کرتی ہیں۔

ارباب بصیرت کی تحقیق یہ ہے کہ ایسے خطرات سے نجات صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ آدمی اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور صحیح طور پر مراقبہ رکھے۔ جس نے دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا آخرت میں اس کا حساب آسان ہو جائے گا اور انجام بخیر ہوگا، لیکن جس نے محاسبہ چھوڑ دیا وہ پچھتائے گا۔ اور چونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ نجات کی صورت صرف اطاعت خداوندی میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے صبر اور مرابطہ کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا[5] (اے ایمان والو، صبر کرو اور صبر کی تلقین کرو اور مرابطہ کرو)

مرابطہ کے چھ مقام ہیں: مشارطہ، مراقبہ، محاسبہ، معاقبہ، مجاہدہ، معاتبہ اور ان سب کا اصل محاسبہ ہے لیکن ہر ایک حساب مشارطہ اور مراقبہ کے بعد ہوتا ہے اور اگر خسارہ ہو تو اس کے بعد معاتبہ اور معاقبہ ہوتا ہے اور اس مقام کی شرح لازمی ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۳۰ [2] سورۃ انبیاء۔ آیت: ۴۷ [3] سورۃ کہف آیت: ۴۹

[4] سورۃ زلزال۔ آیت: ۶ [5] سورۃ آل عمران۔ آیت: ۲۰۰

مشارطہ

معلوم ہونا چاہیے کہ جیسے تاجر تجارت میں فائدہ حاصل کرنے کے لیے کسی ساتھی سے مدد لیتا ہے اس سے شرطیں طے کرتا ہے اور حساب لیتا ہے اسی طرح اعمال میں عقل نفس کو شریک کار بناتی، اُس پر فرائض عائد کرتی ہے اور شرائط لگاتی ہے۔ پھر اُسے کامیابی کا رستہ دکھاتی ہے۔ نیز اس کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتی۔

ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد ضروری ہے کہ نفس کا محاسبہ اور شرائط کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور چونکہ اس تجارت کا منافع جنت الفردوس ہے لہٰذا اس میں دنیا کے منافع کی نسبت نفس سے باریک حساب کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ ہر ذی شعور آدمی پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے محاسبے سے غفلت نہ کرے اور اس کی حرکات و سکنات اور اس کے رجحان پر کڑی نگاہ رکھے کیونکہ عمر کے سانسوں میں سے ہر سانس ایک نفیس جوہر ہے جس کا معاوضہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

جب بندہ صبح کے فریضے سے فارغ ہو جائے، تو چاہیے کہ کچھ دیر اپنے دل کو فارغ کرے اور اپنے نفس سے شرائط طے کرے اور کہے اے نفس، میرے پاس سرمایہ صرف زندگی ہے۔ اگر میرا یہ سرمایہ فنا ہو گیا تو تجارت اور منافع سے مایوسی ہو جائے گی۔ اور یہ ایک نیا دن ہے جس میں اللہ نے مجھے مہلت دی ہے اور میری موت کو مؤخر کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ مجھے دنیا سے اُٹھا لیتا، تو میں تمنا کرتا کہ زندگی کی کچھ مہلت اور عطا کر دے، تاکہ میں کوئی نیک عمل کر لوں، تو اے نفس، یہی سمجھ کہ تو فوت ہو چکا تھا اور پھر تجھے واپس کیا گیا ہے۔ اس دن کو ضائع کرنے سے بچ جا اور یہ جان لے کہ دن رات میں چوبیس گھنٹے ہیں اور یوں سمجھ لے کہ بندے کے لیے ہر روز چوبیس الماریاں قطار در قطار رکھی ہیں۔ قیامت کے دن یہ الماریاں کھلی جائیں گی اور اللہ گھنٹے میں کمائی ہوئی نیکیوں کو دیکھے گا۔ اگر یہ نیکیوں کے نور سے بھری ہوں گی تو اُسے اتنی خوشی ہوگی کہ اگر وہ دوزخیوں پر تقسیم کی جائے تو حیرانی کی وجہ سے ان کو آگ کی تکلیف کا احساس نہ رہے اور اگر بدقسمتی سے صورت حال دوسری ہوئی، یعنی کوئی شخص نیکیوں کے بجائے برائیوں میں پھنسا رہا، تو نور کی جگہ اندھیرے اور بدبو پھیلے گی اور گھنٹہ جس میں اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہوگی اسے عذاب الیم سے ہمکنار کر دے گا۔ اسی اتنی گھبراہٹ اور ذلت محسوس ہوگی کہ اگر وہ تمام جنتیوں پر تقسیم کر دی جائے، تو ان کی نعمتیں مکدر ہو جائیں۔

بے عمل لوگوں کے لیے ایک اور خزانہ کھولا جائے گا جو خالی ہوگا۔ نہ اس میں کوئی خوشی کی بات ہوگی، نہ غمی کی اور یہ وہ گھنٹہ ہوگا جس میں یہ لوگ سوئے رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص اس کے خالی ہونے پر افسوس کرے گا اور اسے ایسا دکھ ہوگا جیسا کہ اُس آدمی کو جو بہت سا منافع حاصل کرنے پر قادر تھا لیکن موقع ضائع کر کے اس سے محروم ہو گیا۔

ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے نفس سے کہے آج کے دن کوشش کرکے ہر الماری کو نیک اعمال سے بھر لے۔ ایک کو بھی خالی نہ چھوڑ۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے علّیین کے درجات ضائع ہو جائیں اور دوسرے اُن کو حاصل کر لیں۔

بعض نے کہا، فرض کرو گنا ہگار کو اگر معافی مل بھی جائے، تو کیا اس سے محسنین کا ثواب فوت نہیں ہو گیا؟

اس نقصان سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے ساتوں اعضاء آنکھ، کان، زبان، پیٹ، شرمگاہ، ہاتھ اور پاؤں کو پاک رکھے اور ان کو نفس کے سپرد کردے کہ یہ اعمال کی تجارت میں اس کے خادم اور رعایا ہیں۔ انہی سے اس کے اعمال پورے ہوتے ہیں۔ یاد رہے انسان کے ان اعضاء کی تعداد کے مطابق جہنّم کے بھی سات دروازے ہیں۔ نافرمان اور غیر محتاط انہی دروازوں سے داخل ہوں گے۔ نفس کو وصیت کرے کہ اپنے مددگاروں کو گناہوں سے بچائے۔ آنکھ کو حرام چیزوں کی طرف دیکھنے سے بچائے۔ کسی مسلمان کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ بے مقصد چیز کو دیکھنے سے محترز رہے اور اُن کو ان چیزوں میں استعمال کرے جن میں آخرت کا نفع ہو۔ آنکھوں کی پیدائش کا صحیح مقصد عبرت کی نگاہ سے عجائبات قدرت کو دیکھنا اور کتاب اللہ میں اعمال خیر پر نگاہ دوڑانا ہے۔ یقیناً وہی شخص ذی شعور ہے جو حکمت کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق زندگی گزارے۔

اور اسی طرح لازمی ہے کہ تمام اعضاء کے متعلق ان کے مناسب حال وصیت کرے۔ خصوصاً زبان اور پیٹ کے متعلق، ہم پہلے زبان کی آفات کا تذکرہ کرچکے ہیں۔ زبان کو ذکرِ الٰہی اور تعلیم و تعلّم اور اللہ کے رستے کی رہنمائی اور آپس کی اصلاح وغیرہ کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

پیٹ کو حکم دے کہ لذیذ کھانوں کی طلب سے باز رہے اور شہوات اور شبہات سے بچے۔ صرف ضرورت کے مطابق کھائے۔

اپنے نفس پر شرط عائد کرے کہ اگر تو نے امورِ خیر میں سے کسی چیز کی خلاف ورزی کی، تو تجھے سزا ملے گی۔ پھر شب و روز کی عبادات کے متعلق اسے علیحدہ وصیت کرے کہ نوافل کا خیال رکھے اور نوافل کثرت سے ادا کرے۔

ان شرائط کو یاد دلانا روزانہ کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ نفس ان کا عادی ہو جائے۔

ہم دیکھتے ہیں روزانہ کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا ہوتی رہتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا حق فائق ہوتا ہے۔ اور یہ حق اس آدمی پر زیادہ ہوتے ہیں جو دنیاوی کاموں میں سے کسی میں مشغول ہو۔ مثلاً حاکم ہو، تاجر ہو یا کسی ایسے ہی دوسرے کام میں منہمک رہتا ہو۔ ایسی صورت میں یہ بات ایک طرح ضروری ہے کہ دینی اور دنیاوی فرائض میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑے۔ نفس کو وصیت کرے کہ وہ حق کا مطیع رہے۔

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عقلمند وہ آدمی ہے جو اپنے نفس کو اپنے تابع رکھے اور موت کے بعد کام آنے والے عمل کرے۔ اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہش کے پیچھے لگ جائے اور اللہ سے بھلائی کی اُمید رکھے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "قیامت کا حساب ہونے سے پہلے اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو اور اعمال کا وزن ہونے سے پہلے اُن کو تولو اور بڑی پیشی کے لیے تیار کرو۔ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ[1] (اس دن تم پیش کیے جاؤ گے تم سے کوئی چیز مخفی نہ رہے گی)۔

---

[1] سورہ حاقہ - آیت: ۱۸

فصل دوم

مراقبہ

جب انسان اپنے نفس کو وصیت کرے اور اس پر ذکر کردہ شرائط عائد کر چکے تو اب صرف مراقبہ اور ملاحظہ کی ضرورت ہے۔ احسان کی تفسیر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اس کو نہیں دیکھتا، تو یہ سمجھے کہ وہ تجھے ضرور دیکھ رہا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عظمت کو دل میں پوری طرح بٹھائے اور عبادت کی حالت میں اس کی نگرانی کرے۔

کہا گیا ہے کہ شبلیؒ، ابوالحسین نوریؒ کے پاس گئے۔ وہ بالکل ساکن بیٹھے تھے۔ شبلیؒ نے اُن سے پوچھا: "آپ نے یہ مراقبہ اور سکون کس سے سیکھا ہے؟"

کہا: "ہماری ایک بلی تھی، اُس سے سیکھا ہے۔ جب وہ شکار کا ارادہ کرتی تو اپنے آپ کو اس طرح ساکن کر لیتی کہ اُس کا ایک بال بھی حرکت نہ کرتا۔"

انسان کو چاہیے کہ عمل سے پہلے بھی اور عمل کے دوران بھی مراقبہ کرے کہ آیا اس عمل کا محرک نفس ہے یا اللہ تعالیٰ کی رضا؟ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو اُسے کر گزرے ورنہ چھوڑ دے اور یہی اخلاص ہے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ نے کہا: "اللہ اُس بندے پر رحم کرے جو ارادہ کرتے وقت عمل پر غور کرے، اگر اللہ کے لیے ہو تو عمل کرے اور اگر کسی اور کے لیے **ہو تو پیچھے** ہٹ جائے۔"

دراصل تو مراقبہ طاعت میں ہے کہ وہ اس میں **مخلص ہو۔ نافرمانی میں مراقبہ** یہ ہے کہ توبہ کرے، نادم ہو اور اس کو ختم کر دے۔ اسی طرح مباح میں مراقبہ یہ ہے کہ ادب کی رعایت رکھے اور نعمتوں پر شکر ادا کرے کیونکہ کوئی نعمت بھی ایسی نہیں کہ جس کے لیے شکر ضروری نہ ہو۔

حضرت وہبؒ بن منبہ نے آلِ داؤد کی حکمت میں کہا: "**عقلمند** پر لازم ہے کہ چار اوقات سے غافل نہ ہو۔ **ایک گھڑی** میں اپنے رب سے ہم کلام ہو۔ ایک میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ ایک گھڑی ایسے دوستوں کے پاس گزارے جو اس کو اس کے عیب بتائیں اور اس کے نفس کی خامیوں سے اسے مطلع کریں۔ اور ایک گھڑی میں

حلال لذتوں سے استفادہ اور حرام سے پرہیز کرے۔ اور یہ گھڑی پہلی تمام گھڑیوں کی معاون ہے۔ اور اسی سے قوت زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ وہ گھڑی ہے جس میں وہ کھانے پینے میں مشغول ہوتا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ ذکر اور فکر سے کھاتے پیتے وقت بھی غافل نہ رہے کہ وہ طعام جسے کھا رہا ہے اس میں بھی بہت سے عجائبات ہیں۔ اگر وہ ان میں غور کرے، تو یہ بات اعضاء کے بہت سے اعمال سے افضل ہے۔

عمل کے بعد محاسبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر آدمی اس پر غور کرے جو اُس نے کل کے لیے آگے بھیجا ہے)

یہ دراصل محاسبے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "حساب لیے جانے سے پہلے پہلے اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو۔"

حضرت حسنؒ نے کہا: "مومن اپنے نفس پر نگرانی کرنے والا ہے۔ وہ اپنے نفس سے حساب لیتا ہے" اور کہا "مومن کے سامنے ناگہانی طور پر کوئی چیز آجاتی ہے۔ وہ اسے پسند آتی ہے اور کہتا ہے: خدا کی قسم! میں تجھے چاہتا ہوں اور تو میری ضرورت ہے لیکن تجھے حاصل کرنے کا میرے پاس کوئی حیلہ نہیں ہے۔ تیرا حاصل کرنا بہت دُور ہو گیا ہے۔ میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے" اور پھر کوئی کوتاہی اس سے ہو جاتی ہے تو وہ ہوش میں آجاتا ہے اور کہتا ہے میں نے اس سے کیا حاصل کرنا چاہا؟ میرا اور اس کا کیا تعلق؟ میں ان شاء اللہ اس کی طرف کبھی رجوع نہیں کروں گا۔

مومن ایک ایسی قوم ہیں جن کو قرآن نے قید کر رکھا ہے اور اُن کے اور اُن کی ہلاکت کے درمیان حائل ہو چکا ہے۔ مومن دنیا میں دین کا قیدی ہے۔ وہ اپنی گردن آزاد کرانے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ کسی چیز سے بے خوف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے، وہ جانتا ہے کہ اسے اپنے کان، آنکھ، زبان اور اعضاء کے سلسلے میں پابند کیا گیا ہے اور ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

شروع دن میں ایک ایسا وقت لازمی طور پر ہونا چاہیے جس میں انسان اپنے نفس سے شرط کرے کہ میں فلاں کام کروں گا اور فلاں کام نہیں کروں گا۔ اسی طرح آخر دن میں بھی کوئی وقت رکھے جس میں اپنے نفس سے مطالبہ کرے اور جو کچھ وہ دن میں کر چکا ہے اس کا حساب لے۔ جیسا کہ تاجر لوگ اپنے شریک کار سے حساب کرتے ہیں اور حساب

سورۃ حشر۔ آیت: ۱۸

کا مطلب یہ ہے کہ اپنا سرمایہ اور منافع اور خسارہ دیکھے، تاکہ اسے نفع و نقصان کا پتہ چلے۔

دین میں اصل سرمایہ فرائض ہیں۔ نوافل اور فضائل منافع ہیں اور گناہ خسارہ۔ پہلے اپنے نفس سے فرائض کا حساب کرے اور اگر وہ گناہ کا ارتکاب کر چکا ہو تو اُسے سزا دے، تاکہ جو کمی ہوئی ہے وہ پوری ہو جائے۔

کہا گیا ہے کہ توبہ بن صمہ، رقہ کا باشندہ اپنے نفس سے روزانہ حساب لیتا تھا۔ ایک دن اس نے حساب کیا تو وہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے سالوں کے دن گنے، تو وہ اکیس ہزار پانچ سو دن ہوئے۔ وہ چیخ پڑا اور کہا: "ہائے افسوس، اگر مجھ سے ایک دن کا ایک بھی گناہ ہوا، تو میں اللہ کے سامنے اکیس ہزار پانچ سو گناہ لے جاؤں گا؟ حالانکہ ہر روز کئی ہزار گناہ ہو جاتے ہیں"۔ پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا اور فوت ہو گیا۔ اُس وقت لوگوں نے ایک غائبانہ آواز سنی: "جنت الفردوس کی دوڑ کیسی اچھی رہی!"

اسی طرح ہر آدمی کو چاہیے کہ اپنے نفس سے ایک ایک سانس کا حساب لے اور ہر حرکت دل اور اعضاء کے گناہوں کا خیال رکھے۔ اگر انسان ہر گناہ کے بعد ایک پتھر اپنے گھر میں پھینکنے لگے تو تھوڑی ہی مدت میں اس کا گھر پتھروں سے بھر جائے، لیکن وہ گناہوں کو بھول جاتا ہے حالانکہ وہ ثابت ہیں: اَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ (اللہ نے ان کو گن رکھا ہے اور وہ اس کو بھول چکے ہیں)۔

نفس کی گوشمالی

جب مرید اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اس کی کوتاہی دیکھ کر اُسے چھوڑ دینے کے ارادے پر اکتفا کرے، تو گناہ کرنا اُس کے لیے آسان اور چھوڑنا مشکل ہو جائے گا۔ اُسے چاہیے کہ لغزش ہونے کی صورت میں اپنے نفس کو جائز سزا بھی دے، جیسے کہ اپنے بال بچہ کو مناسب سزا دیتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اپنے باغ کی طرف نکلے واپس آئے تو لوگ عصر کی نماز پڑھ چکے تھے۔ آپ نے کہا: "میں اپنے باغ کی طرف نکلا اور واپس آیا تو لوگ نماز پڑھ چکے ہیں۔ میرا یہ باغ مسکینوں پر صدقہ ہے"۔ لیثؒ نے کہا: "اُن کی جماعت جاتی رہی تھی نہ کہ اصل نماز۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ کسی کام میں مشغول ہوئے اور مغرب کی نماز کو اتنی دیر ہو گئی کہ دو ستارے نکل آئے۔ پھر آپ نے نماز پڑھی اور دو غلام آزاد کیے۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ ایک رات سو گئے اور تہجد کی نماز نہ پڑھ سکے، تو آپ سال بھر تک قیام کرتے رہے۔ رات بھر نہ سوتے۔ اس طرح نفس کو پوری پوری سزا دی۔

حضرت حسانؓ بن سنان ایک بالاخانے کے پاس سے گزرے اور کہا: "یہ کب تعمیر ہوا تھا؟" پھر اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: "تو وہ باتیں پوچھتا ہے جن سے تیرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں تجھے ایک سال کے روزوں کی سزا دوں گا۔" پھر آپ نے سال بھر روزے رکھے۔

یاد رہے اپنے آپ کو ناجائز سزائیں دینا حرام ہے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک عورت کی ران پر ہاتھ رکھ دیا، تو اس ہاتھ کو آگ میں جلا ڈالا۔ اسی طرح ایک اور آدمی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک عورت کے پاس جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ پھر سوچا یہ میں کیا کرنے لگا ہوں؟ پھر جب اس نے اپنے پاؤں کو لوٹانے کا ارادہ کیا تو کہا ایسے نہیں ہو سکتا۔ وہ پاؤں جو اللہ کی نافرمانی کے لیے نکلا وہ میرے ساتھ واپس نہیں جائے گا، تو اس نے اس پاؤں کو کاٹ دیا۔

ایک اور آدمی نے ایک عورت کو دیکھا، تو اس نے اپنی آنکھ نکال دی۔ ہماری شریعت میں یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ اُن کی شریعت میں جائز تھیں۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ حتی الامکان گناہوں سے بچیں اور کوئی غلطی ہو جائے، تو صدقِ دل سے توبہ کریں۔

ہمارے مذہب والے بعض آدمی بھی انہی کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ اُن کو اس پر جہالت آمادہ کرتی ہے۔ جیسا کہ غزوان زاہد سے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایک عورت کو دیکھا، تو اپنی آنکھ پر زور سے تھپڑ مارا کہ آنکھ پھوٹ گئی۔ بعض کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ جنبی ہو گیا اور سردی سخت تھی۔ اس کے نفس نے غسل میں توقف کیا، تو اس نے قسم کھائی کہ گودڑی سمیت غسل کرے گا نہ اُسے اتارے گا نہ نچوڑے گا اور گودڑی خاصی وزنی تھی۔ ۹ سیر سے بھی زیادہ۔ اور یہ سب کچھ جہالت کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان کو اپنے نفس میں اس طرح کے تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں جاہل صوفیاء کے ایسے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔

مجاہدہ

مجاہدہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا حساب کرے اور گناہ دیکھے، تو اسے سزا دے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر دیکھے کہ وہ سستی کی وجہ سے فضائل میں یا کسی ورد میں کوتاہی کرتا ہے تو چاہیے کہ اسے بھاری اوراد سے سبق سکھائے۔ جیسا کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے بیان ہوا ہے کہ آپ سے نماز کی جماعت فوت ہو گئی، تو آپ نے وہ ساری رات جاگ کر گزاری۔ اگر اوراد پر اس کا نفس اطاعت نہ کرے، تو اس سے جہاد کرے اور حتی الامکان اسے

مجبور کرے۔

حضرت ابنِ مبارکؒ نے کہا کہ نیک لوگوں کے نفس خود بخود بھلائی پر اُن کی موافقت کرتے تھے اور ہمارے نفس مجبور ہو کر ہماری موافقت کرتے ہیں۔

نیکی پر مدد حاصل کرنے کے لیے عبادت میں کوشش کرنے والوں کی باتیں اور اُن کے فضائل یاد کرے اور ان لوگوں کے ساتھ رہے جو اعمال پر قادر ہوں اور اُن کے افعال کی پیروی کرے۔

بعض نے کہا۔ جب مجھے عبادت میں بندش پیش آتی، تو میں محمد بن واسع کے چہرے کو دیکھتا۔ اس کے اجتہاد پر غور کرتا اور اس کے مطابق ایک ہفتے تک عمل کرتا۔

عامرؒ بن عبد قیس ہر روز ہزار رکعت نماز پڑھتے اور اسودؒ بن یزید اتنے روزے رکھتے کہ رنگ زرد ہو جاتا۔ مسروقؒ نے حج کیا، تو سجدے کی حالت ہی میں سوتے۔ داؤد طائی روٹی کھانے کی جگہ چند ٹکڑے بھگو کر پی لیا کرتے اور دو گھونٹ کے درمیان پچاس آیات پڑھتے۔ کرزؒ بن دبرہ ہر روز تین مرتبہ قرآن مجید ختم کرتے اور عمرؒ بن عبد العزیز اور فتح موصلی خون کے آنسو روتے۔

سلف میں سے چالیس آدمیوں نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔

ابو محمد حریریؒ ایک سال تک معتکف رہے۔ نہ سوئے نہ لیٹے۔ نہ دیوار سے ٹیک لگائی اور نہ پاؤں پھیلائے۔ ابو بکر کتانیؒ نے اُن سے پوچھا۔ "آپ کو اتنی قدرت کس طرح حاصل ہوئی؟" تو کہا۔ "اللہ نے میرے باطن کا صدق دیکھا تو میرے ظاہر پر میری مدد کی۔"

زحلہؒ عابدہ کے پاس لوگ گئے اور اُن سے کہا: "اپنے نفس پر کچھ نرمی کرو۔" تو انھوں نے کہا "یہ دوڑ کے دن ہیں جس سے آج کا دن فوت ہو گیا وہ کل اُسے کبھی نہ پا سکے گا۔ میرے بھائیو، خدا کی قسم! جب تک میرے اعضاء مجھے اٹھاتے رہیں گے میں نماز پڑھتی رہوں گی اور میں اپنی زندگی بھر اللہ کے لیے روزے رکھوں گی اور جب تک میری آنکھوں میں پانی ہے میں روؤں گی۔"

جو آدمی ان لوگوں کی سیرتوں کو دیکھنا چاہے اور اُن کے مجاہدات کے باغوں میں پھرنا چاہیے، وہ میری کتاب "صفۃ الصفوۃ" دیکھے۔ عبادت گزار عورتوں کے واقعات ایسے ہیں جن کو سن کر انسان اپنے آپ کو حقیر سمجھے۔

معاتبہ

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "جو اللہ کے لیے اپنے نفس پر ناراض ہوا اللہ اسے اپنی ناراضگی سے امن

دے گا۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا "میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے جب کہ آپ باغ میں داخل ہوئے سُنا۔ اس وقت میرے اور آپ کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔" عمر بن خطاب! تو امیرالمومنین ہے، بہت خوب، خدا کی قسم! اے خطاب کے بیٹے! اگر تو اللہ سے ڈرے گا تو امن میں رہے گا، ورنہ اللہ تجھے سزا دے گا۔"

حضرت بختری بن حارث نے کہا "میں ایک عابد کے پاس گیا۔ اُس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ اپنے نفس کو ڈانٹ رہا تھا۔ وہ اسے ڈانٹتا رہا یہاں تک کہ مر گیا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے اور یہ برائی کا حکم دینے والا بنا کر پیدا کیا گیا ہے اور برائی کی طرف بہت مائل ہے۔ تجھے حکم ہے کہ تو اس کو سیدھا کرے۔ پاک کرے، اس کے گھاٹ اُس سے چھڑائے اور اسے قہر کی زنجیروں سے کھینچ کر اپنے رب کی عبادت کی طرف لائے۔ اگر تو نے اُس کو ذرا ڈھیل دی، تو وہ سرکش ہوگا، بدکے گا اور اس کے بعد تو اس پر قابو نہ پا سکے۔ ہاں اگر تو اُس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہے گا، تو اُمید ہے کہ یہ مطمئن ہو جائے گا۔ تو اُسے نصیحت کرنے سے غافل نہ ہو۔ اس پر متوجہ رہ اور اس کی جہالت اور عبادت اس کے ذہن نشین کرتے ہوئے کہہ۔" اے نفس، تو کتنا جاہل ہے عقلمند اور ذہین ہونے کا دعوی کرتا ہے حالانکہ تو سب سے زیادہ غبی اور بے وقوف ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ تیری جگہ یا جنت ہے یا دوزخ؟ جو یہ نہ جانتا ہو کہ وہ ان دونوں میں سے کس میں جانے والا ہے۔ وہ کیسے غافل ہو سکتا ہے۔ انسان رات یا دن میں ناگہانی طور پر مر جاتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ہر آنے والی چیز قریب ہے اور موت اچانک بغیر کسی اطلاع کے آئے گی اور یہ کسی عمر پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر سانس پر امکان ہے کہ اس میں ناگہانی موت آ جائے۔ اگر ناگہانی موت نہ بھی آئے، تو بیماری ناگہانی آ سکتی ہے اور پھر وہ موت تک پہنچا دیتی ہے۔ تجھے کیا ہوا ہے؟ تو موت کی تیاری کیوں نہیں کرتا؟ حالانکہ وہ تجھ سے قریب ہے۔

اے نفس اگر اللہ پر تیری جرأت اس لیے ہے کہ وہ تیری نافرمانیوں کو نہیں دیکھتا تو تیرا یہ کفر بہت بڑا ہے۔ اور اگر تو جانتا ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، تو تو کتنا احمق اور بے حیا ہے، کیا تجھ میں اللہ کا عذاب برداشت کرنے کی طاقت ہے؟ ایک گھڑی حمام میں بیٹھ کر اس کا تجربہ کر یا اپنی انگلی آگ کے قریب کر دیکھ! اے نفس اگر تیری استقامت میں رکاوٹ خواہشات کی محبت سے ہے، تو وہ خواہشات طلب کر جو باقی رہیں اور کدورتوں سے پاک صاف ہوں۔ بہت سے لقمے ایسے ہوتے ہیں جو کئی نعمتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔

اس بیمار کی عقل کے متعلق آپ کیا کہیں گے جسے طبیب نے تاکید کی ہو تین دن پانی نہ پیو تم تندرست ہو جاؤ گے اور پھر ساری عمر پیتے رہو گے ؛ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ مریض کو طبیب کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا۔

ابد کی نسبت سے جو کہ جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کی مدت ہے دنیا کی زندگی تین دن سے بھی کم ہے، بلکہ دنیا کی عمر کی نسبت ایک لحظہ سے بھی کم ہے۔ غور کرنا چاہیے اس مختصر زمانے کی آسائش کے لیے نہ ختم ہونے والی زندگی کا عذاب خرید لینا کتنی بڑی نادانی ہے۔

جو آدمی مجاہدے کی تکلیف پر صبر نہیں کر سکتا وہ آخرت میں عذاب پر کیسے صبر کر سکے گا!

کیا تجھے عزو جاہ کی محبت نے مشغول کر دیا ہے ؛ تو اس دنیا میں ہمیشہ نہ رہے گا اور نہ وہ جن کے نزدیک تیری منزلت ہے۔ تو نے دنیا کو کیوں نہ چھوڑ دیا کہ اُس کے شرکاء خسیس ہیں اور جس کی تکلیف بہت زیادہ اور جس کی ہر نعمت جلد فنا ہو جانے والی ہے۔ کیا تو رب العالمین کی ہمسائیگی کو بے وقوفوں کی جوتیوں میں بیٹھنے سے بدلنا چاہتا ہے۔

اکثر سرمایہ تو ضائع ہو چکا۔ نکمی عمر تھوڑی سی باقی رہ گئی۔ اگر تو اس کو پا بھی لے تو ضائع شدہ پر تجھے ندامت ہوگی اور اگر تو نے پچھلی کو بھی پہلی کی طرح ضائع کر دے تو پھر کیا حال ہو گا۔ چھوٹے دنوں میں بڑے دنوں کے لیے کام کر، اُن سوالات کے جواب تیار کر لے جو تجھ سے قبر کی تنہائی میں پوچھے جائیں گے اور اس وقت سے پہلے اس دنیا سے آزاد لوگوں کی طرح نکل جا کہ تجھے مجبور کر کے نکالا جائے گا۔

جو رات اور دن پر سوار ہوا وہ اس کو لے جائیں گے۔ اگرچہ وہ جانا نہ چاہے گا۔

اس نصیحت میں غور کر اور اپنی حالت پر آنسو بہا کہ ندامت کے آنسو اللہ کی رحمت کو جوش میں لاتے ہیں۔

فصل سوم

غور و فکر

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا اور غور و فکر کرنے والوں کی تعریف کی ہے: "وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا"[1] (اور وہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیے)۔

فرمایا: إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ[2] (اس میں نشان ہیں غور کرنے والوں کے لیے)۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی نعمتوں میں غور کرو اور اللہ کے متعلق غور نہ کرو۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "ایک گھڑی غور و فکر کرنا ساری رات کے قیام سے بہتر ہے۔"

وہب بن منبہؒ نے کہا: "جو زیادہ غور کرے وہ سمجھ جاتا ہے اور جو سمجھے وہ یقین کر لیتا ہے اور جو یقین حاصل کرے وہ عمل کرتا ہے۔"

حضرت بشر حافیؒ نے کہا: "اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر غور کریں تو اس کی نافرمانی نہ کریں۔"

حضرت فریابیؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ[3] (میں اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں) کے متعلق کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ایسے لوگوں کے دلوں کو اپنے کاموں میں غور کرنے سے روک دیتا ہے۔

حضرت داؤد طائیؒ چاندنی رات میں چھت پر تھے۔ آپ نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کے متعلق غور کیا تو بے ہوش ہو کر اپنے ہمسائے کے گھر میں گر پڑے۔ وہ تلوار لے کر دوڑا لیکن جب آپ کو دیکھا تو کہا: "اے داؤد! آپ کیوں گر پڑے؟" کہا: "میں خود نہیں سمجھا۔"

---

[1] سورۃ آل عمران - آیت: ۹۱ [2] سورۃ رعد - آیت: ۳ [3] سورۃ اعراف - آیت: ۱۴۶

یوسف بن اسباطؒ نے کہا: "دنیا دیکھنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ اس سے آخرت کو دیکھا جائے۔"

حضرت سفیانؒ ثوری کو شدتِ غور و فکر سے پیشاب کے ساتھ خون آنے لگا تھا۔

حضرت ابوبکر کتانی نے کہا: "غفلت سے بیدار ہونے پر ڈر جانا، نفسانی خواہشات سے منقطع ہو جانا اور دنیا سے کٹ جانے کے خوف سے کانپ جانا جنوں اور انسانوں کی عبادت سے بہتر ہے۔"

غور و فکر کے نتائج

معلوم ہونا چاہیے کہ غور و فکر کبھی دین کے متعلق ہوتا ہے اور کبھی دوسری چیزوں کے متعلق۔ ہماری غرض دین سے ہے اور اس کی شرح بڑی طویل ہے۔ انسان کو چار چیزوں میں غور کرنا چاہیے۔ طاعاتؑ، معاصیؑ، ہلاکؑ کرنے والی باتیں اور نجاتؑ دینے والی صفات۔

تجھے چاہیے کہ اپنے نفس کے شر اور اپنی صفات سے غافل نہ ہو، جو یا تو اللہ سے دُور لے جانے والی ہیں یا اُس کے قریب کرنے والی ہیں۔

ہر ایک مُرید کے پاس ایک کتاب ہونی چاہیے جس میں وہ تمام صفاتِ مُہلکہ اور تمام صفاتِ نافعہ، تمام معاصی اور طاعات کو درج کرے اور ہر روز اُن کا مطالعہ کیا کرے۔ ہمارے نزدیک ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے دس چیزوں پر غور کر لینا کافی ہے، اگر ان سے بچ گیا تو دوسری سے بھی بچ جائے گا، وہ یہ ہیں: بُخلؑ، کبرؑ، عُجبؑ، ریاؑ، حسدؑ، شدتِ غضبؑ، کھانے کی حرصؑ، جماع کی حرص، مال کی محبتؑ اور جاہؑ کی محبت۔

اسی طرح نجات دلانے والی دس چیزوں پر غور کرے جو یہ ہیں: گناہوںؑ پر ندامت، مصیبتؑ پر صبر، تقدیرؑ پر راضی رہنا، نعمتوںؑ پر شکر کرنا، امیدؑ اور خوف کا معتدل ہونا، دنیاؑ سے بے رغبتی، اعمالؑ میں اخلاص، لوگوںؑ کے ساتھ حُسنِ خُلق، اللہ تعالیٰؑ کی محبت اور خشوعؑ۔

یہ بیس خصلتیں ہیں۔ دس بُری اور دس اچھی۔ جب بُری خصلتوں میں سے ایک سے نجات پالے تو اپنی کتاب میں اس پر لکیر کھینچ دے اور اب اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دے اور اس کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے۔ یہ سمجھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہوا ہے۔ پھر باقی نو کی طرف توجہ کرے اور اسی طرح کرتا جائے، یہاں تک کہ سب پر لکیر کھینچ دے۔ اس کے بعد اپنے نفس سے نجات دلانے والی صفات سے متصف ہونے کا مطالبہ کرے اور جب ایک کے

ساتھ متصف ہو جائے مثلاً توبہ اور ندامت سے، تو اس پر خط کھینچ دے اور باقی میں مشغول ہو جائے۔ ان باتوں کا وہ ہر ایک مرید محتاج ہے جو راہِ حق میں کمربستہ ہے۔

جو نیک شمار کیے جاتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی کتاب میں ظاہری گناہوں کو ضرور درج کریں۔ جیسے مشتبہ چیزوں کا کھانا۔ غیبت، چغلی، لڑنا جھگڑنا، اپنی مدح میں زبان کھولنا، اولیاء اللہ کی محبت میں افراط کرنا، دشمنوں سے از حد بیر رکھنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی کرنا وغیرہ۔ کیونکہ اکثر وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو نیکوں میں شمار کرتے ہیں ان معاصی سے پاک نہیں ہوتے اور جب تک اعضاء گناہوں سے پاک نہ ہوں دل کی تطہیر اور اُس کی آبادی میں مشغول ہونا ممکن ہی نہیں۔

محتاط زندگی گزارنے کی صورت میں بھی انسان کی طبیعت میں ایک آدھ بات ایسی بالعموم ہوتی جس کی اُسے اصلاح کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر پرہیز گار عالم اپنے علم کے اظہار اور شہرت کی طلب سے خالی نہیں ہوگا۔ خواہ اُس کے اظہار کا طریقہ کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے تقویٰ کا اظہار کرے یا علم کا بہرحال ایک برائی ہوگی اور جس نے ایسا کیا وہ عظیم فتنے میں مبتلا ہوا۔ اس سے صرف صدیق ہی بچتے ہیں۔

بعض اوقات عالموں کا علم یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ عورتوں کی طرح ایک دوسرے سے غیرت کھاتے ہیں اور یہ سب کچھ ان بری اور مہلک صفات کے راسخ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جن کے متعلق عالم سمجھتا ہے کہ وہ ان سے نجات پا چکا ہے حالانکہ وہ ان کے متعلق دھوکے میں مبتلا ہوتا ہے۔

جو شخص ان صفات کو اپنے اندر محسوس کرے اس پر لازم ہے کہ وہ گوشہ نشینی اختیار کرے اور گمنامی طلب کرے۔ نیز فتویٰ دینے سے پرہیز کرے۔ صحابہ فتویٰ ایک دوسرے پر ٹالا کرتے تھے اور ان میں سے ہر آدمی یہ پسند کرتا تھا کہ کاش اس کا بھائی جواب دے دے۔

ایسے مواقع پر انسان نُما شیطانوں سے بچنا چاہیے۔ وہ کہیں گے کہ یہ علم کے مٹ جانے کا سبب ہے۔ انھیں سمجھانا چاہیے کہ دین اسلام مجھ سے بے نیاز ہے۔ اگر میں مر گیا تو دین گر نہیں پڑے گا۔ دوسری طرف اپنے دل کی اصلاح سے بے نیاز نہ ہوں۔ عالم کی نگران صفات کے دل میں مخفی ہونے کی طرف ہونی چاہیے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کے بگاڑ کو درست کرے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کے پسندیدہ کام کریں۔

ذاتِ خداوندی پر غور

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللہ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو اور اللہ تعالیٰ کے متعلق غور و فکر نہ کرو۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور کرنا اس لیے منع ہے کہ عقل اس میں حیران ہو جاتی ہے۔ اللہ کی شان بالیقین اس سے بہت بلند ہے کہ اسے انسان کی فکر معلوم کر سکے یا دلوں میں اس کا کوئی تصور آ سکے: لیس کمثلہ شیئٌ وھو السمیع البصیر (اس کی مثال کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔)

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے متعلق غور و فکر کر لینے کی تو قرآن مجید میں ترغیب موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ[۱] (آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں)

فرمایا: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[۲] (کہو دیکھو آسمانوں اور زمینوں میں کیا کچھ ہے)

اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے خود انسان بھی ہے جو حقیر نطفے سے پیدا ہوا ہے۔ انسان کو اپنے نفس کے متعلق غور کرنا چاہیے کہ اس کی پیدائش میں کتنے ہی عجائبات ہیں جو اللہ کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے سوویں حصے پر بھی مطلع ہونے میں عمریں ختم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود اپنے اندر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ[۳] (اور تمھارے اپنے اندر بھی کیا تم دیکھتے نہیں ہو)

اللہ کے نشانات میں سے وہ ہیرے بھی ہیں جو پہاڑوں کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں اور سونے چاندی اور فیروزہ وغیرہ کی کانیں بھی ہیں۔ غرض یہ کہ جمادات و نباتات اور حیوانات میں اس کی صنعت کے لاکھوں کروڑوں نمونے ہیں جن پر انسان غور کیا کرے۔

گہرے سمندر، جنگل، پہاڑ، دریا اور ہرے بھرے میدان وغیرہ، کون سی ایسی چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی شان ظاہر نہیں ہوتی۔

موتی کی پیدائش پر غور کرو کہ اسے سمندر کی تہ میں سیپ کے اندر کس طرح بنایا ہے اور دیکھو پانی کے نیچے ٹھوس

---

[۱] سورۃ آل عمران - آیت: ۱۹۰ [۲] سورۃ یونس - آیت: ۱۰۱ [۳] سورۃ ذاریات - آیت: ۲۱

پتھر میں مونگا کس طرح اُگتا ہے۔ اس کے علاوہ عنبر، عود اور دوسری چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔

کشتیوں کے عجائبات دیکھو، اللہ نے اُن کو کس طرح پانی کی سطح پر روک رکھا ہے اور سمندروں میں چلایا ہے۔ ہوائیں انھیں لیے پھرتی ہیں اور ان سب سے عجیب چیز پانی ہے کہ وہ زمین کی ہر چیز کی زندگی ہے۔ خواہ وہ حیوان ہوں یا نباتات۔ اگر کوئی انسان پیاسا ہو اور اس کو اس سے روک دیا جائے تو اگر اُس کے پاس ساری دنیا کے خزانے ہوں تو پانی کو حاصل کرنے کے لیے خرچ کر دے۔ پھر اگر پی لے اور وہ باہر نہ نکلے تو اُس کو نکالنے کے لیے تمام دُنیا کے خزانے خرچ کر ڈالے۔ آدمی کو چاہیے اس نعمت سے غافل نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ایک ہوا بھی ہے اور وہ لطیف جسم ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ پھر اس کی شدت اور طاقت کو دیکھو اور فضا کے عجائبات پر غور کرو کہ ان میں کیا کچھ ہے! بادل، گرج، بجلی، بارش، برف، اولے، اور شہاب وغیرہ۔

دیکھو پرندے اپنے پروں سے کیسے ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ جیسے کہ جانور پانی میں تیرتے ہیں۔

آسمان، اس کی عظمت اور سورج، چاند اور ستاروں کو دیکھو۔ ہر ستارے میں اُن کے رنگ، تشکل اور مقامات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ اور پھر دیکھو کیسے رات دن میں اور دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ سورج کی گردش پر غور کرو کہ وہ گرمی، سردی اور بہار و خزاں میں کس طرح مختلف ہوتی ہے!

اور کہا گیا ہے کہ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا سے کچھ اوپر بڑا ہے (موجودہ تحقیقات کے مطابق کئی لاکھ گنا بڑا ہے) یہاں تک کہ آسمان کا چھوٹے سے چھوٹا ستارہ بھی زمین سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ پھر جب ایک ستارے کا یہ حال ہے تو ستاروں کی کثرت کو دیکھو اور آسمان پر غور کرو جس میں یہ ستارے جڑے ہوئے ہیں اور اپنی آنکھ پر غور کرو کہ اس قدر چھوٹی ہونے کے باوجود کس طرح ان کا احاطہ کرتی ہے۔

انسان کی حالت پر افسوس ہے کہ جب وہ کسی دولت مند آدمی کے مکان میں جاتا ہے، جس میں سونے کے نقش و نگار ہوں تو اُس کی حیرت ختم نہیں ہوتی۔ جگہ جگہ اُس کا تذکرہ کرتا ہے لیکن اس عظیم کائنات کو دن رات دیکھتا ہے۔ اس کی زمین، آسمان، رنگا رنگ عجائبات اور عجیب نقش و نگار ہر وقت نگاہوں کے سامنے ہیں، لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کرتا اور نہ اپنے خالق کی عظمت و شان پر غور کرتا ہے۔

انسان دراصل اپنے رب کو بھول چکا ہے اور فانی چیزوں کی لذتوں میں مشغول ہے۔ اس کی غفلت اُس چیونٹی کی طرح ہے جو اپنے بنائے ہوئے گھر سے نکل کر بادشاہ کے محل میں چلی جائے وہاں وہ کسی اور چیونٹی سے ...

کی باتیں اُسے سناتی رہے کہ کیسے بنایا ہے اور اُس میں کیا کچھ جمع کیا ہے، لیکن بادشاہ کے محل اور اُس کے سامان کی کوئی بات نہ کرے۔ یہی حال غافل انسان کا ہے۔ وہ آسمان کو اُتنا ہی جانتا ہے جتنا چیونٹی ہمارے گھر کو جانتی ہے۔

یہ بنیادی باتیں ہیں جن میں مفکرین کا فکر گردش کرتا ہے، علوم بعض مخلوقات کے احاطۂ فکر سے باہر ہیں۔ ہاں وہ یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ عجائباتِ قدرت پر غور کرو گے تو صانع کے جلال کے متعلق تمھاری معرفت کامل ہوگی۔

جس آدمی نے ان چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی صنعت ہیں، اسے اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کی معرفت حاصل ہوگی۔ جس کی نظر ان کی تاثیرات تک محدود رہی اور اس نے مسبب الاسباب سے ان کا تعلق نہ سمجھا وہ بدنصیب ہے۔ ہم جاہلوں کے پاؤں کے پھسلنے سے اور گمراہی کے اسباب کی طرف مائل ہونے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

جس مخلوق مثلاً ملائکہ اور جنوں وغیرہ کو ہم نہیں دیکھتے اُن پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مرئی چیزوں کے تذکرے پر کفایت کی ہے اور غیر مرئی کا تذکرہ نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

کتاب الموت

- موت، مابعد موت اور اس کے متعلقات کا تذکرہ
- امید اور موت
- رسول اللہ اور خلفاء راشدین کی وفات کا ذکر
- موت کے وقت صحابہؓ سے منقول کلمات اور زیارتِ قبور
- قبر کا تذکرہ

فصل اوّل

موت، مابعد موت اور اُس کے متعلقات کا تذکرہ

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں منہمک اور اُس کے دھوکے میں مبتلا آدمی کا دل لازماً موت کے ذکر سے غافل ہوتا ہے۔ وہ اس کا بالکل تذکرہ نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہے تو نفرت کے رنگ میں۔ وہ دنیا کی ناپائیداری پر افسوس اور موت کی مذمت میں مشغول رہتا ہے اور یوں ایسے آدمی کو موت کا تذکرہ اللہ سے اور دُور کر دیتا ہے۔ البتہ توبہ کرنے والا موت کا تذکرہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو اور وہ اپنی توبہ کو پورا کر سکے۔ اس سلسلے میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ موت کو اس لیے ناپسند کرتا ہے کہ عقبیٰ کے سفر میں زادِ راہ کی تیاری سے پہلے موت نہ آجائے؛ چنانچہ اُس کا موت کو ناپسند کرنا بُرا نہیں۔ یہ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت نہیں آتا کہ "جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اُس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے"۔ کیونکہ وہ اللہ کی ملاقات سے اپنی کوتاہیوں اور گناہ کی وجہ سے ڈرتا ہے اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دوست کی ملاقات کو اس خیال سے مؤخر کرے کہ اس کی پسند کے مطابق تیاری کرنے کے بعد ملاقات کے لیے جائے گا۔ ایسے آدمی کے لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ملاقات کو پسند نہیں کرتا اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی تیاری میں لگا رہے۔

عارف:۔ ہمیشہ موت کا تذکرہ کرتا ہے کیونکہ وہ اُس کے دوست کی ملاقات کے وعدہ کا وقت ہے۔ وہ موت کا اس لیے بھی مشتاق رہتا ہے کہ گنہگاروں کی دنیا سے خلاصی پا جائے اور رب العالمین کی ہمسائیگی میں منتقل ہو جائے۔

گویا توبہ کرنے والا موت کی کراہت اور عارف موت کی تمنّا اور محبّت میں معذور ہے، تاہم ان دونوں سے وہ شخص بہت افضل ہے جو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ اپنے لیے نہ موت کو پسند کرتا ہے نہ زندگی کو، بلکہ اسے وہی پسند ہے جسے اس کا مولا پسند کرے۔ یہ تسلیم و رضا کا مقام ہے اور یہ آخری منزل ہے۔

بہرحال موت کے تذکرے میں ثواب اور فضیلت ہے۔ دنیا میں غرق آدمی بھی کبھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے کہ وہ دنیا سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ موت کا تذکرہ دنیا کی نعمتوں کو مکدر کر دیتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی موت کا اکثر

تذکرہ کیا کرو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا۔ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ آدمی موت کا تذکرہ کس طرح کرتا ہے؟" انھوں نے کہا ہم نے کبھی اسے موت کا تذکرہ کرتے نہیں سنا، تو آپ نے فرمایا: "تمھارا ساتھی اس درجہ کا نہیں ہے۔"

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "کون آدمی زیادہ عقلمند ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "جو موت کا تذکرہ زیادہ کرے اور موت کے بعد کے لیے اچھی تیاری میں لگا رہے۔ یہی عقلمند ہے۔"

حضرت حسن بصری نے کہا: "موت نے دنیا کو ذلیل کر دیا۔ عقلمند کے لیے دنیا میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ جو آدمی بھی دل میں ہمیشہ موت کو یاد رکھے گا دنیا اس کی نگاہ میں حقیر ہو جائے گی اور دنیا کی تمام اشیاء بے قدر ہو جائیں گی۔"

ابن عمر رضی اللہ عنہ جب موت کا تذکرہ کرتے تو پرندے کی طرح پھڑکتے۔ آپ ہر رات فقہاء کو اکٹھا کرتے اور موت اور قیامت کا تذکرہ کرتے۔ پھر روتے گویا کہ ان کے سامنے جنازہ رکھا ہوا ہے۔

حضرت حامد قیصری کہا کرتے: "ہم میں سے ہر ایک کو موت کا یقین ہے لیکن اس کے لیے کوئی تیاری کرتا ہمیں نظر نہیں آتا۔ اور ہم میں سے سب کو جنت کا یقین ہے، لیکن اس کے لیے عمل کرنے والا نظر نہیں آتا اور سب دوزخ پر یقین رکھتے ہیں اور اس سے خوف کھانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ تم کس چیز پر خوش ہو رہے ہو۔ تم موت کا انتظار نہیں کرتے حالانکہ وہ سب سے پہلے اللہ کے حکم میں سے بھلائی یا برائی کے ساتھ تم پر وارد ہونے والی ہے۔ اے بھائیو! اپنے رب کی طرف اچھی طرح چلو!"

شمیط بن عجلان نے کہا: "جس نے موت کو اپنا نصب العین بنا لیا وہ دنیا کی تنگی یا فراخی کی پرواہ نہیں کرتا۔"

معلوم ہونا چاہیے موت کا خطرہ بڑا عظیم ہے، لوگ اس سے محض قلّتِ فکر و ذکر کی وجہ سے غافل ہیں اور اگر کوئی اس کا تذکرہ کرتا بھی ہے، تو غافل دل سے کرتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تمام خیالات سے کنارہ کش ہو کر موت کا تذکرہ کرے اور یوں سمجھے کہ وہ سامنے سے آ رہی ہے۔ اس کا حال ایسا ہو کہ گویا خطرناک جنگل طے کرنا چاہتا ہو یا سمندر کا سفر کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں وہ سب سے زیادہ خطرات کے متعلق غور کرے گا۔

اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اُن ساتھیوں اور ہم عصروں کو یاد کرے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اُن کی موت اور اُن کے زمین کے نیچے دفن ہونے کو یاد کیا کرے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "خوش قسمت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔"

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "جب مُردوں کا تذکرہ ہو تو اپنے آپ کو بھی انہی میں سے شمار کرو"
قبرستان میں اکثر جائے اور جب دنیا کی کسی چیز میں اس کا دل اٹک جائے تو اس وقت سوچے کہ لازماً اس سے جدا ہونا ہے۔ یوں اس انہماک سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کندھے سے پکڑا اور کہا: "دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راہ چلتا مسافر"۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے: "جب شام ہو جائے، تو صبح کی امید نہ رکھو اور اگر صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور اپنی صحت میں بیماری اور اپنی زندگی میں موت کا سامان کرو"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف خواہش اور لمبی امید کا ہے۔ خواہش تو حق سے گمراہ کرتی ہے اور لمبی امید آخرت کو بھلاتی ہے۔

حضرت حسنؒ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: "کیا تم سب جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو؟" انھوں نے کہا ہاں۔ تو فرمایا: "امید چھوٹی رکھو اور اپنی موت کو اپنے سامنے رکھو اور اللہ تعالیٰ سے پوری طرح حیا کرو"۔

حضرت ابو زکریا تیمی نے کہا: "سلیمان بن عبدالملک مسجد حرام میں تھا کہ ایک پتھر پر لکھا ہوا کتبہ لایا گیا جس پر مرقوم تھا:
"اے آدم کے بیٹے! اگر تو اپنی موت کے قرب کو دیکھ لے تو اپنی لمبی آرزوؤں سے بے نیاز ہو جائے نیک عمل کرنے میں زیادہ رغبت کرے اور اپنی حرص اور حیلے کم کر دے۔ اگر تیرے قدم پھسل گئے تو ندامت تیرا دامن نہ چھوڑے گی اور تیرے اہل و عیال تجھے خاک کے سپرد کر دیں گے۔ تیری اولاد اور نسب تجھ سے الگ ہو جائے گا۔ پھر نہ تُو دنیا کی طرف لوٹنے والا ہوگا اور نہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کر سکے گا۔ لازمی ہے کہ قیامت کے لیے جسے ندامت کا دن کہتے ہیں کچھ عمل کر لے"۔

معلوم ہونا چاہیے کہ لمبی امید کے دو سبب ہیں: دُنیا کی محبت اور جہالت۔

جب انسان دنیا کی خواہشات، لذتوں اور تعلقات سے مانوس ہوتا ہے تو اس کی جدائی دل پر گراں گزرتی ہے اُس کا دل موت کی یاد سے رُک جاتا ہے جیسا کہ ہر آدمی اپنی ناپسندیدہ چیز کو اپنے نفس سے دُور رکھنا چاہتا ہے۔ انسان باطل خواہشات میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو ہمیشہ اپنی مراد کے موافق دنیا میں باقی رہنے کی امید دلاتا ہے وہ مال، اہل و عیال، مکان و سامان اور ضرورت کی چیزوں کے خیال میں اس طرح ڈوبا رہتا ہے کہ اپنی موت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی اس کا خیال آ بھی جائے تو اُسے آئندہ پر ٹالتا ہے اور اپنے نفس کو یقین دلاتا ہے کہ ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے۔ آگے چل کر توبہ کر لوں گا۔ پھر سوچتا ہے بوڑھے ہو کر تائب ہو جاؤں گا اور جب بوڑھا

ہوجاتا ہے تو کہتا ہے اس مکان کی تعمیر سے فارغ ہوجاؤں، اس زمین کو آباد کرلوں، اس سفر سے واپس آجاؤں۔ بس اسی طرح ٹالتا جاتا ہے۔ ایک کام پورا کرنے کی حرص کرتا ہے تو اس کے ساتھ دس شغل اور چمٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت اُسے آکر دبوچ لیتی ہے۔ اور اب یہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہے کہ جن کاموں میں وہ اُلجھا رہا ایک بھی نفع پہنچانے والا نہ تھا۔

دوزخیوں کا اکثر رونا اسی "پھر کرلوں گا" کا ہوگا۔ کہیں گے: ہائے افسوس! اس "پھر" پر جس نے ہمیں تباہ کردیا۔

یہ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے غفلت ہے "جس سے چاہے محبت کر آخر تو اُسے چھوڑنے والا ہے"

دوسرا سبب جہالت ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جوانی پر اعتماد کرتا ہے۔ جوانی میں موت کا آنا بعید سمجھتا ہے اور یہ اس کی بھول ہے۔ اگر وہ اپنے شہر کے بوڑھوں کا شمار کرے، تو انھیں آسانی سے شمار کرلے گا اور وہ اس لیے تھوڑے ہیں کہ لوگوں کو موت جوانی میں زیادہ آتی ہے۔ جب تک ایک بوڑھا مرتا ہے ہزار بچے اور جوان مر جاتے ہیں۔

کبھی اپنی صحت سے دھوکا کھاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ مرنے کے لیے کمزور ہونا شرط نہیں۔ موت تو ناگہانی طور پر آجاتی ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو مرض ناگاہ آسکتا۔ اگر وہ غور کرے، تو معلوم ہوگا کہ موت کا کوئی وقت نہیں۔ وہ گرمی، سردی، بہار، خزاں، دن، رات، غرض کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ اس کے لیے عمر کا کوئی بھی حصہ مخصوص نہیں۔ جوان، ادھیڑ، بوڑھے اور بچے سب پر آتی ہے۔

انسان کے لیے یہی بات اچھی ہے کہ موت کی تیاری کرے۔

فصل دوم

امّید اور موت

لمبی امیدوں کے معاملے میں لوگ مختلف ہیں۔ بعض بوڑھا ہونے تک زندہ رہنے کی اُمید رکھتے ہیں اور بعض کی امید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کا تصور کچھ ایسا ہوتا ہے گویا ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ابو عثمانؒ نہدی سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے کہا: میری عمر ایک سو تیس سال ہو چکی ہے۔ ہر چیز کمزور ہو گئی، لیکن امید جیسے پہلے تھی اسی طرح اب بھی ہے۔

دوسری طرف بعض لوگ گویا امید کا دامن تھامتے ہی نہیں، حضرت ابو محمد حبیبؒ کی بیوی نے کہا: "ابو محمد کہا کرتے تھے، اگر میں آج مر جاؤں تو غسل دینے کے لیے فلاں آدمی کو بلانا اور وہ اس اس طرح کرے۔ اور تم اس طرح کرنا۔" اُن سے پوچھا گیا: "کیا انھوں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟" کہنے لگی: "وہ ہر روز ایسا ہی کہا کرتے تھے۔"

حضرت ابراہیمؒ بن سبط نے کہا: "مجھ سے ابو زرعہ نے بیان کیا کہ میں تجھ سے ایسی بات کہہ رہا ہوں جو تیرے سوا میں نے کبھی کسی سے نہیں کہی۔ بیس سال جاتے ہیں کہ میں جب بھی مسجد سے نکلتا ہوں، تو میرے دل میں خیال آتا ہے کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔"

بعض سے کہا گیا: "تم اپنی قمیص کیوں نہیں دھوتے؟" تو جواب دیا: "موت اس سے زیادہ قریب ہے۔"

محمدؒ بن ابی توبہ نے کہا: "حضرت معروفؒ کرخی نے اقامت کہی اور مجھ سے فرمایا آگے ہو کر نماز پڑھاؤ۔ میں نے کہا: آج تو میں نماز پڑھا دیتا ہوں، لیکن آئندہ میں کبھی نہیں پڑھاؤں گا۔" تو معروف نے کہا: "کیا تمھارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ تم اور نماز بھی پڑھو گے؟ اتنی لمبی اُمید سے خدا کی پناہ۔ یہ اچھے اعمال سے روک دیتی ہے۔"

امیدیں قلیل ہونے کے معاملے میں اکثر زاہدوں کا یہی حال تھا۔ جب امید چھوٹی ہو جاتی ہے، تو عمل اچھا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ آج مر جائے گا تو وہ مرنے والے کی طرح تیاری کرتا ہے۔

اگر شام ہو جائے تو سلامتی پر اللہ کا شکر ادا کرے اور سمجھے کہ اس رات میں مر جائے گا اور عمل کرنے میں جلدی کرے۔

شریعت میں عمل اور اس کے جلدی کرنے کی ترغیب آئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دو نعمتیں ہیں جن میں اکثر لوگ خسارہ اٹھاتے ہیں صحت اور فراغت۔" انہی میں سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔ جوانی کو بڑھاپے سے۔ صحت کو بیماری سے۔ دولتمندی کو تنگدستی سے۔ فراغت کو مصروفیت سے اور زندگی کو موت سے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہر چیز میں جلدی نہ کرنا بہتر ہے سوائے آخرت کے کاموں کے۔"

حضرت حسنؒ کہا کرتے تھے: "ان لوگوں پر تعجب ہے جنھیں کہا گیا کہ زاد راہ لو اور کوچ کرو۔ لوگ جانے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہ بیٹھ کر کھیل رہے ہیں۔"

بنی تمیم کے مولیٰ سحیم نے کہا: میں عبداللہ بن عبداللہ کے پاس جا کر بیٹھا۔ آپ نے اپنی نماز مختصر کی اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "اپنی حاجت بتاؤ میں جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا کونسی جلدی ہے؟ کہا ملک الموت کے آنے کی اور آپ ہر روز ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رات کو کھڑے ہوتے۔ وضو کرتے اور نماز پڑھتے۔ پھر پرندے کی طرح تھوڑا سا اونگھ جاتے۔ پھر کھڑے ہوتے، وضو کرتے اور نماز پڑھتے۔ پھر اونگھ جاتے۔ پھر کھڑے ہوتے اور نماز پڑھتے اسی طرح کئی مرتبہ کرتے۔

عمیرؒ بن ہانی ہر روز ایک لاکھ مرتبہ تسبیح پڑھتے۔ ابو بکرؒ بن عیاش نے کہا: "میں نے اس گوشے میں بیٹھ کر اٹھارہ ہزار مرتبہ قرآن مجید ختم کیا ہے۔"

اگر انسان کے سامنے موت کے سوا اور کوئی بھی مصیبت اور ہولناک منظر نہ ہو تو بھی اس پر زندگی مکدر ہو جانی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ اسی کے متعلق سوچتا رہے۔ انسان اگر عظیم لذتوں میں ہو اور اسے یقین ہو کہ سپاہی آکر اس کو پانچ کوڑے مارے گا، تو اس کی لذت مکدر ہو جاتی ہے، لیکن موت کا خیال اسے پریشان نہیں کرتا، حالانکہ اس کا آنا ایک یقینی بات ہے۔ وہ اس کے ذکر سے غافل ہے، تو اس کا سبب صرف جہالت اور دھوکا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ موت تلوار کی ضرب سے زیادہ سخت ہے۔ مضروب اس لیے چیختا اور فریاد کرتا ہے کہ اس کی قوت ابھی باقی ہوتی ہے، لیکن موت کے وقت مرنے والے کی آواز شدت تکلیف سے منقطع ہو جاتی ہے کیونکہ تکلیف حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس کے دل اور تمام مقامات پر غالب آ جاتی ہے۔ اس کا ہر عضو کمزور ہو جاتا ہے اور اس

میں فریاد کرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ وہ چاہتا ہے کہ رونے چیخنے اور فریاد کرنے سے آرام حاصل کرے، لیکن ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی تمام رگوں سے روح کھینچی جاتی ہے اور ہر عضو آہستہ آہستہ مرجاتا ہے۔ سب سے پہلے قدم ٹھنڈے ہوتے ہیں پھر پنڈلیاں پھر رانیں یہاں تک کہ موت ہنسلی تک پہنچتی ہے۔ اس وقت اس کی نظر دنیا اور دنیا والوں سے منقطع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے": جب تک بندے کی نزع کا وقت نہ شروع ہو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے"۔

بیان کیا گیا ہے کہ وہ دو فرشتے جو بندے پر مقرر ہیں موت کے وقت اس کو نظر آتے ہیں۔ اگر وہ نیک ہو تو اس کی ثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ تجھے اچھی جزا دے اور اگر وہ بُرا ہو تو کہتے ہیں اللہ تجھے اچھی جزا نہ دے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا": اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندے پر دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو اس کے عمل لکھتے ہیں۔ جب بندہ مرجاتا ہے، تو کہتے ہیں۔ اے اللہ! یہ تو مر گیا کیا اب ہم آسمانوں پر آجائیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا آسمان میرے فرشتوں سے بھرا ہوا ہے جو میری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم زمین پر رہیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری زمین بھی میری مخلوق سے بھری ہوئی ہے وہ میری تسبیح بیان کرتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں ہم کہاں رہیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم اس بندے کی قبر پر کھڑے ہو کر میری تسبیح و تکبیر و تحمید اور تہلیل کرتے رہو اور قیامت تک یہ میرے بندے کے لیے لکھتے رہو"۔

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا": مومن کو جب موت آتی ہے اور اسے اللہ کی رضامندی اور عزت افزائی کی بشارت ملتی ہے، تو اسے آئندہ کی چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہیں۔ اور دوزخی بندہ جس کا خاتمہ خراب ہوتا ہے ایسے سخت حالات میں آگ کی بشارت سنتا ہے"۔

بہت سے سلف بُرے انجام سے ڈرتے تھے۔ ہم نے کتاب الخوف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم اللہ کریم سے دُعا کرتے ہیں کہ اپنی وسیع رحمت سے ہم پر رحم فرمائے اور مہربانی کرے اور ہمارا خاتمہ اچھا کر دے آمین۔

مرنے والے کے نزدیک کون سے حالات مستحب ہیں؟ تو وہ یہ ہیں کہ اس کا اللہ کے متعلق حسن ظن ہو اور اس کی زبان پر کلمۂ شہادت ہو اور اس کے حال پر اللہ کی مہربانی کی علامت یہ ہے کہ اس میں بے قراری نہ ہو۔ یہ اس چیز کی شہادت ہے کہ اس نے بھلائی دیکھ لی۔

بیان کیا گیا ہے کہ مومن کی روح نکلتے وقت اسے پسینہ آجاتا ہے۔ مستحب ہے کہ اسے لا الٰہ الا اللہ کہنا یاد کرایا جائے، جیسا کہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللہ یاد کراؤ۔

یاد کرانے والے کو چاہیے کہ نرم رویہ اختیار کرے۔ اس پر اصرار نہ کرے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اپنے مرنے والوں کے پاس جاؤ اور انھیں لا الہ الا اللہ یاد کراؤ اور انھیں جنت کی خوشخبری دو کیونکہ موت کے وقت بردبار اور علم والا مرد یا عورت بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ اللہ کا دشمن ابلیس ایسے وقت میں بندے کے بہت قریب ہوتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے "تم اس حال میں مرو کہ اللہ کے متعلق تمھیں حسن ظن ہو۔"

بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس گئے۔ وہ مر رہا تھا۔ آپ نے پوچھا "تیرا کیا حال ہے؟" اس نے کہا: "مجھے اللہ کی رحمت کی بھی امید ہے اور اپنے گناہوں سے بھی ڈرتا ہوں؟" تو آپ نے فرمایا: "ایسی حالت میں جس بندے کے دل میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں اللہ اس کی امید پوری کرتا ہے اور جس چیز سے ڈرتا ہے اس سے بے خوف کر دیتا ہے۔"

موت کے وقت امید افضل ہے کیونکہ خوف ایک کوڑا ہے جس سے ہانکا جاتا ہے۔ موت کے وقت نظر ٹھہر جاتی ہے، تو اس پر مہربانی ہونی چاہیے اور اس لیے بھی کہ شیطان اس وقت بندے کو خدا کے فیصلے پر ناراض کرنا چاہتا ہے اور اسے آئندہ کے متعلق ڈراتا ہے۔ اس وقت حسن ظن سب سے طاقتور ہتھیار ہے جس سے دشمن کی مدافعت کی جائے۔

سلیمان تیمی نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹے سے کہا: "مجھے رخصت کی حدیثیں سناؤ تاکہ میں اللہ تعالیٰ سے ایسے حال میں ملوں کہ میرا اس کے متعلق اچھا ظن ہو۔"

فصل سوم

رسول اللہ اور خلفاء راشدین کی وفات کا ذکر

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی آپ سے زیادہ اللہ کو پیارا نہیں، لیکن اس کے باوصف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کی سختی آئی۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی کا تھا رکھا ہوا رکھا تھا۔ آپ اس میں اپنا ہاتھ ڈبو کر چہرہ پر ملتے اور فرماتے: "لا الٰہ الا اللہ موت کی بڑی سختیاں ہیں۔"

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری بڑھ گئی اور آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہائے ابا جان کی تکلیف! تو آپ نے اُن سے فرمایا: "آج کے بعد تمھارے باپ پر کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ہم اپنی ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں جمع ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دیکھا۔ آپ کے آنسو نکل آئے اور آپ نے ہمیں اپنی وفات کی خبر دی اور فرمایا: "مرحبا، اللہ تمھیں سلامت رکھے، اللہ تمھارا نگہبان، اللہ تمھاری رعایت رکھے، اللہ تمھیں اتفاق دے، اللہ تمھاری مدد کرے، اللہ تم کو توفیق دے اللہ تم کو نفع دے، اللہ تمھیں عزت دے، اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمھیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اللہ تمھاری نگہبانی کرے۔" ہم نے کہا: "اے اللہ کے رسول! آپ کی وفات کب ہو رہی ہے؟" فرمایا: "وقت قریب آچکا ہے، اللہ کی طرف جانا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ اور جنۃ الماویٰ کی طرف اور فردوسِ اعلیٰ کی طرف۔" ہم نے کہا۔ اے اللہ کے رسول! ہم آپ کو کس کپڑے میں دفن کریں؟ فرمایا: "اگر تم چاہو تو میرے انہی کپڑوں میں یا یمنی سفید چادروں میں دفنا دینا۔" ہم نے کہا۔ آپ کا جنازہ کون پڑھائے گا؟ اور ہم رونے لگے۔ آپ نے فرمایا: "صبر کرو اللہ تم پر رحم کرے اور تمھارے نبی کی طرف

سے تمھیں اچھی جزا دے۔ جب تم مجھے غسل دے چکو، اور کفن پہنالو، تو میری اس چارپائی کو میری قبر کے کنارے رکھ دو، تو تم تھوڑی دیر تک سب باہر نکل جانا۔ سب سے پہلے مجھ پر میرا دوست اور حبیب جبریل نماز پڑھے گا۔ پھر میکائیل پھر اسرافیل اور پھر عزرائیل۔ پھر بہت سے ملائکہ۔ پھر تم فوج در فوج داخل ہونا۔ مجھ پر درود پڑھنا اور سلام کہنا اور رونے چیخنے سے مجھے تکلیف نہ دینا۔ سب سے پہلے مجھ پر میرے اہل بیت کے مرد نماز پڑھیں۔ پھر عورتیں۔ ان کے بعد تم۔ اور صحابہ جو موجود نہ ہوں ان کو بھی اور جو قیامت تک میرے دین کے متبع ہوں گے ان سب کو میرا سلام کہنا۔ خبردار میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ میں ہر مسلمان کو سلام کہہ رہا ہوں۔"

آپ کی وفات سے تین دن پہلے آپ کے پاس جبرئیلؑ آئے اور کہا: "اے احمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کے متعلق اللہ تعالیٰ مجھ سے وہ بات پوچھتے ہیں جسے وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ کا کیا حال ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: "اے جبرئیلؑ میں غمزدہ ہوں اور تکلیف میں ہوں۔" پھر دوسرے دن جبرئیلؑ آئے اور وہی بات کہی۔ آپؐ نے وہی جواب دیا، پھر تیسرے دن آئے اور وہی بات کہی اور آپؐ نے وہی جواب دیا، تو اس وقت ملک الموت آکر اجازت مانگنے لگا۔ جبرئیلؑ نے کہا: اے احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ملک الموت ہے۔ اجازت مانگ رہا ہے، اور آپؐ سے پہلے ملک الموت نے کبھی کسی سے اجازت نہیں مانگی اور نہ آپؐ کے بعد کسی سے اجازت مانگے گا۔ تو آپؐ نے فرمایا: "اس کو اجازت دے دو۔" چنانچہ وہ اندر آیا اور آپؐ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کی اطاعت کروں۔ اگر آپؐ مجھے حکم دیں گے کہ میں آپ کی روح قبض کروں، تو میں کروں گا اور اگر آپ حکم دیں گے کہ میں اس کو چھوڑ جاؤں، تو میں چھوڑ جاؤں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے ملک الموت! کیا تم ایسا ہی کرو گے؟" اس نے کہا مجھے آپ کی اطاعت ہی کا حکم ہوا ہے۔ تو جبرئیلؑ نے کہا: اے احمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ آپؐ کے مشتاق ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: "اے ملک الموت! جو حکم ہوا ہے اس کی تعمیل کرو۔" جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ! آپ پر سلام ہو یہ میرا زمین پر آخری پھیرا تھا۔ دنیا میں مجھے آپ ہی سے تو کام ہوتا تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ حضرت عائشہؓ کے سینے سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ آپؐ کے اوپر ایک دھاری دار چادر تھی اور گاڑھے کا تہ بند تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: "ہائے باپ نے اپنے رب کی آواز پر لبیک کہا۔ اے باپ! آپ کا ٹھکانا جنت الفردوس ہے۔ اے باپ آپ کی وفات کی خبر ہم جبرئیلؑ کو دیتے ہیں۔ اے باپ! آپ اپنے رب کے کتنے قریب چلے گئے۔"

پھر جب آپ دفن ہوئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "اے انس! کیا تم نے خوشی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈال لی تھی؟"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا:

۱- جب میں نے اپنے نبیؐ کو زمین پر پڑے دیکھا، تو مکان اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئے۔

۲- اور میں ایک دیوانے عاشق کی طرح ہو گیا اور میری ہڈیاں کمزور ہو کر ٹوٹ رہی تھیں۔

۳- اے عتیق! تجھ پر افسوس تیرا محبوب خاک میں چلا گیا اور اب تو اکیلا اور تھکا ہوا رہ گیا۔

۴- اے میرے ساتھی! افسوس آپؐ کی وفات سے پہلے کاش میں قبر میں چلا جاتا اور مجھ کو پتھروں سے ڈھانپ دیا جاتا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات

ابوالملیح نے بیان کیا کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا، تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور کہا: اگر آپ میری وصیت قبول کریں، تو میں آپ کو وصیت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ رات کے حق ہیں جن کو وہ دن میں قبول نہیں کرتا۔ اور کچھ دن کے حق ہیں جن کو وہ رات میں قبول نہیں کرتا اور جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں اللہ تعالیٰ نفل قبول نہیں کرتا اور جن لوگوں کے آخرت میں وزن بھاری ہوں گے وہ حق کی اتباع کی وجہ سے بھاری ہوں گے اور یہ حق ان پر بھاری تھا اور ترازو کا حق ہے کہ اس میں حق رکھا جائے تو وہ بھاری ہو جائے اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے وہ باطل کی اتباع کی وجہ سے ہلکے ہوں گے اور دنیا میں بھی باطل ان پر ہلکا ہوگا اور ترازو کا حق ہے کہ اگر اس میں باطل رکھا جائے تو وہ ہلکا ہو جائے۔

کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ سختی کی آیت کے ساتھ ہی امید کی آیت بھی نازل فرمائی ہیں اور امید کی آیت کے ساتھ ہی سختی کی آیت بھی ہوتی ہے تاکہ بندے میں ڈر اور امید دونوں رہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے اور نہ اللہ سے ناحق امید رکھے۔ اگر آپ میری یہ وصیت یاد رکھیں گے، تو کوئی غائب چیز موت سے بڑھ کر عزیز نہ ہوگی اور وہ لازماً آنے والی ہے، اور اگر میری اس وصیت کو ضائع کر دیں گے تو کوئی غائب چیز موت سے بڑھ کر بری نہ لگے گی اور وہ لازماً آنے والی ہے اور آپ اس سے بھاگ نہیں سکیں گے۔"

کہا گیا ہے کہ آپ کی وفات کا وقت آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور انھوں نے یہ شعر پڑھا ۔

"تیری زندگی کی قسم جب لمبے سانس آنے لگیں اور سینہ تنگ ہو جائے تو دولت کسی آدمی کے کام نہیں آتی۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چہرہ سے کپڑا ہٹایا اور کہا: "ایسا نہیں ہے، بلکہ اس طرح کہو: وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ[1] (اور حق کے ساتھ موت کی بے ہوشی آگئی یہ وہی موت ہے جس سے تو بھاگتا تھا) میرے ان دونوں کپڑوں کو دیکھو، ان کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دے دینا۔ نئے کپڑوں کی زندہ کو میت کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: "جب آپ زخمی ہو گئے، تو آپ کا سر میری گود میں تھا اور یہی آپ کی موت کی بیماری تھی۔ آپ نے فرمایا: "میرے رخسار زمین پر رکھ دو۔ میں نے کہا میری گود میں ہوں یا زمین پر آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ اور میرا خیال تھا کہ آپ یہ بات بے چینی کی وجہ سے فرما رہے ہیں؛ چنانچہ میں نے تعمیل نہ کی۔ آپ نے پھر کہا تیری ماں مرے، میرا رخسار زمین پر رکھ دے، اگر میرے رب نے مجھ پر رحم نہ کیا، تو میری بھی اور میری ماں کی بھی بربادی ہے"

بیان کیا گیا ہے کہ جب آپ زخمی ہوئے اور آپ کو اٹھا کر گھر لایا گیا تو لوگ آکر آپ کی تعریف کرنے لگے۔ ایک نوجوان آیا اس نے کہا۔ اے امیرالمومنین! آپ اللہ کی بشارت سے خوش ہوں، آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی۔ پھر اسلام میں آپ کا جو مرتبہ تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ پھر آپ خلیفہ بنے، تو آپ نے انصاف کیا اور پھر اب شہادت نصیب ہو رہی ہے۔" تو آپ نے فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ معاملہ برابر سرابر ختم ہو جائے۔ نہ میں کچھ مانگتا ہوں نہ مجھ سے کچھ پوچھا جائے۔" پھر فرمایا: "اے عبداللہ بن عمر، عائشہؓ ام المومنین کے پاس جاؤ اور کہو عمرؓ آپ کو سلام کہتا ہے اور امیرالمومنین نہ کہنا کیونکہ میں آج مومنوں کا امیر نہیں ہوں۔ اور کہو عمرؓ بن خطاب اپنے دونوں ساتھیوں کے پاس دفن ہونے کی اجازت مانگتا ہے۔" تو وہ گئے اور سلام کہا اور اندر آنے کی اجازت مانگی۔ پھر اندر گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "عمرؓ آپ کو سلام کہتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے پاس دفن ہونے کی اجازت مانگتا ہے" تو آپ نے فرمایا: "یہاں دفن ہونے کا میرا اپنا ارادہ تھا لیکن میں ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں۔ پھر جب عبداللہ بن عمرؓ واپس آئے تو کہا گیا عبداللہ بن عمر آگئے ہیں، تو آپ نے فرمایا: "مجھے اوپر اٹھاؤ" تو ایک آدمی نے آپ کو ٹیک دی۔ پھر

[1] سورۃ قٓ۔ آیت ۱۹۔

آپ نے پوچھا" کیا خبر لائے ہو؟" اُنھوں نے کہا جو آپ کی پسند تھی۔ انھوں نے اجازت دے دی ہے۔ تو کہا الحمد للہ مجھے اس سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ جب میں مرجاؤں تو مجھے اٹھا کرلے جانا۔ پھر سلام کہنا اور کہنا عمر بن خطاب اجازت مانگتا ہے اگر اجازت دے دیں تو مجھے اندر لے جانا اور اگر مجھے واپس کر دیں تو مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔"

مسلم کے افراد میں حضرت مسوّر بن مخرمہ کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "خدا کی قسم اگر میرے پاس اتنا سونا ہو کہ زمین بھر جائے تو میں بن دیکھے اللہ کے عذاب کے فدیہ میں دے دوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے: "خدا کی قسم! اگر میرے پاس ساری دنیا ہو تو میں اپنے فدیہ میں دے دوں۔"

حضرت عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ کی وفات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی نائلہؓ بنت فرافصہ کہتی ہیں: "جس دن حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اس سے پہلے دن آپ روزے سے تھے۔ جب روزہ افطار کرنے کا وقت آیا تو آپ نے بلوائیوں سے پانی مانگا۔ اُنھوں نے پانی نہ دیا تو آپ نے روزہ افطار نہ کیا اور سو گئے۔ جب سحری کا وقت ہوا تو میں پڑوسنوں کے پاس آئی اور ان سے پینے کو پانی مانگا۔ انھوں نے مجھے ایک لوٹا پانی دیا۔ میں آپ کے پاس آئی اور آپ کو ہلایا تو جاگ اٹھے۔ میں نے کہا یہ پینے کا میٹھا پانی ہے۔ آپ نے اپنا سر اُٹھایا اور کہا "میں روزے کی حالت میں ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس مکان کی چھت سے جھانکا۔ آپؐ کے پاس میٹھا پانی تھا فرمایا "اے عثمانؓ پانی پی لے۔" میں نے سیر ہو کر پیا۔ پھر فرمایا "اور پیو" تو میں نے پھر پوری طرح پیٹ بھر کے پیا۔ پھر فرمایا: "قوم عنقریب تیرا انکار کر دے گی اگر تو اُن سے لڑے تو کامیاب ہوگا اور اگر اُن کو چھوڑ دے گا تو تو روزہ ہمارے پاس آ کر افطار کرے گا۔" پھر بلوائیوں نے اسی دن آپ پر حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔"

علاءؒ بن فضیل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو آپ کے خزانہ کی تلاش شروع ہوئی۔ انھوں نے مکان میں ایک مقفل صندوق دیکھا۔ اسے کھولا تو اُس میں ایک ڈبیا تھی اُس کو کھولا تو ایک کاغذ برآمد ہوا جس میں لکھا تھا: "یہ عثمان کی وصیت ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ عثمانؓ بن عفان شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ اور جنت حق ہے۔ دوزخ حق ہے اور اللہ قیامت کے روز تمام قبروں والوں کو اٹھائے گا اس میں

کوئی شک نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ ہم اسی پر زندہ رہے اور اسی پر مریں گے۔ اور اسی پر اٹھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ"

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وفات

حضرت شعبیؒ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تلوار کی ضرب لگی تو آپ نے پوچھا: میرے قاتل کا کیا بنا؟" انھوں نے کہا اسے پکڑ لیا ہے۔ تو فرمایا "اُسے میرا کھانا کھلاؤ۔ میرا پانی پلاؤ۔ اگر میں زندہ رہا تو خود فیصلہ کر لوں گا۔ اور اگر میں شہید ہو گیا تو اُسے تلوار کی صرف ایک ضرب لگانا زیادہ نہ لگانا"

پھر حضرت حسنؓ کو اپنے غسل کی وصیت کی اور فرمایا کفن قیمتی نہ ہو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ نے فرمایا: "کفن مہنگا نہ لیا کرو کہ وہ جلدی ہی گل سڑ جائے گا۔" مجھے درمیانی چال لے کر چلنا۔ نہ تو بہت جلدی اور نہ دیر کرکے۔ اگر بھلائی ہوگی تو مجھے اس کی طرف جلدی لے چلو گے اور اگر برائی ہوگی تو اپنے کندھوں سے مجھے جلدی اتار دو گے"!

بیان کیا گیا ہے کہ جس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا صبح کے وقت ابن سیاج آپ کو نماز کی اطلاع دینے کے لیے آیا۔ آپ لیٹے ہوئے تھے۔ طبیعت بوجھل تھی۔ اس نے دوبارہ آواز دی۔ پھر بھی لیٹے رہے۔ پھر تیسری مرتبہ آواز دی تو کھڑے ہو گئے اور چلتے ہوئے کہنے لگے ؎

۱۔ موت کے لیے تیار ہو جا یقیناً موت تجھے آنے والی ہے۔

۲۔ اور موت سے نہ گھبرا اگرچہ وہ تیری مجلس میں نازل ہو جائے۔

پھر آپ مسجد کے چھوٹے دروازہ تک پہنچے تو عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ پر حملہ کر دیا اور آپ کو تلوار ماری۔

فصل چہارم

موت کے وقت صحابہؓ سے منقول کلمات اور زیارتِ قبور

جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا "میرا بستر گھر کے صحن میں لے چلو۔" آپ کو باہر نکالا گیا تو کہا: "اے اللہ! میں اس مصیبت پر تجھ سے ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ اتنی بڑی مصیبت مجھ پر پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔"

بیان کیا گیا ہے کہ جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے فرمایا "باہر نکل کر دیکھو صبح ہوئی یا نہیں؟" اُن کو بتایا گیا ابھی صبح نہیں ہوئی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا تو پھر ان کو بتایا گیا۔ اب صبح ہو گئی ہے، تو آپ نے فرمایا: "اُس رات سے اللہ کی پناہ جس کی صبح دوزخ کو لے جائے۔" پھر فرمایا: "موت کو مرحبا، غائب زیارت کو آیا۔ دوست ضرورت کے وقت آیا۔ اے اللہ! میں تجھ سے ڈرا کرتا تھا اور آج میں تجھ سے امید رکھتا ہوں۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ مجھے دنیا کی محبت اس لیے نہیں تھی کہ میں یہاں نہریں کھودوں یا درخت لگاؤں، بلکہ میری محبت اس لیے تھی کہ گرمیوں کے روزے رکھوں اور سرد راتوں میں قیام کروں اور دنیا کے اوقات میں مشقت کروں اور ذکر کے حلقوں میں علماء کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر ان کے ساتھ رہوں۔"

ابو مسلم نے کہا: میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کے پاس آیا۔ آپ جان دے رہے تھے اور کہتے تھے: "کیا کوئی آدمی ہے جو موت کے لیے عمل کرے۔ کیا کوئی آدمی ہے جو میرے اس دن جیسے دن کے لیے عمل کرے۔ کیا کوئی آدمی ہے جو میری اس آخری گھڑی کے لیے عمل کرے؟" پھر آپ کی روح قبض ہو گئی۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنی وفات کے وقت رونے لگے۔ پوچھا گیا کیوں روتے ہو؟ تو کہا: "ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ ہمارا سامان ایسا ہونا چاہیے جیسے کسی مسافر کا سامان (مختصر) ہوتا ہے، اور اب میرے پاس یہ اتنے سامان پڑے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کے پاس صرف کپڑے دھونے کا ایک برتن، ایک پیالہ اور ایک لوٹا تھا۔

حضرت مزنی نے کہا: میں امام شافعی کے پاس اس بیماری میں گیا جس میں آپ کی وفات ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا

آپ کا کیا حال ہے؟" کہا "میں دنیا سے جا رہا ہوں، دوستوں سے جدا ہو رہا ہوں۔ اپنے بُرے اعمال سے ملنے والا ہوں۔ موت کا پیالہ پینے والا ہوں۔ اللہ کے پاس جانے والا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میری روح جنت کی طرف جائے گی کہ میں اسے مبارک باد دوں یا دوزخ کی طرف جائے گی کہ میں اس سے تعزیت کروں۔" پھر آپ یہ شعر پڑھنے لگے: ؎

۱۔ جب میرا دل سخت ہو گیا اور میرے راستے تنگ ہو گئے تو میں نے تیری معافی کے لیے امید کی سیڑھی لگائی۔

۲۔ میرے گناہ بہت بڑے تھے جب میں نے ان کو تیری معافی کے مقابل رکھا، تو تیری معافی ان سے زیادہ بڑی تھی۔

۳۔ تو محض اپنے احسان اور بزرگی کی وجہ سے سخاوت کر کے ہمیشہ گناہ معاف کرتا رہا۔"

کہا گیا ہے کہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ قبروں کے پاس بیٹھتے۔ اس کے متعلق اُن سے پوچھا گیا تو کہا: "میں ان لوگوں کے پاس بیٹھتا ہوں جو میری آخرت یاد دلاتے ہیں۔ اور اگر میں نہ آؤں، تو میری غیبت نہیں کرتے۔"

حضرت میمون بن مہران نے کہا: "میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ قبرستان کی طرف گیا۔ جب انھوں نے قبروں کو دیکھا تو رونے لگے۔ پھر میری طرف متوجّہ ہوئے اور کہا: "اے میمون! یہ میرے باپ دادا بنی اُمیّہ کی قبریں ہیں۔ گویا کہ وہ دنیا والوں کے ساتھ ان کے عیش و عشرت میں کبھی شریک نہ ہوئے تھے۔ کیا تم ان کو گرے ہوئے نہیں دیکھتے؟ ان کو عبرتناک حالات درپیش ہیں۔ مصیبت ان پر مستحکم ہو گئی ہے۔ کیڑے ان کے جسموں میں ٹھکانہ بنائے ہوئے ہیں۔ پھر روئے اور کہا، "خدا کی قسم! جو ان قبروں میں پڑے ہیں میں اس آدمی سے زیادہ خوش حال کسی کو نہیں سمجھتا جو ان قبروں میں پہنچنے کے بعد اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔"

قبروں کی زیارت مستحب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قبروں کی زیارت کیا کرو کہ وہ تمھیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔"

جو آدمی قبر کی زیارت کرے اسے چاہیے کہ میّت کے منہ کی طرف کھڑا ہو اور کچھ قرآن پڑھ کر ان کو ہدیہ کرے اور جمعہ کے دن زیارت کیا کرے۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب عاصم جحدری فوت ہو گئے تو دو سال بعد ان کے گھر والوں میں سے کسی آدمی نے اُن کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا: "کیا آپ فوت نہیں ہو چکے تھے؟" کہا ہاں۔ کہا اب کہاں ہو؟ تو عاصم نے کہا خدا کی قسم میں جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں ہوں۔ میں اور میرے کچھ ساتھی ہر جمعہ کی رات اور اس کی صبح کو ابو بکر بن عبداللہ مزنی کے پاس جا کر تمھاری خبریں حاصل کرتے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا تمھارے جسم یا تمھاری ارواح؟ تو کہا بہت دُور کی بات ہے۔ جسم تو گل سڑ گئے۔ یہ روحیں ملاقات کرتی ہیں۔ میں نے کہا جب ہم تمھاری زیارت کرتے ہیں تو کیا تمھیں اس کا علم ہوتا ہے؟ کہا ہاں

جمعرات کی شام سے لے کر ہفتہ کے سورج طلوع ہونے تک کے اوقات میں۔ تمہارا علم ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ دوسرے دنوں کے علاوہ اس میں کیوں پتہ چلتا ہے؟ کہا جمعے کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے۔"

عثمان بن سواد طفاوی نے بیان کیا کہ ان کی والدہ عبادت گزار عورتوں میں سے تھی۔ اُسے راہبہ کہا جاتا تھا۔ جب اس کی موت کا وقت آیا، تو اُس نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور کہا:" اے میرے سامان، اے میرے ذخیرے، جس پر مجھے اپنی زندگی اور موت کے بعد بھی بھروسہ ہے۔ مجھے موت کے وقت ذلیل نہ کرنا اور قبر میں مجھے وحشت نہ ہو۔ پھر وہ فوت ہوگئی۔ میں ہر جمعہ کو اس کی قبر پہ جاتا اور اُس کے لیے دُعا کرتا اور استغفار کرتا۔ پھر دوسرے اہل قبور کے لیے بھی دُعا کرتا۔ ایک رات میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا میں نے اُس سے پوچھا:" اماں جان آپ کیسی ہیں؟"

کہنے لگی۔" بیٹا، موت بڑی سخت مصیبت ہے اور الحمد للہ میں بڑے اچھے برزخ میں ہوں۔ اس میں پھول بچھائے جاتے ہیں اور سندس اور استبرق کے تکیے رکھے جاتے ہیں اور قیامت تک یہی حال رہے گا۔"

میں نے پوچھا:" آپ کو کوئی ضرورت ہے؟" کہنے لگی" ہاں، ہماری زیارت کے لیے جو تم آیا کرتے ہو اُسے نہ چھوڑنا۔ جب تم جمعہ کے دن اپنے گھر سے آتے ہو تو میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ اے راہبہ تیرا بیٹا آیا ہے۔ پھر میں بھی خوش ہوتی ہوں اور میرے ارد گرد کے مُردے بھی خوش ہوتے ہیں۔"

انس بن منصور نے کہا:" ایک آدمی جنازوں میں شامل ہو کر نماز پڑھا کرتا تھا۔ جب شام ہو جاتی، تو قبرستان کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور کہتا:" اللہ تمہاری وحشت دُور کرے، اللہ تمہاری غربت پر رحم کرے۔ اللہ تمہاری غلطیاں معاف فرمائے۔ اللہ تمہاری نیکیاں قبول کرے۔" اس کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔ اُس آدمی نے کہا۔ ایک دفعہ میں شام کو نہ گیا اور نہ دُعا کی جیسے دعا کیا کرتا تھا۔ میں سویا ہوا تھا کہ بہت سے لوگ میرے پاس آئے۔ میں نے کہا تم کون ہو؟ اور کیوں آئے ہو؟ کہنے لگے ہم قبرستان والے ہیں۔ تو نے ہمیں ہدیہ کی عادت ڈال دی ہے۔ میں نے کہا وہ ہدیہ کیا ہے؟ کہنے لگے وہ دعائیں جو تو کیا کرتا ہے۔ میں نے کہا میں آئندہ ضرور کیا کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد دعا نہیں چھوڑی۔"

بشار بن غالب نے کہا:" میں نے رابعہ بصریہ کو خواب میں دیکھا اور میں ان کے لیے بڑی دعائیں کیا کرتا تھا۔ تو انھوں نے مجھ سے کہا:" اے بشار! تمہارے تحفے نور کے تھالوں میں رکھ کر ریشم کے رومالوں سے ڈھانپ کر ہم کو پیش کیے جاتے ہیں۔" میں نے کہا یہ کیسے؟ کہنے لگیں زندہ لوگ جب مُردوں کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور وہ دعائیں قبول ہو جاتی ہیں تو اسی طرح پیش کی جاتی ہیں کہ اُن کو نور کے تھال میں رکھا جاتا ہے۔ پھر اُن کو ریشمی رومالوں سے ڈھانپا جاتا ہے۔ پھر جس مُردے کے لیے دُعائیں کی جاتی ہیں اُس کو پیش کر دی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کی طرف سے یہ ہدیہ

تمھیں بھیجا گیا ہے۔"

آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح اور جسم الگ الگ ہو جاتے ہیں اور روح اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے خواہ عذاب میں ہو یا نعمت میں اور روح بذاتِ خود بعض تکالیف سے متأثر ہوتی ہے۔ جیسے غم اور فکر اور آرام بھی پاتی ہے جیسے خوشی اور سرور بھی۔

جو چیز بذات خود روح کی صفت ہے وہ جسم کی جدائی کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور جو صفت اعضاء کے واسطے سے ہے وہ جسم کی موت سے معطل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ روح جسم میں واپس آئے۔ اور یہ ناممکن نہیں کہ قبر میں بھی روح جسم میں لوٹائی جاتی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے قیامت تک موخر کیا جائے۔ صحیح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس فیصلہ کو بہتر جانتا ہے جو اُس نے اپنے ہر بندے کے متعلق کیا۔

موت کا مفہوم یہ ہے کہ جسم سے روح کے تصرفات ختم ہو جائیں اور بدن روح کا آلہ نہ رہے۔ موت کے بعد انسان سے اس کے اہل اور مال کو الگ کر دیا جاتا ہے کیونکہ اب وہ کسی اور عالم کی طرف جا رہا ہوتا ہے جس میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر دنیا میں اس کی کوئی ایسی چیز ہو جس سے وہ خوش ہوتا ہو اور آرام پاتا ہو تو موت کے بعد اس کی حسرت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ صرف اللہ کے ذکر سے خوش ہوتا ہو اور اسی سے محبت رکھتا ہو تو یہ ایک بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس کی بدولت کامل سعادت پاتا ہے۔ اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا۔

مرنے کے بعد میت پر وہ چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں جو زندگی میں ان پر منکشف نہیں تھیں، جیسے جاگنے والے پر وہ چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں جو سونے والے پر منکشف نہیں ہوتیں۔ دراصل لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ جب مرتے ہیں تو بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے جو چیز منکشف ہوتی ہے وہ اس کی نفع اور نقصان دینے والی نیکیاں اور بدیاں ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ چیزیں کتاب میں لکھی ہوئی تھیں جو اس کے دل میں پوشیدہ طور پر رکھ دی گئی تھیں۔ دنیا کی مشغولیتوں نے اس سے مطلع نہ ہونے دیا تھا، جب وہ مشاغل ختم ہوئے تو تمام اعمال منکشف ہو گئے۔ اب وہ اپنی برائیاں دیکھتا ہے اور ان پر اتنا افسوس کرتا ہے کہ ان سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے اگر اسے آگ میں غوطہ لگانا پڑے تو وہ آگ میں کود جائے۔ یہ سب کچھ موت کے وقت ہی اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ گناہگار پر یہ دکھ دفن ہونے سے پہلے ہی ہجوم کر آتے ہیں۔ ہم اللہ سے عافیت چاہتے ہیں۔

جو چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ موت سے روح ختم نہیں ہو جاتی ان میں سے یہ آیت بھی ہے: "ولا تحسبن الذین

قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ[1] (اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں ان کو مردہ مت سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے رزق دیے جاتے ہیں)

حضرت مسروقؒ نے کہا، ہم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو آپ نے کہا۔ اُن کی ارواح سبز پرندوں کے اجسام میں ہیں۔ ان کے لیے عرش سے لٹکی ہوئی قندیلیں ہیں۔ جنت میں جہاں چاہتے ہیں کھاتے پیتے پھرتے ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں اور پھر پوری حدیث بیان فرمائی۔

کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ[2] (وہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور قیامت کے دن کہا جائے گا آلِ فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو)۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی کہ ان کو موت کے بعد سزا دی جاتی ہے۔ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو صبح و شام اس کی جگہ اس پر پیش کی جاتی ہے۔ اگر وہ جنتی ہے تو جنت کی اور اگر دوزخی ہے تو دوزخ کی۔ اور کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانا ہے۔ یہاں تک کہ تجھے اللہ قیامت کے دن اٹھائے۔"

پہلے گزر چکا ہے کہ انسان پر جب اپنی برائیاں ظاہر ہوتی ہیں تو اس کو افسوس ہوتا ہے اور بہت تکلیف پاتا ہے۔ مومن آدمی کے متعلق عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "مومن کی مثال، جب کہ اس کی جان نکلتی ہے، اُس آدمی کی طرح ہے جو قید خانہ میں تھا اور اسے نکال دیا گیا۔ وہ زمین میں خوب سیر کرتا پھرتا ہے۔" اور یہ صحیح ہے۔ مومن پر موت کے بعد اللہ کے اتنے احسانات اور نوازشیں ہوتی ہیں کہ ان کی نسبت وہ دنیا کو قید خانہ سمجھتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی اندھیرے مکان میں بند تھا اور پھر اُس کا دروازہ ایک بڑے وسیع باغ کی طرف کھول دیا گیا جس میں رنگ رنگ کے درخت ہیں۔ پھر وہ دنیا کی طرف واپس آنا پسند نہیں کرتا جیسے کہ کوئی آدمی ماں کے پیٹ میں دوبارہ جانا پسند نہیں کرتا۔ مجاہدؒ نے کہا: مومن اپنے بعد اپنے بچے کی نیکی سے خوش ہوتا ہے اور اس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔"

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت: ۱۶۹ [2] سورۃ غافر، آیت: ۴۶

فصل پنجم

قبر کا تذکرہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا" قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"

اور یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا" جب میّت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو قبر کہتی ہے افسوس تجھ پر اے آدم کے بیٹے! تجھے کس چیز نے دھوکہ دیا، کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میں اندھیرا گھر ہوں۔ تنہائی کا گھر ہوں اور کیڑوں کا گھر ہوں"

ترمذی نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز پڑھنے کی جگہ آئے تو کچھ لوگوں کو اس طرح دیکھا گویا وہ بہت زیادہ خوش ہیں۔ آپ نے فرمایا" اگر تم لذّتوں کو توڑنے والی موت کا تذکرہ زیادہ کیا کرو تو میں تمھیں اس طرح نہ دیکھوں۔ موت کا تذکرہ زیادہ کرو کیونکہ قبر ہر روز آواز دیتی ہے۔ میں تنہائی کا گھر ہوں، میں بے آباد ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں۔ میں کیڑوں کا گھر ہوں"

جب مومن بندہ دفن ہوتا ہے، تو قبر اسے کہتی ہے۔ مرحبا اَھلاً وَسَھلاً۔ میرے اوپر جتنے بھی آدمی چلتے تھے تو مجھے ان سب سے زیادہ پیارا تھا۔ آج جب تو میرے پاس آیا ہے اور میرے سپرد ہوا ہے تو تُو ابھی دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ پھر وہ حدِ نگاہ تک اُس کے لیے فراخ ہو جاتی ہے اور اُس کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھولا جاتا ہے۔

جب فاجر یا کافر بندہ دفن ہوتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے" تیرا آنا مبارک نہ ہو جتنے آدمی بھی مجھ پر چلتے تھے۔ تو مجھے ان سب سے زیادہ بُرا لگتا تھا۔ اب جو تو میرے پاس آیا ہے اور میرے سپرد ہوا ہے تو تُو دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ پھر وہ تنگ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں گھس جاتی ہیں"

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں سے دکھایا۔ بعض کو بعض میں داخل کیا۔ پھر فرمایا" اس پر ستّر اژدہے چھوڑ دیے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین پر پھونک مارے تو قیامت تک زمین سے کوئی چیز پیدا نہ

وہ اس کو ڈسیں گے اور نوچتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اس کا حساب ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قبر یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔"

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: "جب مومن بندے کو قبر میں رکھا جاتا ہے، تو اس کے نیک اعمال نماز، روزہ، حج، جہاد اور صدقہ وغیرہ اس کو گھیر لیتے ہیں۔" اور فرمایا: پھر عذاب کے فرشتے اُس کے پاؤں کی طرف سے آتے ہیں تو نماز کہتی ہے، پیچھے ہٹو، تم اس کو سزا نہیں دے سکتے، یہ قدموں کے ساتھ اللہ کے لیے قیام کرتا رہا ہے، پھر وہ سر کی جانب سے آتے ہیں تو روزے کہتے ہیں، تم اس کو سزا نہیں دے سکتے، یہ روزے رکھا کرتا تھا، پھر وہ اس کے جسم کی طرف سے آتے ہیں تو حج اور جہاد کہتے ہیں پیچھے ہٹو، اس نے اپنی جان کو تھکایا، بدن کو مارا اور اللہ کے لیے حج اور جہاد کیا، تم اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ پھر وہ اس کے سامنے سے آتے ہیں تو صدقہ کہتا ہے ان ہاتھوں سے اللہ کی رضا کے لیے کتنا ہی صدقہ نکلا ہے جو قبول ہو چکا ہے، تم اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ پھر اُس سے کہا جاتا ہے، تو زندگی میں بھی پاک تھا اور مرنے کے بعد بھی پاک ہے۔ پھر رحمت کے فرشتے آجاتے ہیں وہ اُس کے لیے جنت کا فرش بچھاتے ہیں۔ جنت کے کپڑے لاتے ہیں اور اس کی قبر حدِ نگاہ تک فراخ ہو جاتی ہے اور جنت سے قندیلیں لائی جاتی ہیں جن سے اُس کی قبر قیامت تک روشن رہتی ہے۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن بندے کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی قبر سے واپس آتے ہیں تو وہ اُن کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ اسے بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو اُس آدمی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کہا کرتا تھا؟ تو مومن کہتا ہے: میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں اپنی آگ کی جگہ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں جنت میں جگہ دے دی ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ ان دونوں (جنت دوزخ) کو دیکھتا ہے۔"

فاجر یا منافق آدمی سے کہا جاتا ہے تم اس آدمی کے متعلق کیا کہا کرتے تھے؟ تو وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا، میں بھی وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ اس سے کہا جاتا ہے نہ تو نے سمجھا اور نہ پڑھا، پھر اُسے لوہے کے ہتھوڑوں سے کانوں کے درمیان مارا جاتا ہے۔ وہ ایسا چیختا ہے کہ جنوں اور انسانوں کے سوا اس کے قرب و جوار کی ہر چیز اس کو سنتی ہے۔" (بخاری، مسلم)

انہی میں حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہارا قبروں میں امتحان ہوتا ہے اور یہ امتحان مسیح دجال کے فتنے کی طرح بڑا ہی سخت ہوتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے تم اس آدمی (رسول اللہ) کے متعلق کیا کچھ جانتے ہو؟ تو مومن کہتا ہے "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" اور پھر باقی حدیث کا ذکر کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب حضرت سعدؓ بن معاذ کا جنازہ اٹھا اور ہم نے ان کو قبر میں دفن کر دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "کوئی بھی آدمی ایسا نہیں جسے قبر نہ بھینچتی ہو اور اگر کوئی آدمی اس سے بچ سکتا، تو سعد بن معاذ بچ جاتا۔" اور پھر باقی حدیث ذکر کی۔

حضرت عبداللہؒ صنعانی نے کہا: "میں نے یزیدؒ بن ہارون کو اُن کی وفات سے چار روز بعد خواب میں دیکھا۔ پوچھا: اللہ نے آپ سے کیا کیا؟ کہا میری نیکیاں قبول فرمائیں اور میری غلطیاں معاف کر دیں۔ میں نے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟ کہا سخی سے سخاوت ہی ہو سکتی ہے۔ اللہ نے میرے گناہ معاف کیے اور مجھے جنت میں داخل کیا۔ میں نے پوچھا یہ نوازش کس سبب سے آپ پر ہوئی؟ کہا ذکر کی مجالس میں حاضری۔ حق کہنے۔ سچ بولنے۔ نماز میں لمبا قیام کرنے اور تنگدستی پر صبر کرنے کی وجہ سے۔ میں نے کہا۔ منکر نکیر کی بات صحیح ہے؟ کہا۔ ہاں اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں انھوں نے مجھے بٹھایا اور پوچھا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ تو میں اپنی ڈاڑھی سے مٹی جھاڑنے لگا اور کہا مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہو؟ میں یزید بن ہارون واسطی ہوں۔ میں دنیا میں لوگوں کو ساٹھ سال تک دین سکھاتا رہا۔ اب مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو؟ تو ایک نے ان میں سے کہا۔ سچ کہتا ہے۔ یہ یزید بن ہارون ہے۔ پھر کہا نئی دلہن کی طرح سوجا آج کے بعد تجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔"

حضرت مروزیؒ نے کہا: "میں نے امام احمد بن حنبلؒ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے دو سبز حُلّے پہنے ہوئے تھے۔ آپ کے سر پر نور کا تاج تھا اور وہ ایسی چال چل رہے تھے جو دنیا میں اُن کی چال نہیں تھی۔ میں نے پوچھا: "اے احمد! یہ کون سی چال ہے؟ یہ تو آپ کی چال نہیں تھی؟ فرمایا: یہ جنت کے خادموں کی چال ہے۔ میں نے کہا یہ آپ کے سر پر تاج کیسا ہے؟ تو فرمایا۔ میرے رب نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور مجھ سے آسان حساب لیا اور مجھے حُلّے پہنائے اور نوازش کی اور اپنے قریب کیا اور میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اللہ نے مجھے یہ تاج پہنایا اور فرمایا۔ اے احمد، یہ وقار کا تاج ہے جو میں تجھے پہنا رہا ہوں۔ کیونکہ تو نے ہی کہا تھا" قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے"

كتاب الجزا

- قیامت، دوزخ اور جنّت کا احوال
- اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا تذکرہ

فصل اوّل

قیامت، دوزخ اور جنّت کا احوال

ہم قبر کی ہولناکیاں بیان کر چکے ہیں اور اُن سے سخت تر صُور کا پھونکا جانا۔ قبروں سے اُٹھنا۔ حساب و کتاب، ترازو اور پل صراط سے گزرنا وغیرہ ہے اور یہ وہ ہولناک مراحل ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے۔ اس میں بڑا غور و فکر کرنا چاہیے۔

اکثر لوگوں کے دلوں میں تو آخرت پر ایمان راسخ ہی نہیں ہے، اگر کسی انسان نے حیوانات کے پیدا ہونے کو مشاہدہ نہ کیا ہوا ور پھر اسے بتایا جائے کہ صانع اپنی قدرت سے اس گندے نطفے سے ایسا آدمی پیدا کرتا ہے جو خوب صورت، عقلمند اور بولنے والا ہوتا ہے، تو اس کی تصدیق کرنے سے اس کی طبیعت انکار کرے گی، اسی سے عام انسانوں کی کم فہمی اور علمی کم مائیگی کا اندازہ کرنا چاہیے۔ جو ذی شعور آدمی پہلی پیدائش کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت سے کہ وہ دوبارہ پیدا کرے گا، کیسے انکار کر سکتا ہے۔ اگر ایمان کمزور ہے، تو پہلی پیدائش کو دیکھ کر اس کو مضبوط کر کہ دوسری پیدائش بھی ایسی ہی ہے۔ بلکہ اس سے آسان ہے۔ اور اگر تیرا ایمان قوی ہے تو اپنے دل کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر۔ ان میں غور کر کے عبرت پکڑ اور اپنی اصلاح پر کمربستہ ہو جا۔

مُردوں کے کانوں میں جو پہلی آواز پڑے گی وہ اسرافیل کی آواز ہو گی جب کہ وہ صُور پھونکے گا اور جس آواز کو تو بھول چکا ہے، جب اسے سنے گا تو سخت پریشان ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ[1] (اور صور میں پھونکا جائے گا، تو وہ ناگہاں قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں کیسے خوش ہو سکتا ہوں جب کہ اسرافیل نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور اپنے کان لگا رکھے ہیں۔ وہ انتظار کر رہا ہے کہ اسے صور پھونکنے کا حکم دیا

---

[1] سورۃ یٰسین۔ آیت: ۵۲

جائے تو وہ پھونکے؟ مسلمانوں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! ہم کیسی بات کہیں؟ فرمایا کہو: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے اور ہم نے اس پر توکل کیا۔"

غور کرو لوگ قیامت کے روز اٹھیں گے اور اٹھنے کے بعد کیسے ننگے بدن، ننگے پاؤں میدان محشر کی طرف چلائے جائیں گے جو صاف چٹیل میدان ہوگا اس میں کوئی درخت یا ٹیلہ نہ ہوگا جس کے سائے میں آدمی پناہ لے سکے۔

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے روز لوگ چٹیل میدان میں اکٹھے کیے جائیں گے۔ جیسے صاف روٹی کی ٹکیا۔"

غور کرو لوگوں کی اتنی بھیڑ، سورج کا سروں کے قریب ہوتا۔ پسینے کا بے انداز بہنا اور پھر دل کی بے چینی، کیسی پریشان کن صورت حال ہوگی!!

حدیث میں ہے: "لوگوں کا پسینہ ان کے اعمال کے مطابق ہوگا۔"

اے مسکین! غور کر کہ جب بغیر کسی واسطہ کے تجھ سے تیرا رب اعمال کے متعلق سوال کرے گا، تو تیرا کیا حال ہوگا؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "قیامت کے روز لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیوں میں تو پوچھ گچھ اور معذرتیں ہوں گی۔ تیسری پیشی میں نامۂ اعمال مل جائیں گے۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں، کسی کو بائیں میں۔"

حضرت ابوبرزہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بندے کے قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک اس سے یہ سوال نہ ہو جائے گا کہ عمر کس شغل میں گزاری؟ اس میں کیا عمل کیے، مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جسم کی قوتوں کو کس چیز میں ختم کیا؟"

حضرت صفوانؒ بن محرز نے کہا: "میں عبداللہؓ بن عمر کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا کہ ایک آدمی سامنے آیا اور اس نے کہا، آپ نے قیامت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کچھ سنا ہے؟" انھوں نے فرمایا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اللہ عزوجل اپنے بندے کو اپنے قریب کرے گا۔ پھر لوگوں سے اس کو پردے میں کرے گا۔ پھر اس کے گناہوں کا اس سے اقرار کرائے گا اور کہے گا کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ یہاں تک کہ اس کے سارے گناہوں کا اس سے اقرار کرائے گا۔ تب وہ سمجھے گا کہ وہ ہلاک ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی تھی اور میں آج بھی تجھے معاف کرتا ہوں۔ پھر اس کی نیکیوں کی کتاب اس کو دی جائے گی۔"

رہے کافر اور منافق، تو ان کے متعلق گواہ کہیں گے: هٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ[1] (یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ خبردار ظالموں پر خدا کی لعنت ہے) (بخاری مسلم)

صحیحین میں ابوسعیدؓ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جہنم پر پُل رکھا جائے گا اور سب سے پہلے میں گزروں گا۔"

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: "پُل لایا جائے گا اور اُسے جہنم پر رکھا جائے گا۔" صحابہؓ نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! پُل کیسا ہوگا؟" فرمایا: "پھسلانے والا۔ گرانے والا۔ اُس پر لوہے کے کڑے اور آنکڑے اور کانٹے ہوں گے اور مومن اس سے یوں گزر جائے گا جیسے نظر گزر جاتی ہے۔ کوئی بجلی کی چمک کی طرح، کوئی ہوا کی طرح، کوئی گھوڑے کی دوڑ، کوئی اونٹ کی دوڑ، کوئی صحیح سلامت نجات پانے والا، کوئی خراش والا، یہاں تک کہ آخری آدمی گھسٹ گھسٹ کر جائے گا۔"

جہنم کا تذکرہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ہم نے ایک دھماکہ سُنا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا جانتے ہو کہ یہ کیا تھا؟" ہم نے کہا اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانے۔ تو آپؐ نے فرمایا: "یہ ایک پتھر جہنم میں پھینکا گیا تھا۔ ستّر سال کے بعد وہ اب جہنم کے پیندے میں گرا ہے۔" (مسلم)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمھاری اس آگ سے جسے آدمی جلاتے ہیں جہنم کی آگ ستّر گنا زیادہ تیز ہے۔" صحابہؓ نے کہا: "یارسولؐ اللہ! یہی کافی تھی۔" تو آپ نے فرمایا: "وہ اُنہتّر حصے اس سے زیادہ تیز ہے اور ہر حصہ اتنا ہی گرم ہے۔"

مسلم کے افراد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جہنم کو لایا جائے گا۔ اس دن ستّر ہزار باگیں اسے پڑی ہوں گی اور ہر باگ کے ساتھ ستّر ہزار فرشتہ ہوگا جو اسے کھینچ کر لائیں گے۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "دوزخیوں کو اتنی سخت بھوک لگے گی کہ وہ اسے جہنم کے عذاب کے

---

[1] سورۃ ہود۔ آیت: ۱۸

برابر سمجھیں گے۔ پھر وہ کھانا مانگیں گے، تو انھیں تھوہر دی جائے گی جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے۔ وہ پھر فریاد کریں گے، تو اُن کو گلے میں اٹک جانے والا کھانا ملے گا۔ پھر وہ یاد کریں گے کہ گلے میں اٹکے ہوئے کھانے کو پانی سے نگلا کرتے تھے اور وہ پانی مانگیں گے، تو اُن کو گرم پانی ملے گا۔ لوہے کے آنکڑوں سے اُن کو دیا جائے گا۔ جب ان کے قریب ہوگا تو اُن کے مونہوں کو جُھلس دے گا اور جب ان کے پیٹ میں داخل ہوگا، تو ہر چیز کو گلا کر باہر نکال دے گا۔ پھر جہنم کے داروغوں سے فریاد کریں گے کہ اپنے رب سے دُعا کرو کہ ایک دن عذاب میں تخفیف ہو جائے، تو وہ ان کو جواب میں کہیں گے: "کیا تمھارے پاس کھلے دلائل لے کر رسول نہ آئے تھے، وہ اقرار کریں گے۔ ہاں آئے تھے۔" تو داروغہ کہیں گے اب پھر تم ہی دعا کرو اور سمجھ لو کہ کافروں کی دعا بالکل بیکار ہے، پھر آپس میں کہیں گے اچھا مالک سے سوال کرو، تو کہیں گے "اے مالک، اے رب ہمیں موت دے دے۔ تو وہ کہے گا۔ تم نہیں رہنے والے ہو۔ پھر کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال۔ اگر ہم پھر ایسا کریں تو ہم ظالم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اِخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (ذلیل ہو کر اس میں رہو اور مجھ سے بات نہ کرو)

اس وقت وہ ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور پھر چیخ و پکار شروع کر دیں گے۔

جہنم کے سانپ بچھو کے متعلق غور کرو۔ حدیث میں ہے کہ اس کے سانپ بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہیں اور اس کے بچھو جیسے خچروں پر جھول ڈال رکھی ہو۔

حضرت حسنؒ سے مروی ہے کہ آگ اُن کو ہر روز ستر ہزار مرتبہ کھائے گی اور پھر وہ پہلے کی طرح ہو جائیں گے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دوزخ کے حالات بڑے لمبے ہیں اور ان میں سے تھوڑے سے تھوڑا بھی اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ اگر تمھارا اس پر ایمان ہے تو خبردار ہو جاؤ اور آنے والے حالات سے ڈرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندے پر دو خوف جمع نہ کرے گا اور خوف سے ہماری مراد عورتوں کی نرم دلی نہیں کہ ایک گھڑی روتی ہیں اور پھر غافل ہو کر عمل چھوڑ دیتی ہیں۔ خوف سے ہماری مراد وہ خوف ہے جس سے گناہ چھوڑے جائیں اور اطاعت کی رغبت ہو۔ باقی رہا بے وقوفوں کا خوف جو صرف ہولناکیوں کے سننے پر اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی مدد چاہتے ہیں۔ ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں۔ اے اللہ ہمیں سلامت رکھ" اور اس کے ساتھ وہ برائیوں پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ اور شیطان ان سے کھیلتا رہتا ہے جیسے کہ وہ آدمی جس پر درندہ حملہ کرنے والا ہو اور وہ قلعہ کے پاس ہو اور قلعے میں داخل نہ ہو بلکہ اپنی جگہ پر کھڑا رہے اور زبان سے کہے میں اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

لہ سورۃ غافر۔ آیت: ۴۹

راہِ نجات

دنیا میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھو اور ان کی سنت کی تعظیم کا حریص بن۔ شاید کہ وہ آخرت میں تیری سفارش کریں کیونکہ تمام انبیاء سے پہلے انہی کی شفاعت قبول ہو گی۔ آپ اپنی اُمت کے بڑے بڑے گناہگاروں کی سفارش کر کے ان کو نجات دلائیں گے۔

نیک لوگوں کو دوست بناؤ کہ ہر مومن کی شفاعت ہو گی اور دھوکا کھا کر سستی نہ کرنا اور اسے اللہ سے پر اُمید رہنا نہ سمجھنا کیونکہ جو کسی چیز کی امید رکھتا ہے وہ اس کو طلب کرتا ہے۔

جس آدمی کے ذمے مظالم ہوں اور وہ ان کی ادائیگی سے پہلے مر جائے تو قیامت کے دن اس کے حق دار اس کو گھیر لیں گے۔ کوئی کہے گا اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ کوئی کہے گا اس نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔ کوئی کہے گا اس نے میرا حق مارا۔ کوئی کہے گا اس نے میری ہمسائیگی کا حق ادا نہ کیا۔ کوئی کہے گا اس نے مجھ سے دھوکا کیا۔ تو اُن لوگوں سے بچنا مشکل ہو گا۔ کہا جائے گا آج کسی پر ظلم نہ ہو گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن مومن آگ سے بچ جائیں گے، تو انھیں جنت اور دوزخ کے درمیان پُل پر روک دیا جائے گا اور جو حقوق اُن کے ذمے ہوں گے ان سے بدلہ دلوایا جائے گا اور جب وہ پوری طرح پاک ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا "کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟" صحابہؓ نے کہا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو نہ سامان۔ تو فرمایا: "میری امت میں سے مفلس وہ آدمی ہے جو قیامت کے دن نماز روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اور اس نے کسی کو گالی دی ہو گی۔ کسی پر تہمت لگائی ہو گی۔ کسی کا مال کھایا ہو گا۔ کسی کا خون گرایا ہو گا۔ کسی کو مارا ہو گا۔ تو یہ سب کچھ اس کی نیکیوں سے پورا کیا جائے گا۔ پھر اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور حقوق پورے نہ ہوں گے تو مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم قیامت کے دن حقداروں کو ان کے حقوق ضرور ادا کرو گے، یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بے سینگ کی بکری کا بدلہ بھی لیا جائے گا۔"

یہ سب احادیث صحاح میں ہیں۔

غور کرو کہ اولاً تو تمھاری نیکیاں سلامت ہی کب رہیں گی کیونکہ ان میں ریا اور غیبت تو شامل ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اگر وہ سلامت بھی رہیں تو وہ حق داروں کو دے دی جائیں گی۔

چاہیے کہ تم اپنے نفس کے لیے بیدار ہو جاؤ، اور اپنے اوقات ضائع نہ کرو۔ مسکین وہ آدمی ہے جو ختم ہونے والی لذت کو پسند کرے اور اُس کے بدلے دائمی عذاب خرید لے۔ ہم اللہ سے سلامتی اور نیکی کی توفیق مانگتے ہیں۔

جنّت کا تذکرہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں کچھ جنت کے متعلق بتائیے کہ اس کی تعمیر کیسی ہے؟ فرمایا: "ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی اور اُس کی لپائی خالص کستوری سے ہے۔ اُس کے کنکر جواہرات ہیں۔ اُس کی مٹی زعفران ہے۔ جو اس میں داخل ہو گا نعمت میں ہو گا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ مرے گا نہیں نہ اُس کے کپڑے پرانے ہوں گے نہ جوانی ختم ہو گی"۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن جنّت کا ذکر کیا اور فرمایا: اُس کے لیے کوئی کوشش کرنے والا ہے؟ رب کعبہ کی قسم، وہ بھڑکتی ہوئی خوشبو، چمکتا ہوا نور، بہتی ہوئی نہریں پاک بیویاں، خوبصورتی اور نعمت کدہ اور ہمیشہ رہنے کا مقام ہے"۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم اس کے لیے کوشش کرنے والے ہیں؟ فرمایا: "ان شاء اللہ تعالیٰ"۔

صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل پر اس کا خیال ہی گزرا"۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہو گی وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہو گی۔ پھر اُن کے بعد جیسے کہ کوئی چمکدار ستارہ آسمان میں ہو۔ نہ پیشاب کریں گے نہ تھوکیں گے۔ نہ ناک جھاڑیں گے۔ نہ کھنگھاریں گے۔ اُن کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی خوشبو کستوری ہو گی، اُن کی انگیٹھیاں عود اور لوبان کی ہوں گی۔ ان کی بیویاں حور عین ہوں گی۔ ایک ہی آدمی کی طرح ہوں گے، اپنے باپ آدم کی صورت پر۔ ساٹھ ہاتھ بلند قد"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی۔ خوبصورتی کی وجہ سے اُن کی پنڈلیوں کا گودا اُن کے گوشت کے اندر سے نظر آتا ہو گا، نہ ان میں اختلاف ہو گا نہ بغض، ان کے دل ایک ہی آدمی کی طرح ہوں گے۔

صبح و شام اللہ کی تسبیح کریں گے۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دو جنت چاندی کی ہیں۔ اُن کے برتن بھی اور اُن کا سامان بھی چاندی کا ہے اور دو جنت سونے کی ہیں۔ اُن کے برتن بھی اور اُن کا سامان بھی سونے کا ہے۔ اور بندوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان صرف ایک کبریائی کا پردہ ہوگا، جنت عدن میں کوئی چیز دیدار الٰہی میں حائل نہ ہوگی۔" (بخاری۔ مسلم)

انہی میں حضرت ابو موسیٰ کی حدیث بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت میں ایک جوف دار موتی کا خیمہ ہوگا جس کا عرض ساٹھ میل ہوگا اور اُس کے ہر گوشے میں اس کے ایک گوشے والے دوسروں کو نہ دیکھیں گے، البتہ مومن ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے کئی مقامات پر جنت کی نعمتوں کا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔ پھر کئی آیات میں اسے جمع فرمایا ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ [1] (اس میں ہر وہ چیز ہوگی جسے نفس چاہیں اور آنکھیں لذت پائیں)

یہ ارشاد بھی ہے: لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا [2] (وہاں سے وہ کبھی منتقل ہونا نہ چاہیں گے)

اس پر یہ اضافہ فرمایا، فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ [3] (جو کچھ اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے اسے کوئی آدمی نہیں جان سکتا)

جنت کی صفات تو بہت زیادہ ہیں۔ ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

سب سے افضل چیز جو جنت میں ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا ہم اپنے رب کو دیکھیں گے؟ تو فرمایا: کیا جب بادل نہ ہو اور چودھویں رات کا چاند ہو تو اس کے دیکھنے میں تمھیں کوئی چیز حارج معلوم ہوتی ہے؟ فرمایا: قیامت کے دن تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔"

---

[1] سورۃ زخرف۔ آیت: ۷۱ [2] سورۃ کہف۔ آیت: ۱۰۸ [3] سورۃ سجدہ۔ آیت: ۱۸

فصل دوم

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا تذکرہ

ہم اس کتاب کو اللہ کی رحمت کی فراخی پر ختم کرتے ہیں اور ہم اس سے اس کے فضل کی امید رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس سے معافی کی امید رکھیں، تاہم اس کی رحمت اور کرم سے معافی کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ[1] (کہہ دیں اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ سارے گناہ بخش دے گا بے شک وہی ہے بخشنے والا مہربان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو ایک کتاب میں لکھا جو اس کے پاس عرش پر ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔" (البخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک رحمت انسانوں، جنوں، کیڑوں مکوڑوں اور چارپائے جانوروں پر اتاری ہے۔ اسی سے وہ ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں۔ اسی سے آپس میں رحم کرتے ہیں اور اسی سے جانور اپنی اولاد پر مہربان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ننانوے رحمتیں اپنے پاس رکھی ہیں۔ قیامت کے دن ان سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمھارا رب بڑا مہربان ہے، جو آدمی نیکی کا ارادہ کرے، پھر اس پر عمل نہ کرے اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جب عمل کرے تو اس کے بدلے دس سے لے کر سات سو گنا تک لکھی جاتی ہیں۔ اور جو آدمی برائی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر عمل کرلے تو اس کی ایک برائی لکھی جاتی ہے۔ یا اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کے لیے ہلاکت ہوگی جو پوری طرح تباہ ہونے کا مستحق ہوگا۔

---

[1] سورۃ زمر۔ آیت ۵۳

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو ایک نیکی کرے اس کے لیے دس گنا ہے اور میں اس سے زیادہ بھی دوں گا، اور جو ایک برائی کرے گا تو اس کی سزا اتنی ہی ملے گی یا میں معاف کر دوں گا۔ اور جو میری طرف ایک بالشت بھر قریب ہوگا میں ایک ہاتھ بھر اس کے قریب ہوں گا اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھے گا میں اس کی طرف ایک قلادہ بھر بڑھوں گا اور جو میری طرف چل کر آئے گا میں اس کی طرف دوڑ کر جاؤں گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آدمی نے کوئی گناہ کیا پھر کہا اے رب! میں نے گناہ کیا ہے مجھے معاف کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخش بھی سکتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا رک گیا پھر اس نے اور گناہ کیا پھر کہا۔ اے میرے رب میں نے گناہ کیا ہے مجھے معاف کر دے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخش بھی سکتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا وہ رکا رہا۔ پھر اس نے اور گناہ کیا اور کہا اے میرے رب! میں نے اور گناہ کیا ہے۔ مجھ کو معاف کر دے، فرمایا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ بخشتا ہے۔ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔"

جو چاہے عمل کرے۔ یہ سب احادیث صحاح میں ہیں۔

صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیدی لائے گئے۔ ان میں ایک قیدی عورت دوڑتی پھرتی تھی۔ جب وہ قیدیوں میں کسی بچے کو دیکھتی تو اسے پکڑ کر اپنے پیٹ سے لگا لیتی اور اسے دودھ پلاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم دیکھتے ہو کہ اگر اس عورت کا اپنا بچہ جل جائے تو کیا یہ اسے آگ میں پھینک دے گی؟" ہم نے کہا خدا کی قسم کبھی نہ پھینکے گی تو آپ نے فرمایا: "جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔"

صحیحین میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی بھی لا الٰہ الا اللہ کہے پھر اسی عقیدے پر اس کی موت ہو جائے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔" میں نے کہا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟ فرمایا: اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے۔ کہا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟ فرمایا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے۔ پھر چوتھی مرتبہ میں فرمایا: "ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود بھی جنت میں جائے گا۔"

انہی میں عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے اس آدمی پر آگ حرام کر دی جس نے سچے دل سے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا"۔

انہی میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی نے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور اس کے دل میں ایک جَو کے برابر بھی بھلائی ہوئی، اُسے آگ سے نکالا جائے گا۔ پھر اس کو نکالا جائے گا جس نے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور اس کے دل میں گندم کے دانے کے برابر بھلائی ہوئی۔ پھر آگ سے اسے نکالا جائے گا جس نے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور جس کے دل میں ایک ذرّہ کے برابر بھلائی ہوئی"۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر مومن کے پاس کوئی یہودی یا عیسائی لایا جائے گا اور اس کے سپرد کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ تیرا آگ سے فدیہ ہے"۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری اُمّت میں سے ایک آدمی منتخب کر کے سب کے سامنے لائے گا۔ جس کے گناہوں کے ننانوے دفتر ہوں گے۔ ہر دفتر حدِ نگاہ تک لمبا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تم ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہو؟ کیا نامۂ اعمال لکھنے والے میرے فرشتوں نے تم پر ظلم تو نہیں کیا؟ کہے گا اے میرے رب! بالکل نہیں۔ پھر ارشاد ہوگا کیا تمھارا کوئی عذر یا نیکی ہے؟ تو وہ آدمی پریشان ہوگا اور کہے گا اے میرے رب! کوئی نہیں تو ارشاد ہوگا ہاں تیری ایک نیکی ہمارے پاس موجود ہے اور آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ پھر ایک کاغذ نکالا جائے گا اس میں لکھا ہوگا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ تو کہا جائے گا تجھ پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ پھر وہ سارے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور اس پرچے کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ تو فرمایا وہ سب دفتر اوپر اٹھ جائیں گے اور یہ پرچہ بھاری ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے نامِ نامی سے کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی"۔

حضرت فضیل بن عیاض نے عرفہ کے دن لوگوں کا تسبیحات پڑھنا اور رونا دیکھ کر فرمایا۔ دیکھو اگر یہ سارے لوگ ایک آدمی کے پاس جائیں اور اس سے ایک دانق (درہم کا چھٹا حصہ) مانگیں تو کیا وہ اُن کو خالی ہاتھ لوٹائے گا؟ تو کہا گیا نہیں تو فرمایا خدا کی قسم اللہ کے نزدیک معاف کر دینا اس سے بھی زیادہ آسان ہے جتنا کہ اُس آدمی کو ایک دانق دینا۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے کہا ایک رات شدید بارش تھی اور رات اندھیری تھی مجھے خانہ کعبہ کا مطاف خالی مل گیا۔ میں ساری رات سحری تک طواف کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور دعا مانگی۔ اے اللہ! مجھے ہر اس چیز سے بچا جسے تو ناپسند کرتا ہے۔ تو غائبانہ ایک آواز آئی تو مجھ سے عصمت کا سوال کرتا ہے اور میری تمام مخلوق مجھ سے عصمت ہی کا سوال کرتی ہے۔ اگر میں تم سب کو گناہوں سے محفوظ رکھوں تو میں اپنا فضل کس پر کروں؟

ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہم سے وہ معاملہ نہ کرے گا جس کے ہم مستحق ہیں بلکہ ہم پر وہ احسان کرے گا جو اس کی شان کے لائق ہے اور ہم ایسے اقوال سے جو ہمارے اعمال سے مطابق نہیں رکھتے اور ہر تصنع سے جس سے ہم لوگوں میں خوبصورت نظر آتے ہیں اور ہر اس علم وعمل سے جس سے ہم نے اس کی رضا کا ارادہ کیا لیکن اس میں ان کو خراب کرنے والی چیزیں مل گئیں، ان سب چیزوں میں ہم اللہ کی بخشش مانگتے ہیں اور ہم اس کے کرم کے صدقے اس کے کرم، اور اس کی سخاوت کے طفیل اس کی سخاوت کا سوال کرتے ہیں۔ وہ قریب ہے مجیب الدعوات ہے اور سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ بہت سی اور پاکیزہ اور برکت والی تعریفیں جیسے ہمارا رب پسند کرے اور چاہے اور جیسے اس کی کریم ذات کے شایان شان ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اور صحابہ سب پر بے شمار رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔